من و یزداں

علّامہ نیاز فتح پوری

Jurat-e-Tehqiq
جراتِ تحقیق
RealisticApproachi.org

جراتِ تحقیق

برصغیر میں روشن خیالی کی تحریک کے نقطۂ آغاز کی کھوج کی جائے تو تحقیق کا سرا راجہ رام موہن رائے اور سرسید احمد خان سے جا ملتا ہے، راجہ رام موہن رائے نے ہندوستان کے عوام میں جدید تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اپنے مذہبی عقیدے کے برخلاف ستی کی ظالمانہ رسم پر سرزمین ہندوستان میں ہمیشہ کیلئے پابندی عائد کرانے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ سرسید احمد خان نے ملائیت کے شکنجے میں جکڑے، عقائد کے جمود میں پھنسے مسلمانوں میں جدید تعلیم اور اس کی اہمیت کو نا صرف فکری طور پر اجاگر کیا، بلکہ علی گڑھ یونیورسٹی قائم کرکے عملی طور پر اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ان دونوں حضرات کی عملی جدوجہد کی بدولت برصغیر میں روشن خیالی کی داغ بیل رکھی جا چکی تھی، ان کے روشن کردہ چراغ سے مزید چراغ روشن ہوتے گئے اور روشن خیالی کی تحریک رفتہ رفتہ پروان چڑھتی رہی اور ارتقائی مراحل طے کرتی رہی۔ روشن خیالی کی تحریک کا نصب العین عظمت رفتہ کے پندار میں خوابیدہ لوگوں کو جدید افکار کی انقلابی دستک کے ذریعے بیدار کرنے کی کوشش کرنے کے ساتھ یہ باور کرانے کی جدوجہد ہے کہ شعوری ارتقاء کی بدولت اب علوم کو عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھنے کا دور ہے، عقیدے، اساطیر، ظن اور تخمینے کے بجائے اجتماعی شعور کے ذریعے انسانی مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں زندگی کے اصول متعین اور مقرر کئے جائیں گے۔ فلسفۂ یونان کے عہد آفرین کے بعد خرد افروزی اور حقیقت پسندی کی نشاۃ ثانیہ کا سورج طلوع ہو کر ضوء فشاں ہو چکا ہے۔

بعد ازاں روشن خیالی کی علمی و فکری تحریک کا علم علامہ نیاز فتح پوری، سید سبط حسن اور علی عباس جلال پوری، جی ایم سید، پروفیسر مہدی حسن، اور ارشد محمود نے اپنی قلمی جدوجہد کے ذریعے بلند کیا، اور اردو داں طبقے کیلئے ایسا تحریری مواد تخلیق کیا جو آج روشن خیالی کی تحریک کیلئے بطور نصاب کام دے رہا ہے۔

جرات تحقیق پاکستان اور دنیا بھر میں اردو داں طبقے میں فکری ارتقاء کی نشو و نماء کیلئے کوشاں ہے۔ عقیدت و اساطیر کے چنگل میں پھنسے عوام پر حقیقت کو منکشف کرنے کیلئے سرگرم عمل ہے۔ تحقیق کے ساتھ حقیقت کو عیاں کرنے کی جرات پر عمل پیرا ہے۔ ادارۂ جرات تحقیق اردو میں اپنے بلاگ کے ساتھ ساتھ اپنے باذوق شائقین کے ذوق مطالعہ کی تسکین کیلئے فکر و نظر کی نشو و نما کرنے والی معیاری کتابیں منتخب کرکے پیش کرتا ہے۔

https://RealisticApproach.org

مذہبِ انسانیت کا پہلا اور آخری صحیفہ

من ویزداں

جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم
اور صحائفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور
نفسیاتی نقطۂ نظر سے مدلّل بحث کی گئی ہے

علامہ نیاز فتح پوری

جرأتِ تحقیق
RealisticApproach.org

نام کتاب:.......................................من ویزداں

مصنف: ....علامہ نیاز فتح پوری

صفحات: 393

طباعت:.......................................برقی ایڈیشن(Ebook)

سن اشاعت:.......................................اکتوبر2016ء

ISBN نمبر.......................................

نسخہ : 2.1

ٹائپنگ:....................................... Mukhtalif Ali Khan, Ali Camus Ayaz,Ya Alee, Akhtar Farooq, Sedart Baloch,Muqeem Ali, تھیامنوہر

کمپوزنگ،لے آؤٹ،ٹائٹل:.......................................علی رشاد

پروف ریڈنگ:.......................................طلحہ چوہان

ناشر: ....ادارہ جراتِ تحقیق

اس کتاب کی اشاعت کے لئے Zayd bin Mohammad نے خصوصی تعاون کیا

ان بے شمار لاکھوں

انسانوں کی یاد میں جو

مذہب کے نام پر

ذبح کئے گئے

Jurat-e-Tehqiq

فہرست

مضامین	صفحہ
عرض ناشر — ایاز نظامی	8
علامہ نیاز فتح پوری اور ان کی ادبی خدمات — معین الدین	11
خدا ہے یا نہیں؟	15
آہ زعمرے کہ گزشت ایں چنیں	21
نظریۂ اسلام میری نظر میں	25
میری عصبیت	30
بلقیس رعنا کے دو خط	33
مذہبی بیماری	38
ہمارے علماء کرام کا دینی نظریہ	41
سید سلیمان ندوی	50
نگار کی الحاد پروری	58
کورانہ تقلید	64
اے خدا	69
کیا خدا کا وجود ہے؟	75
شیعہ سنی نزاع	80
سید سلیمان ندوی اور میں	88
ایک تلخ حقیقت	93
ہماری قدامت پرستیاں	104
مذہب و الحاد	110
اکابر اسلام کے بعض خرافیات	114
ہمارا مستقبل	121
عیش و مسرت	125
خدا–لامذہبیت کے زاویۂ نگاہ سے	128
بقائے روح و معاد	143
بُعد المشرقین	149
دشمن اسلام کون ہے؟	154
میرے مذہبی خیالات	162

Jurat-e-Tehqiq

گزشتہ و آئندہ 164
خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا 170
مسلمانوں کا یوم النبی 178
عالم گیر مذہب 184
حیات وماوراء حیات 189
علم و یقین واعتقاد و مذہب 195
انسانی زندگی کا معیار اور علماء کرام 202
افسانۂ روح وروحانیت 210
خود نمائی خدا شناسی است 217
کیا مذہب فطری چیز ہے 222
مولوی و مولویت 229
ملاحدۂ دور حاضر کے نقطۂ نظر سے
❶ مذہب کی حقیقت 234
❷ صراط مستقیم 243
❸ مذہب کا مستقبل 254
❹ روایات و معجزہ کی حقیقت 273
❺ مذاہبِ عالم کی تاریکیاں 281
مذاہب کی واہمہ پرستی 288
بت پرستی وبت شکنی 292
قرآن کے کلامِ خدا ہونے کا صحیح مفہوم 298
روح وبقائے روح 307
خدا کا تصور 314
مآخذ القرآن پر اصولی گفتگو 317
سامی مذاہب کی روایات 340
شیطان 373
معصیت اور مذاہب و عقل 376
شریعت میں تغیر وتبدّل 379
درود شریف 384
عبادت 387
مساجد اور سیاسی جلسے 391

* ~ * ~ * ~ * ~ * ~ * ~ *

عرضِ ناشر

"من ویزداں" میری محسن کتاب ہے جس نے میری سوچ کے دھارے کو تبدیل کر کے زندگی میں ایسا انقلاب برپا کیا جس کے ولولے میں زندگی کی ہر سانس میں محسوس کرتا ہوں، ہر بار "من ویزداں" کے مطالعہ سے، سوچ کی نئی نئی کونپلوں نے سر ابھارا، ذہن میں ابھرنے والے سوالات کے قابلِ تشفی جوابات میسّر آئے، ہمّتِ کفر اور جرأتِ تحقیق کو مہمیز میسر آئی۔ کتاب کی تحریر صاحبِ کتاب کی عظمتِ فکر تسلیم کرنے پر از خود مجبور کر دیتی ہے، اور یہی ایک مصنف کی اصل عظمت و جلالت ہے، ؏ "قلم گوید کہ من شاہِ جہانم" میں نے جب بھی "من و یزداں" کا مطالعہ کیا مجھے ایسا احساس ہوا کہ یہ کتاب خاص میری مضطرب طبیعت کی تسکین کے لئے ہی تصنیف کی گئی ہے، جب بھی اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں، عالمِ تصوّر میں خود کو علّامہ صاحب کے سامنے زانوئے تلمّذ و ادب تہہ کئے ہوئے پاتا ہوں۔

جب ان گنت لوگوں کو یہ اعتراف کرتے دیکھا کہ "من ویزداں" نے ان کی زندگی تبدیل کر کے رکھ دی، تو سرشاری کا ایک احساس رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے کہ اس ساقی کی ساقی گری سے فیض یاب ہونے والے رندوں کی کوئی کمی نہیں ہے، میرے ہم مشرب و ہم پیالہ اور بھی بہت ہیں، یہ وہ مئے خانہ ہے جہاں پیمانے کی کوئی پابندی نہیں، ندیموں کی کوئی کمی نہیں۔

صاحبو! زیست و موت کا معاملہ ذی روحوں تک محدود نہیں، کتابیں بھی زندہ ہوتی ہیں اور مر بھی جاتی ہیں، کتابیں تو بے شمار لکھی گئیں اور لکھی جاتی رہیں گی، جو منصۂ شہود پر رونما ہوئیں، لکھی گئیں، پڑھی گئیں، لیکن بھلا دی گئیں، دوبارہ ان کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، تو سمجھو وہ کتاب مر گئی، اس کی موت واقع ہو گئی، لیکن کچھ کتابیں زندہ و جاوداں ہوتی ہیں، ان سے بے نیاز ہونا مشکل ہوتا ہے، ان کتابوں کی طلب انہیں مرنے نہیں دیتی، "من ویزداں" بھی زندہ و جاوید کتاب ہے جو نہ صرف خود بقیدِ حیات ہے بلکہ اپنے مصنف کو بھی زندہ و جاوید بنائے ہوئے ہے۔ آج وطنِ عزیز میں جہاں بھی روشن خیالی کی شمعیں روشن دیکھتا ہوں، مجھے علامہ نیاز فتح پوری اور "من ویزداں" کا پرتو جھلکتا صاف نظر آتا ہے۔

متاثرینِ نیاز کے ہجوم میں مجھے کچھ اصحابِ منبر و محراب بھی نظر آتے ہیں جو گلشنِ نیاز کے خوشہ چیں ہیں لیکن وہ کبھی جوٹھے منہ اس کا اعتراف نہیں کرتے، کیوں کہ ایسا اعتراف

ان کے علمی قد کاٹھ میں نصب بیساکھیوں کی پردہ کشائی کے مترادف ہے، یا پھر اخلاقی جرأت کی کمی اس اعتراف کے مانع ہے۔

ایک عرصہ سے مجھے یہ قلق لاحق تھا کہ "من ویزداں" جیسی معنوی دولت سے مالامال کتاب کی معیاری و دیدہ زیب طباعت پر توجہ نہیں دی گئی، نیٹ پر جو نسخے دستیاب تھے ان میں اسکیننگ کا معیار انتہائی ناقص تھا، کئی صفحات غائب تھے اور کئی صفحات اپنی ترتیب پر موجود نہ تھے، "من ویزداں" کی ہارڈ کاپی یا سافٹ کاپی کے مطالعہ کے دوران ایک معیاری نسخے کی اشد ضرورت ہمیشہ محسوس ہوئی، اسی فکر و قلق کی بدولت بالآخر اس کتاب کو جدید پیرہن میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کتاب کی از سرِ نو برقی طباعت کیلئے مجھے دو نسخوں کی مدد دستیاب رہی، پہلا نسخہ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اور دوسرا نسخہ ۱۹۶۲ء کراچی کا شائع شدہ ہے، میں نے معیار دوسرے نسخے کو ہی بنایا ہے کیوں کہ وہ نظر ثانی شدہ نسخہ ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ نسخۂ اول سے بھی جابجا مدد لی ہے۔ بعض مقامات پر میں نے متروک کے بجائے رائج املاء کو ترجیح دی ہے۔کتاب کے آغاز میں علّامہ نیاز صاحب کے مختصر حالاتِ زندگی پر مشتمل ایک مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے جو جناب معین الدین (بنگلہ دیش) کا تحریر کردہ ہے اور ادارہ فروغِ قومی زبان کی ویب سائٹ سے حاصل کیا گیا ہے۔

ایک اضافی کام کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ علامہ صاحب نے کتاب میں جن شخصیات، مقامات، کتابیات و اصطلاحات وغیرہ کا ذکر کیا ہے، ان کے آن لائن حوالہ جات تلاش کرکے مذکورہ الفاظ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے، تاکہ مطالعہ کے دوران ان الفاظ پر کلک کرکے مزید تفصیلات و معلومات حاصل کی جاسکیں، کوشش ہوگی کہ جلد ہی اس مرحلہ پر بھی کام کرکے اگلے ایڈیشن میں یہ اضافہ شامل کر دیا جائے۔

جن احباب نے اس نسخہ کی تیاری میں معاونت کی میں ان کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ میں نے اپنے طور پر پوری کوشش کی کہ یہ جدید نسخہ ہر طرح کی اغلاط سے پاک ہو، لیکن عین ممکن ہے کہ اس کے باوجود اغلاط باقی رہ گئی ہوں، قارئین سے التماس ہے کہ کسی غلطی پر متنبہ ہوں تو ضرور مطلع کریں۔

نیاز مندِ نیازؔ
ایازؔ نظامی

علّامہ نیاؔز فتح پوری

www.niazfatehpuri.com

علامہ نیاؔز فتح پوری اور ان کی ادبی خدمات

اپنے وقت کی نابغۂ روزگار شخصیت

مغلوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوتے ہی اندھیرے کی دیوار دراز ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن مصلح قوم سرسید کی تحریک نے اس دیوار میں روشنیوں کے روزن کھول دیے۔ قدامت کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی روشن خیالی کی کرنیں نمودار ہونے لگیں۔ ان کی تعلیمی اصلاحات اور ان کے رسالے ’’تہذیب الاخلاق‘‘ کی اشاعت نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جس میں نوجوان طبقہ ہر گتھی کو عقل کے ناخن سے کھولنے کا شائق ہو گیا۔ ایک ایسی فضا تعمیر ہوئی جس میں ہر پرانی بات بہت زیادہ پرانی معلوم ہونے لگی۔ سنی سنائی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینے کے بجائے بحث و تکرار کے دروازے کھلنے لگے۔ لہٰذا نیاز محمد خاں بہ لحاظ عمر بہت چھوٹے تھے لیکن بہ اعتبار عقل بہت پختہ اور عمر کے اس حصے میں جب بچے صرف کھیلتے اور کودتے ہیں، وہ تعلیم کی ان منازل سے گزر رہے تھے جو سن بلوغ میں طلبہ کے سامنے آتی ہیں۔ عقل کا یہ معیار انہیں ارد گرد کے ماحول سے کس طرح بے خبر رکھ سکتا تھا، جبکہ انہیں باپ کی طرف سے روشن خیالی کے تحفے روز ملتے تھے۔

علامہ نیاز فتح پوری کا آبائی وطن فتح پور ہسوہ تھا لیکن وہ ۱۳۰۲ ہجری مطابق ۱۸۸۴ء میں بمقام سنئی گھاٹ ضلع بارہ بنکی پیدا ہوئے جہاں ان کے والد محمد امیر خاں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ جناب محمد امیر خاں ۱۹۰۸ء میں مرزا غالب اور امام بخش صہبائی وغیرہ کے دوستوں میں تھے اور علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے نیاز صاحب کی تعلیم و تربیت کا نہایت معقول انتظام بچپن ہی سے کر دیا۔ چناں چہ مولوی حبیب الدین اور مولانا صدیق حسن غازی پوری وغیرہ اتالیق کی حیثیت سے سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے۔ لیکن باقاعدہ تعلیم کے لیے نیاز صاحب مدرسہ عالیہ رام پور اور ندوۃ العلما لکھنؤ میں بھی رہے لیکن اس سلسلے میں ان کا زیادہ قیام فتح پور میں رہا۔

فتح پور کا مدرسہ اسلامیہ جو اب مسلم انٹر کالج ہے اور علی گڑھ کے بعد غالباً پہلا مدرسہ تھا جس میں عربی، فارسی اور علوم اسلامی کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس مدرسہ کی بنیاد ۱۸۰۲ء میں مولانا سید شاہ ظہور اسلام نے ڈالی تھی جو مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل عالم اور مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے۔ غرض کہ مولانا موصوف انیسویں صدی عیسوی کے ایک زبردست عالم، سماجی مصلح اور تعلیمی مفکر تھے۔ یہ دراصل انہی کے فیض صحبت اور تعلیم و تربیت کا رشد تھا کہ اس مدرسہ نے مولانا عبدالرزاق کانپوری۔ حکیم مولوی عبدالحئی، مولانا حسرت موہانی، مولانا احسن الدین خاموش اور علامہ نیاز فتح پوری جیسے نامور مؤرخ، مفکر، شاعر و ادیب پیدا کئے۔

نیاز صاحب کی تعلیمی زندگی کا زیادہ حصہ مولانا ظہور اسلام کی شاگردی میں گزرا۔ انہی کے مدرسہ سے نیاز صاحب نے دیوبند کے نصاب تعلیم کی تکمیل کی اور وہیں سے ۱۸۹۹ء کو میٹریکولیشن کا امتحان

پاس کیا۔ ۱۹۰۰ء میں پولیس سب انسپکٹر نامزد ہوئے اور مراد آباد میں ایک سال کی ٹریننگ مکمل کر کے تھانہ ہنڈیا ضلع الٰہ آباد میں تعینات ہوئے۔ چوں کہ ملازمت اور نیاز صاحب کی طبیعت میں بعد المشرقین تھا اس لیے دو سال میں استعفیٰ دے دیا۔ پھر چند سال انہوں نے ادھر اُدھر مختلف ملازمتوں کے سلسلے میں بسر کیے اور گزارے لیکن لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ اس لیے بہت جلد صحافت کی طرف آ گئے اور باقاعدہ صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۱۰ء سے ہوتا ہے جب کہ وہ مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ رسالہ "زمیندار" سے منسلک ہوئے اور ۱۹۱۰ء سے لے کر "**نگار**" کے سالِ اجراء ۱۹۲۲ء تک ان کا زیادہ قیام بھوپال اور دلی میں رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کے انشائیوں اور افسانوں کی دھوم مچ رہی تھی اور بقول مُلّا واحدی "ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈپٹی عبدالرؤف اور بعض دوسرے نوجوان نیاز صاحب سے ملنے کے لیے دلی کے پھیر کیا کرتے تھے"۔

فروری ۱۹۲۲ء میں نیاز صاحب نے ترکی زبان کی مشہور شاعرہ نگار بنت عثمان کے کلام سے متاثر ہو کر رسالہ "**نگار**" جاری کیا۔ ۱۹۲۶ء میں نیاز صاحب بھوپال سے لکھنؤ منتقل ہو گئے اور "**نگار**" کو بھی ساتھ لائے۔ لکھنؤ میں انہیں ذاتی مکان، پریس اور اطمینان و آسائش کے سارے ذرائع حاصل تھے لیکن ۱۹۵۴ء میں اپنی چہیتی بیٹی شوکت جہاں کی ناگہانی موت سے سخت صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد بعض ایسے افسوس ناک خانگی واقعات رونما ہوئے کہ وہ نیاز صاحب کے لیے روح فرسا المیہ بن گئے۔ ان کے قلب و ذہن پر اس المیہ نے اتنا گہرا اثر ڈالا کہ وہ سخت علیل ہو گئے اور کئی ماہ تک صاحب فراش رہے۔ نیاز صاحب جس خانگی المیہ کا شکار ہوئے تھے وہ قانوناً اس کا دفاع آسانی سے کر سکتے تھے، لیکن ان کی اخلاقی غیرت نے اسے قبول نہ کیا۔ وہ اس زہر کو پی گئے لیکن جینے کا حوصلہ باقی نہ رہا۔ ان حالات میں ان کے بعض احباب اور اعزّہ نے انہیں پاکستان آنے کا مشورہ دیا اور مجیب انصاری مرحوم کی کوششوں سے وہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۲ء میں پاکستان کے مشہور شہر کراچی آ گئے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے "**نگار**" کے نیاز نمبر میں بہت صحیح لکھا ہے کہ "ان کی نجی زندگی میں بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے باعث وہ اپنا کوئی کام سکون خاطر سے نہ کر سکتے تھے"۔

لکھنؤ میں جو ذہنی اذیت انہیں پہنچی تھی، اس کا ازالہ تو خیر ممکن نہ تھا لیکن پاکستان آنے کے بعد پھر بھی فضا کی تبدیلی کا خاصا اثر رونما ہوا۔ اب اس اذیت سے بہت کچھ نجات پا گئے۔ نیشنل بینک آف پاکستان کے منیجنگ ڈائریکٹر جناب ممتاز حسین کے التفاتِ خاص نے انہیں فیریئرہال کراچی کے کتب خانے سے منسلک کر دیا چوں کہ یہ کام نیاز صاحب کے مذاق اور مزاج کے عین مطابق تھا اس لیے ان کی دلچسپی اور توجہ دونوں کا مرکز بن گیا اور دو سال کی مدت میں انہوں نے عربی و فارسی کے ہزاروں مخطوطات پر مفید حواشی و اشارات مرتب کر دیئے۔

پاکستان اردو ترقی بورڈ کی زیرِ ترتیب لغت پر نظرِ ثانی کا کام بھی ان کے سپرد تھا اور آخری ایام تک وہ اس کام کو نہایت دلچسپی اور انہماک سے کرتے رہے۔ اس کے علاوہ روزنامہ "جنگ" میں ہفتہ وار کالم "رنگارنگ" بھی پابندی سے لکھتے تھے اور اپنا رسالہ "**نگار**" کراچی کی ذمہ داریوں کا بھی انہیں پورا احساس تھا۔ سوالات و جوابات کا کالم "باب الاستفسار"، "باب الانتقاد" وغیرہ مستقلاً وہی لکھتے تھے۔ علمی و ادبی مقالات اور مضامین کی ترتیب، پروف ریڈنگ اور کتابوں پر تبصرے کا کام انہوں نے معاون

پر چھوڑ رکھا تھا لیکن پریس جاتے جاتے وہ سارے پرچے پر ایک نظر ضرور ڈال لیتے تھے۔ جو خطوط ان کے نام ہوتے تھے، ان کے جوابات بھی وہ پابندی سے لکھنے کے عادی تھے۔ یہ سارا کام وہ حد درجہ انہماک و تندہی سے کرتے تھے لیکن تھکن کے آثار ان کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھے گئے۔

صاحب مذکور باب الاستفسار میں خصوصاً بڑے ذوق و شوق سے لکھتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو پر ان کی نظر وسیع بھی تھی اور گہری بھی۔ اساتذہ کے کلام کا بیشتر حصہ انہیں زبانی یاد تھا۔ صرف غزل کے اشعار نہیں بلکہ طویل مثنویاں، قصیدے، قطعات اور رباعیاں وغیرہ سبھی ان کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ اس لیے کسی لفظ کی سند تلاش کرنے میں چنداں دقت نہ ہوتی تھی۔ علم و بیان و بدیع اور عروض و قافیہ وغیرہ کے مسائل پر بھی وہ برجستہ لکھتے تھے۔ تاریخ اسلامی قرآن و حدیث کے مباحث پر بھی ان کا قلم خوب چلتا تھا۔ وہ حافظ قرآن تو نہ تھے لیکن قرآن کے اجزا انہیں کثرت سے یاد تھے کہ کسی مسئلہ پر قلم اٹھاتے وقت انہیں دشواری نہ ہوتی تھی۔

معلومات عامہ کے استفسارات کے سلسلے میں وہ البتہ مختلف کتابوں سے مدد لیتے تھے لیکن پھر بھی معلومات عامہ کا اتنا بڑا ذخیرہ ان کے ذہن میں محفوظ تھا کہ حیرت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں وجہ یہ تھی کہ عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کے سارے اہم رسالے پڑھتے تھے۔ ایک مدت سے یہی رسائل، جن کا تعلق مختلف علوم و فنون سے ہوتا ہے، دراصل ان کے معلومات عامہ کے سرچشمہ تھے اور انہی کے ذریعے وہ ہر علم و فن کے جدید ترین رجحانات و انکشافات سے باخبر رہتے تھے اور کبھی کبھی ان رسائل کا اقتباس بھی لیتے تھے اور کبھی کبھی دوران مطالعہ آزاد ترجمہ کے ذریعہ اس کا رس نچوڑ لیتے تھے۔

صاحب موصوف کی زندگی برسوں سے معمولات کے ساتھ بسر ہو رہی تھی۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، گھومنے پھرنے اور لکھنے پڑھنے وغیرہ یعنی سب کے اوقات مقرر تھے۔ گرمیوں میں روزانہ چھ سات گھنٹے اور سردیوں میں آٹھ دس گھنٹے وہ جم کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ وہ سارا کام پابندئ وقت اور سلیقہ سے کرتے تھے اور اسی نہج سے دوسروں کو بھی کام کرنے کی ہدایت اور تلقین کرتے تھے۔

جون ۱۹۶۵ء میں جب ڈاکٹروں نے ان کے گلے کی گلٹی کو سرطان یعنی کینسر کا پیش خیمہ بتایا تو وہ حد درجہ متفکر و مضمحل رہنے لگے۔ تقریباً ڈیڑھ دو ماہ تک برقی شعائیں (شعاعیں) دی گئیں مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ آپریشن کی نوبت آئی تو اسے بھی وہ بڑے ضبط اور ہمت سے جھیل گئے۔ آخری ایام میں چوں کہ جی بھر کے لکھنے پڑھنے سے معذور ہو چکے تھے۔ اس وقت، ٹائم کاٹے نہ کٹتے تھے۔ اپنی بے عملی پر کڑھتے تھے اور مختلف اشعار سے دل بہلاتے تھے۔ آخری وطن میں جبکہ وہ زندگی سے یکسر مایوس ہو چکے تھے۔ "**نگار**" پاکستان اور اپنے دونوں بیٹوں سرفراز نیازی اور ریاض نیازی کے متعلق وہ اکثر سوال کرتے تھے کہ اب کیا ہو گا؟ انہیں بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ ان کے بعد "**نگار**" اپنی انفرادی روایت کے ساتھ جاری نہ رہ سکے گا اور ان کے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کی تکمیل ان کی خواہش کے مطابق نہ ہو سکے گی۔ جب کبھی کوئی قریبی دوست یا ہمدرد ان کی عیادت کو آتا تو یہ دونوں باتیں چھیڑ کر آبدیدہ ہو جاتے اور دوسروں کو بھی آبدیدہ کر دیتے تھے لیکن افسوس بلکہ صد افسوس کہ ۲۴ مئی بروز منگل ۱۹۶۶ء کو اسّی (۸۰) سال کی عمر میں صبح چار بجے انتقال کر

گئے۔ مرحوم اپنی ذات سے ایک ادارہ، ایک مکتبۂ فکر اور ایک تحریک تھے۔ ہر چند کہ وہ طبعًا عزلت پسند اور گوشہ گیر تھے۔ کم آمیز و کم سخن تھے اور غالب کے اس شعر کے ترجمان تھے ؏

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جناب نیاز صاحب گزشتہ ساٹھ پینسٹھ سال سے مسلسل لکھ رہے تھے اور ایسی انفرادیت کے ساتھ لکھ رہے تھے کہ ان کی کسی تحریر کو حرف مکرر کہنا مشکل ہے، صحافت ہے، ادبی تنقید ہے، انشائیہ ہے، مکتوب نگاری ہے، تاریخ اسلام ہے، جمالیات، افسانہ، ناولٹ، تحقیق، علوم عقلیہ، مذہبیات، نفسیات اور معلومات عامہ وغیرہ سب پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اور اپنے مخصوص اسلوب نگاری و طرز فکر کی بدولت ایسا نقش چھوڑ گئے کہ اردو میں جب بھی یہ موضوعات مسائل علمی وفنی انداز سے زیر بحث آئیں گے تو علامہ مرحوم کا نام ضرور لیا جائے گا۔

نیاز فتح پوری صاحب جب ہندوستان میں تھے تو ۱۹۶۲ء میں حکومت کی جانب سے "پدما بھوشن" کا خطاب ملا اور اپنے رسالہ "**نگار**" کے تقریباً دس نمبر نکالے۔ آپ ایک اچھے معیاری رسالہ کے ایڈیٹر ہونے کے علاوہ کتابیں بھی لکھتے رہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ افسانوں کے دو مجموعے "نگارستان" اور "جمالستان"۔ اور تاریخ الاولین، فراست الیہ، جذبات بھاشا اور ترغیبات جنسی وغیرہ اردو دان حضرات ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں جبکہ نیاز صاحب کا پہلا افسانہ "ایک شاعر کا انجام" ہے۔ رسالے اور کتابوں کی فہرست بتاتی ہے کہ نیاز صاحب اکثر موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہے اور ہر جگہ وہ اپنی ادبی شان کو برقرار رکھے ہیں جو ان کے لیے مخصوص ہے۔ ان کی تحریر میں بے باکی اور آزادیٔ رائے قدم قدم پر موجود ہے۔

جناب علامہ حقیقتاً سرسید احمد خان اور شبلی نعمانی کے ملے جلے دبستان فکر وادب کی آخری یادگار تھے۔ نیاز اور "**نگار**" لازم وملزوم رہے ہیں اور شاید یہ یادگار ان کے لائق فرزند حقیقی ومعنوی کی مشترک مساعی سے سرسبز رہے گی۔

الغرض اردو زبان کے محسنوں میں ایسی ہمہ جہت اور ہمہ صفات شخصیت شاید ہی کوئی اور ہو جیسی کہ علامہ نیاز فتح پوری صاحب کی تھی۔ کئی زبانوں پر دسترس، شاعر، انشاپرداز، فلسفہ ومذہب، فقہ وحدیث، منطق وموسیقی، تاریخ ونفسیات، فن تجوید وتنقید غرض کہ کون سا باب علم تھا جو ان پر بند تھا۔ صحافت کے میدان میں ماہنامہ "**نگار**" ان کی ایسی یادگار ہے جسے صدیوں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس رسالے کو ادیبوں اور شاعروں کی نرسری کہا جاتا ہے۔ ان کے نظریات، عقائد ہر چند کہ تنازعات کا سبب رہے، مگر اس کے باوجود انہوں نے جتنا علمی وادبی کام کیا وہ بڑے بڑوں کے بس سے باہر ہے۔ بنابریں ان کو نابغۂ روزگار شخصیت کہا جاتا ہے۔[1]

معین الدین (بنگلہ دیش)

1- معین الدین صاحب کا یہ مقالہ ادارہ فروغِ قومی زبان کی ویب سائٹ سے اخذ کیا گیا ہے۔لنک

خدا ہے یا نہیں ؟

اس کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے چاہو، چاند کے ایاب وذہاب سے پوچھو، آب شاروں کی روانی اور دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔

موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل، بہار و خزاں کا ظہور و خفاء، نباتات کی بو قلمونی، وحوش و طیور کی طبیعی نیر نگی۔ نوعِ انسانی کے قوائے کامنہ، فضائے بسیط کے ستارے، کائنات کی لاانتہاء وسعت، خور و شبنم، ذرہ و آفتاب اور ان سے بھی فروتر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض، علم الجو، علم الافلاک، علم کیمیا، علم وظائف الاعضاء، علم الحیات، نفسیات وغیرہ رکھا ہے بتائیں گی کہ یقیناً کوئی ایسی قوت موجود ہے جس کے سمجھنے کیلئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں اور اسی لئے یہ مسئلہ اس قدر بدیہی، اس درجہ روشن و واضح ہے کہ اگر چاہوں تو اسے مشاہدات سے تعبیر کر سکتا ہوں، جس کیلئے نہ کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی حجت و استدلال کی۔

آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ ہو جاتا ہے، صبح کو پھول کھلتے ہیں اور سارا گنج نکہت سے معمور ہو جاتا ہے، یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے، یہ وہ صداقت ہے جو آپ اپنی مصدق ہے، اگر ہم اس سے ناواقف ہیں تو کس کا قصور؟

حق خامش ست وبا تو بصد رنگ گفتگو ست — شوق آرمیدہ است وفلک تاز جستجو است
موقوف اضطراب زمان نیست عرض راز — گر داری اشارۂ تحقیق مو بمو ست
ہر گہ نظر خطاب کند حرف خامشی ست — ہر جا بہار ساز شود نغمہ رنگ و بو ست
کثرت حجاب جلوہ وحدت نمی شود — مژگاں بہر چہ باز کنی دیدہ محوِ او ست

پھر اب اور نہ کبھی، یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوا کہ کوئی قوت مافوق الادراک ہے یا نہیں؟ البتہ عقولِ انسانی کا اختلاف اس امر میں ضرور ہوا ہے کہ ہم اس کا تصور کیوں کر

کریں؟ اس نہ دیکھے جاسکنے والے کو کیوں کر دیکھیں؟ اور اس نہ سمجھے جاسکنے والے کو کس طرح سمجھیں؟ فلسفہ آج تک اس گرہ کو نہ کھول سکا، مذہب کی عقدہ کشائیاں تمام تر اسی ایک معمہ سے وابستہ رہیں اور مختلف زمانوں میں، مختلف قوموں نے مختلف طریقوں سے اسی مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا لیکن کیا یہ امر حیرت ناک نہیں کہ باوجود اس کے کہ حقیقت ایک ہے مگر تعبیرات بے انتہاء، شاہد ایک ہے مگر اس کی داستانیں کثیر

حسنك واحد و عباراتنا شتّی

جنگ ہفتاد دوملت ہمہ را عـــذر بنہ

چوں ندیدند حقیقـــت رہِ افسانہ زدند

مذاہبِ عالم اور اقوام وملل کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو گا کہ کفر واسلام، اذان وناقوس کی جنگ جو آج نظر آرہی ہے، کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کی ابتداء اسی وقت سے ہوتی ہے جب انسان اپنا جذبۂ تفوق پرستی لے کر سامنے آیا پھر یہ جنگ یقیناً علم و مذہب کی جنگ نہیں، کیوں کہ اگر مذہب کا مقصود حقیقی صرف خداشناسی ہے تو پھر مجھے کوئی سمجھائے گا کہ دنیا کا وہ کون سا علم ہے جو معناً اس غائت تک نہیں پہنچتا، بلکہ یہ جنگ ان رقیبوں کی تھی جو سوا اپنے کسی اور کو "خلوتیانِ راز" میں شامل دیکھنا پسند نہ کرتے تھے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ اپنے ہی ذوقِ سجود کا تفوق ثابت کرکے آستانِ "محبوب" کو اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتے تھے اور یہ کمزوری کم و بیش ہر زمانہ کے انسان میں پائی گئی ہے، اور آج بھی تمام افتراق وانشقاق اسی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

فلسفہ واستدلال کی دنیا میں آکر جس وقت اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ خدا کے جس تصور کو مذاہبِ عالم نے پیش کیا وہ صحیح نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ صرف قومی نظامِ تمدن کے لحاظ سے وہ کسی وقت مناسب رہا ہو لیکن اخوتِ عامہ اور ہمہ گیری کے لحاظ سے وہ نامکمل تھا۔ دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ایسا ہوا ہے جس نے ہزاروں لاکھوں سال کی اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھایا ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اب نہ مذہب کے لحاظ سے کسی اور مذہب کی ضرورت دنیا کو باقی ہے نہ مبلغِ مذہب کی حیثیت سے کسی اور ہستی کے رونما ہونے کی۔ اور مذہبِ اسلام ہے جو نہ کسی ملک کیلئے مخصوص ہے نہ کسی قوم کیلئے مختص، اس کی دعوت گبر و ترسا یہود و نصاریٰ، عالم و جاہل، امیر و فقیر، شاہ و گدا، مشرق و مغرب، شمال و جنوب، ہر طبقہ و ہر ملک کیلئے یکساں ہے، اور

اسی لئے اس نے جو مفہوم خدا کی کبریائی کا پیش کیا ہے، وہ ایسا جامع، ایسا قرینِ عقل، ایسا ہمہ گیر اور اس درجہ وسیع ہے کہ جس آسانی سے ایک جاہل اسے قبول کر سکتا ہے بالکل اسی طرح ایک فلسفی بھی اس کے ماننے پر مجبور ہے۔

وہ زمانہ جب "آسمانی بادشاہت" کا وعظ کہہ کر خدا کو ایک دنیاوی صاحبِ جبروت بادشاہ کی طرح پیش کیا جاتا تھا، ختم ہو گیا۔ وہ عہد جب عقولِ انسانی صرف مرئی و محسوس اشیاء پر ایمان لا سکتے تھے اور جب ضرورتاً اور مصلحتاً مسیح کو خدا کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی تھی، گزر گیا، وہ دورِ انسانیت جب تمرکزِ نفس Concentration of Mind کیلئے رمزی اور اشاری Symbolic طریقِ عبادت محسوس کر کے خدا کے وجود کو بتوں، ہیکلوں، تمثالوں اور مجسموں میں تبدیل کیا گیا، باقی نہیں ہے، یہ تمام زمانے اب سے تقریباً ۱۴۰۰ سال قبل ختم ہو گئے جب ریگستانِ عرب سے ایک انسان کامل کا ظہور ہوا اور اس نے نہایت ہی مختصر و سادہ الفاظ میں خدا کے وجود کا وہ فلسفہ بیان کیا جو اس سے قبل کسی نے بیان نہ کیا تھا، اس نے ثنویت و تثلیث کی تردید کی، اس نے تجسیم و تشکیل کو غلط ٹھہرایا، اس نے تشتت و انتشار کو محو کیا، تفریق و افتراق کی راہوں کو بند کیا اور اس نے بتایا کہ خدا تمام مکانیات و زمانیات سے بے نیاز ہے، مادیات کی دنیا سے علیحدہ ہے اور تمام نسبتوں اور اضافتوں سے منزہ جو عقولِ انسانی کو کسی وجود کے سمجھانے کیلئے متعین کی جاتی ہیں۔

ایک طرف تو اس نے بتایا کہ اس کا قیام عرشِ بریں پر ہے یعنی ذاتِ انسانی سے علیحدہ کائنات کی فضائے وسیع و لامتناہی میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اور دوسری طرف اس کو شہ رگ سے زیادہ قریب بتایا یعنی جس حد تک ذاتِ انسانی کا تعلق ہے اس کے قرب کی کوئی انتہاء نہیں، وہ سانس میں جاری ہے، خون میں ساری ہے، روح میں دوڑ رہا ہے، قلب میں جا گزیں ہے اس کو رحمان و رحیم بتایا، اور جبار و قہار ظاہر کیا، بظاہر یہ نام ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن یہیں سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جن کو اسماءِ حسنٰی کہا جاتا ہے وہ نہ خدا کے ذاتی نام ہیں نہ صفاتی، بلکہ آثاری و مظاہری اسماء ہیں جن کا تعلق کائنات کے ہر تغیر و تبدل، زندگی کے تمام اصول اور ہستی کے جملہ اعتبارات و امتیازات سے ہے یعنی اگر انسان خوش و پر امن زندگی بسر کر رہا ہے تو یہ بھی اسی کا مظہر ہے اور اگر قہر و جبر کی ساعتیں گزار رہا ہے تو یہ بھی اسی ایک ذات کی وجہ سے ہے جس نے اسباب و علل پیدا کر کے عالم کی تمام کیفیاتِ مادی و ذہنی کو اپنے سے منسوب کیا اور

جن کے ترک و اختیار کیلئے انسان کو عقلِ کامل عطا فرمائی۔

یہ تھا خدا کا وہ تصور جو بانیٔ اسلام نے بتایا، اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس سے زیادہ پاکیزہ و منزہ خیال جو بلند ترین فکرِ انسانی کیلئے بھی قابل قبول ہو اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے وہ اصل اصولِ مذہب جو انسان کو وسیع النظر بناتا ہے۔ جو تمام افراد کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کر سکتا ہے اور جو دلوں کو تعصب و جہل کینہ و بغض سے پاک رکھتا ہے لیکن کیا کوئی مسلمان آج ایسا ہے جو کہہ سکے کہ وہ خدا کو ایسا ہی سمجھ رہا ہے جیسا بانیٔ اسلام نے سمجھایا تھا اور اس کی آغوش ہر انسان کیلئے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کسی ملک و قوم کا ہو، پوری طرح کھلی ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں کے علماء مقدس جو اپنی ساری زندگی صرف روزہ نماز کی تلقین میں بسر کر دیتے ہیں کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی غور نہیں کرتے کہ جس خدا کا پیام وہ دنیا کو پہنچا رہے ہیں وہ پہلے روزہ نماز کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کی تصدیق چاہتا ہے جو اس کے اور بندوں کے درمیان قائم ہے اور جس کے سمجھنے پر کائنات کی ترقی، روح کا استعلاء، اخلاق کی پاکیزگی، مادّی ارتقاء اور عالم کا امن و سکون منحصر ہے، اگر ایک مسلمان نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے یہ خیال لے کر نکلتا ہے کہ مندر و کلیسا خدا کی حکومت سے الگ ہیں اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر اپنے سوا تمام عالم کو غیرِ خدا کی مخلوق سمجھتا ہے تو مذہب معلوم و اہلِ مذہب معلوم!

پھر جب خدا سب کا ہے تمام مخلوق اسی کی ہے جس کو نہ مذہب سے فائدہ پہنچتا ہے نہ لادینیت سے نقصان تو پھر یہ عصبیت کیوں یہ تفوّق و برتری کا غلط معیار کیسا؟ طریقِ عبادت کے اختلاف پر جنگ کیا معنی؟ وضع و لباس کی تفریق، تمدن و معاشرت کے امتیازات پر آویزش کیسی؟

دل چو آزاد از تعلق شد منور می شود — قطرۂ کز موج دامن چید گوہر می شود

ہیچ کس را در محبت شرم ہم چشمی مباد — در ہوایت ہر کہ گرید دیدہ ام تر می شود

"انسانیت" اب نہیں بلکہ طفولیت سے ہی حسن و جمال کا خواب دیکھ رہی ہے، اور جس حد اس کا علم اور اس کے مشاعر بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر زیادہ شدت و تنوع کے ساتھ یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے چناں چہ ایک صاحبِ فن اپنے فن میں، ایک شاعر اپنے شعر میں، ایک ادیب اپنے انشاء میں ایک فیلسوف اپنے فلسفہ میں، یہاں تک کہ ایک مادہ

پرستت بھی (جو اپنی فطرت کے لحاظ سے حسن کے مفہوم سمجھنے کا بہت زیادہ نا اہل ہے) حسن ہی کا خواب دیکھتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جمال کسے کہتے ہیں؟

جمال ایک خیال ہے جو مادہ کے ملبوس میں جلوہ گر ہوتا ہے وہ ایک تبسم ہے جو چہرۂ انسانیت کی پیشانی پر نمودار ہوتا ہے وہ صحراءِ حیات جو مادہ کی قیود سے ہمیں آزاد کرتی ہ،وہ حیات سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے جو حیات کو بھی بھلا دیتی ہے،ماں اپنی لڑکی کے سنہرے بالوں کے چھلوں کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے مسکرا پڑتی ہے اور لڑکی ہنس دیتی ہے۔شاعر دیکھتا ہے اور ان دونوں کی ہنسی میں جمالِ الٰہی کی چمک محسوس کرتا ہے۔ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے چہرے پر نگاہ ڈال کر اپنے قلب کو سکون سے بھر لیتا ہے۔ایک شخص شام کے وقت آسمان کی رنگین فضاء کو دیکھ کر آفتاب کو افقِ لانہایت میں غروب ہوتے دیکھ کر جمالِ فطرت سے متاثر ہوتا ہے،ایک شاعر مغنی اس سے متاثر ہو کر اپنی موسیقی سے فضاء میں اس تاثر کو پھیلا دیتا ہے پھر اگر اس کا نغمہ عظمتِ وطن سے متعلق ہے تو وہ اپنے نفس کو وطن کے ہیکلِ مقدس پر قربان کر دیتا ہے اور اگر وہ نغمہ محبت ہے تو ہر آواز کے ساتھ وہ اپنی روح کے اجزاء کو اس پر صرف کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔

تارد Tarde اپنی کتاب "المنطق الاجتماعی" logique sociale میں کہتا ہے ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں جب وہ قوی ہوتا ہے ہم اسے عظیم کہتے ہیں، جب اس کے افراد مہذب و شائستہ ہوتے ہیں، یقیناً جمیل ہے۔وہ وطن جو ظلم کے سامنے نہیں جھکتا اور جو لواءِ حضارت بلند کرنا اپنا نصب العین قرار دیتا ہے۔اسپارٹا حسین تھا،جب اسپارٹا کا رہنے والا دیکھتا تھا کہ وہ بلادِ یونان پر حکم ران ہے۔مصر قدیم تھا۔جب اہلِ مصر اپنے ملک کی عظمت اور وہاں کے ہیاکل و آثار میں وہ انوارِ ربانی کی روشنی کو مرکوز پاتے تھے۔رومہ جمیل تھا۔جب اہلِ رومہ اپنی مملکت کو تمام بلادِ عالم کی ملکہ جانتے تھے۔بلادِ عرب جمیل تھا۔جب اسلام اس کے فرزندوں کو حضارت و مدنیت سے آراستہ کر رہا تھا اور اس کی شوکت و جبروت کی داستانیں دنیا کے ہر گوشہ میں سنی جاتی تھیں۔

یہ خیالات تھے ایک مصری ادیب کے جن میں رات میں محو تھا میں نے سوچا کہ سرزمینِ ہند بھی جمیل تھی جب کرشن کی تعلیم نے صحیح معنی میں حریت و آزادی کی روح گوشہ گوشہ میں پھونک رکھی تھی۔لیکن اب وہی سرزمینِ مشرق جو ہمیشہ سے طلوعِ حق و صداقت اور ظہورِ تہذیب و مدنیت کے لئے مشہور تھی۔سو گوار ہے کیوں کہ اس کا جمال

محو ہو گیا ہے۔ اس کی عظمت مٹ چکی ہے اور غالباً اس سے زیادہ دردناک داستان اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہ تمام سوگواریاں خود فرزندان ملک کی لائی ہوئی ہیں، کیا ہندوستان کی تاریخِ غلامی سوا اس بدبختی کے کسی اور چیز کی تاریخ ہے؟ کیا فرزندانِ آریہ ورت کہہ سکتے ہیں کہ ان میں وہی غیرت و حمیت وہی بلند خیالی و عالی نظری پائی جاتی ہے جو ان کے اکابر و اعاظم میں پائی جاتی تھی۔ آج ہندوستان کی آبادی کا عنصرِ غالب غیر کی حکومت سے آزاد ہونے کے لئے بے تاب ہے لیکن کبھی اس نے اس پر غور بھی کیا ہے کہ وہ خود اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ کس سلوک و رواداری کو جائز کھتا ہے، ہندوستان کیلئے آزادی اور سوراج کے طلب گار حکومتِ موجودہ سے اپنے فطری ملکی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں، لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی ملک کی اس آبادی کے جذبات کا خیال نہیں کرتے جن کے نحیف شانوں کی مدد حاصل کئے بغیر یہ بار آسانی سے نہیں اٹھا سکتا۔

علامہ نیاز فتح پوری کی تصنیفات اور رسالہ نگار اس ویب سائٹ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے

www.niazfatehpuri.com

آہ زعمرے کہ گزشت ایں چنیں

چند دن سے میں جس کیفیت میں مبتلا ہوں اس کو اگر کسی ایک فقرہ سے ظاہر کر سکتا ہوں تو عنوان کے مصرع کو ملاحظہ فرمایئے ؎

آہ زعمرے کہ گذشت این چنیں

ماضی کی ہر یاد خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہو، حال کی شیرینیوں سے زیادہ پُر کیف ہوتی ہے اور مستقبل کی ہر تمنا خواہ کتنی ہی عسیر الحصول کیوں نہ ہو، حالاتِ حاضرہ سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہے، یعنی انسان نام ہے ایک طرف خواہشِ استرداد کا اس کیلئے جو گزر گیا اور دوسری طرف دستِ امید بڑھانے کا اس کیلئے جو ہنوز عدم میں ہے پھر چوں کہ حیاتِ انسانی کا ہر لمحہ حال ہی ہو کر گزرتا ہے اس لئے نتیجہ معلوم لیکن میری حالت اس سے بالکل مختلف ہے، ماضی کے استرداد کی تمنا نہیں اور حال کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

بر من آں می رود امروز کہ گوئی فرداست

کہتے ہیں کہ ابو جہل کا علم، علم کی پہلی منزل ہے لیکن شائد یقین کی نہیں! معلوم نہیں علم کو جہل سمجھنے والے اس باب میں کیا کہتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا پیدا ہونا ہی دماغِ انسانی کی پہلی بدعت ہے جسے فطرت تو برداشت کر لیتی ہے لیکن روح کی نزاکت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ پھر کتنے ہیں جن کی روحیں اس کش مکش سے سوگ وار نہیں اور کہاں ہیں وہ نفوس جو احساس کی اس بے اعتدالی سے داغ دار نہیں. جہل و علم سے زیادہ اہم و ضروری یہ دیکھنا ہے کہ ہم اپنی تکمیل کے طلب گار ہیں یا نہیں؟

انسان کا وجود اپنی تخلیق کے لحاظ سے سراپا جستجو ہے، روح خواہ وہ مادّہ سے مجرد ہو یا وابستہ یکسر اضطرابِ تمنا ہے، صبح کا جلوہِ زرّیں، شام کا نقابِ رنگیں، آفتاب کی زرپاشیاں، چاند کی نور افشانیاں، شاہدِ مقصود کے مختلف مظاہر و آثار Phenomena ہیں جو ہم کو عینِ ذات Enuhenoh کی طرف بلاتے ہیں۔ اسی طرح خزاں کی سوگواری، بہار کی نشاط انگیزی، دریا کی روانی، پہاڑ کی استقامت اور ان کو بھی جانے دیجئے خود انسان کے نتائجِ عمل جو سربفلک عمارتوں، محیر العقول ایجادوں اور زر و سیم کے انبار کی صورت میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ سب دعوتیں ہیں اصل منزل تک پہنچنے کی، اس آغوشِ رحمت میں جگہ پالینے کی، جس کا نام مذہبی کاروبار والوں نے فردوس رکھا ہے، لیکن اس میں اس کو "دارالصحو دالمنام" کہتا ہوں، جہاں روح اپنی جستجو ختم

کر کے شیریں خواب میں محو ہو جاتی ہے۔ جہاں تمام امتیازاتِ رنگ و بو مٹ کر صرف ایک احساسِ امن و سکون میں تبدیل ہو جاتے ہیں، آج علم و حکمت کی ترقیاں اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ زمان و مکان، سمت و جہت کا مفہوم بدل گیا ہے اور تمام محالات، ایک ایک کر کے امکانِ وقوع کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں، لیکن کیا انسان بایں ہمہ اقتدار و اختیار روح میں کوئی شائبہ سکون محسوس کرتا ہے؟ آج زر و دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ تمام وہ تمنائیں اور خواہشیں جو انسان کے گوشت و خون سے متعلق ہو سکتی ہیں "شیٔ حاصل" کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا روح کی گرسنگی میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس کی جاتی ہے؟

انسان آگے بڑھ رہا ہے، انسانیت پیچھے ہٹ رہی ہے، دماغ ترقی کر رہا ہے، روح تنزل کر رہی ہے۔ اس وقت کا انسان ایک ایسا مستسقی ہے جس کے سامنے دریا جاری ہے اور پانی پینے کیلئے آزاد، لیکن اس کی روح جس چیز کیلئے بے تاب ہے اس کا کہیں پتہ نہیں!

دہند شوق دلے رخصت نظر نہ دہند

دنیا کے تمام مذاہب اسی فردوس گم گشتہ کو ڈھونڈ نکالنے کیلئے آئے ہیں۔ انبیاء و رسل، اولیاء، و اکابر کی ہستیاں روح کی اسی فریاد کی مختلف صورتیں تھیں جو ابراہیم و اسماعیل، سلیمان و داؤد، یوسف و موسیٰ، عیسیٰ و محمد، زرتشت و کرشن، بودھ و کنفیوشس کی صورتوں میں ظاہر ہوئیں اور آئندہ مختلف ناموں اور شکلوں سے ظاہر ہوتی رہیں گی لیکن ان ہستیوں کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے جو کچھ یاد رکھا وہ صرف یہ تھا کہ فلاں آتش پرست ہے اور فلاں گوسالہ پرست، یہ صلیب کا پرستار ہے اور وہ کعبہ کا، یہ ناقوس پھونکتا ہے اور وہ اذان دیتا ہے، یہ صورت کفر کی ہے اور وہ اسلام کی، حالاں کہ یہ تفریق و امتیاز نوعِ انسانی کی اس روح کے ٹکڑے نہیں کر سکتے جس کا درد درماں ایک، جس کی راحت و اذیت ایک، جس کا اوج و حضیض ایک، اور جس کی فناء و بقاء ایک ہے۔

خدا ایک ہے اور اس کا پیغام بھی ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ ہمیشہ ایک ہی رہے گا خواہ اس کے پہنچانے والے کسی ملک و قوم اور کسی رنگ و نسل کے ہوں اس لئے آج دنیا کی سوگواریوں کا سبب نہ خدا کی دوئی ہے، نہ اس کے پیغام کا تنوع، بلکہ صرف یہ الجھن کہ پیامبر کا وطن کہاں تھا اس کا نام کیا تھا۔ اس کی صورت کیسی تھی، اس کا لباس کس طرح کا تھا، وہ کیا کھاتا تھا، کیا پیتا تھا، پھر خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ اپنی روح ہم تک پہنچائے مگر ہم نے اس کو جسم سمجھ کر اپنے حواس کے تلذذ کو اس کے عرفان کا معیار قرار دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی نکہت سے صرف ہمارے دماغ کو متاثر کرے مگر ہم نے پھول کو اصل چیز سمجھ کر صرف اس کی ظاہری صورت سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا اور جب وہ پھول مرجھا کر فنا ہو گیا تو ہماری

روحیں پھر تڑپنے لگیں آج جب کہ پھول کی چادروں سے چنگاری کی سوزش، زرکار ملبوس سے شعلوں کی تپش اور زر و سیم کے انبار سے آگ کی لپٹ محسوس ہو رہی ہے سب سے زیادہ ضرورت اسی احساس کی ہے۔

بنارس کا مرتاض برہمن ہاتھ میں سمرن لئے ہوتا ہے اور کہتا ہے "میرے مندر میں آؤ، صدائے ناقوس سنو اور مورتی کے سامنے جھک جاؤ تاکہ یہ جلن دور ہو" دیوبند اور فرنگی محل کا عبا پوش مولوی جریب و تسبیح لئے ہوئے رونما ہوتا ہے اور کہتا ہے "میری مسجد میں آؤ۔ اذان کی آواز سنو، قبلہ کی طرف منہ کرکے سجدہ میں گر جاؤ تاکہ یہ سوزش دفع ہو"۔ ایک راہبِ کہن سال نمودار ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے "میرے عالی شان کلیسا میں آؤ۔ گھنٹہ کی صدا پر متوجہ ہو پیمبر مصلوب کی شبیہ سے التجا کرو تاکہ یہ بے چینی دور ہو" جاتریوں کا گروہ جوق در جوق مندروں سے نکلتا نظر آتا ہے، لیکن ان کے قشقہ کا صندل بھی خشک نہیں ہو چکتا کہ ان کے سر جنگ و جدل سے رنگین نظر آنے لگتے ہیں، جماعت کی جماعت مسجدوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر ان کی پیشانی سے سجدہ کا نشانِ خاک بھی محو نہیں ہو چکتا کہ ایک دوسرے پر کثافت اچھالتا نظر آتا ہے۔ گروہ کا گروہ کلیسا سے باہر آتا ہے اور ابھی عود و عنبر کے بخور کی خوشبو بھی ان کے لباس سے جدا نہیں ہوتی کہ معصیت کی آغوش ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک رندلاابالی ایک مردِ ژولیدہ مو، جو نہ کسی مندر میں گیا نہ مسجد میں، نہ جس نے کبھی دیر میں سر جھکایا نہ کلیسا میں۔ انسان کی اس بے چارگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اس قوت کے سامنے جس کو اس نے ہمیشہ علائق مذاہب و مسالک سے بے نیاز ہو کر پہچانا۔ متحیرانہ و مستفسرانہ کھڑا ہو جاتا ہے، آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا اس کی آغوش میں گر جاتا ہے اور یہ اسے سینے سے لگائے اپنی راہ لے لیتا ہے صبح کو قدوسیوں کی جماعت اس خاک بسر و چاک گریباں انسان کو دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہے کہ یہ کوئی شرابی ہے، یقیناً وہ شرابی ہے وہ مست ہے ایسا کہ ؎

مستئیش را نبود نغمہ، صہبا ساماں

دوسرا گروہ آتا ہے، کہتا ہے کہ یہ تو فاسق و فاجر ہے، ملحد و بے دین ہے۔ بے شک وہ ایسا ہی ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ ؎

نازد بہ کفر خود کہ بہ ایمان برابر ست

اس کے مجروح جسم، اس کے داغ دار سر و سینہ کو دیکھ کر لوگ نفرت کرتے ہیں اور جس وقت وہ بے تاب ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ ؎

دردیست در دلم کہ بدرماں برابر ست

تو اس کا سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ تاثرات کب سے مجھے بے تاب بنائے ہوئے ہیں، اور ٹھیک اس وقت جب کہ میں یہ چیخ چیخ اٹھنے کے لئے مجبور تھا کس کس طرح "تابِ گفتگو" مجھ سے چھین لی گئی۔ لیکن اب "اشتہارات" کا رخ بدل گیا ہے، ایماءِ ربّانی کچھ اور ہے، ظلمت کی اس شدت کے بعد روشنی کا نمودار ہونا لازم ہے، مجھے بلا پس و پیش اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہئے کہ وہ لوگ جو اپنے کو اکابرِ دین کہتے ہیں ان کو گروہ طاغوت سمجھو، وہ جو خانقاہوں میں ہاتھوں کو رسمِ دست بوسی کیلئے پھیلائے ہوئے پڑے ہیں ان کو دشمنِ روحانیت جانو، وہ جو تمہیں اپنے آگے جھکنے پر مجبور کرتے ہیں ان کو غولِ صحرائی سے زیادہ وقعت نہ دو، وہ وقت گزر گیا جب خدا مسجد و مندر میں ملتا تھا اب نہ وہ مسجد و مندر ہیں نہ وہ مسجد، مندر تک پہنچانے والے، اب خدا ملتا ہے نفس کی آزادی میں، ترکِ تقلید میں، قلب کے انبساط میں جو صرف اپنی ہی تدبیر و تفکر سے حاصل ہوتا ہے اور روح کی اس آزادی میں جو صرف اخلاق ہی کی پاکیزگی سے میسر آتی ہے رسمی مذاہب ترک کر دو، کہ اب ان سے صرف "فساد و سفکِ دماء" کا کام لیا جاتا ہے، مدعیانِ مذہب کو ٹھکرا دو کہ نوعِ انسانی کی تفریق کا ذمہ دار گروہ تنہا یہی ہے تمام انسان ایک ہیں اور انسانیت ہی کے رشتہ کو اپنا مذہب قرار دو، اگر مذہب کا لفظ تمہارے لئے ضروری ہے ناموں کی تفریق مٹا دو، لباس کی تمیز اٹھا دو، رنگ و نسل کا امتیاز محو کر دو، آسمانی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا مگر اس وقت جب ہماری نگاہوں کے زاویئے بدل جائیں پھر اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا میں حقیقی امن و سکون قائم ہو تمہاری روح کی بے چینیاں دور ہوں تو اپنی نگاہوں کا مرکز ایک ہی قرار دو اور حسب و نسب کے تفاخر، دولت و جاہ کے تفوق، حسن و جمال کی تعلّی اور علم و فضل کے پندار کو یکسر محو کر دو کہ خدا کی بارگاہ میں شریف و رزیل، شاہ و گدا، عالم و جاہل سب ایک ہیں اور وہاں اگر کسی جنس کو قبول حاصل ہے تو صرف تمہاری خوئے عجز، جس نے بندگانِ خدا میں کبھی تفریق نہیں کی اور سب کو اپنی ہی ہستی کا جزو قرار دیا ہے۔

میں جیسا کہ میرے ایک عزیز دوست نے اندیشہ ظاہر کیا ہے، مہدویت کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہ میں کبھی نبوت و رسالت کا مدعی ہو سکتا ہوں، کیوں کہ اب نہ کسی مہدی کی ضرورت ہے نہ رسول کی، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر کبھی رات کی تنہائی میں، صبح کی خلوت میں، طبیعت سکون کی طرف مائل ہو تو جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو سامنے رکھئے اور پھر مجھ سے نہیں بلکہ ع

زخود بجوئے کہ ماراچہ در دل افتادست

نظریۂ اسلام میری نظر میں

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں جیسی آج کل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے کیوں کہ اس نے عوائد و مراسم کی بیخ کنی کر کے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقتاً مسلمان وہی ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔

سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام اور شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے اور چوں کہ غلطی صدیوں سے چلی آرہی ہے اس لئے اس کا دور ہونا آسان نہیں ہے تاہم چوں کہ اس وقت بڑی بات آپڑی ہے اس لئے مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر روشنی ڈالوں۔

انسان و خدا یا خالق و مخلوق کا جتنا یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ خالق اور خدا کی ذات بالکل بے نیاز ہے اور انسان کی کوئی بد عنوانی، کوئی نامعقولیت، یہاں تک کہ بتوں کو پوجنا بھی اس کو کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا۔ کیوں کہ اس کی برہمی نہ انسان کی سی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ خفا ہو جاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی اچھی بات کسی سے ظاہر ہوئی اور ہم اس سے خوش ہو گئے۔

چوں کہ خدا کی ذات ہمارے فلسفۂ مسرت والم سے بلند ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی خوش نودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہو گا، پھر جب اس مفہوم کی جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوش نودی سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقتاً ہماری ہی بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری مضرت سے ہے، اس لئے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشأ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدبیر اختیار کرے جیسا کہ --- إن أريد الّا الإصلاح سے ثابت ہوتا ہے، اور ان مکارمِ اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرے جو تمام نوعِ انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر کفر و اسلام، شرک و توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اسلام و توحید نام ہے صرف "استقامة فی العمل" کا، بلندیٔ اخلاق کا، اخوت عامہ کا، اور کفر و شرک کہتے ہیں نظم و نسق سے منحرف ہو جانے کو، ترکِ عمل کو، انحطاط اخلاق کو، انتشار و افتراق کو، فرقہ بندی کو، تفریقِ جامعۂ انسانیت کو اور

انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔ کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چوں کہ اسی مقصد کو پورا کرنے کیلئے آئے تھے اسی لئے ان کو "كافة للناس" اور "رحمة للعالمين" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ رسول نے فرقہ بندی کے خلاف "اخوّتِ عامہ" کے موافقت میں جو کیا یا کہا اس کا ثبوت کلام مجید سے ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ آمَنَّا بِٱللَّهِ وَمَآ أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ أُنزِلَ عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَمَآ أُوتِىَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَٱلنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُونَ[2] آل عمران: ۸۴

پھر کیا نبیوں میں آپ رام، کرشن، بودھ، کنفوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے، کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟ اور کیا ولقد بعثنا فى كلّ أمّةٍ رسولا ارشاد خداوندی نہیں؟ پھر اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ونحن له مسلمون میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے۔

کلام پاک کے متعدد مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشأ خداوندی یہی ہے کہ ساری دنیا ایک جماعت، ایک امت ہو کر زندگی بسر کرے، اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں ولو شاء الله لجعلهم أمّة واحدة و لكن يضل من يشاء و يهدى من يشاء و لتسئلن عمّا كنتم تعملون

و لو شاء الله کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اگر اللہ چاہتا" بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنا دے ------ لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے اس کو جو اپنی گمراہی چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے لیکن اے لوگو! تم مطمئن نہ ہو، خدا تم سے ضرور باز پرس کرے گا، تمہارے افعال و اعمال پر وہ تم سے پوچھے گا کہ کیوں تم نے ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کو اختیار کیا اور کیوں تم نے اپنے عمل سے اپنی وسعتِ نظر سے اپنی رواداری سے اور اپنے اصولِ زندگی سے اس "اخوتِ عامہ" کو دنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے۔ يضل من يشاء اور يهدى من يشاء کے معنی بھی بعض مفسرین و مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، یعنی انہوں نے يشاء کا فاعل الله کو قرار دیا ہے حالاں کہ حقیقتا "يشاء" کا فاعل "من" ہے ورنہ "و لتسئلنّ عمّا كنتم تعملون" بالکل بے کار ہو جائے گا۔ کیوں کہ جب ہدایت و

2- ترجمہ: کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر نازل کیا گیا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے ملا ہم ان میں سے کسی کو جدا نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

گم راہی صرف خدا کے لئے مخصوص ہو گئی تو باز پرس کیوں اور کس سے ؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے:

صِبْغَةَ ٱللَّـهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ ٱللَّـهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَـٰبِدُونَ ﴿البقرة:١٣٨﴾

یعنی اے رسول! لوگوں سے کہہ دو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یک رنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رنگ سے بہتر کون رنگ ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہے اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق و انتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ:

قُلْ يَـٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَـٰبِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّـهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّـهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا ٱشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ٦٤ آل عمران

پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوا ذات خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی اور ہستی کو اس کا مقابل سمجھا جائے، یہ تعلیم اس قدر سادہ اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گم راہ سے گم راہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے؟ اور وہ شرک و کفر یا جحود و انکار سے کیوں اس درجہ برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے۔

یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اس کی برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت و منفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ انسان کا خواہ انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہنچانے والا ہو جو اجتماعیتِ عالم کو برباد کرنے والا ہو، جو مرکزِ انسانیت سے انحراف پیدا کرنے والا ہو، جس سے اشتراکِ عمل تباہ ہوتا ہو اور جس سے رشتہ تمدن اور شیرازۂ تعاون کمزور ہو جانے والا ہو، شرک و کفر ہے، جحود و انکار ہے، بت پرستی ہے، اور ہر وہ چیز ہے جس کو غیرِ خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ایسا کرنا منشأ خداوندی اور اس کی اہمیت سے انکار کرنا ہے خدا کے وجود کو نظر انداز کر دینا ہے اور اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جانا ہے۔

اس پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کر سکتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ نہ اذان سے خدا کو فائدہ پہنچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی نقصان۔ نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت پہنچتی ہے نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف۔

اگر ایک شخص غیر مسلم ہونے کے باوجود تمام انہی مکارمِ اخلاق اور محاسنِ فطرت سے آراستہ ہے جن کی محمدؐ نے تعلیم دی ہے تو کیا اس کو صرف اس لئے کہ وہ آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہے کافر و مشرک کہہ کر ناری و جہنمی کہہ دیں گے؟ اور دوسرا شخص جو آپ کی جماعت کا فرد ہے لیکن حد درجہ ظالم، بے رحم، مجرم اور شقی تو کیا اس کو صرف اس بناء پر کہ اس کا نام آپ ہی کی طرح ہے، آپ کے اعزہ میں اس کا شمار ہوتا ہے نجات و فردوس کا پروانہ دے دیں گے؟

ایک بے رحم قزاق قافلہ کے قافلہ کو تباہ و برباد کر کے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کر کے فارغ ہوتا ہے کہ دفعتاً مغرب کی اذان ہوتی ہے وہ فوراً اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبے دور کر کے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے، دوسرا شخص جو تمام تمام دن دھوپ میں محنتِ شاقہ برداشت کر کے اپنے متعلقین کیلئے حلال روزی فراہم کرتا ہے۔ گاؤں کے بچوں، بوڑھوں، یتیموں اور بیواؤں کی خدمت کے لئے اپنی محنت، دولت، زندگی سب کچھ وقف کئے ہوئے ہے لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے، مسجد جانے کے بجائے وہ مندر کا رُخ کرتا ہے۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعیٔ اسلام سے دریافت کیجئے وہ نہایت آزادی سے بلا پس و پیش کہہ دے گا کہ بہر حال اس قزاق کو نجات ملنی ہے کیوں کہ وہ مسلمان ہے اور اس دوسرے کو آخر کار دوزخ میں جانا ہے کیوں کہ اس نے بت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا۔ پھر اگر اسلام نام اسی وسعتِ نظر و انصاف کا ہے، اگر "صراط مستقیم" اسی کو کہتے ہیں، اگر فَأْمُرْهُمْ بِالْقِسْطِ کا یہی مفہوم ہے اگر دین محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دوں گا کہ آیئے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہو جایئے کیوں کہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملے گا۔

مسلمانوں کا یہ یقین کر لینا کہ صرف خدا انہی کا ہے اور دوسری قوموں کو اس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کیلئے پیدا کیا ہے ایسا لغو و مہمل اعتقاد ہے جو کسی ذی فہم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا اور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں اسی لئے میں نے کہا کہ جہاں تک نفسِ تعلیمِ مذہب کا تعلق ہے، مسجد و کلیسا، ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بہ حیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو، چینی ہو یا بدھ، معتزلہ ہو یا اشعریہ، ناصبی ہو یا خارجی، شیعہ ہو یا سنی، خدا کے نزدیک ایک ہے، اس کا سب سے ایک ہی مطالبہ ہے پھر جو اس کو پورا کرے گا خدا اسی کو ترقی و فلاح دے گا اور جو اس کو ترک کرے گا خدا بھی اسے چھوڑ دے گا۔

بے شک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہبِ اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمدؐ نے پیش کیا، یقیناً بہترین ذریعہ تصفیۂ اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ہے اور اس لئے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے لیکن میں اس کی اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو برا کہوں جب کہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں۔

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں، اس کی طریقِ عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں۔ بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ اس کو نفسِ مقصودِ مذہب سے آگاہ کرکے آمادہ کریں کہ وہ اپنے طریقِ مذہب کے ساتھ ہی ساتھ مذہبِ اسلام کو بھی دیکھے اور خود فیصلہ کرے کہ منزل تک پہنچانے کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ کون سا ہے، اور میری رائے میں جادلهم بالّتي هي أحسن کا بھی یہی مفہوم ہے۔

اگر آپ اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجئے، یہ عام اصول اخلاق کا ہے، اس لئے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قائم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اور نہ قوت و جبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہو سکتا ہے، تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے، وضع و معاشرت میں تو تبدیلی پیدا کر سکتی ہے لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی، دماغ کو مجبور نہیں کر سکتی ہے، اطمینانِ نفس، طمانیتِ روح، لطف و رأفت، محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ تعلیمِ اسلام کی جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہے، اسے تو آپ پیش نہیں کرتے، دکھاتے ہیں خزف ریزوں کو اور دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ انہیں جواہر ریزے سمجھئے۔

پھر چوں کہ یہ تنگ نظری نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے مقلدین میں پائی جاتی ہے اس لئے جو اعتراض میرا اہلِ اسلام پر ہے، وہی ہندوؤں پر ہے اور وہی دوسرے مذہب والوں پر، نہ ہم میں رواداری، نہ ان میں انصاف، نہ ہم صراطِ مستقیم پر، نہ وہ راہِ راست پر، منزل سے دور رہنے میں سب یکساں ہیں اور گمراہی میں برابر کے شریک۔

یہ ہے میرا اعتقاد و یقین مذہب کے متعلق اور اگر موجودہ حالتِ افتراق قائم رہی تو باور کیجئے کہ ایک زمانہ آئے گا جب تمام مذاہب محو ہو جائیں گے اور وہی وقت تجدیدِ اسلام و احیاءِ دینِ محمدی کا ہو گا۔

ملّتیں جب مٹ گئیں، اجزاءِ ایماں ہو گئیں

○○○

میری عصبیت

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب بعض حضرات میری تحریروں سے عصبیت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ خواہ وہ مذہب و معاشرت سے متعلق ہو یا علم و ادب سے جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صرف میرے خلوصِ نیت کا نتیجہ ہے جس کی اگر کوئی تعبیر ہو سکتی ہو تو صرف یہ کہ ؏

شکایتے است نہ گنجد بدل ز بسیاری

میں اس سے قبل بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ تشیع و تسنن تو خیر نہایت ہی معمولی بات ہے میں تو اصطلاحی کفر و اسلام کا پردہ بھی نوچ کر پھینک دیا ہے اور ''ببانگِ دُہل'' اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر جنت نام ہے صرف سکون روح و طمانیتِ قلب اور اگر یہ جنت ایک زاہد شب زندہ وار صرف تقشف ہی سے حاصل کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ ؏

فردوس را بدامِ نگہ می کنم شکار

میں اس چیز سے واقف ہوں، جس کی جستجو دیر و حرم میں کی جا رہی ہے، میں اس مقصود کو جانتا ہوں جس کو مساجد و کنائس میں ڈھونڈا جا رہا ہے اور میں اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں ہوں کہ یہ محراب و منبر پر پیشانیاں رگڑنے والے آج تک یہی نہیں سمجھ سکے کہ وہ کیا چیز ہے جو سجدہائے نیاز کا مسجود ہو سکتی ہے اور وہ کون سا پردہ ہے جس کے اٹھنے کے بعد یہ تمام اعتبارات سطحی یہ جملہ ممیزات ظاہری محو ہو کر

چشم وا کردن زمیں تا آسماں آغوش داشت

بن جاتے ہیں، پھر اس سے قبل خدا معلوم کتنی زرین صبحیں، کتنی شامیں کتنی خنک راتیں میں نے صرف اس غور و تامل میں صرف کر دیں کہ کیا منصور کا انا الحق کہہ کر دار و رسن کی منزل سے گزر جانا واقعی شاہدِ مقصود کے چہرہ سے حجاب کا اٹھا دینا تھا اور کیا میں بھی اگر ایسا دعویٰ کروں تو بے ہو گا؟ لیکن میں ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اول تو وہ منزل جسے

مرا اکردہ اند آشکارا بہ من

کہتے ہیں کہ کوئی ایسی بلند منزل نہیں جس کو ہر شخص بادنیٰ تامل نہ پا سکتا ہو، چہ جائے کہ اس میں بھی ناصبوری سے کام لیا جائے اس لئے میں بے نیازانہ انداز سے آگے بڑھا اور میں نے

اپنی فطری ودیعتوں میں سے ایک نہایت ابتدائی منزل کی ودیعت کو بے نقاب کرنا چاہا لیکن حیرت ہے کہ دنیا اس کے بھی سمجھنے کیلئے آمادہ نہیں اور جس وقت میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ "یک مے ز آبگینہ وساغر بر آوردم" تو وہ مجھ سے منہ پھیر لیتی ہے مجھے کافر کہتی ہے، دہریہ و ملحد کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے جہل سے میرے علم کو مغلوب کرنا چاہتی ہے حالاں کہ یہاں یہ عالم ہے کہ "گرانی محمل" کا احساس جس قدر قوی ہوتا جاتا ہے اسی اعتبار سے

ہم پردہ رابولولہ سنجم ہزار بار

اس لئے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب و مسلک کے متبع ہوں، بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے شاہدِ مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں، یہ جملہ اضافات وہی حقیقت رکھتی ہیں جو "پارۂ کتاں" چاند کے سامنے اور بحمد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس نا استواری "نسیج" کا تماشہ دیکھنے کیلئے ایک لمحہ کیلئے بھی اپنی نگاہ پستی کی طرف مائل کروں۔ دنیا اگر اپنی صحرانوردیوں میں خضر کو راہبر بنانا چاہتی ہے تو بنائے اور جب تک جی چاہے سکندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اس جستجو میں دعوتِ شرکت نہ دے کہ

سیلاب را ببادیہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایک طرف یہ عزم استوار ہے کہ انتقاد خواہ وہ معاشرت و اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب و سیاسیات سے، ہمیشہ بلند نقطۂ نظر سے ہونا چاہئے تو دوسری طرف میں اپنی فطرت کی کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی۔ اور اس لئے جب مجھے اس کا علم ہو جاتا ہے کہ میری تحریر سے کسی کو صدمہ پہنچ گیا ہے تو میں بہت ملول ہو جاتا ہوں۔ بنابراں اگر میری کسی تحریر سے کسی خاص شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں اس کی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اس لئے ؏

مستم چناں کہ گل نشناسم ز نوکِ خار

اس سلسلہ میں مجھے برا کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو انتقام لینے کے لئے صرف اپنے اہرمن سے چارہ سازی چاہتے ہیں اور گالیوں سے آزار رسانی کے سوا ان کے پاس کوئی آلہ حرب نہیں ہوتا او دوسرے وہ جو میری تحریر میں بے حجابی، عریانی، فحاشی وغیرہ کے نقائص نکال کر اپنے پندار میں مجھے ذلیل و خفیف کرنا چاہتے ہیں۔ سو اول الذکر جماعت سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس طرح ان کا اہرمن ان کے ساتھ ہے اسی طرح میرا ایزداں میرے ساتھ ہے اور اس لئے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں اور مؤخر الذکر جماعت کے حضور میں اپنے ذوقِ ادب و انشاء کی طرف سوا اس کے اور کچھ نہیں عرض کر سکتا کہ ؏

نظارۂ خوباں و مے و نغمہ حرام است
دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا!!

میں پہلے بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام نام ہے صرف ترکِ رسوم کا، تفریق قومی کے محو کر دینے اور جامعۂ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کر لینے کا۔

اسلام مسجد و مندر کی تفریق سے بے نیاز ہے، زنّار و تسبیح کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ نہ ناقوس و اذان کی تمیز اس کا نصب العین ہے نہ پیکرماں اور طواف کا فرق اس کا مطمحِ نظر۔ وہ تمام عالم کو ساری کائنات کو، جملہ نوعِ بشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کر کے صرف ایک نقطہ پر لانا چاہتا ہے اور وہ اس مساوات کا منبع ہے جس سے زیادہ وسیع مساوات دنیا میں کسی ہادی و رہنما، کسی نبی و رسول نے اس سے قبل پیش نہیں کی۔ وہ نہ کسی کے نام کو دیکھتا ہے نہ وضع و صورت کو، نہ وہ نسب کو وجہِ امتیاز دیتا ہے نہ دولت اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ نہ جاہ و ثروت۔ وہ دیکھتا ہے صرف رواداری کو، جذبہ ایثار و فدویت کو، اور محض اس اضطراب کو جو بنی نوعِ انسانی کے ہر فرد میں دوسرے فرد کی اعانت کیلئے پیدا ہونا چاہئے۔ پھر آج اسلام کا صحیح مفہوم بتانے کے لئے سب سے پہلے ضرورت ہے اس عنصر کو محو کر دینے کی جو اسلام کو اصطلاحی لفظ قرار دے کر اس کو اخوتِ عامہ کے مقصد سے علیحدہ کر رہا ہے اور موجودہ ضروریاتِ تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصولِ معاشرت و حیات پر نظرِ ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرے کو نہایت مکروہ پیش کر رہے ہیں۔

اگر زمانہ کے ساتھ لوگوں کے امیال و عواطف اور عقول و افکار میں تغیر ہونا ضروری ہے تو یقیناً وہی مذہب حقیقی معنی میں خدائی مذہب کہلائے گا جو عہد و زمانہ کے لحاظ سے تمام عقول و اذہان کی رہبری کر سکے اور اپنے اندر اس تغیر کو روا رکھے جس کے بغیر "اخوتِ عامہ" کا مقصد عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس لئے جس ایثار و قربانی، جس رسوخ و استواری کی ضرورت ہے وہ ہم میں سے سرمد و منصور کی طلب گار ہے۔ سقراط و حسین کی آرزومند ہے اور ان مردانِ خدا کی منتظر ہے جو ممبر پر نہیں بلکہ دار پر اس راز کا اعلان کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں پھر اگر آج بعض نفوسِ مقدسہ اس قربانی کیلئے آمادہ ہو جائیں اور خدمتِ اسلام کیلئے اپنے تمام مصالحِ ذاتی کو پس پشت ڈالنے کے لئے تیار ہو جائیں تو نہایت آسانی سے حقیقی مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور دنیا از خود ان مولویوں، ان ملّاؤں، ان عالمانِ دین، ان پیرانِ طریقت، ان تصوف پیشگان جم مرتبت کے بتوں کو ٹھکرا دینے کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے۔

بلقیس رعنا کے دو خطوں کا جواب

(پہلا خط)

نیاز بے نیازؔ !

”مسٹر لکھنا آپ کی توہین ہے اور مولانا کہنا آپ کی چڑھ، اس لئے صرف نیازؔ پر اکتفا مناسب تھا۔ . . . . مگر بے نیاز کے اضافہ سے تھوڑی سی شاعری بھی کر دی گئی ہے۔ معلوم نہیں آپ اس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔

میں عرصہ سے ان تمام انقلابات کا مطالعہ کر رہی ہوں جو تدریجاً آپ کے ذہن و دماغ میں پیدا ہوتے جاتے ہیں اور نہیں کہہ سکتی کہ ان کا سلسلہ کب اور کس طرح ختم ہو گا لیکن اگر میں قیاس سے کام لوں تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ بہت جلد خدا اور خدا کی آخری کتاب سے بھی انکار کرنے والے نظر آتے ہیں جس کا ثبوت ماہ جون کے استفسارات میں بآسانی مل سکتا ہے۔

میں آپ کی آزادانہ تنقید کو یقیناً پسند کرتی ہوں لیکن مجھے ابھی تک اس جذبہ کی حقیقت کا علم نہیں ہوا جو اصلی باعث آپ کے لٹریچر کا ہے۔ کیا آپ اس پر کوئی روشنی ڈال کر مجھے ”ظن و گمان“ کی معصیت سے بچا لیں گے؟

بہر حال میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتی کہ اگر آپ کے تمام مقالات حقیقتاً خلوص نیت پر مبنی ہیں تو میں خدا سے انکار کرنے کی حد تک بھی آپ کے ساتھ ہوں اور اگر کسی مصلحت سے فی الحال اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتے جو چند ماہ یا چند سال بعد آپ پیش کرنے والے ہیں تو میں آپ کو مشورہ دوں گی کہ اس پردۂ مصلحت کو فوراً چاک کر دیجئے جو اصل مقصود ہے اسے بھی ظاہر کر دیجئے کیوں کہ میں آپ میں اخلاق کی اتنی کم زوری بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔“

....

(۱) آپ نے تو خیر مسٹر اور مولانا کا قصہ پیدا کر کے بے نیازانہ انداز میں کچھ شاعری سے کام لے لیا، لیکن میں کیا کروں؟ جب کہ مجھے یہی علم نہیں کہ آپ واقعی کیا اور کون ہیں؟ تاہم میں بہت خوش ہوتا اگر آپ اس نیاز مند کو -------- صرف نیازؔ کے لفظ سے یاد کر تیں۔ لیکن بے نیاز کے اضافہ نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس کو قبول کرلوں یا نہیں۔ میں اس وقت شاعری سے کام نہیں لے رہا اس لئے یہ "ردّ قبول" کا قصہ بھی پیش آیا ورنہ "تسمیہ و خطاب" کے متعلق ایک عربی شاعر مجد الدین طوسی عجیب و غریب دل نشین نکتہ بتا گیا ہے ع

اصمّ اذا نودیتُ با سمی واننی　　إذا قیل لی یا عبدَھا لسمیع
لا تدعنی الّا بیا عبدَھا　　فانه أشرف أسمائی

جس وقت لوگ میرا نام کہہ کر پکارتے ہیں تو میں بہرا ہو جاتا ہوں اور جب اسے "فلاں کے غلام" کہہ کر پکارتے ہیں تو میں سن لیتا ہوں۔ اس لئے اے لوگو! مجھے تم "اس کا غلام" ہی کہہ کر پکارا کرو کہ میرا یہی نام سب سے بہتر ہے۔

چہ جائے کہ آپ خود کوئی نام تجویز کریں اور میں اسے گردن جھکا کر قبول نہ کرلوں "نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ" میری طرف سے "پسندیدگی و عدم پسندیدگی" کی خلش میں آپ کے دشمن مبتلا ہوں، جب تک "خونِ دوعالم" اپنی گردن پر لینے والے دنیا میں موجود ہیں، آپ کیوں اپنی عشق کی ناکامی کے خیال سے فکر مند ہوں۔

جلوہ بر خود کن و مارا بہ نگاہے دریاب

(۲) آپ عرصہ سے میرے ذہنی انقلاب کا مطالعہ کر رہی ہیں، اس سے زیادہ خوش بختی میری اور کیا ہو سکتی ہے "خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردۂ" لیکن معاف فرمایئے اگر میں عرض کروں کہ آپ نے میرے "انقلاباتِ ذہنی" کے انجام پر صحیح رائے زنی نہیں فرمائی اور آپ بھی وہی کہنے لگیں جو دنیا کہہ رہی ہے ع

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

اگر آپ باور کریں تو میں کہوں کہ میں دنیا میں ہر چیز سے انکار کر سکتا ہوں یہاں تک کہ آفتاب کے طلوع و غروب کا بھی انکار کر سکتا ہوں جو کائنات کا روشن ترین مشاہدہ ہے لیکن خدا کا انکار مجھ سے ممکن نہیں کیوں کہ اس کی عظمت و جلال، اس کی وسعت ہمہ گیری، اسی ابدیت و لانہایت کا علم مجھے نہایت عمیق مطالعہ کے بعد حاصل ہوا ہے اور میں اس کو حد درجہ عزیز رکھتا ہوں۔

خدا نام ہے "خالقِ کل کا" لیکن مذہب والوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کر کے ہر ٹکڑے کا نام علیٰحدہ علیٰحدہ خدا رکھ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خدا نام ہے "محبت" کا اور "محبت" ہی سے کائنات کو معمور ہونا چاہیئے کہ یہی ہے اصل مفہوم خدا کے "محیط" ہونے کا اور اسلام کا درس بھی یہی ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو میری نیت کے خلوص کی طرف سے کیوں شک پیدا ہوا۔ کیوں کہ ہر وہ شخص جو تمام افراد نوع انسانی کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اس کے باب میں تو غرض و مصلحت کے سوال کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ ہاں البتہ اگر آپ کو میرے مقصود کی طرف سے کوئی شبہ پیدا ہوتا تو بے شک آپ کا یہ فرمانا ایک حد تک معقولیت پر مبنی ہو سکتا ہے۔

(۳) میں گذشتہ ماہ کے استفسار کا جواب دینے کے بعد سمجھتا تھا کہ بعض حضرات اس سے وہی نتیجہ نکالیں گے جو آپ نے فرمایا۔ لیکن میں اس کا جواب دینے پر مجبور نہیں ہوں جب تک اس مئلہ پر منہ کھول کر کوئی بات نہ کی جائے۔ اگر کوئی شخص قرآن مجید کے اسرائیلی قصص کو "واقعاتِ تاریخی" کی حیثیت سے ثابت کرنے کا مدعی ہے تو اس کو چاہیئے کہ پہلے ان باتوں کا جواب دے جنھیں میں نے بائبل کے سلسلہ میں ظاہر کیا ہے۔

اس کے بعد میں ظاہر کروں گا کہ قرآن مجید میں ان قصص کو کس انداز سے اور کس مقصود کیلئے بیان کیا گیا ہے۔

(۴) آپ نے اخیر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر میں یہ سب کچھ خلوص نیت کے ساتھ کہتا ہوں تو آپ منکرِ خدا کی حیثیت سے بھی میرا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہیں اس کے متعلق اس کے سوا کیا عرض کروں کہ میں تو اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کہتا ہوں وہ خلوص نیت ہی پر مبنی ہوتا ہے، اور اگر آپ پھر بھی میرا ساتھ نہ دیں تو میری بد قسمتی ہے۔ لیکن اگر آپ کی معیت کی تنہا شرط خدا کا انکار ہی ہے تو پھر آیئے یہ بھی کر دیکھیں ع

من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

(دوسرا خط)

آپ نے جولائی کے **نگار** میں جس کیفیت کے ساتھ میری تحریر کا جواب عنایت فرمایا ہے اس کا شکریہ قبول فرمایئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی "ادبیت" ایک فسوں ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ آپ کے مخالفین بھی آپ کی تحریروں سے خاص لطف اٹھاتے ہیں۔ آپ نے مذہبی تنقیدوں میں بھی اپنے زورِ قلم سے وہ رنگ پیدا کر دیا ہے کہ جی چاہے یا نا چاہے لیکن ان کو دیکھ کر ایمان متزلزل ہی کرنا پڑتا ہے "کافرماجرائی" کی ایسی مثالیں کم نظر آتی ہیں، میں پہلے بھی سمجھتی تھی کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ خلوص سے خالی نہیں اور اب آپ کے جواب سے اور زیادہ یقین اس کا ہو گیا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کی "تلقین" کو مانتے ہی ایک قسم کا خوف معلوم ہوتا ہے اور جی ہچکچاتا ہے، کیا آپ اس کا سبب بتا سکتے ہیں؟

فی الحال یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کے نزدیک سب سے بہتر مذہب کون سا ہے اور کیوں؟ اصول اسلام میں آپ کو کیا خرابیاں نظر آتی ہیں اور وہ کیوں کر دور ہو سکتی ہیں؟

....

(**نگار**) آپ نے میری "ادبیت" کی "فسوں زائی" اور نشاپردازی کی تعریف میں جو کچھ سپردِ قلم فرمایا ہے وہ خواہ کتنا ہی خلافِ حقیقت کیوں نہ ہو لیکن مجھے مغرور بنا دینے کے لئے کافی سے زائد ہے۔

خوشا لطافتِ اندازۂ ادا فہمی

اگر میں اپنی زندگی میں کسی ایک ہی کا ایمان (بقول آپ کے) "متزلزل" کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے خود بھی اس "کافرماجرائی" پر فخر کرنا چاہیئے مگر اے میری محترم خاتون! کبھی آپ نے اس حقیقت پر بھی غور فرمایا ہے کہ جس کیفیت کو دنیا "کفر و ایمان" سے تعبیر کرتی ہے وہ صرف لفظی نزاع تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ایک ہی چیز کے دو (۲) جدا جدا نام رکھ کر مجادلہ ہو رہا ہے، آہ! دنیا کی عمر اس بحث و اختلاف میں گزر گئی ہے کہ پردۂ جمال کو "حجاب" کہیں یا "نقاب" اور یہ ہوش کسی کو نہیں کہ "طرفِ نقاب" اٹھا کر شاہدِ مستور کا مشاہدہ کریں جو ان تمام ظاہری امتیازات سے بہت بلند واقع ہے۔ منصور و فرہاد کی سرگذشت پر جو تنقید چاہے کر لیجئے لیکن آخر کار حقیقت وہی نظر آئے گی کہ ع

آشفتہ نوائے بہ سردار بر آمد

شوریدہ ادائے بدم تیشہ رواں داد

کیا اب بھی آپ مجھ سے دریافت کریں گی کہ میرے نزدیک سب سے بہتر مذہب کون سا ہے؟ دیکھئے ان لوگوں سے جن کا مذہب صرف "مسلکِ عشق" ہو اس قسم کے سوالات نہیں کئے جاتے ہیں کیا آپ نے نہیں سناع

بادل شدگان ہر کہ در افتاد بر افتاد

کسی "حیراں" سے نہ دریافت کیجئے کہ اسے "جلوۂ محبوب" کہاں نظر نہیں آتا اور ایک "عاجز و سرگشتہ" سے یہ نہ پوچھئے کہ اس نے شاہدِ مقصود کو کس جگہ پایا۔ وہ تو آسانی سے کہہ دے گا کہ "ہر جگہ اور کہیں نہیں" لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس جواب کو سن کر اپنی ہنسی ضبط کر سکیں گی؟

بیدلؔ کہتا ہے ع

بحر بے تاب کہ آن گوہر نایاب کجاست — چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہاں تاب کجاست

دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم — کعبہ زین درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

اے سمندر بہوس داغ فروش آتش کو — ماہیاں تشنہ بہ میرید دم آب کجاست

لیکن وہ حضرات جن کی سطح بیں نگاہیں صرف الفاظ کو دیکھتی ہیں اس پر ہنستے ہیں۔

آپ کو میری "تلقین" پر یقین لاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے، جی ہچکچاتا ہے ----- یوں کیوں نہ کہئے کہ "کلیجہ دھڑکتا ہے" اس کا جواب بہت عرصہ ہوا دہلی کا ایک شاعر ان الفاظ میں دے چکا ہے کہ ع

ادھر لاؤ ذرا دستِ حنائی
پکڑ لیں چور کا دل ہم یہیں سے

مجھے آپ کے اسی خوف اور اسی دھڑکن سے محبت کا سراغ کا ملتا ہے اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب میں آپ کو اپنے "حلقۂ خیال" کا اسیر دیکھ کر آزادی سے کہہ سکوں گا کہ ع

بیا بیا عراقی توز خاصگانِ ما ای

میں کوشش کروں گا کہ آپ کے "خدشات" دور کرنے میں کام یاب ہوں اور بالکل اسی طرح جس طرح آپ چاہتی ہیں۔

دل را بہ طرہائے خم اندر خم افگنم

مذہبی بیمــاری

جس طرح جلدی بیماریاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں -لازم و متعدی- اسی طرح دماغی بیماریوں کی بھی دو قسمیں ہیں، لازم کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو غور و فکر کا اہل نہ سمجھے اور متعدی یہ کہ دوسروں کو بھی نہ سوچنے دے۔

اسلام نے ایمان و اعتقاد کو دو چیزوں پر منحصر کیا ہے: تصدیق بالجنان و اقرار باللسان یعنی ضمیر کا اطمینان اور اس کا زبان سے اقرار۔ ظاہر ہے کہ جب تک نفس مطمئن نہ ہو گا ایمان و اعتقاد میں استحکام و رسوخ پیدا ہونا ممکن نہیں اور جب یہ نقش اچھی طرح دل نشین ہو جائے گا تو زبان سے اس کا اقرار اور گفتگو کے ذریعہ سے اس کا اظہار بھی ایک اثر پیدا کرے گا۔اس اطمینانِ نفس و ضمیر کا ذکر قرآن میں اکثر جگہ آیا ہے، یہاں تک کہ جب ایک پیغمبر نے خدا کے مشاہدۂ عینی کی خواہش کی تو اس کا سبب بھی یہی اطمینانِ قلب بتایا گیا۔ ہر چند دنیا اب اس منزل پر نہیں ہے کہ وجودِ باری پر یقین لانے کے لئے وہ رؤیتِ ظاہری کو ضروری قرار دے تاہم ریب و شک، وہم و ظن، اشتباہ و التباس کی کار گاہ ہنوز قائم ہے اور غالباً زیادہ وسعت و فراوانی کے ساتھ، زیادہ الجھن اور پیچیدگی لئے ہوئے، پھر یہ کس قدر عجیب و غریب ذہنیت ہے کہ ایک طرف تو اس روایت کی بھی تصدیق کی جاتی ہے کہ ایک شخص کے اطمینانِ قلب کے لیے خدا نے اپنے آپ کو بے حجاب و بے نقاب کر دیا اور دوسری طرف اس کی بھی اجازت نہیں دی جاتی کہ ہم جانشینانِ رسول سے صرف یہ سوال کر سکیں کہ وہ کس استحقاق کی بناء پر اپنے آپ کو حاملِ دین سمجھتے ہیں اور وہ دینِ متین کیا ہے جو فطرتِ انسانی کو مطمئن کر سکتا ہے؟

اسلام دنیا کا تنہا فطری مذہب ہم کو ہر ہر موقعہ پر غور و فکر، تامل و تدبر کی تعلیم دیتا ہے، وہ ہم کو بتاتا ہے کہ مذہب کی اصل روح نظامِ عالم پر غور کرنا، کائنات اور اس کے مظاہر و آثار کو دیدۂ نقد و اعتبار سے دیکھنا ہے لیکن مذہب کا علم بردار آج دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ تعلیم کی تکمیل ہو چکی، دین درجۂ کمال کو پہنچ گیا اور وہ تعلیم وہی ہے جو وہ

بتاتا ہے، وہ دین وہی ہے جسے وہ اپنے اسوۂ بلند سے ظاہر کرتا ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ اخلاقیات کا انتہائی درس جو دیا جاسکتا تھا، دیا جاچکا ہے اور اب دنیا کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو اپنے کسی عمل کسی قول، کسی حجت و دلیل سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے اس دعوے سے دنیا کو مطمئن کر سکتا ہے؟

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقلِ انسانی بھی ترقی کر رہی ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی ترقی کی حد کیا ہوگی؟ لیکن یہ مذہب کی حمایت کے لیے تڑپنے والا اب تک یہی درس دے رہا ہے کہ مذہب نام ہے بے عقلی اور ہرزہ کاری کا، دین نام ہے صرف کورانہ اتباع کا اور زبان سے ہر اس امر کے اقرار کر لینے کا جس پر دل کسی طرح مطمئن نہ ہو۔ اس کا نام اس نے "اعلاءِ کلمۃ الحق" اور "امر بالمعروف" رکھ چھوڑا ہے درآں حالِ کہ اس سے زیادہ توہین و تذلیل اسلام کی اور اس سے زیادہ اشاعت کفر والحاد کی کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

وہ زمانہ گیا جب علیین و سجیین کے ہفت طبقات کی تعیین، کوثر و سلسبیل کی روانی اور آتشِ دوزخ کی شعلہ فشانی کے ذکر سے وہ جاہلوں پر ہیبت طاری کر دیا کرتا تھا۔ اب زمانہ ہے علوم و فنون کی ترقی کا، انکشافِ حقائق کا، استقراء و مشاہدہ کا، اور اس لیے ٹھیک اس وقت جب کہ وہ منبر پر بیٹھ کر معجزہ و کرامت کا ذکر کرتا ہوتا ہے صاحبانِ عقل و دانش اس پر ہنستے ہیں اور جن اصولوں کو پیش کر کے وہ اسلام کی طرف بلاتا ہے اسے دیکھ کر لوگ اور زیادہ اس سے ہٹتے جاتے ہیں، حالاں کہ موجودہ زمانہ سے بہتر زمانۂ تعلیم و صداقت کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی سچ کو سچ کی طرح پیش کیا جائے، کیوں کہ دنیا سے مذہب کے اوہام مٹ چکے ہیں، اور رسم و رواج کی حکومت اب اعتقادات کی دنیا میں قائم نہیں رہی، پھر اگر کوئی اس دور کی ذہنیت میں واقعی صحیح اصولِ اخلاق کے پیش کرے جو عین مدعا کسی مذہب کا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اسے قبول نہ کرے۔

کہا جاتا ہے کہ اس ہنگامۂ مادیات میں جب کہ انسان صرف ایک "میکانکی" چیز ہو کر رہ گیا ہے، روح کا اضطراب سکون کا طلب گار ہے جسے اخلاقی یا تمدنی اصطلاح میں دنیا کا امن کہا جاتا ہے، لیکن مبلغینِ مذہب کو اس کا علم نہ ہوگا وہی چیز جسے دنیا کا امن و سکون کہا جاتا ہے اس کے لیے مذہب میں نہایت ہی جامع و پُر معنی لفظ صراطِ مستقیم کا استعمال کیا گیا ہے جس کو زبان سے تو ہزار بار ادا کیا جاتا ہے لیکن اس کے مفہوم پر ایک مرتبہ بھی

غور نہیں کیا جاتا جس طرح دو لفظوں کے درمیان خط مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اسی طرح دنیا میں اس منزل تک پہنچنے کے لیے بھی جو ارتقاءِ انسانیت کا نصب العین ہے ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ راستہ وہی ہے جسے اسلام نے بتایا اور جو تمام نوع انسانی کو بلا تفریقِ نسل و قومیت بلا امتیازِ ملک و ملت یکساں طور پر دعوت دیتا ہے۔

لیکن کیا اسلام کی یہ صلحِ کل تعلیم، یہ ہمہ گیر درسِ اخلاق و عمل آج بھی باقی ہے؟ اس کا جواب ان کلید بردارانِ فردوس سے چاہو، ان اجارہ دارانِ خلد سے طلب کرو، ان قائدینِ اسلام ور ہنمائے ملت حنیفی سے دریافت کرو جن کے یہاں اخلاق اسلامی نام ہے صرف ایک خاص وضع و صورت کا، ایک مخصوص رسم رواج کا اور جو آفرینش انسان کی حقیقی غایت حور و قصور اور کوثر د سلسبیل کے حصول کے سوا کسی اور چیز کو نہیں سمجھتا، پھر وہ لوگ جو خدا کے وجود کے ساتھ مخصوص انداز کی عبادت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کس مقصد کے حصول کے لیے ہے؟ اگر اس سے مدعا وہی ہے جو ابھی عرض کیا گیا ہے ------- تو خیر، ورنہ از راہِ کرم مجھے بتائیں کہ کلام پاک میں لكل أمة جعلنا منسكا هم ناسكوه فلا ينازعنك فى الامر کا کیا مفہوم ہے اور لكل امة جعلنا منسكا ليذكروا اسم الله سے کیا مراد ہے؟ کیا عبادت و نسک ایک ہی چیز نہیں، کیا نماز اور نسک ایک ہی مفہوم کے دو لفظ نہیں؟

○○○

ہمارے علماء کرام کا دینی نظریہ

۱۰/دسمبر ۱۹۲۹ء کو میں نے ایک استفتاء مرتب کیا جس کا مضمون یہ تھا:

"ایک شخص خاندانی مسلمان ہے اور خود بھی نہایت پابندِ صوم وصلوٰۃ ہے، تہجد گزار ہے، ذکر و شغل کا بھی عادی ہے، وضعِ ظاہری بھی بالکل شریعتِ اسلام کے مطابق رکھتا ہے، لیکن زندگی اس کی مکروفریب، کذب وافتراء ایذارسانی و قطعِ رحم میں بسر ہوتی ہے۔
دوسرا شخص قوم کا برہمن، پشتینی کافرو مشرک ہے، اس کے گلے میں بتوں کی ہیکل پڑی رہتی ہے، رات دن پوجاپاٹ کرتا رہتا ہے مگر اسی کے ساتھ اس کی زندگی ابناء جنس کی خدمت، یتامیٰ کی پرورش، بیواؤں کی ہمدردی میں بسر ہوتی ہے اس کی ذات یکسر امن وسکون ہے۔
براہ کرم مذہب اسلام کے نقطۂ نظر سے بتائیے کہ ان دونوں میں کون ناجی ہے اور کون ناری یا دونوں ناجی یا دونوں ناری؟ اگر آپ چاہیں تو استناداً قرآن، حدیث، اقوالِ اکابر کا حوالہ دے دیں ورنہ اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے مجھے صرف جناب کی رائے بہ حثیت ایک عالم دین ہونے کے درکار ہے۔"

اس کی مطبوعہ نقلیں بغرض حصولِ جواب ہندوستان کے ۳۲ مشہور علمائے کرام کے نام روانہ کی گئیں جن میں صرف ۲۴ حضرات نے جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی۔

ان جوابات کو اگر ان کی مختلف ذہنیتوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو ان کو چار علیٰحدہ علیٰحدہ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ ضعیف و کمزور یا مصلحت اندیش ذہنیت جو کسی قسم کا جواب دینا پسند نہیں کرتی۔ دوسری وہ جسے ہم "مذبذبین" کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں تیسری جس کا تعلق "راسخون" سے ہے اور چوتھی وہ جو بالکل غیر جانب دار رہنا چاہتی ہے اور عدم علم کا اظہار کرتی ہے۔

اول الذکر ذہنیت کی مثال آپ کو صرف مولانا اشرف علی صاحب کے جواب میں نظر آئے گی کہ انہوں نے نہ صرف جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ اس کی بھی کوشش کی کہ ان کی شخصیت کا پتہ نہ چلے۔ کیوں کہ انہوں نے جواب میں نہ اپنے دستخط ثبت فرمائے اور نہ مقام درج کیا۔

انہوں نے جو جواب دیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے کہ:

"سوال تنقیح طلب ہے جو تحریر میں خالی از تکلف نہیں، ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے"

مولانا کا مدعا اس جواب سے غالباً یہ ہے کہ اس استفسار یا استفتاء پر بعض تنقیحیں (عدالتی نہیں بلکہ دینی و مذہبی) قائم ہونا چاہئے اور ان تنقیحوں کے قائم کرنے میں انہیں تکلّف ہے، تکلیف کا اندیشہ ہے، اس لیے ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے کیوں کہ نہ کوئی شخص لکھنؤ سے تھانہ بھون جانے کی زحمت اختیار کرے گا اور نہ مولانا کو جواب دینے کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ یہی وہ "ناوک فرمائی" ہے جو سودا کے زمانہ میں صرف "مرغِ قبلہ نما" کو تڑپا دیتی ہے لیکن اب "حطیمِ کعبہ" کو متزلزل کر رہی ہے۔

شکر ہے کہ اس ذہنیت کی مثال مجھ کو تمام جوابوں میں صرف ایک ہی ملی اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو شاید مسائلِ روزہ و نماز سے زیادہ کسی ایسے استفسار کا جواب دینے کی اہل نہیں ہے جو فلسفہ مذہب سے متعلق ہو یا کسی اصولی گفتگو سے۔

باقی تین ذہنیتوں میں سے وہ ذہنیت جس کو میں نے "راسخون" میں داخل کیا ہے یا جدید سیاسی اصطلاح میں قدامت پسند یا کنزرویٹو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حسبِ ذیل حضرات کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے:

قاضی صاحب بھوپال، مفتی صاحب رام پور، مفتی صاحب حیدر آباد، مولانا حسین احمد صاحب مفتی دیوبند، مولانا نثار احمد صاحب مفتی آگرہ، مولانا محمد کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب دہلی، مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی، مولانا سید سلیمان شاہ پھلواروی، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ، مولانا عبدالعزیز صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب۔

ان حضرات نے نہایت صفائی اور پورے رسوخ و یقین کے ساتھ حکم لگایا ہے کہ مسلمان چاہے کچھ کرے، بہر حال ناجی ہے بشرطِ یہ کہ ایمان پر اس کا خاتمہ ہو اور بت پرست کافر کتنا ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو اس کا ناری ہونا یقینی ہے۔

غیر جانب دار یا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے والی ذہنیت مولانا عبدالستار لاہوری اور مولانا احمد احمدی کے جوابات سے ظاہر ہوتی ہے، اول الذکر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ "ناری اور ناجی ہونے کے متعلق وہ "لب کشائی" نہیں کر سکتے۔ اس کا علم مالک الملک کو ہے۔" اسی طرح ثانی الذکر صاحب نے صفائی کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ " اس کو خدا بہتر جانتا ہے کہ کون ناری ہے اور کون ناجی۔"

اب صرف ایک جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا رہ گیا جس کو میں نے مذبذب

ذہنیت کے نام سے موسوم کیا ہے، کیوں کہ وہ جواب شروع کرتے ہیں ان الفاظ سے کہ: "دونوں ناری ہیں" اور ختم کرتے ہیں اس "لیکن" پر جس میں مسلمان کے بخشے جانے اور کافر کے نہ بخشے جانے کا امکان ظاہر کیا ہے اور ایک شخص کے لیے دشوار ہے کہ ان دونوں رایوں میں کس کا اعتبار کرے اور کس کو صحیح جواب خیال کرے۔

یہ تھا ایک سرسری اور مختصر سا جائزہ یا عمومی تبصرہ جو "علماء کرام" کے جوابات پر کیا گیا ہے۔ اب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک اصولی گفتگو اس مسئلہ پر کرنا چاہتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ عقلِ انسانی یا فطرتِ انسانی جس پر اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا بیان کیا جاتا ہے ان جوابات میں سے کسی جواب پر مطمئن ہو سکتی ہے یا کسی پر نہیں؟

مولانا عبدالستار صاحب لاہوری اور مولانا احمد صاحب کے جوابات تو قطعاً لائق اعتناء نہیں، کیوں کہ جب وہ اسلام کی صداقت کے مدعی ہونے کے بعد اس کی پیروی کر رہے ہیں تو ان کا یہ کہنا کہ " ہمیں علم نہیں کون ناری ہے کون ناجی" اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلام سے بہتر کسی اور مذہب کے ہونے کا امکان باقی ہے اور وہ ایک ایسے مسلک کے ماننے والے ہیں جو خود ان کے اندر کوئی کیفیت یقین اور رسوخ کی پیدا نہیں کرتا اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ کیوں مذہبِ اسلام کو صحیح مذہب مانتے ہیں تو اصولاً وہ یہی جواب دیں گے کہ اسلام ان کے نزدیک سب سے بہتر مسلک ہے لیکن اس کے بعد اگر ان سے یہ دریافت کیا جائے کہ کیا اسلام کا بہترین مسلک ہونا ان کے نزدیک اس لیے نہیں ہے کہ اسی پر انسان کی نجات منحصر ہے، تو کیا ان کو یہی جواب دینا چاہئے کہ اس کا علم ان کو نہیں ہے، حیرت ہے کہ وہ اس عالم ریب و شک میں کس طرح اپنے آپ کو حقیقی معنی میں اسلام کا متبع کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو دعوتِ اسلام کیوں کر دے سکتے ہیں، جب کہ خود انہیں اس امر کا یقین نہیں کہ اسلام نجات کا ضامن ہے۔

مجھے مولانا احمد احمدی کے اس جواب پر بہت زیادہ حیرت ہے کیوں کہ احمدی جماعت بالکل تبلیغی جماعت ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ کسی کو بھی اپنے مسلک کی طرف دعوت دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا جواب بھی زیادہ توجہ طلب نہیں۔ کیوں کہ انہوں نے کوئی یقینی بات نہیں کہی، اگر وہ صرف دونوں کے ناری ہونے پر حکم لگاتے تو گفتگو ہو سکتی تھی لیکن چوں کہ اخیر میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے پہلا بخشا جائے اور

دوسرا نہیں۔اس لیے جو گفتگو "راسخون" کے جوابات کے سلسلہ میں ہو گی، وہی مولانا ندوی کے فتویٰ کے خلاف پیش کی جاسکتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا ہے من جملہ سولہ(۱۶) حضرات کے، بارہ (۱۲) نے پورے وثوق کے ساتھ مسلمان کے ناجی ہونے پر حکم لگایاہے،خواہ وہ کتنی ہی معصیت کرے اور برہمن کے ناری ہونے کا فتویٰ دیاہے خواہ اس کے عمل کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔اس لئے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے پہلے چند تنقیحوں کا قائم کرلیناضروری ہے:

1۔مذہب کا مقصدِ صحیح کیاہے؟

2۔اخلاق حسنہ کی غایت کیاہوسکتی ہے؟

3۔ناری وناجی ہوناکسے کہتے ہیں؟

4۔خدااور مذہب کاباہمی تعلق کس قسم کاہے؟

اگر ہم ان چار باتوں کا فیصلہ کر سکے تو ان علماء کرام کے جوابات پر بھی تنقید کر سکیں گے اور خود بھی اپنے استفتاء کا جواب دے سکیں گے جو ہندوستان کے اتنے حاملینِ شریعت کے پاس بغرض حصولِ فتویٰ بھیجا گیا تھا۔

چوں کہ مختلف اوقات میں مختلف مذہبی مباحث کے تحت "**نگار**" میں ان تمام امور پر اس سے قبل کافی گفتگو ہو چکی ہے،اس لئے زیادہ میں تفصیل وطوالت سے کام نہ لوں گا بلکہ مختصراً صرف انہی امور کو پیش کروں گا جو مسئلہ زیرِ بحث پر روشنی ڈالنے کے لئے ضروری ہیں۔

تنقیح اول کے متعلق ساری دنیا کی متفقہ رائے یہی ہے کہ مذہب کا مقصد اصلاحِ اعمال،تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ نفس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اسی طرح تنقیح دوم کے متعلق بھی یہی ایک رائے پائی جاتی ہے کہ اخلاق حسنہ کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان دنیا کے نظامِ تمدن میں عضوِ مفید کی حیثیت اختیار کرکے دوسروں کے ساتھ ہم دردی سے پیش آئے۔ابنائے جنس کے نظامِ عمرانی میں ایک فردِ معاون ہو کر زندگی بسر کرے اور نفسی و ذاتی اغراض سے شیرازۂ اخوتِ عامہ کو درہم وبرہم نہ ہونے دے، چناں چہ یہی وہ اصلِ اصول تھا جس کی بناء پر شریعتیں مرتب ہوئیں، قوانین وضع کئے گئے اور اچھے برے افعال کی فہرست ترتیب دے کر عوام کے سامنے گناہ و ثواب اور سزاو جزا اور خدا کی تعیین کی گئی تاکہ جو لوگ حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ بھی اصل راہ سے

منحرف نہ ہوں اور قانونی پابندی سے ان کی بے راہ روی کو متعذر بنایا جائے۔

تیسری تنقیح سب سے زیادہ اہم تنقیح ہے کیوں کہ استفتاء میں یہی دریافت کیا گیا تھا اور اسی میں مجھے اکثر علماء کرام سے اختلاف ہے، عام طور پر ناری و ناجی ہونے کا تعلق "حیات بعد الممات" سے سمجھا جاتا ہے یعنی جب انسان مر جائے گا تو جو اعمال دنیا میں اس نے کئے ہیں ان کے لحاظ سے اس کو انعام یا سزا ملے گی اور اس انعام و سزا کو بہشت و دوزخ کی صورت میں پیش کیا جائے گا، بعض کا خیال ہے کہ یہ عذاب وثواب جسم کے ساتھ ہو گا اور دوزخ میں واقعی سانپ، بچھو اور آگ کی شعلے ہوں گے اور جنت میں حقیقتاً حوریں، غلمان، باغ اور میوے وغیرہ ہوں گے، لیکن بعض کہتے ہیں کہ عذاب وثواب روحانی ہو گا اور دوزخ و جنت کا بیان صرف تشبیہی و تمثیلی ہے، بہر حال وہ انعام و سزا جسمانی ہو یا روحانی، نتیجہ ہے اعمالِ حسنہ یا افعالِ سیئہ کا جو اس دنیا میں انسان سے سرزد ہوئے ہیں--- اس وقت اس بحث میں نہ پڑوں گا کہ مرنے کے بعد سزا یا جزا کا مفہوم نتیجہ خیز و قابلِ یقین امر ہے یا نہیں؟ بلکہ میں اس کو حرف حرف صحیح ماننے کے بعد ناجی وناری کے مفہوم پر ایمان لاتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ناری وناجی ہونے کا تعلق علاوہ اعمالِ حسنہ کے کسی اور چیز سے ہے اور اگر ہے تو کیوں؟

اور جو کچھ اوپر بیان ہو چکا ہے اس سے لازماً ہر شخص اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ چوں کہ مذہب کا مقصودِ اصلی اخلاقِ حسنہ کی تعلیم ہے اس لیے ناری وناجی ہونے کا انحصار صرف اخلاقِ انسانی پر ہونا چاہئے اگر وہ برے ہیں تو ہم کہیں گے کہ وہ ناری ہے اور اچھے ہیں تو حکم لگائیں گے کہ وہ ناجی ہے۔ اس لیے ہمارے علماء کرام کا فاسق وفاجر مسلمان کے متعلق یہ حکم لگانا کہ بہر حال وہ ناجی ہے اور خوش اخلاق برہمن کی نسبت یہ فتویٰ صادر کرنا کہ وہ کچھ کرے نجات اس کی ممکن نہیں یقیناً متذکرہ بالا اصول سے علیٰحدہ کسی اور اصول پر مبنی ہو گا پھر آیئے غور کریں وہ اصول کیا ہو سکتا ہے؟

میں نے جہاں تک غور کیا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ علماء کرام نے مذہب اسلام اور اخلاقِ حسنہ کو علیٰحدہ علیٰحدہ دو چیز قرار دیا ہے اور ان کے درمیان جو نسبت پائی جاتی ہے وہ اس طرح ہے کہ ان دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے اور افتراق بھی، یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو لیکن اخلاق حسنہ نہ رکھتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی میں اخلاق حسنہ موجود ہوں اور وہ مسلمان نہ ہو۔ یعنی اصل چیز ان کے نزدیک اخلاقِ انسانی نہیں بلکہ

محض مسلمان ہونا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں؟

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض مسلمان ہونا ہی نجات کا ضامن ہے اور انسان کے اچھے اعمال کوئی چیز نہیں ہیں تو پھر اسلام کا مقصد کیا ہے اور اسلام کس چیز کا نام ہے؟

جن علماء کرام نے بدکار مسلمان کے ناجی ہونے اور نیکوکار برہمن کے ناری ہونے پر حکم لگایا ہے وہ گویا بہ الفاظ دیگر اس بات کے معتقد ہیں کہ محض خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار کر لینا یا یوں کہئے کہ ان کی مقرر کی ہوئی ایمان مجمل و مفصل کی عبادت کو ایک اشلوک کی طرح پڑھ کر اعتقاد کر لینا کافی ہے، اور کائنات میں انسان کا وجود صرف اس لیے ہے کہ وہ چند الفاظ کو یاد کر لے۔ کیوں کہ خدا اور اس کی خدائی، کائنات اور اس کا جملہ نظام عبارت ہے انہی دو سطروں کے حفظ کر لینے سے۔

اگر حقیقتاً اسلام یہی ہے اور اس کی تمام تعلیمات کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے تو ہم کو تنقیح چہارم کا پہلے فیصلہ کر لینا چاہئے کہ خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کیا ہے، یعنی خدا کو مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا وہ ضرورت صرف ایک شخص کے اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے پوری ہو جاتی ہے۔

یہ مسئلہ میرے نزدیک زیادہ پیچیدہ ہے کیوں کہ خود انہی علماء کرام کے اعتقاد کے موافق خدا کی ذات بے نیاز ہے اور وہ ہماری عبادت، ہماری نیائش بلکہ خود ہماری اور ساری کائنات کی ہستی کی طرف سے بالکل بے پرواہ ہے۔ نہ آفرینش سے اس کی کوئی غرض وابستہ ہے نہ ہلاکت و فنا سے، اس نے اگر عالم کو پیدا کیا تو اس طمع و غرض سے نہیں کہ کوئی اس کا نام لے گا اور اگر وہ سب کو تباہ و برباد کر دے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اگر وہ ہمارے انسانی بادشاہوں اور رئیسوں کی طرح نہیں ہے تو نہ اس میں جذبۂ انتقام کی پرورش ہوتی ہے نہ جذبۂ استحسان کی۔ کوئی عمر بھر اگر اس کی عبادت کرے تو وہ اپنے اصول بدلنے والا نہیں اور اگر کوئی ہر وقت اسے گالیاں دے تو اس سے متاثر نہیں ہوتا اس لیے اب سوال نہ اصطلاحی عبادت کا رہا نہ اصطلاحی کفر کا۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہماری عبادتیں اگر کسی غرض سے وابستہ ہو سکتی ہیں تو وہ خدا سے متعلق نہیں ہے، بلکہ خود ہماری فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا اثر ہماری دنیاوی زندگی پر پڑنا چاہئے دنیاوی زندگی کی تخصیص میں نے اس لیے کی کہ اخروی زندگی کے ماننے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ خدا کیوں اس سلسلہ کو

قائم رکھے اور اس سے حیات انسانی و تمدن انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور جب کہ بقول مقتدایانِ مذہب دوبارہ عالمِ آب و گل میں آنا نہیں ہے تو جزا و سزا نتیجہ کے لحاظ سے بالکل بے کار چیز ہو جاتی ہے۔ سزا و جزا کا مدعا یہ ہے کہ ایک شخص آئندہ فعل مذموم سے احتراز کرے، لیکن جب اس کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی اور دار العمل ختم ہو جاتا ہے تو سزا و جزا محض ایک لا یعنی شے ہو کر رہ جاتی ہے بہر حال جو صورت ہو یہ بالکل یقینی ہے کہ خدا سے ہماری عبادت و نافرمانی کا کوئی تعلق نہیں ہے یعنی خدا اس سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر خود ہمارے اوپر ہوتا ہے اور وہ اثر فلاح و بہبود یا ہلاکت و زوال کے سوا کچھ نہیں۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام نے کیوں اعمالِ حسنہ کو تنہا ذریعہ نجات قرار نہیں دیا۔ سو آیئے سب سے پہلے قرآن میں جستجو کریں کہ اس کا فیصلہ کیا ہے کیوں کہ اس کے فیصلہ سے علماء کرام کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں جہاں کہیں ایمان و اسلام کا ذکر آیا ہے وہیں اعمال صالحہ کو بھی اس کے ساتھ لازم کر دیا ہے اور بغیر افعالِ حسنہ کے ایمان کا کوئی مفہوم قرار نہیں دیا گیا۔ قرآن میں کثرت سے اس مفہوم کی آیات موجود ہیں مثالاً چند یہاں پیش کی جاتی ہیں:

إنّما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخو يكم یعنی مومنین کی پہچان یہی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں اور باہم دگر امن و صلح، صلاح و فلاح کی زندگی بسر کریں فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝٧ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝٨ یعنی جو کوئی (خواہ وہ کسی ملک و قوم کا ہو) ذرہ برابر انیکی کرے گا اس کا نتیجہ دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اس کا نتیجہ پائے گا۔

إِنَّ ٱللَّـهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ یعنی اللہ کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ خدا اپنے اندر بری یا بھلی کوئی تبدیلی نہ پیدا کرے۔

إِنَّ ٱللَّـهَ لَا يَظْلِمُ ٱلنَّاسَ شَيْـًٔا وَلَـٰكِنَّ ٱلنَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ بلکہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود انسان ہی اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی متعدد آیات ایسی پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کا مفہوم ہی عملِ صالح ہے۔ چناں چہ ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوتا ہے: وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ ءَامَنَّا بِٱللَّـهِ وَبِٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ یعنی بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے در آں حالِ کہ وہ مومن نہیں ہیں

-----کیوں؟ اس لیے کہ ان کی اعمال اچھے نہیں ہیں، اور ان کے اخلاق برے ہیں پھر کیا اس آیت کے تحت وہ مسلمان جن کا ذکر میں نے اپنے استفتاء میں کیا ہے، ایمان سے خارج نہیں ہو جاتا اور اس کو ناری نہیں کہہ سکتے؟

اسی طرح کثرت سے کلامِ مجید میں اعمال و نتیجۂ اعمال کے فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ لَّيْسَ لِلْإِنسَـٰنِ إِلَّا مَا سَعَىٰ یعنی انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی ہے اور وہی ملے گا جو اس کے عمل کا اقتضاء ہے۔

پھر کیا اس اصول کے ماتحت وہ برہمن اپنے اعمالِ حسنہ کا اجر نہ پائے گا اور وہ مسلمان اپنے افعالِ سیئہ کی سزا کا مستوجب نہ ہوگا اور کیا اس اجر و سزا کو ناجی و ناری کے الفاظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس مسئلہ میں سب سے بڑی الجھن جس چیز نے پیدا کر دی ہے وہ شرک و توحید یا کفر و اسلام کی تفریق ہے چوں کہ مشرک و کافر کے لیے قرآن میں جا بجا ناری ہونے کی وعید آئی ہے اور مشرک و کافر کا مفہوم بت پرست یا غیر مسلم قرار دیا گیا ہے اس لئے ایک مولوی نہایت آسانی کے ساتھ ایک غیر مذہب والے کے ناری ہونے پے فتویٰ صادر کر دیتا ہے، خواہ اس کے اعمال کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں۔

میرے نزدیک کفر و اسلام یا شرک و توحید کا مفہوم ہی ان لوگوں نے بالکل غلط سمجھا ہے جس طرح توحید کے معنٰی زبان سے خدا کو ایک کہہ دینے کے نہیں ہیں اس طرح شرک کے معنٰی بت پرستی کے نہیں ہیں۔ توحید سے مقصود خدا کو ایک کہنا نہیں، کیوں کہ ایک کی نسبت بھی اس کی شان کے منافی ہے، بلکہ اس سے مراد اس کو کل سمجھنا ہے اور اپنے آپ کو بھی اسی کل کا جزء قرار دے کر تمام قوائے عمل سے کام لے کر تمام ان مدارجِ ارتقاء کو طے کرنا ہے جو اس کل یا قدرت نے سعی و عمل کے لیے مخصوص کر دیئے ہیں چوں کہ بت پرست اقوام، یعنی وہ قومیں جو تمام کاموں کا انحصار بتوں کی خوشنودی پر رکھتی ہیں، رفتہ رفتہ اپنے تمام عزائم و قوائے کاسبہ کو مضمحل بنا لیتی ہیں اس لیے رفتہ رفتہ انسانی عمران و تمدن کو تباہ کر کے خود بھی تباہ ہوتی ہیں۔

چوں کہ عہدِ رسالت میں مشرکینِ عرب کی حالت بالکل اسی طرح درجۂ انحطاط پر پہنچ گئی تھی اس لیے شرک و کفر کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا بغیر اس کے کہ انہیں فلسفۂ کفر و اسلام کو سمجھایا جاتا جس کے سمجھنے کے وہ اہل نہ تھے۔

اس لیے معلوم یہ ہوا کہ محض کفر و شرک بغیر کسی سبب کے معصیت نہیں ہے اور خود خدا کی خوشنودی یا برہمن یا اس کے اعزاز و توہین کا سوال اس میں پنہا نہیں ہے اگر کوئی رسول پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی قوم کے لیے قوانین وضع کرتا ہے یا کوئی اسلوبِ حیات متعین کرتا ہے تو اس سے مراد اس کی یہ ہوتی ہے کہ قوم ان پر کاربند ہو کر ترقی کرے محض ان قوانین کا حفظ کر لینا یا بالکل مادی طور پر رسم و رواج کی طرح اس اسلوبِ زندگی پر عامل ہو جانا مفید مدعا نہیں۔ اس لئے اگر کوئی مسلمان باوجود نماز روزہ و دیگر احکام کی، شریعت کی پابندی کے اپنے اندر کوئی معنوی یا روحانی تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ صرف ان اعمال و شعائر کی پابندی اس کی نجات کے لیے کافی ہے (جیسا کہ ہمارے علماء کرام نے اپنے فتاوے میں ظاہر کیا ہے) تو میں اس کو بھی شرک و کفر ہی قرار دوں گا اور ایک بدکار بت پرست کے مقابلہ میں اس کو کوئی ترجیح نہیں دے سکتا۔ کیوں کہ ان دونوں کے درمیان سوا اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ ایک نے بت پتھر کا بنایا ہے اور دوسرے نے وہم و خیال کا۔ وہ اگر صرف مورت کی پرستش کو انجامِ مقاصد کا ذریعہ سمجھتا ہے تو یہ صرف نماز و روزہ کو اصلِ ایمان قرار دیتا ہے اس کا خدا پارۂ سنگ ہے اور اس کا بت نماز۔

اسی طرح اگر کوئی شخص بت پرستی کے بعد اعمالِ حسنہ کا حامل ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کے اخلاق کی پاکیزگی کو بے نتیجہ ولایعنی قرار دیں۔ اگر یہ نتیجہ اس کی بت پرستی کا نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ آپ اس کی بت پرستی کو ایک لایعنی شے کہہ سکتے ہیں اور یہ بھی حکم لگا سکتے ہیں کہ اگر وہ بت پرست نہ ہوتا تو بھی چوں کہ فطرت کی طرف سے اس کو طبعِ سلیم عطا ہوئی تھی، اس لئے اسی طرح کا پاکیزہ اخلاق کا انسان ہوتا۔ لیکن یہ حق آپ کو کب حاصل ہے کہ اس کے افعالِ حسنہ کو بالکل نظر انداز کر دیں۔ پس اس صورت میں کیا اسلام کا مفہوم بت پرستی کے علاوہ کچھ اور رہ جاتا ہے، کیا اس صورت میں آپ اس کے قائل نہیں ہوتے کہ اسلام کا مقصود صرف ظاہری مراسم کی پابندی ہے اور قرآن میں اس سے انکار نہیں کیا گیا ہے اس لئے میرے نزدیک اس فتویٰ کا صحیح جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ:

”ایک بدکار مسلمان قطعاً ناری ہے اور ایک نیکوکار برہمن یقیناً ناجی ہے“

سیّد سلیمان ندوی سے

معاصر "معارف" کے فاضل محرر نے فروری ۱۹۳۱ء کے شذرات میں جو ابتدائی دو صفحے تحریر فرمائے ہیں وہ خواہ کتنے ہی عام مصلحانہ انداز میں کیوں نہ لکھے گئے ہوں لیکن لکھنے والے کی تعمیم میں ایک ایسی تخصیص اور اس کی نگاہِ غلط انداز میں ایسی "پرسشِ پنہاں" موجود ہے کہ ہم کیا دنیا جان سکتی ہے کہ کس کو بسمل کرنے کے لیے مولانا نے اپنے "دستِ بازو" کو رنج پہنچانے کی زحمت گوارا کی ہے۔

قربان نگاہے تو شوم باز نگاہے

جنوری کے **نگار** میں اس مضمون کو دیکھ کر جس میں "علماء اکرام" کے فتاویٰ اور ان کے نظریۂ دینی پر تنقید کی گئی تھی، سب سے زیادہ جس کو متوجہ ہونا چاہیئے تھا وہ ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی ہی تھے کیوں کہ انہی کا فتویٰ ایسا تھا جو "صنعتِ تذبذب" میں لکھا گیا تھا اور اس لئے انہی پر اس کی شرح و تفسیر واجب تھی لیکن ہمیں افسوس ہے کہ انہوں نے شذرات کے صرف دو صفحات پر کفایت فرمائی جو حقیقتاً بہ اندازۂ "نیم نگاہ" بھی تسکین بخش نہیں، پھر اس سے زیادہ ہماری نارسائی بخت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ٹھیک اس وقت جب کہ **نگار** جنوری کی اشاعت کے بعد ہم اپنے آپ کو ساری دنیا کی طرف سے نویدِ "قتل و ذبح" پہنچا رہے تھے ترکش سلیمانی سے ایک تیر صرف بھی کیا جاتا ہے تو شکستہ پر، گستہ سوفار، نشانہ سے الگ اور سست رفتار

کیا یہی ہے جسے ناوک فگنی کہتے ہیں

ہم کو محترم مولانا سے جو دارالمصنفین ایسے خانوادۂ علم و فضل کے چشم و چراغ اور شبلی اسکول کی ذہنیت کے سب سے بڑے علم بردار ہیں، یہ توقع تھی کہ وہ **نگار** کے فتویٰ والے مضمون کو دیکھ کر ہماری غلطیوں کی اصلاح فرمائیں گے جو شکوک و اوہام ہم ایسے عامی و جاہل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں انہیں اپنے فاضلانہ طرزِ استدلال سے دور کرنے کی سعی کریں گے اور اگر یہ سب نہیں تو کم از کم وہ اس قدر عنایت تو ضرور روا

رکھیں گے کہ اپنے "ممکن" والے معمہ کو حل کر کے فتوے کے صحیح مفہوم سے دنیا کو آگاہ کر دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ انہوں نے اپنے منصبِ دینی کے لحاظ سے اس مسئلہ پر کوئی توجہ کی اور نہ دوستانہ حیثیت سے ہم کو لائقِ اعتناء سمجھا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا

مولانائے محترم نے اپنے شذرات میں جو کچھ اظہارِ خیال فرمایاہے وہ ان کے نزدیک ایسے اصولِ راسخ سے متعلق ہے کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے (اور تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) تو پھر وہ اصول از خود باطل ہو جاتے ہیں جن پر فتاوےوالے مضمون کی بنیاد قائم کی گئی تھی اور اس طرح کسی تفصیلی گفتگو کی بھی ضرورت نہیں رہتی، اچھا آیئے! تو ان اصول پر بھی سے ایک نگاہ ڈال لیں جو مولانا نے قائم کئے ہیں اور غور کریں کہ ان میں کون سی نئی چیز پائی جاتی ہے۔ شذرات میں ابتدائی چار ٹکڑے اسی موضوع کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ہر قسم کا کامیابی صرف دو چیزوں پر موقوف ہے ایک تو چند طے شدہ اصولوں کو دل سے تسلیم کر لینا اور دوسرا ان طے شدہ اصولوں کے مطابق سختی سے عمل کرنا ان کو عام محاوروں میں اصول و عمل کہو یا مذہب کی زبان میں ایمان و عمل، بات ایک ہی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ پہلے اصول پھر عمل ، یا پہلے عمل ،اور پھر اصول۔ ظاہر ہے فلسفیانہ حیثیت سے یہی جواب ملے گا کہ پہلے اصول پھر عمل۔ یہ کہنا کس قدر حماقت ہے کہ پہلے پابندی پھر اصول یا پہلے عمل پھر ایمان۔"

ہم کو بھی اس سے حرف بہ حرف اتفاق ہے اور کون ہے جو اصول کی تعیین سے پہلے پابندی اور ایمان کی تعیین سے قبل عمل کا مطالبہ کرے گا۔ لیکن سوال یہی ہے کہ آج کل مسلمانوں نے جس چیز کو اصول یا ایمان قرار دے رکھا ہے وہ حقیقتاً اصول یا ایمان ہے بھی یا نہیں؟

مولانا معاف فرمائیں! اگر میں یہ عرض کروں کہ وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں میرا اصل اعتراض تو یہی ہے کہ اصولِ ایمان کی صحیح تعیین ہی باقی نہیں رہی اور پابندی یا اعمال ہی کو اصول یا ایمان قرار دینے کی حماقت میں دنیا مبتلا ہے میں کب کہتا ہوں کہ کسی منزل کی تعیین نہ کیجئے۔ کوئی مقصود سامنے نہ رکھئے، کوئی غرض مشترک نہ پیدا کیجئے، کیوں کہ بغیر اس کے جہد و عمل، سعی و اقدام، کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ میں خود اس وقت ایک مولوی سے، ہر اس صاحبِ جبہ و دستار سے جو خود کو تنہا آلۂ رشد و ہدایت

سمجھ کر عوام کی دسترس سے دور، قدیم رومہ ویونان کے غضب آلود دیوتا جیوپیٹر کی طرح کبر وغرور کی شکنیں چہرہ پر ڈالے ہوئے ایک مرتفع مسند پر اپنے آپ کو اس قدر بلند کھینچے ہوئے ہے. میں یہی دریافت کرتا ہوں کہ خدا کے لیے اور اس رسول کے لیے جس کا تو صحیح جانشین بنا ہوا ہے بتا اور صحیح صحیح بتا کہ ایمان کیا ہے، اصول مذہب کیا ہیں؟

وہ کہتا ہے "نماز وروزہ و تسبیح وتوبہ و استغفار" میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایمان نام درستی اخلاق کا نہیں، اصولِ خیر ونجات، تزکیۂ روح و نفس سے متعلق نہیں؟ وہ اس کے جواب میں "ہاں" تو کہہ دیتا ہے لیکن اس کا وعظ یہی ہوتا ہے کہ اصل چیز صرف نماز ہے ایک مخصوص طریقۂ عبادت ہی کا نام ایمان ہے اور کوئی شخص اس طریق سے علیحدہ ہو کر چلتا ہے تو وہ گمراہ رہے گا خواہ اس کے اخلاق کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں؟

پھر اب میں خود مولانا ندوی سے پوچھتا ہوں کہ اصول کی تعیین وایمان کی تخصیص کو کس نے نظر انداز کیا، طریقِ کار اور راہِ عمل کو کس نے اصل ایمان قرار دیا۔ میں نے، جو صرف نیکوکاری کو اصول و ایمان قرار دیتا ہے، یا اس مولوی نے جو کہتا ہے کہ "اخلاقِ حسنہ سے نجات ممکن نہیں، جب تک ایک شخص خاص وضع، خاص لباس، خاص قسم کی داڑھی اور متعین حرکات کے ساتھ نماز پڑھنے والا نہ ہو"۔

خدارا! اب آپ ہی فیصلہ کیجئے داوری آپ ہی کے ہاتھ ہے کہ وہ کون ہے جو ذریعہ کو صرف ذریعہ سمجھتا ہے اور وہ کون ہیں جنہوں نے ذریعہ کو اصلِ مقصود قرار دے لیا ہے۔

شذرات کا دوسرا ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"کسی سمجھ دار انسان سے کوئی کام نتیجہ کے سمجھے بوجھے بغیر سرزد نہیں ہو سکتا وہی نتیجہ اس کام کی غرض وغایت ہوتی ہے، اخلاق، محض اخلاق کا تصور، غرض وغایت اور نتیجہ کے بغیر ممکن نہیں، اخلاق کا کمال اعمال میں نہیں بلکہ ان کی غرض وغایت کی بلندی اور ذاتی خواہشوں اور طلبِ معاوضہ سے انتہائی پاکی میں ہے انسان کے اعمال کا پست اور ذلیل جذباتِ، نفسانی ہوا اور ہوس سے پاک ہونا اخلاق کی بلندی اور طہارت کے لیے ضروری ہے انسان کا کام صرف اس قدر نہیں کہ کسی غریب آدمی کو چند پیسے دے دے بلکہ اس کے بعد یہ بھی ہے کہ یہ کام اس طرح کیا جائے کہ کرنے والے کا مقصود اپنی ناموری، نمائش، معاوضہ، فریب اور اس غریب کو ممنونِ احسان بنانا نہ ہو بلکہ صرف اخلاصِ قلب ہو ان قلبی جذبات اور دل کے رجحانات کی اصلاح وپاکی سوا اس کے ممکن نہیں کہ ایک دانائے رموز و عالم الاسرار ہستی کا یقین کیا جائے جو دلوں کے ایک ایک رگ کی جنبش اور ایک ایک ریشہ کی حرکت کو دیکھتا اور سنتا اور جانتا ہے اس لئے خدا پر

ایمان لائے بغیر حسنِ عمل اور حسنِ خلق کا تصور ممکن ہی نہیں کہ جوارح کے اعمال کی درستی سراسر قلب کے اعمال کی درستی پر موقوف ہے"

مولانا کا مقصود اس تحریر سے غالباً یہ ہے کہ اخلاق کی بلندی کا معیار صرف اخلاص ہے اور اخلاص حاصل ہونا ممکن نہیں جب تک خدا پر ایمان نہ رکھا جائے۔ یقیناً مجھے بھی لفظ بہ لفظ اس سے اتفاق ہے لیکن تھوڑے لفظی و معنوی اختلاف کے ساتھ اور وہ یہ کہ جس چیز کو وہ اخلاصِ قلب کہتے ہیں میں اسے "احساسِ فرض" کہتا ہوں اور یہ بھی صرف اس لئے کہ "نفسانی ہوا و ہوس" کا کوئی لگاؤ بھی باقی نہ رہے۔ اگر ایک شخص خدا پر ایمان رکھنے کے بعد اخلاصِ قلب سے کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کا اجر خدا سے چاہتا ہے اور اس طرح گویا وہ بندے سے نہیں تو اس کے خدا سے ضرور بیع و شریٰ کرنا چاہتا ہے اور یہ جذبہ کلیتاً ہوا و ہوس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر یہ تعلیم دی جائے کہ کسی کے ساتھ نیکی کرنا ہر انسان کا فرض ہے جو قدرت یا خدا کی طرف سے ہر انسان پر عائد کیا گیا ہے تو پھر کسی قسم کا شائبہ نفسانی خواہش یا غرضِ ذاتی کا پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ کسی پر احسان کرنا گویا خود ممنون ہونا ہو گا کہ اس طرح وہ ایک فرض سے سبک دوش ہو گیا۔

جب تک کہ اعمال کے ساتھ خدا کا ڈر یا اس کی خوشنودی و برہمی کا خیال شامل رہے گا انسان صحیح معنوں میں کبھی کوئی نیکی نہیں کر سکتا بلکہ اس کے تمام افعالِ حسنہ یا تو اس طمع کے زیرِ اثر ظہور پذیر ہوں گے جو حور و غلمان، یا کوثر و سلسبیل سے متعلق ہو سکتے ہیں یا اس ڈر سے جو فطرتاً آگ، اژدہا، سانپ بچھو سے انسان کو ہوتا ہے۔ خدا کو ماننا اور اس طرح ماننا گویا وہ ہندوستان کی کسی ریاست کا نواب ہے جس کے جاسوس ہر وقت، ہر جگہ لگے ہوئے ہیں اور جو ذرا ذرا سی بات میں دار پر کھنچوا سکتا ہے کم از کم میرے خیال میں کسی طرح نہیں آتا۔ میں خدا کو بے نیاز مطلق جانتا ہوں، جس کو نہ ہمارے افعالِ بد سے واسطہ ہے نہ اعمالِ حسنہ سے کوئی تعلق، کائنات کے اور تمام نظام کے ساتھ اس نے انسان کی تمدنی زندگی کا بھی ایک قانون بنا دیا ہے جس کو انسان نے اپنی ارتقائی دور کے مختلف منازل میں اچھی طرح سمجھ لیا ہے پھر اگر وہ اس پر کاربند ہو گا تو خود اسی کی ہیئتِ اجتماعی کو فائدہ ہو گا ورنہ تباہ و برباد ہو جائے گا خواہ بجائے پانچ کے چالیس وقت نماز کیوں نہ پڑھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

"خدا پر ایمان لائے بغیر حسنِ عمل کا تصور ہی ممکن نہیں"

میں اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں کیوں کہ دنیا میں بعض افراد ایسے مل سکتے ہیں جو باوجود انکارِ خدا کے اچھے خصائل رکھتے ہیں اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں، صرف اس خیال کے تحت کہ یہ ہر انسان کا فطری فرض ہے میں حیران ہوں کہ مولانا اس کا انکار کیسے کر سکتے ہیں جب کہ وہ خود بھی اس کے قائل ہوں گے کہ "نیکی خود آپ اپنا بدلہ ہے" اور اس نظریہ کے تحت خدا کے ماننے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو اصولی گفتگو ہوئی اب رہا وہ مسئلہ جس کے سلسلہ میں مولانا نے یہ اظہارِ خیال کیا ہے سو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ جو ایک نیکوکار برہمن کوناری بتاتے ہیں تو کیا وہ خدا کا قائل نہیں ہے کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک بت پرست (اصطلاحی معنوں میں) حقیقتاً ایک ایسی قوت کا قائل نہیں ہوتا جسے سوا خدا سمجھنے کے چارہ نہیں اس لئے میری رائے میں مولانا کو یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ "بغیر مسلمان ہوئے حسنِ خلق کا تصور ممکن نہیں" اور یہ ثابت کرنے کے بعد وہ بے شک نیکوکار برہمن کوناری اور بدکار مسلمان کوناجی کہہ سکتے تھے۔

اس کے بعد مولانا زیادہ کھل کر اصل مدعا کی طرف آئے ہیں اور فرماتے ہیں:

> "آج جب کہ مسلمانوں کو عملاً کام کرنا ہے صرف باتیں بنانا نہیں، کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس پر بحث نہیں کرتے کہ ایمان ہو یا حسنِ خلق، عملاً حاصل کرنا چاہیئے بلکہ اس پر بحث کرتے ہیں کہ نجاتِ اخروی کا ذریعہ محض ایمان ہے یا حسنِ عمل، صرف حسنِ عمل ہی سہی ہمارے داعی اس کا نمونہ بن کر دکھائیں اس کی اہمیت نمایاں کر کے بتائیں وہ کبھی اس کی دعوت نہیں دیتے کہ نماز پڑھنی کس قدر ضروری ہے، لے دے کے دعوت یہ ہے کہ نماز پانچ وقت ہے کہ تین وقت، تین ہی وقت سہی مگر ان تینوں وقتوں میں پڑھی بھی تو جائے یہ وہ لوگ ہیں جو ایجابی اسلام کے بجائے صرف سلبی اسلام کو مسلمانوں کی ہر ترقی کا ذریعہ جانتے ہیں۔ حالانکہ پانچ وقتوں والا غازی سلطان صلاح الدین، سلطان محمد فاتح اور سلیمانِ اعظم پانچ وقتوں کی نماز پڑھنے سے نا اپنی سلطنت کھو بیٹھے اور نا اس عہد کے ملاحدہ ترکِ صلوۃ و عدمِ ایمان کے باوجود ملک کا چھوٹا سا گوشہ حاصل کر سکے اگر ملک ہی حاصل کرنا ترقی ہے"۔

مولانا نے اس بیان میں چند در چند غلطیاں کی ہیں اول تو "وہ کچھ لوگ جو ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو نجاتِ اخروی سے کوئی بحث نہیں کرتے" اس میں سے اگر آپ لفظ اُخروی نکال دیں تو بے شک آپ کا یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے کیوں کہ اُخروی کا جو مفہوم آپ کے یہاں ہے اس سے وہ کوسوں دور ہیں اور اگر بطور معارضہ یا استفادۂ اُخروی نجات سے

گفتگو کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ آپ اس کے قائل ہیں اور آپ ہی کے مسلمہ اصول کو سامنے رکھ کر اصولاً بحث کرنا چاہئے“

دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ ان لوگوں کو صرف باتیں بنانے والا ظاہر کیا گیا ہے اور عملاً حسنِ خلق سے بے گانہ۔ اگر اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ دوسرے گھر کی تیز روشنی کو گل کرکے اپنے گھر کی ضعیف روشنی کو نمایاں کیا جائے تو میں حیران ہوں کہ مولانا نے کیسے کہہ دیا کہ ایسے لوگ حسنِ اخلاق سے معرّا ہوتے ہیں اور عمل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

اس وقت اظہارِ انکسار کی ضرورت نہیں مجھے صاف صاف دریافت کرنا چاہئے کہ مولانا مجھے کیوں حسنِ اخلاق سے معرّا جانتے ہیں اور کس روایت کی بنا پر مجھے بداخلاق کہہ سکتے ہیں در آں حالِ کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ”مجھ صرف باتیں بنانے والے“ کے اخلاق بدرجہا اب بہت سے مولویوں سے اچھے ہیں جو مولانا کے نزدیک حسنِ اخلاق کی تعلیم دینے والے ہیں اور باتیں نہیں بناتے۔

اب رہا یہ الزام کہ ایسے لوگ تین ہی وقت نماز پڑھنے کی دعوت لوگوں کو کیوں نہیں دیتے، سو اس کا جواب زیادہ دشوار نہیں جب کہ صدیوں سے سے پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور پڑھانے والوں کے اخلاق سامنے موجود ہیں ؏

تو برون در چہ کردی کہ درون کعبہ آئی

گفتگو تو اسی میں ہے کہ مولویوں نے لوگوں سے اس قدر نمازیں پڑھوائیں، اتنے روزے رکھوائے کہ وہ نماز و روزہ ہی کو اصل ایمان سمجھنے لگے اس لئے اب وقت کا اقتضاء کیا ہے، نماز کی اہمیت کا درس دینا یا اُس چیز کا جس کے حصول کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ نماز بھی تھی اور جو اب اپنی اہمیت ذریعہ ہونے کے بھی کھو چکی ہے؟

اگر سلطان صلاح الدین وغیرہ پانچ وقت نماز پڑھنے سے اپنی سلطنت نہیں کھو بیٹھے تھے تو اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ سلطنت ان کو پانچ وقت کی نماز ہی سے حاصل ہوئی تھی اور اگر یہ صحیح ہے تو کیوں نہ آج تمام مولوی پنج وقتہ نماز پڑھ کر کم از کم صوبہ برار ہی انگریزوں سے چھین کر حضور نظام کو دلوا دیں یا خود ہی لے لیں اور خیر صوبہ برار یا کوئی حصۂ ملک تو خیر بڑی چیز ہے، میں کہتا ہوں کہ بجائے پانچ وقت کے وہ چالیس وقت کی نماز ۴۰ ہزار برس تک ادا کرتے رہیں تو بھی وہ ایک انچ زمین حاصل نہیں کر سکتے۔

اب رہا دوسرا الزام کہ ملاحدہ، ترکِ صلوٰۃ و عدمِ ایمان کے باوجود کیوں نہیں ملک کا

کوئی چھوٹا سا گوشہ حاصل کر لیتے۔ سو یہ بالکل بے محل ہے کیوں کہ انہوں نے تو اس کا کبھی دعویٰ ہی نہیں کیا اور نہ وہ اس کے قائل ہیں کہ سلطنت یا ملک گیری نماز سے متعلق ہے اور اگر الزامی جواب دینا چاہیں تو کہہ بھی سکتے ہیں کہ آج دنیا میں حکم رانی کس قوم کا حصہ ہے، کیا وہ بڑی خدا ترس ہے، کیا وہ بڑی مسلمان ہے، کیا وہ ملحد بے دین نہیں؟ اور دور کیوں جایئے خود ترکی کو دیکھئے کہ اس کے احیاءِ ثانیہ کا کیا راز ہے اور کیا ترکوں پر الحاد و بے دینی کا الزام عائد نہیں کیا جاتا؟ نماز کے متعلق آپ گفتگو کا ایسا پہلو کیوں اختیار کرتے ہیں جو بالکل بے محل و غیر متعلق ہے۔ میں نے کب کہا کہ نماز بری چیز ہے؟ یقیناً وہ ایک بہتر طریقۂ اصلاحِ نفس کا ہے اور میں پابندِ صوم و صلوٰۃ کو اچھا سمجھتا ہوں بشرطِ آن کہ وہ آپ ہی کے نظریہ کے مطابق ایمان و عمل میں امتیاز پیدا کر سکے۔ نماز اگر نفسِ ایمان سمجھ کر ادا کی جائے گی تو یقیناً وہ اپنے حدود سے متجاوز ہو کر ناجائز چیز قرار دی جائے گی، لیکن اگر اس کو محض ایک ذریعۂ فلاح سمجھ کر اختیار کیا گیا اور جذبۂ رأفت و لطف اس کی وساطت سے اپنے اوپر طاری کیا گیا تو اس کے بہتر ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟

اخیر میں مولانا فرماتے ہیں کہ:

> ”اصل یہ ہے کہ آج کل یورپ کی نقالی ہر چیز میں ہے، مذہب و اصلاحِ مذہب میں بھی نقالی ہے۔ یورپ کے ریفارمیشن کی تاریخ پڑھ پڑھ کر ہر جدت پسند کو اسلام کا لوتھر بننے کا خیال ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ اسلام و مسیحیت میں اشتراک کیا ہے جس کے لئے اسلام کو لوتھر کی ضرورت پیش آئے؟ عیسائیوں نے عیسائیت ملنے کے پندرہ سو برس بعد عیسائیت کو چھوڑ کر سلطنت پائی لیکن مسلمانوں نے تو اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی اور جب اسلام چھوڑا، سلطنت بھی چھوٹی! کیا یہ فرق ہمارے نئے مصلحین کے سامنے ہے؟ غلط رسوم و رواج اور خارجی بدعات کا نام مذہب نہیں ہے جس کی تصویر آپ اپنے واہمہ سے کھینچ کر دکھائیں“

اس کے جواب میں ہم اسی عبارت کو دہرا کر خود مولانا سے سوال کریں گے کہ وہ اسلام کہاں گیا جس کے ساتھ ساتھ سلطنت آئی تھی؟ اگر سلطنت کا ساتھ آنا اسلام کا لازمی نتیجہ ہے تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جاتا ہے کہ ترقی ملک گیری کا نام نہیں ہے۔ اگر آج اسلام کہیں نہیں ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا علماء کا گروہ اس الزام سے بری ہو سکتا ہے؟ یا تو اس کا اعتراف کیجئے کہ اس وقت کوئی عالمِ دین کوئی ہادئ شریعت، کوئی مصلحِ مذہب و ملت موجود نہیں ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان اسباب کو تلاش کیجئے جنہوں

نے سلطنت کو اسلام سے جدا کر دیا وہ لوگ جنھیں آپ نئے مصلحین کے لقب سے یاد کرتے ہیں وہ بھی اس جستجو میں ہیں اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ یہ سارا ادبار انہی کا لایا ہوا ہے جو اپنے آپ کو علماء کرام اور ہادیانِ مذہب کہتے ہیں، اور آپ بھی اس جستجو میں ہیں لیکن آپ کی جستجو خود اپنے اندر سے شروع نہیں ہوتی اور اس لئے آپ کو اس ''لنکا ڈھانے والا'' کا پتہ نہیں چلتا۔

یہ آپ صرف زبان سے کہتے ہیں کہ ''غلط رسوم اور خارجی بدعات کا نام اسلام رکھ لیا گیا ہے'' لیکن ان رسوم و بدعات کے مٹانے کے لئے آپ کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے کیوں کہ آپ میں ایسا کرنے کی جرأت و جسارت نہیں ہے اور یہ جرأت و جسارت کیوں نہیں ہے؟ اس لئے کہ جب تک نصیحت دوسروں سے متعلق ہوتی ہے، بہت دلچسپ ہے لیکن جہاں اپنی ذات کا سوال آیا تو پھر وہی ''کشفِ ساق'' کا پیش آجاتا ہے جس کا تحمل آسان نہیں۔

بندہ نواز! اگر ہم کچھ نہیں کر سکتے تو ہمارے پاس اس کا ایک معقول جواب بھی ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں۔ لیکن آپ تو ایسا نہیں کہہ سکتے، اٹھئے اور ان رسوم و بدعات کو مٹایئے جن میں اسلام گم ہو گیا ہے اگر ہم سلبی اسلام والے ہیں تو آپ ایجابی اسلام والے کیوں سامنے نہیں آتے؟ اور ان اوہام و شکوک کو کیوں نہیں رفع کرتے جنھوں نے مسلمانوں کو نصف سے زیادہ تعداد میں ملحد، بے دین اور کافر بنا رکھا ہے؟

آپ لوگوں کو صرف کافر و ملحد کہہ کر ذہن کی اس رفتار کو نہیں روک سکتے جو زمانہ کے ساتھ ساتھ ایک سیلاب کی طرح بڑھتی آرہی ہے بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ خود اس سیلاب میں پڑ کر بہہ نکلنے والوں کو طوفان سے بچائیں لیکن اگر آپ اس سے معذور ہیں تو پھر یہ وعظ و نصیحت بھی ترک کیجئے کہ اس سے بجائے فائدے کے اور نقصان ہے اور کبھی کبھی اپنی جماعت کو بھی غیر معصوم جان کر اس کے اعمال و افعال کا جائزہ لے لیا کیجئے کہ خانقاہوں کے گوشوں اور مسجد کے محراب و منبر سے جو تقدس کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں کیا وہ واقعی صحیح اور درست ہیں؟

اتنی نا بڑھا پاکئ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قباء دیکھ

نگار کی الحاد پروری

غالبؔ، مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سنو صاحب! شعراء میں فردوسیؔ، فقراء میں حسنؔ بصری، اور عشاق میں مجنوںؔ۔ یہ تین آدمی، تین فن میں سرِ دفتر و پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسیؔ ہو جائے، فقیر کی انتہاء یہ ہے کہ حسنؔ بصری سے ٹکر کھائے اور عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو......"

اسی میں اگر یہ اضافہ کر دیا جائے کہ ایک صداقت پرست، ایک حق شناس اور ایک بے لاگ تنقید کرنے والے کی انتہاء یہ ہے کہ وہ کافر و مرتد بنا دیا جائے، ملحد و بے دین کے نام سے پکارا جائے تو میرے لئے اس سے زیادہ فخر کا موقعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج میں بھی اسی منزل میں ہوں جو کسی وقت فردوسیؔ، حسنؔ بصری اور مجنوںؔ کو اپنے فن میں نصیب ہوئی تھی، اور ناشکری ہوگی اگر اس سے زیادہ کوئی اور سعادت طلب کروں ؏

مابہ جامے کہ زجم ماند قناعت کردیم

بہ سکندر بدہید آن چہ زدارا ماند

آج سے کئی صدی قبل جب مذہب نام نفس و ضمیر کے سکون کا تھا جب قرآن کا مفہوم ایک مولوی کے مواعظ و ارشادات سے بلند تھا، جب دینِ حنیف میں جبر و اکراہ کا ذرا سا بھی شائبہ گوارانہ کیا جاتا تھا اور جب عہدِ بنی عباس میں اس آزادی کے ساتھ ہر شخص کو اسلام کا صحیح مفہوم جاننے کے لئے جرح و تنقید کی اجازت تھی، اس وقت کفر و ارتداد کا مفہوم صرف یہ تھا کہ اصولِ اخلاق کو پس پشت ڈال کر انسانیت کی ترقی کو روک دیا جائے۔ لیکن اب یہ معیار بہت بلند ہو گیا ہے، اس قدر بلند کہ میں تو خیر کیا چیز ہوں، اگر آج غزالیؔ اور رازیؔ زندہ ہوتے تو ان کا دامن بھی مولوی کے ہاتھ میں ہوتا۔ غضب خدا کا میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و جبروت اور اس کی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شائد ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار لکھ چکا کہ رسول کی صداقت و بلندئ فطرت پر جس طرح ایمان لایا ہوں شائد ہی کوئی ایمان لایا ہو، لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں، ملحد ہوں مرتد ہوں۔ پھر اگر اسی اقرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے تو ؏

نازم بہ کافری کہ بہ ایماں برابر ست

لاؤ ساری دنیا کی بے دینی مجھے دے دو، تمام عالم کا ارتداد میرے حوالے کر دو اور کائنات کے ہر ہر گوشے کا الحاد میرے قلب میں بھر دو کہ اس دولت کے ساتھ تو مجھے جہنم بھی اس فردوس سے زیادہ عزیز ہے جہاں ایک مولوی مسلمان کو کافر بنائے بغیر نہیں جا سکتا

ایں چہ شورے ست کہ در دور قمری بینم

اس دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے زیادہ منظم طور پر میری بے دینیوں کے خلاف تبلیغ و اشاعت کی گئی۔ یہاں تک کہ بعض انجمنوں نے جو مقامی "مولوی جماعت" کے زیرِ اثر تھیں میرے اور **نگار** کے الحاد کو ناقابل برداشت قرار دے کر نگای کی خریداری سے لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ صوبۂ بہار کے کوئی بزرگ مولوی عبدالحکیم یا حکیم الدین صاحب ہیں، انہوں نے اپنے صوبہ کے اخبار اتحاد میں ایک خطیبانہ مقالہ کے ذریعے سے ابناءِ وطن کو **نگار** کے فتنہ سے آگاہ کر کے اس کے مطالعہ کو حرام و ناجائز قرار دیا۔ یہاں تک کہ یہیں لکھنؤ میں بعض اکابرِ قوم و مذہب نے جلسہ کر کے یہ بھی ارادہ کیا کہ میری اس عارضی زندگی کو ہی ختم کر دیا جائے۔ بعض حضرات نے متعدد خطوط اس نوع کی تخویف و ترہیب کے بھی میرے پاس روانہ کئے۔ مقامی اخباروں میں روزنامہ ہمّت اور ہفتہ وار سچ نے اس کارِ ثواب میں زیادہ اہتمام و توجہ سے کام لیا۔ الغرض اس دوران میں وہ سب کچھ ہوا جو صحافت و پرپیگنڈا کی مدد سے ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے ان تمام حملوں کے جواب میں صرف سکوت سے کام لیا کیوں کہ ان تمام حضرات میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے **نگار** کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کی ہو اور مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے یہ سب ظن و قیاس اور عوام کی افواہ کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ بے معنی ہوا کرتی ہے یا پھر دیدۂ دانستہ کتمانِ حقیقت ہے اور میرے خلاف میری ہی تحریر کی غلط تعبیر جو ممکن ہے اصولِ جنگ کے لحاظ سے ان کی شرعِ متین میں جائز قرار دے دی گئی ہو یا جنھوں نے میرے خلاف تبلیغ و اشاعت ہی کے ذریعے سے فردوس میں ایک قصرِ تازہ کی تعمیر کا عزمِ راسخ کر لیا ہو۔

ہمارے مسٹر عبدالماجد صاحب دریابادی (زباں پہ بارِ خدایہ کس کا نام آیا) **نگار** کی الحاد پروری کا ذکر تو اکثر کرتے رہتے ہیں لیکن کیا کبھی کوئی ضعیف سی کوشش انہوں نے اس امر کی بھی کی ہے کہ وہ عصبیت سے علیحدہ ہو کر میرے خیالات پر غور فرماتے اور پھر فیصلہ کرتے کہ میرا حقیقی مقصود، اسلام کی خدمت ہے، یا اس کی تخریب و توہین۔ مجھے

حیرت ہے کہ باوجود ایں ہمہ دعوائے ادبیت و تفلسف وہ تعصب و برہمی کے زیرِ اثر یہ بھی نہ غور کر سکے کہ جن مضامین کے اقتباسات وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ انہی سے ان کی تردید ہوتی ہو۔ میر بکائی کے فکاہی مضمون میں خدا کے متعلق جو خیالاتِ پریشان ظاہر کئے گئے ہیں وہ ایک دیوانہ یا مخبوط الحواس کی طرف سے ہیں جیسا کہ مضمون کی ابتداء میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور مضمون سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کو جو چاہے کہے، جس اصول کے تحت چاہے مطالعہ کرے لیکن آخر کار وہ خدا ہے اور وہی کرتا ہے جو اسے منظور ہوتا ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ أنتم سکاریٰ کو علیحدہ کرکے صرف لا تقربوا الصلوۃ پیش کرنے والی ذہنیت جناب عبدالماجد صاحب دریابادی کو کس مدرسہ میں زانوئے ادب تہ کرنے سے حاصل ہوئی؟ اسی طرح انہوں نے دوزخ و جنت کے متعلق میرے خیالات سمجھنے میں غلطی سے کام لیا (گو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی قصد و ارادہ کے تحت تھی یا تعصب و ناانصافی کی بناء پر) میرا مقصود ان مضامین سے سے یہ تھا کہ جن غلط روایات کی بناء پر دوزخ و جنت کا مفہوم عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر مضحک اور اسلام کی شان کے منافی ہے۔ پھر جب تک جناب دریابادی یا انہی کی طرح کوئی اور حامئ دین یہ ثابت نہ کر دے کہ واقعی دوزخ و جنت کا تعلق مادی لذات سے ہے اس وقت تک میرے ان مضامین کو توہینِ مذہب یا مخالفتِ اسلام کی صورت میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہنا بھی سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتاب احادیث بحالتِ موجودہ ہر گز اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کلیۃً اعتماد کرکے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جا سکے۔ علی الخصوص مذہبِ اسلام جو دنیا کا تنہا فطری مذہب ظاہر کیا جاتا ہے، کیا جناب دریابادی کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ صحاحِ ستہ میں جتنی احادیث درج ہیں وہ واقعی وہی ہیں جو ان کے جامعین نے فراہم کی تھیں اور ان میں بعد کو تدلیس و تحریف یا حذف و اضافہ کچھ نہیں ہوا؟ یقیناً اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے میری مخالفت نہ امام بخاری سے ہے نہ ان کے مجموعۂ احادیث سے بلکہ صرف اس خیال سے کہ کیوں بغیر تنقید کے ہر قول کو رسول اللہ سے منسوب کرکے مذہب اور رسول کی توہین کی جائے اور کیوں ایک ایسے شخص کو جو بغیر سمجھے ہوئے احادیث کو احادیث سے ماننے کے لئے تیار نہیں، مذہب کا مخالف قرار دیا جائے۔ بخاری کے درس سے ترکِ مذہب کا درس اسی لحاظ سے کہا گیا کہ بحالتِ موجودہ اگر شروع سے لے کر اخیر تک تمام

احادیث کو صحیح تسلیم کرنے پر انسان کو مجبور کیا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب کا خیال ترک کر دے گا اور اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر وہ جس مذہب کا پیرو ہوگا اسے اسلام تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور جو نام چاہئے اس کا قرار دے لیجئے۔

اسی طرح جناب عبدالماجد صاحب نے ۲۵ ستمبر کے سچ میں میرے خلاف اور جو الزامات قائم کئے ہیں وہ سب تحریفِ مفہوم کا نتیجہ ہیں اور میرے مقصود سے بالکل علیحدہ۔ میں نے جن اکابرِ ملت کی طہارت و عصمت کی داستانوں کا ذکر کیا ان سے مراد صرف آج کل کے بعض ایسے نام نہاد علماء کرام ہیں جو صداقت کو محو کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور جن کا باطن ان کے ظاہر سے بالکل مختلف ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سلسلہ میں انہوں نے ابو حنیفہ وغیرہ کو کیوں شامل کر لیا۔ کیا عبارت کے سیاق و سباق سے وہ یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ میری مراد اکابرِ ملت سے کیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اگست ۳۰ء کے ملاحظات میں اپنا ذکر دیکھ کر وہ بے تاب ہوگئے اور فرطِ غضب میں محض انتقام لینے کے لئے انہوں نے میرے فقرہ کا محل بدل کر خواہ مخواہ ایسے معنی پیدا کئے جو لوگوں کو مشتعل کر دینے والے ہوں۔

پھر یہ سب کچھ جانے دیجئے، میں مانتا ہوں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں یا جو مضامین **نگار** میں شائع ہوتے ہیں وہ یکسر الحاد و شرک ہیں لیکن خدارا کبھی ان کا جواب دینے کی بھی توسعی فرمایئے۔ بفرضِ محال یہ بھی مان لیجئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں تو کیا آپ کا فرض بحیثیت ایک مسلم ہونے کے یہ نہیں ہے کہ میرے شبہات کو دور کریں، مجھے راہِ راست پر لائیں، یا یہ فرض اس طرح پورا ہو جاتا ہے کہ مجھے ملحد و مرتد بنا کر خدا کے حوالے کر دیا جائے اور **نگار** کے مطالعہ کو حرام قرار دے کر میری تاریک ذہنیت میں اور اضافہ کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے، یہ کس نوع کی خدمتِ اسلام ہے، یہ کس انداز کی تبلیغ ہے؟

تمام رسائل میں صرف "معارف" ہی ایک رسالہ ایسا ہے جو کبھی کبھی جواب دینے کی زحمت گوارا کرتا ہے اور محض "کفر گری" کو ذریعۂ حرب و دفاع قرار نہیں دیتا لیکن افسوس ہے کہ **نگار** میں جس نقطۂ نظر سے گفتگو ہوتی ہے اس سے وہاں بھی اعتناء نہیں کیا جاتا اور اس لئے میری تشنہ کامیاں بدستور باقی رہتی ہیں۔

میرا دعویٰ ہے کہ تمام مذاہبِ عالم میں اسلام ہی صرف ایک مذہب ایسا ہے جو وقت و زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے اور یہی ایک تنہا مسلک ہے جس نے اخوتِ عامہ اور انسانیت

کبریٰ کو منزلِ حقیقی قرار دے کر ساری دنیا کو اشتراکِ عمل کی دعوت دی اور اسی اعتقاد و یقین کے ساتھ میں تمام اصول و شعائر پہ نگاہ ڈالتا ہوں۔ یوں تو ایک مولوی بھی بظاہر یہی کہتا ہے کیوں کہ جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرے مذہبِ اسلام کا امتیاز اور اس کی ہمہ گیری کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جس وقت اصول و عقائد، شعائر و عمل کا سوال آتا ہے تو پھر اس کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے جو یقیناً کسی پیروِ اسلام کا نہیں ہو سکتا۔

اس لئے اس وقت جو برہمی علماءِ کرام کی میرے خلاف ہے اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ میں اسلام کا مخالف ہوں، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کیوں ان کے سامنے سر بہ سجود نہیں ہوتا اور میں کیوں اسلام کو ان کے عقول کا پابند نہیں سمجھتا۔ جن حضرات نے **نگار** کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اسلام نام صرف یزداں پرستی کا ہے تو اس کے متعدد شواہد اس میں نظر آسکتے ہیں، لیکن اگر اسلام کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو میں پہلے کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں اور فاش و برملا کہتا ہوں کہ میں ہر گز مسلمان نہیں ہوں اور نہ دنیا میں کوئی انسان مسلمان ہو سکتا ہے۔

آج زمانہ جس دورِ اضطراب سے گزر رہا ہے اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ پھر کوئی بت شکن نبی پیدا ہو، بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی مذہب شکن رسول آئے اور دنیا سے مذہبیت کی اس کی گراں باری کو دور کر دے جس نے امن و سکون غارت کر رکھا ہے پھر اگر آپ ایسے نازک وقت میں اسلام کی کوئی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں اور اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا نصب العین دنیا میں امن و سکون قائم کرنا ہے تو اس کی صورت وہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کرتے ہیں، بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ ع

یک دو نفس نالہ شو از دلِ دیوانہ بر آ

اسلام کے چہرے کو ان تمام داغوں سے پاک کیجئے جنھوں نے اس کے اصل خط و خال کو پوشیدہ کر رکھا ہے اور وہ حقیقی سادگی، وہ بلند نظری، وہ فراخ دلی اور علوّے نگاہ پھر پیدا کیجئے جو اسلام کے عناصرِ ترکیبی تھے۔ اس وقت تک آپ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے صرف "بہ آواز دولاب مستی کنند" کو اپنا ایمان قرار دیئے ہوئے ہیں اور کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ان حرکات مذبوحی پر جرح و تنقید کرے۔ لیکن اگر آپ نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ آپ اپنے اصول کی تبلیغ بھی چاہتے ہیں تو پھر معاف کیجئے اس وقت آپ کا مجھے کافر و ملحد کہہ دینا، **نگار** کے خلاف لغو وغلط پروپیگنڈا قائم کر کے عوام میں ہیجان پیدا کر دینا، مفید طلب نہیں ہو سکتا کیوں کہ شائد آپ کو علم نہیں کہ اس وقت دماغِ انسانی جس اضطراب میں مبتلا

ہے اس کی تشفی آپ کے پروپیگنڈا سے نہیں بلکہ **نگار** ہی کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔ پھر ممکن ہے کہ آج کاماحول اس کی قدر نہ کرے لیکن ایک وقت آئے گا جب نگار کے صفحات ہی میں آپ کو پناہ لینا پڑے گی اور آپ کے پاس کوئی ذریعۂ دفاع نہ ہو گا مگر وہ جسے **نگار** اور صاحبِ **نگار** قائم کر چکا ہے۔و ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کلام اللہ کے بعد جس مذہبی لٹریچر (یعنی مجموعۂ احادیث) کو آپ اپنا مقصود سمجھے ہوئے ہیں اس نے اسلام کی جڑوں کو کس قدر متزلزل کر دیا ہے۔ عیسائیوں کے اعتراضات، آریوں کے حملے اور تمام غیر مسلم اقوام کی نکتہ چینیاں کلامِ مجید پر اتنی منحصر نہیں ہیں جتنی احادیث پر، اور حقیقت یہ ہے کہ آج تک ڈاکٹر ٹسڈل کی مشہور کتاب "ینابیع الاسلام" کا جواب ہمارے ہاں کے کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا، کیوں کہ اس کے تمام اعتراضات کا بڑا ماخذ مجموعۂ احادیث ہے اور آپ اس پر مجبور ہیں کہ جو واقعہ یالفظ رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا ہے اسے غلط نہ قرار دیں خواہ وہ کتنا ہی لغو و مہمل کیوں نہ ہو۔ یعنی یہ تو آپ گوارا کر سکتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد کھوکھلی ہو جائے لیکن مجموعۂ احادیث پر آپ سے کبھی تنقید نہ ہو گی اور اگر دوسرا اس کی جرأت کرے گا تو اسے ملحد، بے دین، فتنہ پرداز اور خدا جانے کیا کیا کہیں گے۔ در آں حالِ کہ ان تمام الفاظ کا بہترین مخاطب تو واضعین احادیث ہی کی ذاتِ بابرکات ہو سکتی ہے۔

بہر حال میں ان تمام معذرت نگاریوں کے بعد بھی ہر وقت اپنے آپ کو ایک مبتدی طالبِ علم سے زیادہ نہیں جانتا اور اس کے لئے تیار ہوں کہ ہندوستان کا کوئی ایک مولوی یا مولویوں کی کوئی بڑی سے بڑی جماعت مجھے سمجھا دے اگر میں غلطی پر ہوں لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں جو آپ لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ مذہبیات کے سلسلہ میں اس مقصود سے ہٹ جاؤں جس کا نام میں نے صرف معرفتِ انسانی رکھا ہے اور خوامخواہ وہ الجھنیں عوام کے سامنے لے آؤں جو مجموعۂ احادیث اور علماء کرام کی تنگ نظری سے پیدا ہو گئی ہے۔

کورانہ تقلید

صنم کہ بر دل و دینِ خود اعتمادم نیست
بہ نیم غمـــزہ ایں رارہائے وہم آں را
(غالبؔ)

انسان کی زندگی میں بعض ایسی ساعتیں بھی آتی ہیں جب وہ محوِ خواب ہوتا ہے لیکن انسانیت بیدار ہوتی رہتی ہے اس کے قواء بظاہر بے کار نظر آتے ہیں لیکن روح اپنا کام کرتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے جوارح ظاہری درد و تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن قلب و دماغ آہستہ آہستہ "سکونِ جاں" کی منزل سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ انسانیت پوری طرح آنکھ کھول کر مسکرانے لگتی ہے، روح ایک فاتحانہ مسرت کے ساتھ اچھل پڑتی ہے، قلب و دماغ نشۂ کامیابی و نشاط سے سرشار ہو جاتے ہیں اور آخرکار انسان بھی چونک پڑتا ہے۔ اس کے اعضاء بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے جسے "آشتی جسم و روح" سے تعبیر کرنا چاہئے، اسی کا دوسرا نام دنیائے عمل ہے اسی کو "عالم تگ و دو" کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے شاعرانہ زبان میں "شک زمیانِ وقت و یقیں جلوہ کرد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر تا ایں دم کرۂ ارض کی زندگی پر کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی دن، کوئی ساعت، بلکہ میں تو کہوں گا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جس میں قدرت کے اس نظامِ فطرت کے اصول اور خدا کی اس نہ تبدیل ہونے والی سنت پر کشود کار کا انحصار نہ رہا ہو، جواہرِ فرد اور قوت کا باہمی تعلق مادہ کی مختلف صورتیں، ایتھر بلکہ ماوراء ایتھر عناصرِ آفرینش کا نواۃ اور برق پاروں کی صورت اختیار کرنا، بطخاتِ سحابیہ کا رفتہ رفتہ منجمد ہو کر مختلف کرّوں، سیاروں، چھوٹے چھوٹے ستاروں، چاندوں اور شہابِ ثاقب میں تبدیل ہو جانا، یہ کیا ہے؟ کیا سب اسی بیداری کا نتیجہ نہیں؟ کیا مادہ کا تفاعل اس کی بیداری

نہیں؟ کیا برق پاروں کی گردش ان کا انبساطِ عمل نہیں؟ کیا آفتاب کے طلوع و غروب، چاند کے ایاب و ذہاب میں اس ابتسامِ خداوندی کی جھلک موجود نہیں جس کے پَرتو سے تمام ملکوتی قوتیں دفعتہً جگمگا اٹھتی ہیں۔

ابراہیم کی بت شکنی کیا اس بیداری کا نتیجہ نہ تھی۔ موسیٰ کا فرعون کی قوتِ قہرمانی کے مقابل میں آ جانا کیا روح و جسم کے اتحاد کا نتیجہ نہ تھا۔ عیسیٰ کا صلیب پر چڑھ جانا کیا اس احساس کے علاوہ کچھ اور تھا۔ مہاتما بودھ کا شاہانہ جاہ و جلال کی زنجیروں کو توڑ پھینک دینا کسی اور قوت کا کرشمہ تھا۔ رام چندر جی کی صحرا نوردیاں کیا کسی جذبۂ غیر روحانی سے متعلق تھیں؟ کرشن جی کی معرکہ آرائیاں کیا کوئی اور منظر پیش کرنے والی تھیں؟ کنفیوشس کی ذات کیا کسی غیر صادق کیفیت کا مظہر تھی؟ زردشت کی زندگی میں کیا کسی اور شعلہ کی جھلک پائی جاتی تھی؟ سرزمینِ عرب سے پیدا ہونے والے سب سے بڑے انسان کا کوہِ فاران پر چڑھ کر کفارِ عرب کو پیامِ خداوندی پہنچانا کیا کسی اور احساس کا نتیجہ تھا؟ حسین کی عظیم الشان قربانی کیا کوئی اور رودادِ عمل تھی؟ منصور کے ساتھ دار و رسن کا معاملہ بھی اسی معمہ کی گرہ کشائی تھی اور منصور کے حلقوم پر تیغ کی روانی بھی اسی کا اعادہ تھا۔

لیکن جس طرح قدرت عرصہ تک محوِ خواب رکھنے کے بعد نوعِ انسانی کو بیدار کرنے کے لئے اس کے کسی فرد کا انتخاب کر لیتی ہے اسی طرح وہ یہ بھی کرتی ہے کہ وہ قرنوں تک بیدار رکھنے کے بعد دوبارہ آہستہ آہستہ نیند طاری کر دیتی ہے۔ پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کے لئے یہ نیند موت کی نیند میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے فنا اور کبھی یہ نیند پھر ایسی بیداری اختیار کر لیتی ہے جیسے مردہ میں از سرِ نو جان پڑ جائے۔

کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اس کا اختتام ہو جاتا ہے، یہ بالکل صحیح ہے کیوں کہ جو چیز جہل کے دور کرنے کے لئے آئے گی، اس کی ابتداء عہد تاریک ہی سے ہو گی اور یقیناً جب علم کی ترقیاں انسانی دماغ کو منور کر چکیں گی تو دورِ اصلاح ختم ہو جائے گا۔ اگر اس کا مقصود کسی انسان کو محدود منزل تک پہنچا کر ٹھہر جانا ہے لیکن اگر کوئی خیال دنیا میں ایسا ہے یا ہو سکتا ہے جس کے دائرۂ عمل سے تعینِ منزل کا سوال خارج ہے یا جس نے لانہایت کو اپنی تگ و دو کی جولان گاہ قرار دیا ہے یا جس کا مدعا عقولِ انسانی کو ہر وقت اور ہمیشہ منور کرتے رہنا ہے یعنی اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو اخلاق ہی کی ترقی کو منتہائے نظر قرار دیتی ہے جس کی دعوت عالمِ انسانی

کے ہر ہر فرد کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر سکتی ہے اور جو تمام ظاہر پرستوں سے بلند ہو کر انقیادِ فطرت کا مفہوم صرف روح کے جھک جانے کو قرار دیتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ایسی تعلیم کو ختم ہو جانا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک تعلیمِ اخلاق کا سوال ہے اس وقت تک جتنی اصلاحیں دنیا میں بروئے کار آئیں ان سب کا مقصود ایک ہی تھا، سب نے یہی تعلیم دی کہ اچھے کام اچھے اور برے برے ہیں۔ لیکن اس تعلیم کے عملی پہلو کے لحاظ سے جو اصول و قواعد انہوں نے مقرر کئے وہ وقت اور زمانہ کے لحاظ سے ضرور مختلف تھے اور انہیں مختلف ہونا چاہیۓ تھا کیوں کہ ان کا عقولِ انسانی کے مطابق ہونا ضروری تھا اور عقولِ انسانی کی ترقی ہمیشہ سے جاری ہے اور رہے گی لیکن جس وقت ہم تقابلاً ان کا مطالعہ کریں گے ان کے مقاصدِ تعلیم اور ان کے اصولِ اصلاح سے اور ہم ان کے اس پیغام پر غور کریں گے جو انہوں نے نوعِ انسانی تک پہنچایا تو ہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان تمام تعلیمات میں صرف ایک ہی تعلیم ایسی ہے جس کے نصب العین کی بلندی تمام کائنات کا احاطہ کر لینے والی ہے اور جس نے اگر ایک طرف اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ تعلیم دی کہ نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی مرکز پر جمع ہو کر ابناءِ جنس کی خدمت کرنا چاہیۓ تو دوسری طرف علوم کی ترقی کے لحاظ سے اس نے تمام مظاہرِ فطرت، انسان کے تصرف میں دے کر گویا یہ بتا دیا کہ انسان حقیقتاً نام ہے اس قوتِ عمل کا جو لانہایت تک برابر اسبابِ ترقی کا ساتھ دیتی چلی جائے اور زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسلک کا حقیقی پیام یہی ہے جو بیان کیا گیا ہے تو دنیا کے افراد اس کے ماننے سے کیوں احتراز کرتے ہیں اور اس کے متبعین کے زوال و انحطاط کا کیا سبب ہو سکتا ہے غیر جماعتیں اس سبب کو اس کی تعلیمات میں ڈھونڈتی ہیں اور میں اس کو تاریخ میں پاتا ہوں، یعنی وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شائد اس کے اصولِ تعلیم ہی ایسے ناقص و نامکمل ہیں کہ اس کے متبعین زمانہ کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے پستی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اور میرا دعویٰ یہ ہے کہ اس انحطاط کا سبب ہی یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا جس کے بہت سے اسباب تاریخ میں مل سکتے ہیں۔ جس وقت آپ نوعِ انسانی کی ذہنی یا اخلاقی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم

ہو گا کہ جب تک کسی قوم یا جماعت کا کوئی مصلح ان کے اندر موجود رہتا ہے ایک عام انقیاد و اطاعت اور اقدامِ عمل کے سوا کوئی صورت اختلاف کی پیدا نہیں ہوتی لیکن جس وقت وہ اٹھ جاتا ہے تو رفتہ رفتہ قواءِ عمل کی حرکت مضمحل ہونے لگتی ہے اور اسی کے ساتھ اختلافِ آراء پیدا ہونے لگتا ہے جو اجتماعی روح کے لئے سمّ قاتل سے کم نہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخوت و ہم دردی، عدل و مساوات کا جذبہ ضعیف ہو کر ملوکیت و استبداد کی بنیاد پڑنے لگتی ہے اور انسانی برتری کا معیار، اخلاق نہیں بلکہ جاہ و ثروت، دنیاوی نمود و نمائش قرار پا جاتا ہے اور آخر کار ہر ہر فرد خود غرضی، نفسانیت اور آسائشِ جسم و جان کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھنے لگتا ہے یعنی ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب روئے زمین پر ہر سانس لینے والے انسان کے سامنے تعلیم و اخلاق و اصلاح پیش کی جاتی ہے اور ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کے بعد شمعِ یقین اپنے دل میں روشن کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے اور پھر دوسرا وقت وہ آتا ہے جب خود اپنے افراد کو بھی اس کے اندر پناہ لینے کی جگہ نہیں ملتی اور اپنی کم زوریوں، اپنی نااہلیوں کا اندیشہ اس قدر غالب آجاتا ہے کہ ان کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ یہی وہ منزل ہے جس کی طرف غالبؔ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ع

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دُکّاں رفتم

یہی سبب ہے کہ آج ہماری قومی و اجتماعی حیات، ہماری مذہبی و اخلاقی زندگی، ہمارا اقتصادی و معاشرتی نظام، الغرض ہماری ہر ہر چیز خواہ کسی شعبۂ حیات سے متعلق ہو کسی نظامِ زندگی سے وابستہ ہو، بالکل ویسی ہی ہے جیسے اندھوں کی وہ نزاع جب ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے مختلف اعضاء کو ٹٹولنے کے بعد اس کی ماہیت کا اندازہ لگایا اور ہر ایک نے اپنی جگہ اپنے آپ کو سچا باور کر کے دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کیا، در آں حالِ کہ ہاتھی کی حقیقت کو ان کے اعتقاد و یقین سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔

آج جس چیز کو ہم یقین کی صورت سے پیش کر رہے ہیں وہ محض وہم و گمان ہے، آج جن باتوں کو ہم حقائق و مسلمات کہہ کر بیان کر رہے ہیں وہ صرف مزخرفات و ترہات ہیں، دنیا نئی ہے اور اس کے اصول نئے، زندگی نئی ہے اور اس کے امیال و عواطف نئے، پہلے سانس لینے کا طور اور تھا اور اب جینے کی راہیں اور ہیں۔ اب سے ایک صدی قبل جو انسان

پیدا ہوتا تھا اب نہیں پیدا ہوتا اور پہلے عقلِ انسانی کے جو دروازے مقفل نظر آتے تھے اب بالکل کھلے ہوئے ہیں، ذہن و دماغ جن زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے وہ اب ٹوٹ رہی ہیں، فراستِ انسانی آزاد ہے اور اب اسی شخص کو یہاں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے جو آزادی کے ساتھ سوچ سکتا ہے جو آزادی سے بول سکتا ہے جس نے آزادی ہی کے لئے مرنا اور جینا اپنا شعار قائم کر لیا ہے اور جو دنیا کی آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے۔

پھر کیا انسان کی یہ مسرت اس لئے ہے کہ وہ مذہب و اخلاق کی بندشوں سے چھوٹ کر بہیمانہ اخلاق اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو گیا ہے؟ کیا یہ جذبۂ سرور اس بناء پر ہے کہ خون خواری و درندگی سے باز رکھنے کے لئے ناخن و چنگال کو قطع کرنے والی قوت کوئی باقی نہیں رہی؟ ----- نہیں ------ یہ مسرت صرف اس لئے ہے کہ آج بالکل پہلی مرتبہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھ رہا ہے اور حقیت یہ ہے کہ جس نے آزادی کی پوجا کی اس نے خدا کی پرستش کی کیوں کہ قدرت کا یہی وہ منظر ہے جو انسان کو انسانِ اعلٰی یا خدا کا نائب و خلیفہ بنا دینے والا ہے۔

○○○

اے خدا!

اے بہ خلاو ملا خوئے تو ہنگامہ زا
باہمہ در گفتگو، بے ہمادر ماجرا

اے خدا! اس وقت بھی جب کہ قرونِ مظلمہ کی دنیا تجھے صرف غصہ کی آگ برسانے والا دیوتا سمجھ رہی تھی، مجھے تیرے دونوں ہاتھ لطف و رأفت کے پھولوں اور عطوفت کے ہاروں سے لدے ہوئے نظر آتے تھے۔

اول دن سے میں ڈرایا جارہا تھا کہ میں نے ایسا کیا تو تُو خفا ہو جائے گا، ایسا نہ کیا تو تُو برہم ہو کر مجھے آگ میں ڈال دے گا، لیکن میں نے تجھے قلب کی گہرائیوں، اپنی روح کے اعماق میں ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا۔

ٹھیک اس وقت کہ لوگ تیرے غصے کے اندیشہ سے کانپتے ہوتے تھے، تیری محبت و شفقت کے حضور میں سکون کے ساتھ تیری تعریف کے گن گایا کرتا تھا، وہ روتے تھے، میں ہنستا تھا۔ وہ تیرے سامنے جھکتے تھے تجھ سے ڈر کر، اور میں تیرے حضور میں سربسجود ہوتا تھا، تیری محبت سے بے تاب ہو کر ؎

دلے دارم خراب از التفاتِ چشم بیمارت
ہمہ از جور می ترسند و من از لطفِ بسیارت

ایک زمانہ گزر گیا کہ اس کارگاہِ عالم میں ان کا خوف اور میری محبت دونوں اسی طرح متوازی چلتے رہے، نہ ان میں یہ جرأت کہ میری محبت کی آنکھوں سے تیرے متبسّم و درخشاں چہرے کا نظارہ کرتے۔ نہ مجھ میں اس کا ہوش کہ ان کے آئینۂ خوف میں تیری پیشانی کی شکنوں کو دیکھتا۔ دن گزرتے گئے، آفتاب کے طلوع و غروب کے نہ جانے کتنے مناظر میرے دل میں حسنِ مجرّد کے نقوش قائم کرتے رہے۔ چاند کے عروج و زوال کی مختلف منزلوں میں تو ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے تجھے کِس کِس آن میں دیکھا۔ بہار و خزاں کی متضاد کیفیات میں، دریاؤں کی روانی میں، پہاڑوں کے سکوت میں، آب شاروں کے شور میں جنگل کے سناٹے میں، قصر و دولت کے مخملیں فرش پر، جھونپڑوں کی بوسیدہ چٹائیوں پر،

خواجگانِ کبار کی چینِ ابرو میں ، کاسِانِ ضعیف کی عرق آلود پیشانی میں، امیروں کے زرکار لبادوں میں، کسانوں کے تار تار کُرتوں میں، الغرض اے اعداد و شمار سے باہر! اے زمان و مکان کی قید سے آزاد! میں نے ہر جگہ تجھی کو کار فرما دیکھا اور جہاں دیکھا
شفقت و رأفت کے لاکھوں پھول برساتا ہوا

میں حیران تھا کہ دنیا والے تجھ سے ڈرتے کیوں ہیں؟ محبت کیوں نہیں کرتے، تیری ہیبت کیوں ان کے دلوں میں طاری ہے، تیری رحمت سے الفت کرنے پر کیوں مجبور نہیں؟ اس حال پر بھی ایک زمانہ گزر گیا اور میں خاموش پروانہ وار، تیری شمعِ حسن کا طواف کرتا رہا۔ ایک دن ناگہاں تجھ سے ڈرنے والوں میں سے ایک ڈرنے والا میرے پاس آیا اور بولا کہ "چل ہمارے معبد میں ہمارے خدا کی جستجو کر" میں بولا "تمہارا معبد! تمہارا خدا! کیا وہی معبد جسے آسمان کا صاعقہ، زمین کا زلزلہ مسمار کر دیتا ہے، کیا وہی خدا جس کے تصور کی ابتدا خوف و ہراس سے ہوتی ہے، مجھے نہ یہ چاہئے نہ وہ۔ میرا معبد میرے دل کے اندر ہے جسے کوئی چیز تباہ نہیں کر سکتی، میرا خدا میری روح کے اندر محبت کا زرّین نقاب ڈالے ہوئے جگمگا رہا ہے"۔

پھر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور ایک بے آب و گیاہ قطعۂ زمین سے رونما ہونے والی ہستی نے مجھ سے کہا کہ "چل ہماری پرستش گاہ میں خدا کی پرستش کر" میں نے پوچھا وہ پرستش گاہ کیسی ہے اور وہ خدا کیسا ہے؟ جواب ملا "وہ معبد کسی مکان میں مقید نہیں، بلکہ انسان کے ہر سجدہ کے ساتھ از خود پیدا ہوتا ہے اور وہ خدا یکسر محبت و شفقت ہے جو میرے ذریعہ سے تمام دنیا کے بسنے والوں کو اپنی رحمت کا پیام دینا چاہتا ہے"۔

میں فرطِ مسرت سے اچھل پڑا۔ لاکھوں برس کے انتظار کے بعد وہ آواز کان میں آئی جس کے لئے روح بے تاب اور دل دیوانہ تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا، اس کے سامنے اپنا دل ڈال دیا، اس کے دامن سے اپنا دامن باندھ دیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور میری ہستی اس کی ہستی کا ایک جزو ہو کر سکون کے شیریں خواب میں محو ہو گئی۔ ہر بات کے کہنے کا ایک محل ہوتا ہے، ایک مخصوص ہستی ہی اس کو کہہ سکتی ہے اور مخصوص زبان میں۔ دنیائے اثر و تاثر میں کامیابی کا انحصار انہی تین چیزوں پر ہے اور اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی کمی ہوئی تو سمجھ لو کہ ناکامی یقینی ہے۔ مے خانہ میں ایک رند کی طرح سے صلاح و تقویٰ کی گفتگو ویسی ہی بے معنیٰ ہے جیسی معبد میں ایک زاہدِ مرتاض کی جانب سے دعوتِ جام و سبو، نہ اس طرح وہاں حلقۂ تسبیح و تہلیل قائم ہو سکتا

ہے اور نہ یہاں بزمِ نشاط برپا۔ بالکل یہی حال روحِ انسانی کے ان رازوں کا ہے جو وقتاً فوقتاً زبان پر بے اختیارانہ آجاتے ہیں لیکن ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو صرف محرابِ مسجد ہی میں کہے جاسکتے ہیں اور بعض وہ جو

بردار تواں گفت بہ منبر نہ تواں گفت

اس لئے اگر کوئی شخص، محراب و منبر سے جدا رہنا چاہتا ہے تو وہاں کی ہر بات باہر کیوں کہے؟ اور جو دار پر چڑھائے جانے سے ڈرتا ہے وہ اس کے راز کو کیوں زبان پر لائے؟

دنیا اس دورِ آزادی میں مذہبی پابندیوں، اخلاقی بندشوں سے علیحدہ ہو کر محض اپنے ذہن و دماغ کی پرستش کرنا چاہتی ہے، صرف اپنے سمجھے ہوئے اصولِ اخلاق کی پابندی پسند کرتی ہے لیکن جس طرح عالم نظامِ اجتماعی اس انفرادی سرکشی کو برداشت نہیں کرسکتا اسی طرح یہ "ذہنی انفرادیت" بھی اسی آسانی سے انقیاد و اطاعت قبول نہیں کرسکتی۔

یہ ہے وہ عظیم الشان جنگ جو اس وقت انسانوں کے قلوب کو غیر مطمئن بنائے ہوئے ہے، جس نے ذہنی توازن کے سکون کو تباہ و برباد کر رکھا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ استردادِ "حیوانیت" کی صورت میں ظاہر ہوگا یا قیامِ "انسانیت کبریٰ" کی شکل میں۔

قانونِ انسانی کا اقتدار و اثر انسان کے صرف ظاہری اعضاء تک محدود ہوتا ہے لیکن خدائی قانون دلوں پر حکومت کرتا ہے اس لئے یہ اضطراب کسی ملکی آئین سے دور نہیں ہو سکتا اس کا علاج اگر کوئی ہے تو وہی ضابطۂ خداوندی جو خوف و جبر سے نہیں بلکہ محبت و رأفت کے ساتھ سب کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہے اور انفرادی اغراض کو دل سے نکال کر اجتماعی فلاح کی بنیاد پر روحِ انسانی کو رواداری کے درد و ایثار کے جذبہ سے معمور کردیتا ہے۔ پھر آج ہے کوئی مذہب ایسا جو دنیا کے اس دماغی، روحانی اور اخلاقی ہیجان پر قابو حاصل کرسکے؟ ------کوئی نہیں----- آپ کو معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا؟ اخلاقی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی، مذہبی بندشیں یکسر فنا ہوجائیں گی، درندگی و خون خواری کا نام تہذیبِ انسانی قرار پائے گا۔ ہر فرد کا ہاتھ دوسرے فرد کے خون سے رنگین نظر آئے گا اور آخر کار جب انسان تھک کر خستہ و درماندہ ہو کر ہانپنے لگے گا، ایک جگہ گر پڑے گا تو اُفق سے ایک روشن ستارہ طلوع کرتا ہوا اُسے نظر آئے گا جس کی روشنی سے راحت و سکون محسوس ہوگا جس کی تیز کرنیں اس کے دکھے ہوئے اعضاء اور زخمی جسم پر مومیائی کا سا کام کریں گی اور افرادِ نوعِ انسانی پھر ایک بار اسی کے درخشاں فضا میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوں گے۔ اور یہی ہے وہ حقیقت، جس کو غالبؔ نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ "ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے

ایماں ہو گئیں" پھر یہ بات نہ محراب و منبر کی ہے کہ مجھ سا رند معصیت کوش اسے نہ کہہ سکے، نہ حدیث دار ورسن ہے کہ میرا ضعیف قلب اس کے اظہار سے خائف ہو۔ یہ ایک ایسے واقعہ کی پیشین گوئی ہے جس کو میری نگاہیں ابھی سے دیکھ رہی ہیں اور ہر چند اس وقت میں نہ ہوں گا لیکن جو ہو گا وہ دیکھ لے گا کہ آخر کار نوعِ انسانی اسی ایک مرکز پر جمع ہو کر رہی جسے آج کل کی اصطلاح میں نہیں بلکہ مستقبل کی اصطلاح میں سچے مذہب کے نام سے پکاریں گے، کیوں کہ وہ عبارت ہو گا محض انسانیت سے جس کی سب سے پہلے اسلام نے دعوت دی اور آخر میں بھی وہی اس کو انجام تک پہنچانے والا ثابت ہو گا۔

دنیا میں کوئی چیز بذات خود نہ بری ہے نہ اچھی ہے۔ اس سے اچھائی یا برائی کا خلق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کا استعمال کیا جائے۔ پھر اگر اس سے خیر و فلاح کا کام لیا جاتا ہے تو اس کی تعریف کی جاتی ہے ورنہ نہیں۔ زنگ خوردہ لوہے کا ٹکڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اگر اسی سے زخم پہنچایا جانے لگے تو لوگ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔ تیغ و تفنگ اپنی جگہ بے حقیقت چیزیں ہیں لیکن ان کے استعمال کی تاریخ اس قدر خونیں ہے کہ لوگ اس کو دیکھتے ہی خائف ہو جاتے ہیں، در آں حالِ کہ اگر ان سے انسان کا خون نہ بہایا جاتا تو آج لوگوں کو یہ یقین کرنے میں بھی تامل نہ ہوتا کہ بندوق کی گولی انسانی سینہ کے اندر پیوست ہو سکتی ہے اور تلوار کی دھار انسان کے اعضاء کو قطع کر سکتی ہے۔ بالکل یہی حالت دنیا کی ان تمام تحریکوں کی ہے جن کو اصلاحِ نوع انسانی اور قیامِ امن و سکون کے لئے بروئے کار لایا گیا پھر جب تک ان سے مقصدِ اصلاح پورا ہوتا رہا لوگ متوجہ ہوتے رہے اور جب ان کی حقیقی روح مفقود ہو گئی تو لوگوں نے ان سے روگردانی اختیار کر لی اور وہ فنا ہو گئیں۔ اصلاحِ اخلاق کی دنیا میں سب سے بڑا مرتبہ مذہب کا سمجھا جاتا ہے یعنی کوئی تحریک دنیا میں قیامِ امن و سکون کے نام سے ایسی پیش نہیں کی گئی جس کا نام مذہب نہ رکھا گیا ہو لیکن جب آپ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ مذاہبِ عالم خواہ اپنی تعلیم کے لحاظ سے کتنے ہی امن پسند کیوں نہ ہوں لیکن تاریخی حیثیت سے ان کی خون ریزیاں و خون آشامیاں نوعِ انسانی کے مصائب کی نہایت دردناک داستانیں ہیں۔ یقیناً اس سے زیادہ حیرت ناک امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو مذاہب یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ وہ دنیا سے قتل و غارت گری، وحشت و درندگی مٹانے آئے ہیں اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہی کے متبعین نے دنیا میں خون ریزیاں کیں اور مذاہب کا نام لے کر قتال و جدال کا بازار گرم کیا گیا۔ یقیناً ایک سوچنے والے دماغ کے لئے یہ مسئلہ بڑی الجھنیں پیدا کر

دینے والا ہے اور وہ حیران رہ جاتا ہے کہ اس سے وہ کس نتیجہ پر پہنچے ؟ آیا یہ کہ مذہب کا خیال ہی دنیا میں ایک لغو خیال ہے یا یہ کہ واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی۔

اس حقیقت پر **نگار** کے صفحات میں بار بار روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے اور نوعِ انسانی کی ترقی کے لئے کسی ایسے نظام کا قائم ہونا جو امن و سکون کی بقاء اور اخلاق کے قیام کا ضامن ہو۔ خود انسان کی فطرت کا اقتضاء تھا، خواہ اس کا نام مذہب رکھا جاتا یا کوئی اور، اس لئے اس پر بحث کرنا صرف لفظی نزاع ہو گی کہ اس کا نام مذہب کیوں رکھا گیا۔ کسی اور نام سے کیوں نہ موسوم کیا گیا۔ بہر حال فی نفسہ مذہب کی ضرورت یا اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ اس لئے لا محالہ ہم کو دوسری صورت پر غور کرنا پڑے گا کہ کیا واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی۔ لفظِ مذہب کا مفہوم طریقِ حیات یا طریقِ عمل ہے جو اپنی جگہ کس قدر معصوم معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی معصوم لفظ دنیا میں کتنی خون ریزیوں اور معصیت کوشیوں کا سبب بنا اور وہی چیز جس کو پیامِ امن و نجات کی صورت سے ہمیشہ پیش کیا گیا اس نے کتنا ہنگامہ اور فتنہ و فساد عالم میں برپا کیا لیکن آپ جس وقت جنگوں کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت تک حقیقتاً دنیا میں کوئی ایک جنگ بھی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہب کے نصب العین سے منسوب کیا جا سکے یا کسی مذہب نے اسے روا رکھا ہو بلکہ تمام لڑائیاں صرف ہوسِ ملک گیری کی بناء پر لڑی گئیں یا خود غرضی یا نفسانی خواہشات پر۔ پھر یہ تو ہوا کہ بعض اہلِ مذہب نے محض مدافعت و حفاظت کے لئے واقعی خلوص و صداقت کے ساتھ اسلحہ اٹھائے، لیکن جارحانہ جنگ کوئی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہبی ضرورت کی صورت پیش کیا جا سکے۔ تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ اس نے اپنی عسکریت کی نمائش اسی وقت کی جب مدافعت و حفظِ نفس کے خیال نے ان کو اس پر مجبور کر دیا یا طاغوتی قوتوں نے دنیا کے امن و سکون کو خراب کرنا چاہا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دنیاوی اغراض کے لئے اسلام نے کسی کا خون بہایا ہو، پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیا انسانی خود غرضی اور نفس پرستی کی اس سے زیادہ کوئی مکروہ مثال اور مل سکتی ہے کہ اس نے جنگ تو کی ہمیشہ اسبابِ عیش و تنعم فراہم کرنے کے لئے، جاہ و ثروت، دولت و حکومت کی خواہش پورا کرنے کی غرض سے، دشمنوں سے قبائلی و ذاتی عناد کا انتقام لینے کے لئے لیکن منسوب کیا اسے مذہب سے، اور مذہب کا نام لے لے کر اس نے ہمیشہ لوگوں کی جانیں لیں، تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مذہب کا اولین دور ہمیشہ اس نوع

کے جذبات سے صاف و پاک رہا ہے۔ لیکن جب بعد کو اس میں ایک جماعت دنیا پرست لوگوں کی پیدا ہوئی تو جنگ و جدال، کشت و خون سبھی کچھ ہوا اور لوگوں نے غلطی سے اس کو مذہب کی تعلیم سے منسوب کیا، پھر جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے لئے آج باہم نوعِ انسانی کے افراد میں مذہبی تفریق کو استخوانِ جنگ نہ بناؤ اور مذہب کو بدنام نہ کرو کیوں کہ مذہب پیامِ امن و سکون ہے اور وہ فساد کو کبھی پسند نہیں کرتا اس لئے میرے نزدیک سب سے زیادہ مضرت رساں تحریک دنیا میں وہ ہے جو قومیت اور وطنیت کے رشتہ کو مذہب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور بڑا ظالم وہ تھا جس نے اول اول اس بدعت کو رواج دیا، آج ہندوستان اسی لعنت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہنوز غلام نظر آرہا ہے در آں حالِ کہ اس سے بہت چھوٹے چھوٹے ملک کبھی کے آزاد ہو کر ترقی کی راہوں پر لگ گئے ہیں۔ غضب خدا کا! کسی ایک ملک میں رہتے ہوئے صدیاں گزر جائیں، وہاں کی آب و ہوا کا اثر پشت ہا پشت سے ہمارے ذوق و مزاج پر ہوتا چلا آرہا ہو، ایک ہی قسم کی بہار و خزاں میں ایک زمانۂ نامعلوم سے یکساں طور پر زندگی بسر ہو رہی ہو لیکن پھر بھی بے گانگی کا یہ عالم کہ باہم مل کر کھانا بھی نہ کھا سکتے ہوں، محبت و رأفت کے ساتھ ایک رات بھی کسی جگہ بسر نہ کر سکیں۔

مذاہب کا شعائر و مراسم کے لحاظ سے مختلف ہونا عیب نہیں، لیکن ان کی وجہ سے باہم دِگر نفرت و احتراز، بغض و عناد پیدا ہونا یقیناً مذاہب کی توہین ہے کیوں کہ یہ کھلی ہوئی ہلاکت نوعِ انسانی کی ہے اور دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس کا مقصد انسان یا انسانیت کو ہلاک کرنا ہو اس لئے ہم کو شرم کرنا چاہیئے کہ ہم مذہب کا کتنا غلط استعمال کر رہے ہیں اور انسانیت کی قربانی اپنے اغراضِ نفسانی کے دیوتا پر چڑھا کر اسے مذہب کا خراج سمجھتے ہیں۔

○○○

کیا خدا کا وجود ہے؟

دنیائے شاعری میں وجودِ باری پر سب سے زیادہ پاکیزہ خیال مرزا عبدالقادر بیدلؔ کا ہے جنہوں نے احساسِ بے چارگی و بے کسی کا نام خدا رکھا ہے، لکھتے ہیں ع

علاجے نیست داغِ بندگی را
اگر بیشم دگر کم آفریدند

اسی خیال کو اکبرؔ الٰہ آبادی نے اس طرح ظاہر کیا ہے ع

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

خیر یہ تو شاعرانہ باتیں ہیں اور ان لوگوں کے تاثرات ہیں جن سے انکارِ خدا پر بھی باز پُرس نہیں ہو سکتی، لیکن لطف تو یہ ہے کہ جب ہم شاعری سے قطع نظر حکمت و فلسفہ، علم و تحقیق سے مدد چاہتے ہیں تو بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو بیدلؔ یا دوسرے شعراء نے سمجھایا ہے اور یہاں بھی اعترافِ عجز ہی سے معرفتِ الٰہی کی بصیرت شروع ہوتی ہے۔

آیئے آج کی صحبت میں اس اجمال کی تفصیل پر متوجہ ہوں۔

کائنات اور اس کی وسعت کو تو خیر جانے دیجئے کہ ضرورت اس "آسمان پردازی" کی نہیں ہے بلکہ اسی زمین پر رہنے اور بسنے کی حیثیت سے ہمیں سب سے پہلے "کارِ زمین" ہی کو دیکھنا چاہئے کہ خدا نے اپنے آپ کو ہم سے قریب الفہم بنانے کے لئے کچھ دلائل و شواہد یہاں چھوڑے ہیں یا نہیں۔

زمین کے موجودات تین قسموں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جو زندگی رکھتے ہیں اور حرکتِ ارادی کے بھی مالک ہیں مثلاً انسان، شیر، مچھلی، چڑیا وغیرہ اور اس قسم کو حیوان کہتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ مخلوقات ہیں جو زندہ تو ہیں لیکن حرکتِ ارادی سے محروم اور ان کا نام نباتات ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جو نہ زندہ ہے، نہ حرکتِ ارادی پر قادر ہے، جیسے مٹی، پانی، پتھر اور اسے جمادات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں اور کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ پتھر کا ٹکڑا ترقی کر کے گلاب کا درخت ہو جائے اور گلاب ترقی کر کے انسان بن جائے لیکن

کس قدر حیرت ناک امر ہے کہ باوجود اس قدر ظاہری و معنوی بُعد و تفریق کے جس وقت ان تینوں کی کیمیاوی تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی بنیاد ایک ہی ہے یعنی یہ سب کے سب پیدا ہوئے ہیں انہی "موادِ جامدہ" سے جو نہ جان رکھتے ہیں، نہ حرکتِ ارادی پر قادر ہیں اور جن کا نام علمی دنیا میں "عناصر" رکھا جاتا ہے۔

آپ گیہوں کا دانہ زمین میں ڈالتے ہیں اور یہ دانہ مٹی، پانی اور ہوا سے بعض عناصر جذب کرکے رفتہ رفتہ درخت کی شکل اختیار کرتا ہے جس سے وہی گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ آپ لیموں کا تخم بوتے ہیں اور لیموں ہی حاصل کرتے ہیں۔ آپ مرغی کے انڈے کو ایک متعین مدت تک گرمی پہنچا کر اس سے مرغی ہی کا بچہ پیدا کرتے ہیں۔ مرغابی کے انڈے سے مرغابی اور کچھوے کے انڈے سے کچھوے ہی نکلتے ہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ ان سب کی ترکیب انہی عناصر سے ہوئی ہے جو بے جان ہیں جن میں کوئی حرکتِ ارادی نہیں لیکن کیا ممکن ہے کہ گیہوں کے تخم سے نارنگی اور طاؤس کے انڈے سے سانپ پیدا ہو سکے؟ پھر سوال یہ ہے کہ جب بنیاد سب کی ایک ہے تو یہ تفریق کیسی اور حیات کی صورتوں میں یہ تنوع، یہ نیرنگی، یہ بوقلمونی کہاں سے آئی؟

اہلِ علم اس راز کے دریافت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ مختلف زندہ اجسام کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ حیوانات و نباتات کے اجزاءِ ترکیبی اور نباتات و جمادات کے اجزاءِ حیات میں کیا فرق ہے؟ لیکن جب انہوں نے یہ عملِ کیمیاوی کیا تو ہر صورت میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام موجودات خواہ وہ جان دار ہوں یا بے جان، چند عناصرِ بسیط سے مرکب ہیں جو بالکل بے جان ہیں، پھر انہوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے ان کو علیحدہ علیحدہ کرنے سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے آؤ ان کو پھر ملا کر دیکھو، لیکن حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ وہ عناصر کو ایک بار علیحدہ کرنے کے بعد باہم دِگر ملا ہی نہیں سکتے اور اگر کسی طرح ملا دیں تو ان میں کوئی آثارِ حیات پیدا نہیں ہوتے۔

ایک عندلیب ہمارے سامنے چہچہا رہا ہے، پاس ہی ایک گلاب کا درخت ہے، جس کے رنگین پھولوں کی خوشبو ہمارے دماغ کو معطر کر رہی ہے اور وہیں ایک پتھر کا وزنی ٹکڑا ہے جس کو ہمارے ہاتھ آسانی سے نہیں اٹھا سکتے لیکن جب ہم عندلیب کو ہلاک کرکے اس کی ترکیبِ حیات کی جستجو کرتے ہیں، گلاب کا پھول توڑ کر اس کے عناصر دریافت کرتے ہیں، پتھر کے اجزاء تحلیل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجزاء بالکل جامد ہیں، بے جان ہیں۔ نہ ان میں کوئی آواز ہے نہ نغمہ، نہ خوشبو نہ وزن اور مطلق ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی جو بلبل کے حقیر

جثہ میں ایک دنیائے نغمہ، پھول کی ضعیف ونازک شکل میں ایک ہنگامۂ نکہت اور پتھر کے سکون بار دمیں ایک وزنِ اعصاب شکن کی کیفیت رکھتی تھی، پھر جب یہ صورت تحقیق و تفتیش کی کسی نتیجہ تک نہ پہنچا سکی تو انہی علماء نے جستجو کی، ایک اور راہ اختیار کی جو یقیناً زیادہ بالغ نظری پر مبنی تھی انہوں نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کا نام خورد بین ہے اور جو اجسامِ صغیرہ کو لاکھوں کروڑوں گنا بڑا کر کے دکھاتا ہے اس کے ذریعہ سے جب انہوں نے زندگی کے راز کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ زندہ اجسام میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جراثیم پائے جاتے ہیں جو شفاف ہیں، بے رنگ ہیں اور کچے انڈے کی سپیدی کی طرح لیس دار ہیں۔ یہ جراثیم مختلف شکل کے ہیں اور نباتات و حیوانات کے اندر ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مشغلہ یہ ہے کہ آس پاس سے بطور غذا موادِ جامد حاصل کر کے کسی ایسے طریقہ سے جس کا علم اس وقت تک انسان کو حاصل نہیں ہو سکا، ان کو زندگی بخشتے ہیں اور پھر اعصاب، شرائین، عضلات وغیرہ میں تحلیل ہو جاتے ہیں لیکن یہ نظام اتنا مکمل ہے کہ جو جراثیم ہڈی بنانے کے لئے متعین ہیں، وہ ہڈی ہی بنائیں گے جو پتّی کی تشکیل پر مامور ہیں وہ پتّی ہی ترتیب دیں گے اور جن کے سپرد پھل بنانے کی خدمت ہے وہ سوائے پھل کے کچھ نہ بنا سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان جراثیم کو ایک ہی قسم کا ماحول غذا کے لئے ملتا ہے لیکن باوجود اس کے نتیجہ وہی ایک ہوتا ہے یعنی پھل کی جگہ نہ کونپل اُگتی ہے اور نہ ٹہنی کے بجائے پھول۔ اور آخر کار یہ جراثیم تمام جسم میں شرائین میں، اعصاب میں، عضلات میں الغرض ہر جگہ اس قدر کثرت کے ساتھ پھیل کر ایک ہستی کا جزو ہو جاتے ہیں کہ سوئی کی نوک کے ہزارویں حصہ کے برابر بھی جسم کا کوئی حصہ ان سے خالی نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ تمام جراثیم، چند ابتدائی جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے زندہ جرثومہ جو ان جراثیم کی آفرینش کا باعث ہوا کیا تھا؟ اس کو زندگی کس چیز نے بخشی اور پھر اس سے مختلف خواص و کیفیات رکھنے والے لاکھوں کروڑوں سے بھی زیادہ ناقابلِ شمار جراثیم کیوں کر پیدا ہوئے؟ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب اب تک کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا، اور یہی وہ عجز ہے جو کسی قوتِ برتر و اعلیٰ کے تسلیم کرنے کی طرف ایک شخص کی رہبری کرتا ہے۔

آپ کسی کارخانے میں جائیں گے تو دیکھیں گے کہ بڑے بڑے دیو پیکر آہنی پہیئے ہر وقت گردش میں ہیں، بہت سے آلات اِدھر سے اُدھر تیزی سے حرکت کر رہے ہیں ایک منظم طریقہ سے مشین کے تمام پرزے اپنا کام کر رہے ہیں لیکن دیکھنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال کسی کو پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ تمام حرکت و جنبش، یہ تمام نظام و عمل از خود

پایا جاتا ہے۔ یقیناً عقلِ انسانی اس کا سبب دریافت کرے گی اور جب اس کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب اس بھاپ کی قوت سے ہو رہا ہے جو کوئلہ اور پانی کی مدد سے پیدا کی جاتی ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گا، پھر جب ایک معمولی مشین کا وجود اور اس کی حرکت و عمل بغیر کسی موجد و محرک کے نہیں ہو سکتی تو قدرت کے یہ بے شمار مظاہر، آثار، موجودات کی کروڑوں صورتیں کس طرح از خود ظہور میں آسکتی ہیں؟

خیر اس مشین کی مثال چھوڑیئے کہ یہ ایک نہایت ہی فرسودہ طریقِ استدلال ہے، آپ ان چھوٹے چھوٹے جان دار کیڑوں کو لیجئے جن کو نگاہ نہیں دیکھ سکتی اور جو اس حد تک غیر مرئی ہیں کہ اگر ہزار اندر ہزار ان کو جمع کیا جائے تو بھی سرسوں کے دانہ سے زیادہ ان کا حجم نہیں ہوتا، پھر لطف یہ ہے کہ یہ تمام خوردبینی کیڑے اور نباتات بالکل اسی طرح پیدا ہوتے، بڑھتے اور فنا ہوتے ہیں جیسے تمام ذی حیات مخلوق اور علمِ انسانی آج تک نہ ان کی حقیقتِ آفرینش کو دریافت کر سکا اور نہ اس امر پر قادر ہوا کہ ان تمام حقیر مخلوقات میں سے کسی ایک ہی مخلوق کے کسی ایک عضو کو بنا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ انسان ہوا میں پرواز کرتا ہے، برق و کہرباء کے ذریعہ سے زمین کی طنابیں کھینچے ہوئے ہے، اپنی ایجادات و اختراعات سے اس نے انسانی زندگی کے اصول کو بالکل بدل دیا ہے لیکن بایں ہمہ تم ساری دنیا کے ماہرینِ کیمیا و حیاتیات و فضلائے تشریح کو جمع کرکے دریافت کرو کہ کیا وہ مچھر کی ایک آنکھ کی طرح کوئی آنکھ بنا سکتے ہیں۔ مکھی کی ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرح کوئی عضو بنا کر دکھا سکتے ہیں؟ تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے اور آخر کار ان سب آسمان و زمین کے قلابے ملا دینے والوں کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ ان کے امکان سے باہر ہے۔

یہی انسان کا اعترافِ عجز، یہی اس کی عقل و فراست کی حیرانی اور یہی اس کی بے چارگی و بے بسی ہے جہاں سے وجودِ باری کے وجوب کے حدود شروع ہوتے ہیں اور آخر کار بقول رازیؔ، انسان کو کہہ دینا پڑتا ہے کہ اس کے پہچاننے کے لئے نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے نہ کسی حجت و برہان کی، کیوں کہ کائنات کے ایک ایک ذرہ کی تکوین اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہے اور اسی کو ایک شاعر نے ”ہر ورقے دفترے ست معرفتِ کردگار“ کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور امر بھی قابلِ غور ہے یعنی یہ کہ کیا خدا آفرینش کے اس سلسلہ کو قائم کرکے علیحدہ ہو گیا ہے اور اب اسے دنیا کے نظام سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا؟ بعض کا خیال یہی ہے، آیئے اس مسئلہ پر بھی ایک نگاہِ جستجو ڈال لیں۔

ابھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ تمام اجسام، شفاف و لیس دار جراثیم سے بنے ہیں اور ان

جراثیم کی ترکیب تمام حیوانات و نباتات میں ایک ہی ہیں۔ اچھا اب دیکھئے کہ ان جراثیم کی ترکیب کیمیاوی کیا ہے؟

یہ علم غالباً اکثر حضرات کو ہو گا کہ یہ جراثیم چار عناصر بسیط سے مرکب ہیں:

۱- آکسیجن ۲- ہائیڈروجن ۳- نائٹروجن اور ۴- کاربن

کاربن ایک زہریلی گیس ہے، آکسیجن ایک گیس ہے جو اجسام کو مشتعل کر دیتی ہے، اسی طرح ہائیڈروجن ایک شفاف گیس ہے جو آکسیجن سے ہلکی ہوتی ہے اور نائٹروجن بھی لیکن ان کے باہم امتزاج سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ اسکول کے ہر طالبِ علم کو معلوم ہوں گے کہ جب آکسیجن اور ہائیڈروجن دونوں گیسیں ملتی ہیں تو پانی وجود میں آتا ہے، چناں چہ سمندر، دریا، نہر اور بادل وغیرہ میں ہر جگہ پانی کا وجود انہی دونوں گیسوں کے امتزاج سے ہے۔ نائٹروجن اور آکسیجن جب دونوں ملیں گے تو تیزاب پیدا ہو گا۔ آکسیجن و کاربن جب ملیں گے تو ایک زہریلی گیس پیدا کریں گے اور ہائیڈروجن و کاربن مل کر قابلِ اشتعال گیس کی صورت اختیار کر لیں گے اور اگر یہ چاروں مل جائیں تو ظاہر ہے کہ انہیں مذکورہ بالا مرکبات میں سے کوئی نہ کوئی شکل پیدا ہو گی اور یہ مخفی نہیں کہ ان میں سے کوئی صورت حیات کے لئے مفید نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ان عناصرِ بسیط کو مرکب کرکے جراثیم پیدا کرتی ہے اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ نباتات پیدا کرنے والے جراثیم نباتات ہی پیدا کریں گے، حیوانات کے جراثیم حیوانات ہی بنائیں گے۔ کبھی ایسا نہ ہو گا کہ پھول کے جراثیم کسی طائر کی ساخت میں مصروف ہو جائیں اور طائر کے جراثیم کسی انسان کی ترکیب میں۔

اگر یہ نظم و اہتمام جسے صرف نگہداشتِ ایزدی کہنا چاہئے شاملِ حال نہ رہے تو آکسیجن ہمارے جسموں کو جلا ڈالے، ہائیڈروجن سے مل کر تمام دنیا کو عالمِ آب بنا دے، نائٹروجن کے ساتھ ترکیب پا کر ہمارے اوپر تیزاب کا سا کام کرنے لگے، گوشت بنانے والے جراثیم صرف خون بنانے لگیں اور ہم ایک رقیق چیز کی طرح اِدھر سے اُدھر بہتے پھریں، اس طرح ایک کاشت کار گیہوں بوئے اور مینڈک اگنے لگیں۔ مرغی کو انڈوں پر بٹھائیں اور ان سے سانپ پیدا ہونے لگیں۔ الغرض تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔

اگر خدا کے وجود کو تسلیم کرنا انسانی فطرت سے متعلق ہے تو اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں، اور اگر استنتاجی ہے تو شواہدِ طبیعت اور مظاہرِ کائنات سے زیادہ کوئی برہان مقصود تک پہنچانے والی نہیں۔

شیعہ، سنّی نزاع

لکھنؤ اپنی شیعہ آبادی کی کثرت اور اپنی مرکزیت کی وجہ سے ہندوستان میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو سرزمینِ ایران کو حاصل ہے اور اگر یہاں کے مراسمِ عزاداری اور شیون وبکاء کی شدّت ووسعت کو سامنے رکھا جائے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُن سے زیادہ بلند اخلاق کی جماعت دنیا میں کوئی اور ہو سکتی ہے، اگر ان تمام ظاہر داریوں کے ساتھ سو میں ایک حصہ بھی سیرتِ حسین کی کیفیتوں کو وہ حقیقتاً اپنے اوپر طاری کرلیں۔ یوں تو میرا تعلق کسی خاص مسلک و مشرب سے نہیں ہے لیکن چوں کہ میرا خاندان ہمیشہ سے حنفی المذہب رہا ہے اس لئے ممکن ہے مجھے مذہبی حیثیت سے مستحق نہ سمجھا جائے کہ حضراتِ شیعہ کے کسی دینی اعتقاد یا رسم ورواج کے متعلق کوئی رائے پیش کروں، تاہم اس حیثیت سے جو ایک شخصِ ثالث کو حاصل ہوتی ہے غالباً مجھے آزادی سے محروم نہیں کیا جاسکتا جو صرف اظہارِ رائے کی حد تک بلاقیدِ ملک و ملّت ہر شخص کو ملنی چاہیئے، علی الخصوص اس وقت جب کہ لکھنؤ کی موجودہ فضا میں یہ تفریق امن و سکون کو خطرہ میں ڈالنے کی حد تک پیچیدگی اختیار کرچکی ہو۔

بہر حال اِس وقت میرا اس مسئلہ پر قلم اٹھانا نہ اس لحاظ سے ہے کہ میں ان دونوں فریق میں سے کسی ایک فریق کا فرد ہوں اور نہ اس حیثیت سے کہ میں اس سلسلہ میں کسی مناظرۂ مذہبی کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہوں، بلکہ میری یہ جسارت صرف اس خیال کے تحت ہے کہ میں بھی اسی قطعۂ زمین میں سانس لے رہا ہوں جہاں یہ لوگ آباد ہیں اور وہاں کا ایک ادنیٰ باشندہ ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی رائے دینے کا حق ہے خواہ وہ کیسی ہی ادنیٰ اور ناقابلِ لحاظ کیوں نہ ہو۔ ہاں تو جیسا میں نے اولین سطور میں ظاہر کیا، لکھنؤ کو اپنی شیعہ آبادی کے لحاظ سے جو خصوصیت حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں۔ لیکن چوں کہ تناسبِ آبادی کے لحاظ سے اکثریت سنیوں کی ہی ہے اور فرنگی محل کے وجود نے ان کی مذہبی مرکزیت بھی بڑی حد تک یہاں قائم کررکھی ہے اس لئے

باوجود کثرتِ آبادی کے شیعہ جماعت کو یہاں بھی اپنے سے زیادہ بڑی جماعت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور چوں کہ یہاں ہر دو فریق کے علماء اپنے اپنے کام میں برابر لگے ہوئے ہیں اس لئے دونوں جماعتوں کے افراد میں ہر وقت ایک قسم کی گرمی پائی جاتی ہے۔ علیٰ الخصوص محرّم کے زمانہ میں کہ جب دونوں جانب کے مبلغین وواعظین اپنے اپنے ترکش کا ایک ایک تیر صرف کرنے میں اپنی انتہائی قوت سے کام لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک اس سے زیادہ لعنت ایک انسان کے لئے کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ وہ مذہب کے لئے لڑے اور مذہب کی خاطر "جامعہ بشری" میں تفریق کا باعث ہو۔ میں حیران ہوں کہ اگر تمام دنیا میں "انسان" ایک ہے تو پھر اس کا مذہب کیوں نہ ایک ہو جب کہ یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب سب کو ایک کرنے والا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو دیکھ کر ایک شخص یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دنیا کی خون ریزیوں اور خون آشامیوں کا ذمّہ دار صرف مذہب ہے اور جب تک اس کا خیال لوگوں کے دلوں سے محو نہ ہو جائے گا عالمِ انسانی ہمیشہ یوں ہی مجروح وداغ دار رہے گا۔ آپ کسی مذہب کی تعلیمات کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اس سے زیادہ امن و سکون کا خواہش مند کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب آپ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس سے زیادہ وحشت و درندگی کا ثبوت شاید ہی کسی اور ادارہ نے دیا ہو۔ عیسوی مذہب کو لیجئے جو اپنی تعلیمات کے لحاظ سے کیسا گوشہ نشین، کتنا خلوت پسند، کس درجہ امن خواہ اور صابر و ضابط مذہب ہے۔ لیکن جب آپ اس کی تاریخ پڑھیں گے تو حیران رہ جائیں گے کہ انسانی خون بہانے میں شاید ہی کوئی دوسرا مذہب اس سے سبقت لے گیا ہو۔ اسی طرح آپ اسلامی تعلیمات پر غور کیجئے، کیا ان کے مطالعہ کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ عافیت طلبی کی خواہش کسی اور طریقِ تعلیم میں پائی جا سکتی ہے، لیکن تاریخ پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ کو حیرت ہو گی کہ اس عافیت طلب جماعت، اسی امن پسند گروہ اور "رحمة للعالمین" کی اس محبت پرست امّت نے کیسی کیسی خون ریزیاں کیں۔ ٹھیک اسی وقت جب ان کی زبانوں پر "لا تفسدوا فی الأرض" کا وعظ جاری تھا، یہ زمین کے امن کو برباد کر رہے تھے اور اسی لمحہ میں جب یہ غیروں کے ساتھ بھی اپنوں کا سا سلوک کرنے کی تلقین فرما رہے تھے، خود اپنوں سے غیروں کا سلوک کر رہے تھے، گوشت سے ناخن جدا ہو رہا تھا اور انہیں پرواہ نہ تھی۔ بھائی بھائی کو ذبح کر رہا تھا اور یہ مسرور تھے۔

دنیا میں کوئی تعلیم محض تعلیم ہونے کے لحاظ سے بے معنی چیز ہے اگر عملی زندگی میں اِس سے کوئی تغیر پیدا نہ ہو۔ پھر تعلیماتِ مذاہب کو عملی زندگی کے لحاظ سے اگر کسوٹی پر کسا جاسکتا ہے تو وہ صرف صفحاتِ تاریخ ہیں اور یہ جس طرح خون سے رنگین نظر آتے ہیں کسی سے مخفی نہیں۔ یقیناً یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب کا خیال دنیا میں ایک لغو خیال تھا، کیا دنیائے عمل کے لحاظ سے مذاہبِ عالم ناکام ثابت ہوئے۔ کیا انسانی اخلاق پر ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہوا؟ اس کا جواب مجھ جیسا آزاد خیال انسان تو کچھ اور دے گا لیکن ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتا ہے اور مذہب کی ضرورت کا قائل ہے، آپ کے سامنے بہت سی ایسی مثالیں پیش کرے گا جن سے مذہب کی برکات آپ پر ثابت ہو جائیں۔ پھر آپ اس سے یہ پوچھئے کہ اگر یہ صحیح ہے تو اب وہ برکات کیا ہوئیں؟ اور اب وہ تعلیمات کیوں بے اثر ثابت ہو رہی ہیں؟ تو وہ اس کا جواب یہی دے گا کہ ان تعلیمات پر عمل کرنا ترک ہو گیا ہے۔ اس کے بعد آپ یہ سوال کیجئے کہ جب ہر مذہبی انسان اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ وہ تعلیماتِ مذہب پر عامل نہ ہونے سے تباہ ہو رہا ہے تو کیوں عمل نہیں کرتا؟ جان بوجھ کر کیوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں صرف اپنی "بدنصیبی" اور "کم بختی" کا شکوہ پیش کرے گا۔ مگر وہ لوگ جو کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے شائق ہیں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا میں اب مذہبیت کی عمر ہی ختم ہو گئی ہے اور خدا اب کاروبارِ عالم چلانے کے لئے بالکل جدید راہیں پیدا کرنا چاہتا ہے، ہو سکتا ہے کہ حقیقت یہی ہو، لیکن میرے نزدیک اس کا ایک سبب اور بھی ہو سکتا ہے جس کا تعلق نہ بدنصیبی سے ہے نہ عدمِ ضرورتِ مذہب سے اور وہ یہ کہ کہیں ایسا تو نہیں جس کو اب مذہب سمجھا جا رہا ہے وہ سِرے سے مذہب ہی نہ ہو اور جن باتوں کو ہم تعلیماتِ مذہب قرار دے رہے ہیں وہ حقیقتاً مذہب سے کوئی واسطہ نہ رکھتی ہوں۔ دنیا نام جذبات و جذبات پرستی کا نہیں ہے۔ اگر آپ محبت کو اچھی چیز سمجھتے ہیں اور محبت نہیں کرتے تو آپ کے درسِ محبت کو کون سنے گا؟ آپ کی جو حالت آنکھوں کے سامنے ہے اسی کو دیکھ کر آپ کے خیال و اعتقاد پر حکم لگایا جائے گا۔ زمانہ کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ آپ کی دینی و اخلاقی گتھیاں بیٹھ کر سلجھایا کرے، اور آپ کی مذہبی تعلیمات کا مطالعہ کرے۔ وہ تو صرف آپ کو اور آپ کی زندگی کو دیکھے گا اور آپ کی ساری قوم اور آپ کی تمام تعلیماتِ مذہبی پر اسی کے مطابق حکم لگا کر صحیح و غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کرے گا۔

پھر آیئے تھوڑی دیر کے لئے ہم خود بھی غور کریں کہ ہماری حالت کیا ہے؟

اس وقت گفتگو نہ سیاست سے ہے نہ ترقیٔ علم و دولت سے بلکہ ہیئت اجتماعیہ کے اس اساسی و ابتدائی مسئلہ سے جس کو خدائے پاک نے ''حبل اللہ'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ پھر یقیناً خدا کی یہ رسّی کوئی لوہے کی رسّی نہیں ہے، فولاد کی زنجیر نہیں ہے، بلکہ اس رشتۂ اخوّت کی زنجیر ہے جس سے تمام نوعِ انسانی کو وابستہ کیا گیا ہے اور جسے فولاد و آہن سے کہیں زیادہ مستحکم ہونا چاہیے۔ مگر نوعِ انسانی کا تو خیر کیا ذکر ہے۔ یہاں تو اس جماعت کے افرد بھی اس سے وابستہ نہیں جس میں جماعت کا مفہوم ہی اس ''حبل اللہ'' کے اعتقاد نے پیدا کیا تھا۔ پھر کوئی بتائے کہ کیا شیعہ سنیوں کا افتراق اسی ایک جماعت کے افراد کا افتراق نہیں ہے؟

میں نے ان دونوں جماعتوں کے اختلاف و نزاع پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو سنّی سمجھ کر حالات کا مطالعہ کیا۔ کبھی شیعہ بن کر واقعات پر نگاہ ڈالی۔ کسی وقت ایک شخصِ ثالث کی حیثیت سے اس کو سمجھنا چاہا، لیکن آپ باور کیجیے کہ ان کے اختلاف کا حقیقی سبب سوا حماقتوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ سب سے اہم مسئلہ جو دونوں فریق کے نزدیک ''استخوان جنگ'' بنا ہوا ہے، بعض خلفاء و صحابہ سے متعلق ہے۔ لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ اس کا تعلّق، دینِ اسلام سے کیا ہے اور اس پر جنگ و خوں ریزی کے کیا معنی ہیں؟ فرض کیجیے کہ کسی کے باپ کے پاس مختلف لوگ آتے ہیں اور وہ ان سب سے دوستی کا سا برتاؤ کرتا ہے، باپ کے مرنے کے بعد دو (۲) بیٹوں میں یہ بحث آن پڑتی ہے کہ باپ کے پاس آنے والوں میں سے کون سا شخص سچا دوست تھا اور کون نہیں۔ ایک کہتا ہے سب وفادار دوست تھے، دوسرا کہتا ہے نہیں! بعض مخلص تھے اور بعض غیر مخلص، وہ بھی اپنے دلائل پیش کرتا ہے اور یہ بھی، یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں لیکن اگر اختلافِ نگاہ و حجّت ایسی صورت اختیار کرے کہ دونوں بھائیوں میں سے ہر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو جائے تو اس کو سوا حماقت کے اور کیا کہیں گے، اوّل تو یہ پوچھیے کہ اس وقت جب کہ نہ باپ زندہ ہے نہ اس کے پاس بیٹھنے والے احباب، اس بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر ضرورت مان لی جائے تو بھی اس گفتگو کا اس حد تک بڑھ جانا کہ دو بھائی ایک دوسرے پر تلوار کھینچ کر جان لینے کے لئے آمادہ ہو جائیں، سوا حماقت کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ اعتقاد کے لحاظ سے اسلام نام ہے صرف خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کے اقرار کا، سو اس میں شیعہ سنّی دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اگر حضرات شیعہ بعض خلفاء اور صحابہ کو اچھا نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے کہ اس کے کچھ اسباب و دلائل اُن کے پاس

ہوں گے اس لئے اس مسئلے کا تعلق صرف تاریخ و تحقیقِ تاریخی سے ہونا چاہئے نہ کہ مذہب سے۔ یعنی ہم کو تاریخ کے صفحات میں جستجو کرنا چاہئے کہ وہ اسباب جو بیان کئے جاتے ہیں واقعی صحیح ہیں یا نہیں۔ اگر کسی کے نزدیک صحیح ہیں تو اس کو ایک تاریخی حقیقت کی صورت سے پیش کر کے خاموش ہو جانا چاہئے۔ بُرا بھلا کہنے یا گالیاں دینے سے کوئی فائدہ نہیں اور اگر کسی کے نزدیک غلط ہیں تو ان پر تنقید کر کے علیٰحدہ ہو جانا چاہئے اور اس جستجو میں نہ پڑنا چاہئے کہ کوئی اپنے گھر میں کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

آج میں پوچھتا ہوں کہ کیا تمام شیعہ حضرات اپنی تاریخی کتب کو متفقہ طور پر صحیح تسلیم کرتے ہیں یا اہلِ تسنن بغیر کسی اختلافِ باہمی کے تمام روایات کو منقّح و درست باور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کرنا بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ شیعہ و سنّی کی تاریخی کتابوں میں ہم کثرت سے اختلاف پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جس طرح خود شیعہ علماء اور مؤرخین بہت سے تاریخی واقعات پر مختلف رائیں رکھتے ہیں، اسی طرح سنّی علماء بھی باہم دِگر متفق نہیں، تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جب اور تاریخی واقعات پر اختلاف ہونے کی وجہ سے آپس میں نِزاع نہیں ہوتی تو خاص صحابہ کے مسئلے پر کیوں جنگ کی جاتی ہے اور کیوں ایک دوسرے سے اس قدر علیٰحدہ ہو جاتے ہیں کہ ایک کا مذہب ہی امامیہ یا شیعہ کہلاتا ہے، اور دوسرے کا حنفی یا سنّی، اس پر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف کا سبب محض اختلافِ تاریخی نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے جس کی بنیاد آج نہیں بلکہ اسی وقت پڑ چکی تھی جب رسول اللہ بقیدِ حیات تھے اور اسلام ایک جیتا جاگتا مذہب تھا۔

جب کوئی پیغمبر رونما ہوتا ہے تو وہ ایک خاص خیال کے تحت اصولِ اصلاح و تبلیغ کو متعین کر لیتا ہے جو نتیجہ ہوا کرتے ہیں وقت کا، ماحول کا اور ان خاص خاص واقعات کا جو اس زمانہ میں رُونما ہوئے۔ اسی کو ایک مذہب کی سائیکالوجی کہتے ہیں اور یہیں سے اس کے مستقبل پر حکم لگایا جا سکتا ہے، مثلاً آپ ہندو مذہب کو لے لیجئے اور اس کی سائیکالوجی پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ مزارعین و فلّاحین کا مذہب ہے اور اسی لئے اب تک اس کے متبعین کی معاشرت و زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ایک خاص قسم کی نباتیت پائی جاتی ہے اور عیسوی مذہب کی ابتداء ایک مظلومانہ صبر و استقلال سے ہوئی اور اس کیفیت کے بعد جو عزمِ راسخ ایک قوم میں پیدا ہو جاتا ہے وہ اس وقت بھی عیسوی جماعت میں پوری طرح نظر آتا ہے۔ دینِ موسوی دنیوی برکات کے لئے برسرِ پیکار ہو کر نمودار ہوا اور آخرکار

اس کے مقلّدین میں وہ ردّ عمل پیدا ہوا جو دنیا پرست لوگوں میں قدرتاً پیدا ہو جانا چاہئے۔ اسلام "أنتم الأعلون" کا آوازہ بلند کرتا ہوا نمودار ہوا اور اس لئے پاکیزگیٔ اخلاق کے ساتھ دنیاوی سربلندی کو بھی پیش نظر رکھا۔ پھر چوں کہ فطرتِ انسانی تعیش پسند و جاہ طلب واقع ہوئی ہے اس لئے عہدِ سعادت کے بعد ہی دونوں کا توازن مفقود ہونے لگا اور خلافتِ راشدہ ہی میں دو مخالف فریق پیدا ہو کر طلب جاہ و کشمکشِ باہمی کے مناظر سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک فریق کامیاب ہو گیا جسے آج کل کی اصطلاح میں سنّی کہتے ہیں اور دوسرا ناکام رہا جسے شیعہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علوئین کی جماعت اوّل اوّل صرف جذبۂ محبت کے تحت وجود میں آئی کیوں کہ وہ شخص جو رسول اللہ سے محبت کرے گا اس کا آلِ رسول و اہلِ بیت سے محبت کرنا ناگزیر ہے۔ یہ فطرتِ انسانی ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کو برسرِ عروج و اقتدار دیکھنے کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ رحلتِ نبوی کے بعد خلافت کا مسئلہ جن لوگوں نے جس طرح سے طے کیا اس میں محبت کی رعایت تو یقیناً نہیں تھی لیکن مصلحت و ضرورت کی رعایت ضرور تھی۔ پھر اب یہ فیصلہ کرنا کہ خلافت کا مسئلہ بربنائے اصولِ محبت طے ہونا چاہئے تھا یا بربنائے مصلحت، ازبس دشوار ہے کیوں کہ وہ لوگ جو رسول اللہ و آلِ رسول سے محبت کرنے والے تھے بعد کو ان کی اولاد کے سامنے بھی سوال، محبت کا نہیں رہا بلکہ وہی جاہ و ثروت کا رہ گیا تھا اور جنہوں نے اوّل دن مصلحت و ضرورت کو سامنے رکھ کر خلافت کے مسئلہ کو طے کیا تھا ان کی نسل میں تو خیر کوئی رعایتِ محبت و الفت کی ہو ہی نہیں سکتی تھی، مگر بعد کو "مصلحت و ضرورت" کی اہمیت بھی ان کے سامنے باقی نہ رہی۔ اختلافات بڑھتے گئے مناقشات سنگین ہوتے گئے، دل کی کدورتیں زبانوں پر آنے لگیں، طبیعتوں کی برہمی نے تیغوں کو بے نیام کرنا شروع کیا۔ "محبت و مصلحت" کی نزاع آخر کار صرف دنیاوی، ملکی اور سیاسی نزاع ہو کر رہ گئی۔ نہ رسول و آلِ رسول سے محبت کرنے والے رہ گئے، نہ دیانت و امانت کے ساتھ مصلحت پر غور کرنے والے باقی رہے۔ اور کھلم کھلا سلطنت و دولت و جاہ و ثروت کے لئے دونوں جماعتیں میدان میں اُتر آئیں۔ پھر دیکھو کہ اس کے بعد کیا ہوا، تاریخ کے صفحات ہر شخص کے سامنے کھلے ہوئے ہیں اور معمولی فہم کا انسان بھی آسانی سے اُن کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جو زمانہ امیر معاویہ کی حکومت سے شروع ہوتا ہے

کیا اس کو رسول و آلِ رسول کی محبت سے متعلق کر سکتے ہیں اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس میں سوا کسبِ دولت و ثروت اور حصولِ جاہ و مرتبت کے کوئی اسلامی ضرورت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روح مع اپنے احساسات کے قائم رہتی ہے، اگر اہلِ اسلام کا یہ ایمان ہے کہ رسول اللہ عالمِ روحانی میں اب بھی رسول اللہ ہیں تو خدا کے لئے بتاؤ قاتلِ حسین سے ان کی رضامندی کی صورت کیا ہو سکتی ہے اور وہ کیوں کر امیر معاویہ کو معاف کر سکتے ہیں کہ انہوں نے حسین کے ہوتے ہوئے جان بوجھ کر اپنے فاسق و بادہ خوار بیٹے یزید کو خلیفہ مقرر کیا اور نہ صرف خلیفہ مقرر کیا بلکہ اس کی خلافت کی تکمیل میں ہر اس ترکیب و تدبیر سے کام لیا جو مادی سلطنت کے استحکام کے لئے سیاسیات کی دنیا میں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ آج سنیوں کو شکایت ہے کہ حضراتِ شیعہ صحابہ و خلفاء کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن کیا کبھی ان خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کے کارناموں پر بھی غور کیا ہے جنھوں نے علی الاعلان مسجدوں کے محراب و منبر پر علی کو گالیاں دیں اور دلوائیں۔ یقیناً میں نہایت کراہت کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ حضراتِ شیعہ صحابہ میں سے کسی کو بُرا کہیں لیکن بالکل اسی طرح جس طرح میں "سبِّ علی" کو برا سمجھتا ہوں۔ پھر اگر یہ نزاعات و اختلافات محض تاریخی حیثیت رکھتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا کیوں کہ اسلامی حکومت و خلافت کے ساتھ یہ قصّہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ لیکن مصیبت یہ آپڑی ہے کہ بجائے تاریخی اختلاف کے یہ مذہبی اختلاف ہو گیا اور اگر ایک طرف حضراتِ شیعہ نے "سبّ صحابہ" ایسے مکروہ و لایعنی فعل کو داخلِ مذہب کر لیا تو دوسری طرف سنیوں نے اس قدر عصبیت سے کام لیا کہ "لعنِ یزید" کو بھی ناجائز قرار دے کر فقہ و اصول فقہ میں شامل کرنے سے احتراز نہ کیا۔ حالاں کہ کوئی ان سے پوچھے کہ اس مسئلہ کا فقہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر "لعنِ یزید" اس دلیل کی بنا پر ناجائز قرار دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے خدا نے اسے بخش دیا ہو تو کیا کسی شخص کا یزید پر لعن کرنا، قتلِ حسین سے زیادہ شدید معصیت ہے جس کو خدا معاف نہیں کر سکتا؟

الغرض آپ سنّی شیعہ کے تمام ان اختلافات کو بغور دیکھیں جن کو داخلِ مذہب کر لیا گیا ہے اور پھر انصاف کیجئے کی ان کا تعلق مذہبِ اسلام سے کیا ہے۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایک اختلاف بھی ایسا نہیں نکلے گا جو اصُول سے واسطہ رکھتا ہو بلکہ سب کے سب تاریخ سے متعلق ہوں گے جو سیاسی مصالح کی بناء پر کسی وقت قصداً پیدا کئے گئے تھے

اور اب ہم لوگوں کی حماقت سے وہ داخلِ دین ومذہب سمجھے جانے لگے ہیں۔

یقیناً تعزیہ داری اور مجالس عزا میں ایسی روایات کا پڑھنا جو اہلِ بیت کی سیرت کو بجائے بلند دکھانے کے پست ثابت کرنے والی ہیں، کسی کے نزدیک اچھا فعل قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن اسی کے ساتھ سنّی جماعت اپنی قبر پرستی اور اُن کتبِ مواعظ کی کیوں کر پردہ پوشی کرسکتی ہے جن میں خود رسول کی ذاتِ گرامی کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے دونوں جماعتیں یکساں قابلِ ملامت ہیں لیکن سب سے زیادہ قابلِ ملامت ان جماعتوں کے وہ قائد ورہنما ہیں جو اُن کے جاہلانہ عقائد اور وحشیانہ عقائد کو بجائے دل سے نکالنے کے اور زیادہ مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ کیا میں حضراتِ شیعہ کے علماء ومجتہدین سے یہ سوال کرسکتا ہوں کہ کبھی انہوں نے اپنی مجالس میں یہ تلقین بھی کی ہے کہ حسین کی محبت کا اقتضاء ان کی سی صداقت پرستی اختیار کرنا ہے اور سوا رونے رلانے والی حکایات وروایات کے جن میں بہت کم حصّہ راستی وصداقت کا ہوتا ہے کبھی انہوں نے کسی ایسی تنظیم کی عملی کوشش کی ہے جو براہِ راست لوگوں کے اخلاق کو متاثر کرنے والی ہو؟ اسی طرح کیا سنّی علماء وواعظین سے یہ دریافت کرسکتا ہوں کہ انہوں نے ایّامِ محرم میں کبھی برادرانِ شیعہ کے مذہبی جذبات کا احترام کرکے اُن کی سوگواریوں یا مجالس عزا میں شرکت گوارا کی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے علماء ہی آپس میں نہیں ملنا چاہتے اور چاہ بھی کیوں کرسکتے ہیں جب کہ دنیاوی جاہ وجلال اور عظمت ووقار کی بنیاد ہی تفرقہ پردازی اور جاہلوں کو جاہل ومتعصب بنائے رکھنے کے اصول پر قائم ہوتی ہے اور معاشرت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب تک دو(۲) فریق باہم رواداری سے کام نہ لیں گے کبھی ان کے اختلافات نہیں مٹ سکتے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے ہمارے یہاں علماء کو بیر ہے۔ مگر وہ مناظرہ کے لئے ہر وقت تیار ہیں، مذہبی مجادلہ کے لئے اپنی جماعتوں کو مشتعل کرنے کے لئے ہمیشہ آمادہ ہیں۔ لیکن اگر ان سے کہئے کہ قبلہ کوئی صورت باہم مل کر بیٹھ جانے کی بھی ہے یا نہیں تو وہ کہیں گے کہ اس کا تو امکان نہیں کیوں کہ ایک کے نزدیک صحابہ کو بُرا سمجھنا قران وخدا کو بُرا سمجھنا ہے اور دوسرے کے نزدیک صحابہ کو اچھا کہنا رسول وآلِ رسول کی توہین۔

سیّد سلیمان نَدوی اور میں

آخر کار سید سلیمان صاحب ندوی سے ضبط نہ ہوا اور انہوں نے بھی ستمبر ۳۲ء کے معارف میں پانچ سطریں ایڈیٹر **نگار** کے ملحدانہ مضامین پر سپُرد ِخامہ کر ہی دیں ع

بہ صورت سر زلفے کہ از کمر گزرد

کیا میں سیّد صاحب سے پوچھ سکتا ہوں کہ وہ مجھے ملحد کیوں کہتے ہیں اور میرے کون سے مضامین ہیں جن کو کفر و الحاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

وہ شخص جو خدا کو ایک قوتِ "فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیدُ" مانتا ہو، جو رسول اللہ کو بڑا مقدّس نبی تسلیم کرتا ہو، جو ہمیشہ اعلان کرتا رہتا ہو کہ اسلام ہی دنیا کا تنہا ذریعۂ امن و نجات ہے، کیا اسے صرف اس لئے ملحد قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ فروع میں سید سلیمان یا کسی اور مولوی کا پیرو نہیں؟ وہ شخص جو توحید ربانی کا وحدتِ وجودی کی حد تک قائل ہے، جو رسول کی سیرت کو پاکیزہ ترین نمونۂ اخلاق و انسانیت قرار دیتا ہے اور جو اسلام کو مذہبیات کی دنیا میں "آخری لفظ" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، کیا اسے صرف اس بناء پر کافرو بے دین بنایا جا سکتا ہے کہ وہ قران کے سمجھنے کی خود کوشش کرتا ہے اور مفسرین کی کورانہ تقلید نہیں کرتا؟

وہ شخص جو تمام کائنات کو مظہرِ قوّتِ ربّانی قرار دیتا ہے، جو اسوۂ محمدی کو بہترین اسوۂ انسانیت سمجھتا ہے اور جو قرانِ مجید کو بے مثل صحیفۂ رشد و ہدایت باور کرتا ہے، کیا اُسے صرف اس دلیل پر کافرو مرتد کہہ سکتے ہیں کہ اس کے مطالعہ کا زاویۂ نگاہ خود اس کا ہے اور دوسرے سے استعارہ نہیں کیا گیا؟ حیران ہوں کہ ان لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے! یہ کیا سمجھ رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ سچ ہے ع

پیمانہ بر آں رند حرام ست کہ غالب
در بے خودی اندازۂ گفتار نہ داند

آپ کی سمجھ میں تو کبھی نہ آئے گا لیکن آیئے میں بتادوں کہ مجھ میں آپ میں کیا اختلاف ہے، میں کہتا ہوں کہ چوں کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ہر زمانہ ہر ملک اور ہر قوم کے لئے موزوں ہو سکتا ہے اس لئے اس میں ہر زمانہ کا ساتھ دینے کی لچک پائی جاتی ہے اور اس کی

تعلیم ہر شخص کے لئے قابلِ قبول ہے، لیکن آپ کہتے ہیں کہ نہیں اسلام کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے وہی ہے جو آپ فرماتے ہیں یعنی اسلام صرف اہلِ عرب کے لئے تھا اور اسی زمانہ کے لئے موزوں تھا جب اس کا ظہور ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام فطری مذہب ہے اور اگر اس کا صحیح مفہوم بتایا جائے تو ہر شخص اس کی صحت پر ایمان لا سکتا ہے، اس لئے میں پہلے اصولِ صداقت قائم کرتا ہوں اور پھر قران مجید کی تعلیمات پر روشنی ڈالتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں نہیں، اسلام صرف مسلمانوں کا مذہب ہے اور مسلمانوں ہی کے سامنے پیش ہونا چاہئے، اس لئے آپ پہلے اپنے مفروضات و مزعومات کے لحاظ سے قرآن پر ایمان لانے کی ہدایت کرتے ہیں اور پھر لوگوں سے اس کو تسلیم کراتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اصولِ انسانیت پر اپنی تعلیم کی بنیاد قائم کی اور تمام عالم کو ایک "مرکزِ اخوّت" پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ اس لئے میں فروع کی پابندی کو لوازمِ مذہبی میں داخل نہیں سمجھتا اور تمام مذاہب کو ہی سچا سمجھتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ نہیں اسلام نے عصبیت و افتراق کی تعلیم دی ہے اور "جامعۂ انسانیت" کا قیام اس کا مقصود نہیں اس لئے آپ دوسروں کو بُرا کہتے ہیں اور کافر و ملحد وغیرہ کہہ کر بے زاری کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نام ہے صرف تکمیلِ اخلاق کا۔ آپ کہتے ہیں نہیں اخلاق ہوں یا نہ ہوں صرف ارکانِ مذہب کی پابندی کافی ہے۔ میں کہتا ہوں خدا سے محبت کرنا سیکھو، اور آپ فرماتے ہیں اس سے ڈرو، میں کہتا ہوں کہ اخلاق نبوی کو انسانیت کا بہترین نمونہ سمجھ کر اس کا اتباع کرو اور آپ فرماتے ہیں کہ نہیں پہلے اس کے معجزات اور محیرّ العقول باتوں کو باور کرو، میں کہتا ہوں کہ اسلام نام روزۂ و نماز کا نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اسلام صرف اسی کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نام نہ لمبی داڑھی کا ہے نہ عبا و عمامہ کا، آپ فرماتے ہیں کہ یہی اسلام کی نشانیاں ہیں۔ میں کہتا ہوں ملائکہ نام ہے اُن قوائے کامنہ کا جن کو خدا نے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ نہیں ملائکہ ایک مخلوق ہے "حیزِ مکان و زمان" سے متعلق جو ہاتھ پاؤں رکھتی ہے اور جس کے بال و پر ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جنّت و دوزخ نام ہے انفرادی، قومی و روحانی احساسِ عروج و زوال کا، آپ کہتے ہیں کہ نہیں اس کا تعلق مادّی لذائذ سے ہے۔ میوہ دار درختوں سے ہے۔ شہد و لبن سے ہے۔ خوبصورت عورتوں اور حسین لڑکوں سے ہے۔ میں کہتا ہوں اچھا کام خود آپ اپنی جزا اور بُرا کام آپ اپنی سزا ہے۔ آپ فرماتے ہیں نہیں، اچھے کام کا عوض حور و قصور ہونا چاہئے اور بُرے کام کی پاداش نارِ جہنم و ماءِ حمیم، میں کہتا ہوں کہ خدا کی عظمت و بزرگی اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ وہ ہمارے افعال

سے متاثر ہو کر جذبۂ تحسین و انتقام اپنے اندر پیدا کرے۔ آپ فرماتے ہیں نہیں وہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح خفا بھی ہوتا ہے اور خوش بھی۔ میں کہتا ہوں کہ جو خدا روزانہ بے شمار کُرّے، زمین سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑے بناتا بگاڑتا رہتا ہے اور جس کا یہ مشغلہ ازل سے ابد تک جاری رہنے والا ہے وہ زمین ایسی حقیر کُرہ کی ذلیل مخلوق کو تباہ کرنے کے بعد کیوں دوبارہ زندہ کرنے لگا؟ اس کو کیا غرض ہے، اس کا اس میں کیا فائدہ ہے، کیا مصلحت ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ نہیں خدا کی عظمت صرف اسی کرّہ سے متعلق ہے اور اس کی کا خدائی کا مفہوم اسی طرح ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی لوگوں نے کہا ہے اور وہ اسلام سے خارج نہیں سمجھے گئے۔ لیکن آج میں باوجودِ کہ وحدانیت کا قائل ہوں۔ رسالتِ رسول کا ماننے والا ہوں۔ قرآن پاک کی بلند تعلیمات پر ایمان رکھنے والا ہوں۔ کافر قرار دیا جاتا ہوں۔ ملحد بتایا جاتا ہوں۔ اور بے دینی کا سب سے بڑا علم بردار ہوں۔ کیوں؟

آیئے آج کی صحبت میں مختصراً اس راز کو بھی ظاہر کر دوں، جن حضرات نے شروع سے "**نگار**" کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ میرا موضوعِ سخن ہمیشہ علماءِ سوء کا گروہ رہا ہے، اور میں نے اُن کے حرکاتِ ناشائستہ، ان کے اخلاقِ ذمیمہ ان کے افعالِ رکیکہ اور ان کے مشاغلِ سخیفہ کو بے نقاب کر کے لوگوں کو بتایا ہے کہ ان کا وجود اللہ کا عذاب ہے۔ اُن کی ہستی خدائی لعنت ہے، جس نے مسلمانوں کو گھیر رکھا ہے۔ ان کا مقصودِ زندگی صرف ریا و مکر سے دولت کمانا ہے اور ان کو مطلق پروا نہیں اگر ان کی تعلیمات سے اسلام اور صاحبِ اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے۔ یہ مذہبِ اسلام کو بے عقلیوں کا مجموعہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ موضوع احادیث کو سامنے رکھ کر لغو و مہمل روایات کو اسلام سے منسوب کر کے مذہب کو ذلیل کر رہے ہیں۔ یہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے انسانوں کی عقلوں پر مُہر لگا کر قرآن مجید پر غور و خوض کرنے کو حرام بتا رہے ہیں۔ یہ ذہنی و عقلی آزادیاں سلب کر کے مسلمانوں کو درجۂ انسانیت سے گرا کر حیوان بناتے جا رہے ہیں، یہ اس دورِ علم و روشنی میں ہمیں پھر جہل و تاریکی کی طرف لئے جا رہے ہیں، اور وہ سب کچھ کر رہے ہیں ------ جو ایک خود غرض، نفس پرست انسان کر سکتا ہے۔ میں نے قرونِ اولیٰ کی تاریخ سے، عہدِ عباسیہ و امویہ کے واقعات سے حکومتِ ترکی و ایران کے حالات سے اور افغانستان کے انقلابِ حالیہ کی روداد سے لوگوں پر ظاہر کیا کہ اس جماعت نے جو اپنے کو علم بردارِ مذہب بتاتی ہے انسانیت پر کیا کیا مظالم روا رکھے ہیں، اخلاق کا خون کِس بے دردی سے بہایا ہے اور

عروج و ترقی کے پامال کرنے میں ان کی درازدستیوں نے کیا کیا کام کیئے ہیں۔

پھر ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ ان کا دشمن اور کون ہو سکتا تھا اور اس کا انتقام لینے کے لئے وہ حسبِ معمول سوا مذہب کے اور کس چیز کی آڑ لے سکتے تھے۔ پھر اگر مذہبِ اسلام حقیقتاً نام ہے انہی عقائد و تعلیمات کا جو ان کی طرف سے پیش کی جارہی ہیں، انہی اخلاق کا جو اُن میں پائے جاتے ہیں، اسی محبت و رواداری کا جو ان کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہے، اور اسی وسعتِ نظر و پُرمائگی کا، جو اُن کے اقوال و افعال کی سرمایہ دار ہے تو میں نہایت صفائی سے ایک بار اور ہمیشہ کے لئے یہ اعلان کئے دیتا ہوں کہ:

”میں مُسلمان نہیں ہوں“

لیکن اگر اسلام ضمیر و خیال کی آزادی کو نہیں چھینتا، اگر وہ فکر و رائے کی حرّیت کا دشمن نہیں ہے، اگر وہ بغیر اطمینانِ نفس پیدا کئے ہوئے بہ جبر اپنی حقیقت کسی سے تسلیم نہیں کراتا، اگر وہ مجموعہ مزخرفات و خرافیات نہیں ہے، اور اگر وہ ہر شخص کے لئے ہر زمانہ میں دست گیر و رہنما بن سکتا ہے تو اے مسلمانو! میں تمہی سے پوچھتا ہوں کہ ان مولویوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اسلام سے خارج کریں؟ ایک توحیدِ خداوندی کے اقرار کرنے والے کو کافر کے لقب سے یاد کریں، جس طرح وہ مجھے ملحد و بے دین کہتے ہیں، میں انہیں بھی کہہ سکتا ہوں اور ان کے نقطۂ نظر سے اگر میں غلطی پر ہوں تو میرے نقطۂ نظر سے وہ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں، مجھے بھی انہی کی طرح اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور سمجھنے کا حق حاصل ہے۔ میں بھی اسلام و تعلیماتِ اسلام پر غور کر سکتا ہوں، خدا نے مجھے بھی عقل عطا کی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ مجھے کافر و ملحد کہتے ہیں، وہ خود تعلیماتِ اسلامی سے منحرف ہیں، رسول کی توہین کرتے ہیں، مذہب کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں اور خدا اُن سے بے زار ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ مولویوں کی جنگ مجھ سے نہ مذہب سے کوئی تعلق رکھتی ہے نہ دین کی ہمدردی سے، بلکہ یہ حربہ اُن کا صرف اس لئے ہے کہ میں اُن کے خلاف کیوں لکھتا ہوں۔ ان کی حقیقتوں کو کیوں بے نقاب کرتا ہوں۔ سو انہیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اب اُن کے قصرِ عظمت و پندار کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ ان کی مذہبیت و اخلاق کے چہرے سے پردہ اٹھ چکا ہے اور دنیا ان سے متنفّر ہو کر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ افسوس ہے کہ آج پاکستان میں حکومت اِسلامی نہیں، ورنہ پاکستان اُن کے عذاب سے کب کا نجات پا چکا ہوتا۔ آج ترکی حکومت کی ترقی کی بنیاد صِرف اسی جماعت کے انہدام پر قائم ہے اور ایران کی

بیداری کا آغاز اسی گروہ کو بے دست وپا کر دینے سے ہوتا ہے۔

جب کوئی زبردست قوت ان کے مقابلہ پر آتی ہے تو یہ حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانے لگتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ قانون کب تک اس قسم کے شریروں کو موقع دیتا رہے گا، حالاں کہ اس نوع کا احتجاج ان کے ضعف کی دلیل ہے، ان کی عقلی بے مائگی کا ثبوت ہے اور ایک ایسا اظہارِ عجز ہے جس سے ہر خوددار انسان کو شرم آنی چاہیئے۔ اگر ان کے سامنے مفروضہ عقائد کے خلاف کوئی صدا اٹھتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ عقلی دلائل سے اس کا جواب دیں نہ یہ کہ حکومت کے سامنے دامن پھیلا کر کھڑے ہو جائیں، علاوہ اس کے مجھے حیرت ہے کہ اگر میں واقعی ملحد ہوں تو ان کو کیا تکلیف پہنچ رہی ہے؟ کیا اس سے پہلے کوئی ملحد پیدا نہیں ہوا؟ کیا اس وقت دنیا میں میرے سوا کوئی کافر و ملحد نہیں پایا جاتا؟ پھر ایک میرے ہی خلاف یہ جہاد کیوں ہے؟ میرے ہی اوپر کیوں اس قدر عنایت صرف کی جاتی ہے؟ خدا کی خدائی میں لاکھوں غیر مسلم وبے دین پائے جاتے ہیں، آپ کہاں تک سر پیٹیں گے، کب تک غم کریں گے اور آپ کی اس واویلا کو سنتا کون ہے؟ اگر اکابرِ مذہب کو گالیاں دوں، کسی کی توہین کروں تو بے شک شکایت کا موقع ہے لیکن جب یہ کوئی بات نہیں ہے تو پھر برہمی کے کیا معنی؟ آپ جب مجھے کافر بنا چکے، ملحد قرار دے چکے، تو پھر کیوں میری پرواکرتے ہیں؟ سمجھ لیجئے کہ جہاں اور بہت سے کافروں کو دوزخ کا ایندھن بننا ہے، وہیں مجھے بھی بننا ہے لیکن اگر ان کا مقصود واقعی مجھے راہ راست پر لانا اور اپنا تبلیغی فرض ادا کرنا ہے تو میں سید سلیمان ندوی اور ان تمام علمائے کرام کو جو اُن کے ہم آہنگ ہیں، چیلنج دیتا ہوں کہ وہ کسی مجمع میں جو بالکل غیر جانب دار لوگوں پر مشتمل ہو، اپنے اسلام کو پیش کریں، پھر مجھے موقع دیں کہ میں نے جو کچھ اسلام کو سمجھا ہے اُسے بیان کروں اور اس کے بعد اس مجمع سے فیصلہ چاہیں کہ وہ کس کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی جانے دیجئے خود مجھے موقع دیں کہ میں اُن سے اسلام کی حقیقت کو سمجھوں اور اگر وہ مجھے سمجھا سکے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں بغیر ایک لمحہ کا پس وپیش کئے ہوئے سرِ عجز جھکا دوں گا اور انہی جیسا مسلمان ہونے کا اقرار کرلوں گا۔ ورنہ یوں تیغ و تفنگ، یا حکومت کی امداد سے کسی کو زبردستی مسلمان بنانا، یا کسی کی آزادئ خیال کو چھیننا، اسلام کی حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ چنگیز و ہلاکو اس سے قبل ایسا کر چکے ہیں لیکن دنیا نے انہیں جیسا سمجھا وہ آپ کو بھی معلوم ہے اور مجھے بھی۔

ایک ــــ تلخ حقیقت

اگر آج ہماری قوم سے جو تا سینے والے فنا ہو جائیں تو ہم کو کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے، اسی طرح اگر پارچہ باف، رنگریز، سونار، لوہار، بڑھئی، معمار وغیرہ معدوم ہو جائیں تو ہماری ضروریات زندگی کو کتنا صدمہ پہنچے اور ان کو جانے دیجئے صرف شاعروں کو لے لیجئے کہ ان سے زیادہ بے کار جماعت بظاہر کوئی نظر نہیں آتی، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوں تو ہماری بہت سی لطیف صحبتیں ختم ہو جائیں ----- مگر ------ خدا کیلئے کوئی بتائے کہ اگر آج روئے زمین سے اس جماعت کو فنا کر دیا جائے جو ہمارے مذہب و اخلاق کی ضامن بنی ہوئی ہے تو اس سے ملک و قوم کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔

ہر چیز کی اہمیت کا اندازہ اس خدمت کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے، جو اس دنیا میں متعلق ہوتی ہے، پھر اگر وہ خدمت زیادہ اہم ہے تو اس چیز کا وجود بھی اتنا ہی اہم سمجھا جاتا ہے، اگر وہ چنداں اہم نہیں ہے تو اس کے وجود کی بھی زیادہ پروا نہیں ہوتی یہاں تک کہ اگر کوئی چیز بالکل بے کار ہے تو اسے مِٹ جانا چاہیئے۔

اچھا اب غور کیجئے کہ اس جماعت سے کیا خدمت متعلق ہے یا اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے، انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک وہ جس کا تعلق مادیات سے ہے اور دوسرا وہ جو اخلاقیات سے متعلق ہے، پھر یہ تو ظاہر ہے کہ مادّی زندگی کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ وہ نہایت فخر و ناز کے ساتھ دنیا و کاروبار دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا کرتے ہیں، رہی اخلاقی زندگی سو آج تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں اور دنیا کا وہ کون سا اخلاق ہے جو انسان کو دنیا سے بیزاری کا درس دے سکتا ہے۔

اسلام کی گذشتہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء اور شاہان اسلام مادیت و روحانیت یعنی دنیا و دین دونوں کا مرکز سمجھے جاتے تھے اور اسی لئے اسلام میں

قدرتاً وہ اصول زندگی پیدا ہو گئے جو مذہب کا کاروبار دنیا اور ہنگامۂ حیات کے دوش بدوش لے جانے کے ضامن تھے اور یہی سبب تھا کہ اسلام کے عہدِ وسطیٰ میں جو یقیناً اس کا زرّیں دور تھا ایک شخص کیلئے یہ متعین کرنا دشوار تھا کہ مسلمانوں کے اصول زندگی میں کس طرح خطِ فاصِل کھینچ کر اُن کے دین کو دنیا سے ممیز کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اُن کا بیٹھنا اٹھنا، کھانا پینا، جاگنا سونا، الغرض اُن کا ہر دنیاوی عمل مذہب ہی کیلئے تھا جس طرح اُن کے تمام مذہبی اعمال دنیاوی ترقی کے رُوح رواں تھے، یہی وہ چیز تھی جس نے حکمراں جماعت اور علماء دین کے گروہ کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر رکھا تھا اور اگر اتفاق سے کوئی قاضی یا مفتی، مولوی یا عالم حکومت کے مصالح کے خلاف کوئی فتویٰ دینے کی جرأت کرتا تھا تو اُسے قید وبند میں ڈالا جاتا تھا، ممکن ہے کوئی شخص اسے حکومت کی زیادتی یا سلطنت کا ظلم قرار دے لیکن جہاں تک اصول سیاست کا تعلق ہے اس طرز عمل پر نکتہ چینی کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی

بہر حال مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد ترقی میں یہ جماعت کبھی آزاد وخود سر نہیں رکھی گئی اور ہمیشہ ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ حکومت کے مصالح اور سیاست کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنے احکام فقہی میں تبدیلی پیدا کرتے رہیں، پھر یہ تو یقیناً ہوا کہ جس چیز کو سلطنت کی مصلحت بتایا گیا وہ بارہا مستبدانہ خود غرضی ثابت ہوئی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی عالم دین نے اس خود غرضی کا احساس کر کے صدائے احتجاج بلند کی ہو اور اس کی زبان کو حرکت کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔

پھر غور کیجئے کہ اگر مسلمانوں کی حکومت بدستور قائم رہتی اور اگر بجائے عیسائی حکومتوں کے آج انہیں کی حکومت روئے زمین پر غالب ہوتی تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت جو حالت ہمارے یہاں کے علماء دین کی نظر آتی ہے، اس وقت بھی پائی جاسکتی تھی، قیامت تک ممکن نہ تھا کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے سے احتراز کرتے اور ان کو زندہ سلامت رہنے دیا جاتا کیوں کہ ایک پاپائے روم کیلئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی کلیسا کی دنیا علیحدہ قائم کر کے کاروبار عالم سے کوئی واسطہ نہ رکھے لیکن ایک مسلمان کے دل و دماغ سے کبھی یہ بات نہیں نکل سکتی کہ اس کا مذہب اُس کی دنیا سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اور نہ کبھی یہ بات اس کی عقل میں آسکتی ہے کہ مذہب اسلام کے علاوہ ایک چیز قومیت و

وطنیت اور بھی ہے جو غیر مذہب والوں کو بھی اپنے میں شامل کر کے خالص دنیاوی تمدنی ترقی کیلئے زبردست مرکزیت پیدا کر سکتی ہے

الغرض حکومت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر کوئی مذہب چل سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ وہ ضروریات کے لحاظ سے اپنے احکام و قوانین میں بھی تبدیلی پیدا کرے ورنہ اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے چناں چہ آج ترکی و ایران کے حالات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ وہاں مذہب کی کیا حالت ہے اور علماء مذہب کس بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں، ہندوستان میں جہاں نہ مسلمانوں کی حکومت ہے نہ اکثریت نہ جہانِ علم ہے نہ واقفیت، مولوی جو چاہے کہے جو بدعت جی میں آئے کرتا پھرے لیکن ترکی و ایران میں تو جا کر کہہ دے کہ بینک میں روپیہ جمع کرنا حرام ہے۔

اب اتنا پڑھنے کے بعد آپ پھر ابتدائی سطور پر غور کیجئے اور ٹھنڈے دل سے فیصلہ فرمایئے کہ اس جماعت سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے یا اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے، حکومت تو ہماری ہے نہیں کہ یہ حضرات اس کا ساتھ دے کر عوام پر سلطنت کے اقتدار کو قومی بنائیں اور اس کے عوض میں گراں قدر معاوضے حاصل کرتے رہیں اور چوں کہ یہ خون ان کے منہ لگ گیا ہے اس لئے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ خود اپنی ہی ذات کو دنیا و دین کا مرکز قرار دے کر عوام کو اپنی طرف بلائیں اور اس غرض کیلئے وہ سب کچھ جائز و ناجائز روا رکھیں جو ان کے اسلاف نے شاہان اسلام کیلئے روا رکھی تھیں۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ ایک مولوی کے تمام تعلیمات و نصائح مذہبی کا موضوع صرف ما بعد الطبیعاتی دنیا ہوتی ہے اور وہیں کے خوفناک تاریک مناظر سے ڈرا ڈرا کر وہ اپنی پرستش کرایا کرتا ہے، اس کو مطلق اس سے بحث نہیں کہ دنیا کہاں جا رہی ہے، زمانہ کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے، جہل و تاریکی کس تیزی سے علم کی روشنی میں پیچھے ہٹ رہی ہے، وہ برابر یہی کہے جائے گا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسی کو برحق جانو، وہ اس سے بالکل ناآشنا ہے کہ اس وقت کے اقتصادی مسائل ہم سے کیا چاہتے ہیں، وہ غریب اس سے مطلق آگاہ نہیں کہ ہندوستان کی سیاسیات کا مستقبل کیا ہے، مخلوط و غیر مخلوط انتخاب کیا بلا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ اس جہل پر فخر بھی کرتا ہے، اس نادانی پر ناداں بھی ہے اور کہتا ہے کہ اہلِ جنت تو ایسے ہی سیدھے سادھے بھولے بھالے لوگ ہوتے ہیں در آں حالِ کہ یہ جنت کی مخلوق جو اِن کے معاملات میں اپنے آپ کو اس قدر نیک و بے خبر ظاہر کرنے میں فخر کرتی ہے،

کتنی ہوشیار و باخبر ہے، غریبوں کا روپیہ چھیننے میں اور جاہلوں کا گھر اُجاڑ اُجاڑ کر اپنا گھر بسانے میں جس وقت یہ کسی مجمع میں وعظ فرماتے ہوتے ہیں تو ان کی صورت وحالت یونان کے اس جیوپیٹر دیوتا کی سی ہوتی ہے جس کے ایک ہاتھ میں دوزخ کے انگارے ہیں اور دوسرے میں جنت کی گل فشانیاں اور وہ اپنے آپ کو بالکل مالک و مختار سمجھتے ہیں، خواہ چشمِ زدن میں جلا کر خاکستر کر دیں، خواہ بیک جنبشِ چشم وابرو ہر زرہ کو گل و گلزار بنادیں اور ان لوگوں کی اوّلین کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو دنیا و کسبِ دنیا کے خیال سے منحرف کردیں اور اس کیلیئے وہ غلط توجیہ و تاویل کے ساتھ کلام مجید کی آیتیں بھی پڑھتے ہیں ،احادیث نبوی سے بھی استناد کرتے ہیں، اقوال ائمہ کبار بھی سناتے ہیں اور مثنوی مولانا روم کے اشعار بھی خاص لحن کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس تعلیم کا مقصود حقیقی سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب لوگ دولت کو حقیر سمجھنے لگیں گے تو نہایت آسانی سے ان کے حوالے کر دیں گے اسی کے ساتھ وہ دوسری نفسیاتی ضرب یہ لگاتے ہیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور عہد سلف کے اولیاء کرام کے واقعات سنا کر ان کے خوارق عادات اور کرامات کی داستانیں سنانے لگتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح سینکڑوں سال کی غرق شدہ بارات کو دریا سے نکال لیا، ایک شخص پر نگاہ ڈالتے ہی کیوں کر اس کے دل کا تمام حال بتادیا کسی کے بھاگے ہوئے غلام کو کس طرح ایک تعویز لکھ کر واپس بلا دیا اور پھر آخر میں وہ سارے وعظ کی تان "علماء امّتی کأنبیاء بنی اسرائیل" پر توڑتا ہے اور احمق و جاہل مسلمانوں پر اپنی عظمت و بزرگی، اپنی غیر معمولی قوت روحانی اور اپنی محیر العقول کارناموں کا سکہ بٹھا کر آخر کار ان کی جیبیں خالی کرا لیتا ہے۔

تمام دنیا کی قومیں اس اصول پر ترقی کر رہی ہیں کہ عقول انسانی کی تربیت کیلیئے تمام موانع کو دور کر دینا چاہیئے لیکن یہ فرماتے ہیں کہ نہیں عقلی ترقی روحانی انحطاط ہے اور اب دنیا میں کوئی شخص سوچنے سمجھنے کا مجاز نہیں، جو ہونا تھا وہ ہو چکا، جو کچھ سمجھ میں آسکتا تھا آگیا اور وہ اسی علم و یقین یا ضلالت و گمراہی کو سامنے رکھ کر اپنا دائرہ عمل قائم کرتے ہیں۔ چناں چہ ان کی تصنیف و تالیف، تبلیغ و اصلاح، پند و ہدایات سب اسی اصول کے تحت ہوتی ہے اور اس دائرہ سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہٹنا گوارا نہیں کرتے۔

ایک قوم کے اندر انقلاب کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں، ایک یہ کہ اس قوم کے اندر حسن و اتفاق سے بعض افراد صالح ایسے پیدا ہو جائیں جو قومی جمود کو دور کر دیں یا پھر افرادِ

قوم کے اندر کسی خارجی اثر سے ذہنی اضطراب پیدا ہو جائے، امر اوّل کی تو بظاہر کوئی امید ہندوستان میں نظر نہیں آتی لیکن دوسری صورت کے آثار ضرور رونما ہو چکے ہیں اور ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے جو علماء دین کی تعلیمات کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی ہے لیکن چوں کہ یہاں انسان کی ذہنی و عقلی آزادی کو گہوارہ ہی سے چھیننا شروع کر دیا جاتا ہے اور خدا جانے کتنے زمانہ سے نسلاً بعد نسل اس پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ عادت چھٹتے ہی چھٹے گی اور ہندوستان کا مسلمان مستقبل قریب میں کوئی امید اپنے لئے قائم نہیں کر سکتا، علی الخصوص اس وقت جب کہ ملک کی ایک بڑی قوم ترقی اور ارتقاء کی منزل میں تیزی سے گامزن نظر آرہی ہو اور اس سے تقریباً بے نیاز ہو گئی ہو کہ کون ہمارا ساتھ دے رہا ہے اور کون نہیں۔

الغرض ہندوستان کا مسلمان اس وقت جن راہوں سے گزر رہا ہے وہ اس قدر دشوار گذار ہیں کہ اگر کوئی فوری انقلاب نہایت ہی شدید قسم کا اُن میں رونما نہ ہو تو ان کے نجات کی کوئی صورت نہیں اور ان کا بالکل وہی حشر ہو گا جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا ہوا، کہ چند منہدم آثار تو ان کے باقی رہ جائیں گے لیکن وہ خود کہیں کچھ نہ ہوں گے، ہندوستان کا مولوی یا عالم دین جو بد قسمتی سے ہمارا قائد و رہنما اور ہمارا مصلح بنا ہوا ہے دوزخ و جنت کی روایات بیان کرنے میں رات دن لوگوں سے نمازیں پڑھوانے کی فکر میں تو بے شک منہمک نظر آتا ہے لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کیلئے غور نہیں کرتا کہ جس قوم سے وہ اپنے لئے لذائذ دنیوی حاصل کر رہا ہے اس کی اقتصادی حالت کیا ہے اور اس کا انحطاط کس حد تک پہنچ چکا ہے۔

میں کہتا ہوں، با آواز بلند کہتا ہوں اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے یا نہیں، روزے رکھتا ہے یا نہیں، دوزخ جنت کا قائل ہے یا نہیں بلکہ صرف یہ سوچنے کا ہے کہ مسلمان کے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں، اگر علماء دین ہمارے حقیقی بہی خواہ ہوتے اور ان کے دلوں میں ہمارا سچا درد ہوتا تو اس وقت تمام مواعظ مذہبی کو چھوڑ کر صرف اس پر غور کرتے کہ مسلمان اپنا پیٹ کس طرح بھریں، ان کے بچے بھوک کی تکلیف سے کیوں کر محفوظ رہیں، اور ان کی عورتیں کس تدبیر سے اسباب ستر پوشی حاصل کر سکیں۔ آپ ایک مسلمان کو موٹر پر سوار، نفیس لباس پہنے ہوئے دیکھ کر اس کی خوشحالی اور مسرت کا اندازہ نہ کیجئے بلکہ اس کے گھر میں جا کر دیکھئے کہ کیا حالت ہے اور اس کے دل میں سما کر معلوم کیجئے کہ وہ کس

تکلیف و عذاب میں مبتلا ہے۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے اس قائد و رہنما کو ہمارے اس دینی و دنیوی رہبر کو کبھی اس کا خیال ہوا ہے کہ جس وقت وہ اپنے وسیع دستر خوان پر نفیس نفیس غذائیں کھانے میں مصروف رہتا ہے ٹھیک اسی وقت اس کے پڑوس میں کتنے مسلمان ایسے ہیں جو بھوکے پیاسے پڑے ہوئے ہیں اور کتنے بچے ایسے ہیں جن کی مائیں اپنی خشک چھاتیوں سے ایک قطرہ دودھ کا ان کے منہ میں نہیں ٹپکا سکتیں۔ جس وقت وہ حریر و کمخواب، یا لکھنؤ کی باریک چکن اور ولایتی تن زیب کی اچکن پہن کر ایک ادائے معشوقانہ ساتھ موٹر پر سوار ہونے کیلئے گھر سے باہر نکلتا ہے، کیا ایک لمحہ کیلئے بھی کبھی اس کا خیال اس حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس قوم کے کتنے افراد اس وقت جھلسا دینے والی دھوپ میں ننگے بدن، برہنہ پا پتھر توڑ رہے ہیں، کیا اس سے زیادہ دنیا میں کوئی بے غیرتی، بے حیائی اور بے شرمی ہو سکتی ہے کہ جو افراد فاقہ کر کر کے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے لئے یہ نعائم ولذائذ فراہم کریں انہی کے دکھ درد کی طرف سے وہ یوں بے خبر و بے پرواہ رہے، ہر چند فرعون و نمرود کو گذرے ہوئے زمانہ گزر گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے اور اسی اخلاق سوز و انسانیت شکن خصوصیات کے ساتھ باقی ہے جو کسی وقت ان کے اسلاف میں پائی جاتی تھیں مگر فرق صرف یہ ہے کہ اُن پر عذاب نازل ہو چکا اور اِن کیلئے ہنوز دست خدا میں انتظار کر رہا ہے۔

لکھنوی علماء کے کسی مجمع میں ایک بار میں نے دریافت کیا کہ "فرمایئے اب کیا ارادہ ہے اور قومی فلاح و بہبود کیلئے کون سی مقامی تحریک آپ کے پیش نظر ہے"؟ ان میں سے ایک نے کہا "ہاں! عرصہ سے ہمارا خیال ہے کہ یہاں کے مسلم کلب کی حالت درست کی جائے اور انسائیکلو پیڈیا کے قسم کی ----ایک کتاب اردو میں لکھی جائے" یہ سنتے ہی میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا "قبلہ اپنے جھونپڑے کو محل بنانے سے پہلے کیوں آپ اس کی آرائش و زینت کی فکر میں مبتلا ہیں۔ تمدن کی ترقی، جاہ و ثروت کے تنعم کے ساتھ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہے گا۔ نہ جانے کتنے کلب قائم ہو جائیں گے، کتنی انسائیکلو پیڈیاں بن جائیں گی۔ اس وقت تو سوال جزِّ حیات کا ہے، بقاء زندگی کا ہے، تن پوشی اور دفع گرسنگی کا ہے، اس لئے طریقہ زکوٰۃ کو منظم کیجئے۔ قومی بیت المال کی طرح ڈالئے۔ گھر گھر جا کر دیکھئے کہ کون کس حال میں مبتلا ہے اور سب سے پہلے اس زخم کا علاج کیجئے جس نے ساری قوم کو مفلوج بنا رکھا ہے"۔ یہ سن کر فرمانے لگے کہ "یہ تحریک بھی

ضروری ہے اور انشاء اللہ الرحمٰن اس پر غور کریں گے" لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ جب مولوی کسی بات کو انشاء اللہ سے شروع کرتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔

یہ ہے حال ان تمام اداروں کا جنہیں ہم مدرسہ و خانقاہ کہتے ہیں اور جہاں سے یہ زہریلے افعیٰ نکل نکل کر ہندوستان کی مسلمان آبادی کو ڈس رہے ہیں ان کے علاوہ بعض ادارے ایسے ہیں جو صرف تصنیف و تالیف کیلئے وقف ہیں اور جن کے مدیروں کو فخر ہے کہ دنیا میں بڑا کام کررہے ہیں، مسلمانوں کی عظیم و شان خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن چوں کہ ان کی ذہنیتیں ابھی اسی مسموم ماحول کی پیداوار ہیں اس لئے ان کی جملہ تصانیف غیر ضروری اور غیر اہم بلکہ ایک حد تک مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں یہ بڑی بڑی کتابیں تاریخ و جغرافیہ کی لکھ رہے ہیں لیکن ان کی حقیقت داستان پارینہ دہرانے سے زیادہ کچھ نہیں یہ فلسفہ و مذہب پر موٹی موٹی تالیفات پیش کررہے ہیں لیکن بالکل اسی اندھے کی طرح جس کا سہارا ایک لکڑی کے سوا کچھ نہ ہو، اوّل تو ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ وقت اس قسم کی تصنیف و تالیف میں ضائع کرنے کا نہیں بلکہ دوڑ کر اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے اور ڈوبتے ہوؤں کو باہر نکالنے کا ہے، اور اگر یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے تو پھر کم از کم ایسے لٹریچر پیش کرنے کا ہے جو دوسروں میں یہ ولولہ پیدا کرے جس وقت کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو علوم و فنون کا ذخیرہ خود اپنے ساتھ لے آتی ہے اور ہر جگہ علمی ادارے قائم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن جب انحطاط ہوتا ہے تو یہ ادارے خود بخود ضعیف ہونے لگتے ہیں اور ان کو کوئی قوت سنبھال نہیں سکتی۔ اس لئے جس رنگ کی تصانیف ہمارے یہاں کے بڑے مصنفین پیش کررہے ہیں وہ وقت کے لحاظ سے بالکل لغو و بے کار ہیں اور ان سے ملک و قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ مضرت کا اندیشہ ہے کیوں کہ ان کا موضوع اور ان کے اصول ترتیب وہی آزادیٔ عقل و ضمیر کے چھیننے والے اور اندھی تقلید کو مضبوط کرنے والے ہیں جس نے مسلمانوں کو نکبت و ذلت کی اس منزل تک پہنچا دیا ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اور اپنی بقاء و تحفظ کیلئے کیا تدابیر عمل میں لانا چاہئے۔

غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ اس وقت کرۂ زمین پر مسلمانوں کی آبادی تقریباً 40 کروڑ ہے اور اسی کے ساتھ غالباً یہ بھی آپ کے علم میں ہو گا کہ یہ آبادی کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ آپ نقشہ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ ایک طرف یہ سلسلہ مغربی افریقہ

کے سواحل اٹلانٹک سے شروع ہو کر بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا مصر اور مغربی ایشیاء تک پہنچتا ہے اور پھر سواحل بحرِ قلزم اور بحرِ اسود سے شروع ہوتا ہوا سائبیریا اور منگولیا تک پہنچ جاتا ہے۔ دوسری طرف مشرقی ساحل افریقہ سے شروع ہو کر مڈغاسکر کے عرض البلد پر منتہیٰ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک سلسلہ وہ ہے جو افغانستان کے کوہستان کو عبور کر کے ہندوستان تک پہنچتا ہے اور یہاں سے جزیرہ نمائے ملایا ہوتا ہوا مشرقی مجمع الجزائر تک پہنچ جاتا ہے۔

اچھا اب اسی کے ساتھ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اسلام کی یہ تدریجی ترقی نہ تھی بلکہ ایک سیلاب کی سی ترقی تھی جو وقتاً فوقتاً اٹھتا رہا اور چند صدیوں میں کرۂ ارض کے اتنے وسیع حصہ پر محیط ہو گیا ۶۳۰ء اور ۷۵۰ء کے درمیان ہسپانیہ اور مراکش سے لے کر وسط ایشیاء تک پھیل گیا اور تقریباً ڈھائی صدی تک اسی جگہ محدود رہا۔ اس کے تقریباً ڈھائی صدی بعد ۱۰۰۰ء اور ۱۱۰۰ ء کے دمیان اس کی وسعت مغربی افریقا سے لے کر ایشیاء کوچک، وسط ایشیا اور شمالی ہند تک پہنچ گئی۔ پھر دو صدی گزرنے کے بعد ایک اور لہر اٹھی جس نے (۱۳۰۰ء اور ۱۴۰۰ء کے درمیان) جزیرہ نمائے بلقان سے لے کر سائبیریا، ہندوستان اور مجمع الجزائر تک تمام حصہ کو اپنے اثر میں لے لیا اور اس طرح جو نقشہ مسلم آبادی کا ۱۴۰۰ء میں قائم ہو گیا تھا تقریباً وہی اب بھی نظر آتا ہے۔

اس وقت میں اس امر سے بحث نہیں کروں گا کہ اس کی ترقی کے کیا اسباب تھے، یعنی کوئی خاص اخلاقی خوبی اسلام میں ایسی تھی جس کا اثر دنیا پر پڑا یا یہ کہ صرف اس کی عسکریت کو اس کا امتیاز دینا چاہئے بہر حال حقیقت یہ ہو یا وہ، ہمیں اس سے بحث نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اسلام جہاں جہاں گیا کن خصوصیات کے ساتھ گیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا لیکن اس پر غور کرنے سے قبل بطور اصول موضوعہ ہم کو یہ متعین کر لینا چاہئے کہ اسلام سے ہماری مراد اس مضمون میں کیا ہے۔

میں اس سے قبل بھی ظاہر کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ دین و مذہب بالکل علیحدہ چیزیں ہیں یعنی دین نام ہے اس اعتقاد کا جو متعلق ہے ہماری عبادات سے، ہماری مابعد الطبیعات اور اس سکون نفس سے جو کسی مخصوص عقیدہ کی بناء پر انفرادی طور پر ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے سوسائٹی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، لیکن مذہب نام ہے اس تہذیب و تمدن کا جو کسی دین کے تحت دنیا میں قائم ہو جاتا ہے۔ اور

جس کا تعلق انسان کی ہیئتِ اجتماعی سے ہوتا ہے، اس کا میں وہی مفہوم قرار دیتا ہوں جو انگریزی میں لفظ (Culture) کا ہے پس میری مراد بھی مضمون زیر بحث میں مذہب سے ہے نہ کہ دین سے یعنی میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اسلام بہ لحاظ اعتقاد مذہبی نہیں بلکہ بحثیت ایک خاص مذہب(Culture) ہونے کے کیا خصوصیات اپنے ساتھ ہر جگہ لے گیا۔

اب اس سلسلے میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا اس وقت اس کا ماحول کیا تھا اس میں کلام نہیں کہ اسلام پیدا ہوا ایشیا ہی کے ایک گوشہ سے لیکن اثر اس نے قبول کیا یورپ کی اس تہذیب کا جس کے لئے صحیح لفظ میرے خیال میں صرف ”یونانیات“ ہے مگر اس سے مراد ملک یونان کی تہذیب نہیں بلکہ وہ تمام مغربی تہذیب مقصود ہے جو حقیقتاً مجموعہ تھی، رومہ و یونان دونوں کی تہذیب کا اور جس سے نہ صرف سارا یورپ بلکہ جزیرہ نمائے عرب بھی عرصہ تک متاثر رہنے کے بعد اپنے دور انحطاط میں اسی کے زیر اثر نظر آتا تھا چناں چہ تاریخ شاہد ہے کہ ولادتِ نبوی و بعثت کے وقت سرزمین حجاز میں بھی یہود و نصاریٰ ہی کا اثر قائم تھا، اہلِ عرب باوجود اس کے ان کی بت پرستی شدید قسم کی بت پرستی تھی، نصاریٰ و یہود کے علماء کا خاص احترام کرتے تھے اور ان کے علم و فضل اور روحانیت کے قائل تھے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ اہلِ عرب میں بت پرستی کا خیال خود یونان و رومہ سے آیا تھا لیکن اس کی بڑی وجہ سلطنت رومہ کے اقتدار و وسعت، ہیئت و جبروت کی وہ روایات قدیمہ تھیں جو عرب میں ایک ایک بچہ کے ذہن نشین ہو چکی تھیں اور قدرتاً ہونا چاہئے تھیں جب کہ اس وقت بھی قسطنطین اعظم کا مسیحی جھنڈا آبنائے باسفورس پر لہراتا ہوا ہر شخص کو نظر آتا تھا۔

ہر چند اسلام نے اپنی فتوحات کا اوّلین حدف یونان و رومہ ہی کی حکومت کو قرار دیا لیکن بجائے اس کے کہ یونانیات کا اثر زائل ہوتا مسلمانوں پر اور زیادہ رنگ اس کا چڑھ گیا، یعنی گو ظاہری حکومت تو اہلِ یورپ سے ضرور چھن گئی لیکن اس کی تمدنی حکومت عربوں پر اور زیادہ قائم ہو گئی چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ عربوں نے نہ صرف علوم و فنون میں یونانی لٹریچر کا اثر قبول کیا بلکہ تدوین شرع و فقہ میں بھی ارسطو کی تصانیف سے مدد لی گئی حتیٰ کہ بعض مفسرین نے تو سکندر اعظم کو پیغمبر تک قرار دے دیا۔ ایک ہی تہذیب کی مختلف قوموں کا ایک دوسرے سے برسرپیکار ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔

ہمیشہ ہوا ہے اور ہو گا خود مسلمانوں میں باہم جس قدر جنگ و خوں ریزی ہوئی ہے کسی سے مخفی نہیں، الغرض مسلمانوں. کا رومہ و یونان کے مقبوضات کو تصرف میں لے آنا اگر ایک طرف اسلام کی فتح تھی تو دوسری طرف یونانیت کی بھی کامیابی تھی جس سے اسلام برابر متاثر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اگر ایرانی تہذیب جو جزیرہ نمائے عرب میں کہیں کہیں اکاسرۂ عجم کے سطوت و اقتدار کو قائم کئے ہوئے تھی اس وقت نہ پائی جاتی جس سے اہلِ عرب ایک حد تک متاثر ہو چکے تھے تو آج مسلمانوں کی تہذیب یکسر مغربی تہذیب ہوتی اور اس میں ادنیٰ شائبہ بھی مشرقیت کا نہ پایا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ ترقی میں علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام دی لیکن اس کی بنیاد بھی وہی یونانیات تھی جس نے کسی وقت اسلام کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور آخر کار ان کے تمام شعبہ ہائے حیات کو اس قدر سختی کے ساتھ جکڑ لیا کہ آج ہندوستان میں بھی جہاں مسلمانوں کو رہتے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں وہی مغربی خصوصیت اُن کی قائم ہے اور جس نے ان کے مستقبل کو مشرق میں حد درجہ تاریک بنا رکھا ہے۔

آپ اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ مسلمان جہاں گئے اپنی تہذیب اپنے ساتھ لے گئے اور کسی مفتوحہ ملک کے تمدن سے متاثر نہیں ہوئے جو بالکل مغربی ذہنیت ہے۔

ہندوستان میں ایک غضب اور یہ ہوا کہ دور مغلیہ ختم ہونے کے بعد انگریزوں کی حکومت شروع ہو گئی جو ایک مغربی قوم تھی اور اپنی تمام مغربی خصوصیات اپنے ساتھ لائی تھی اس لئے جس وقت جذبات عناد و انتقام مسلمانوں کے سر دپڑ گئے تو پھر وہی ان کی تقلید میں پیش پیش نظر آنے لگے اور اپنے اوپر افرنجیت طاری کرنے میں نمایاں سبقت کا اظہار کیا۔

چناں چہ اس وقت بھی جب کہ ہندوستان میں ایک سخت سیاسی انقلاب کے آثار پیدا ہو گئے ہیں، بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر ہو کر حقیقی معنٰی میں خدمتِ وطن پر آمادہ نظر آتے ہوں، ورنہ اکثر حصہ انہی افراد کا ہے جو انگریزوں کی طرف مائل ہیں اور ان کو ہندوؤں پر ترجیح دیتے ہیں۔

آپ کسی مسلمان سے جس نے کچھ بھی مذہبی تعلیم حاصل کی ہے دریافت کیجئے کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں میں کس کو بہتر سمجھتا ہے تو وہ فوراً انگریزوں کا نام لے دے گا اور یہ

دلیل بیان کرے گا کہ وہ صاحب کتاب ہیں اور یہ کافر، ان کی لڑکیوں سے ہم شادی کرسکتے ہیں اور ان کے یہاں نہیں۔ کلام پاک ان کے ساتھ صلح آشتی سے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور مشرکین اور کفار سے نہیں، الغرض وہ بہت سے اسباب و دلائل نصاریٰ کی ترجیح میں پیش کرسکے گا پھر چوں کہ مسلمانوں کی یہ ذہنیت بہت قدیم ہے اور صدیوں کی پڑی ہوئی عادت کا ترک ہونا تقریباً محال ہے اس لئے اگر اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی قومی و ملکی تحریکوں میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا تو یہ ان کی فطرت تھی، ان کی مذہبی ذہنیت کا اقتضاء تھا جس میں وہ بڑی حد تک مجبور تھے اور ہیں۔ میں نے جہاں تک مسلمانوں سے اس باب میں تبادلہ خیال کیا ہے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ اپنی تہذیب یا اپنے (Culture) کو بدلنے کیلئے تیار نہیں اور ان کو یقین ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کی سطح پر نہ آیا جائے اور ان کی سطح پر آنا اپنی قدیم تہذیب کی روایات کو صدمہ پہنچانا ہے۔

اس لئے اب سب سے پہلا اصولی سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان کے مسلمان اپنی قدیم روایات تہذیب کو صدمہ پہنچائے بغیر کوئی ملکی یا وطنی جذبہ ہندوستان کے متعلق قائم کرسکتے ہیں یا نہیں اور اگر نہیں تو پھر نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

سوائے ہندوستان کے اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں ان کے حالات پر ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کو منطبق نہیں کرسکتے کیوں کہ ترکی، ایران، افغانستان، عرب و مصر میں نہ وہ محکوم کی حیثیت سے ہیں نہ اجنبی اقوام میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا ملک ہے ان کی آبادی ہے، ان کی حکومت ہے اور اس لئے اگر وہاں کے مسلمانوں کو ان کی مغربی ذہنیت یورپ کی طرف کھینچ رہی ہے تو درست ہے اور انہی اصول کو سامنے رکھ کر ترقی کرسکتے ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمان اگر ان کی پیروی کرنا چاہیں تو یہ کیوں کر کامیاب ہوسکتے ہیں جب کہ ہندوؤں کی بیداری نے مغربی حکومت کا جُوا اپنی گردن سے علیحدہ کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے اور مسلمانوں کیلئے یہ رہا سہا سہارا بھی ختم ہوتا نظر آتا ہے۔

ہماری قدامت پرستیاں

"کسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے جو دریا کی سطح پر مصلا بچھالیتے تھے اور اس پر نماز پڑھتے ہوئے اس کو عبور کر جاتے تھے۔"

"کوئی ولی اللہ کسی طرف سے گزر رہے تھے کہ ایک کنوئیں پر انہوں نے آدمیوں کا ہجوم دیکھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ایک بھینس اندر گر گئی ہے اور لوگ اس کے نکالنے کی فکر میں ہیں، انہوں نے کنوئیں میں ہاتھ لٹکا کر جو باہر نکالا تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ بھینس باہر کھڑی ہوئی ہے"۔

"کسی زمانہ میں ایک صاحب کرامت درویش کثرت ریاضت سے اس قدر لطیف ہوگئے تھے کہ پڑکا ان کے جسم سے آر پار ہو جاتا تھا اور ان کا بدن حائل نہ ہوتا تھا"۔

"تذکرۃ الاولیاء" قسم کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے تو ہزاروں واقعات آپ کو اس سے زیادہ حیرت انگیز نظر آئیں گے لیکن آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ کیا واقعی کسی وقت ہمارے یہاں کے اکابر مذہب و تصوف سے اس قسم کی محیر العقول باتیں ظاہر ہوئی تھیں اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کا کیا سبب تھا اور کس فائدہ و نتیجہ کیلئے تھا اور اب اس "کشف اور کرامات" کے لوگ کیوں نظر نہیں آتے؟"

آپ کسی شخص سے جو ان باتوں کی صحت کا قائل ہے یہ سوال کریں گے تو وہ نہایت ہی غم آلود و حسرت ناک چہرہ بنا کر کہے گا کہ "یہ اگلے لوگوں کی باتیں ہیں جو انہی کے ساتھ گئیں نہ اب وہ ریاضتیں ہیں نہ عبادتیں، نہ وہ روحانیت ہے نہ صداقت، نہ وہ ایمان ہے نہ وہ یقین" پھر آپ اس سے پوچھئے کہ اب ایسا کیوں نہیں ہے، کیا مسلمان دنیا میں نہیں رہے، کیا عبادت کا اصول بدل گیا، کیا اصول اخلاق و روحانیت میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا، تو وہ اس کے جواب میں سوا اس کے کہ اپنی کم بختی کا رونا روئے، خدا کی مرضی پر محمول کرے یا کُل جگ کی خرابی بتا کر خاموش ہو رہے اور کچھ نہ کہے گا۔

اکثر و بیشتر میرے پاس ایسے حضرات کرم فرماتے رہتے ہیں جو میرے کفر و الحاد میں میرے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں، مجھے راہ راست پر لانے کی سعی فرماتے ہیں چناں چہ چند دن ہوئے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور اس عزم کے ساتھ کہ وہ مجھے بے دین کو بغیر مسلمان بنائے ہوئے نہ اٹھیں گے، میں ان کی قطع صورت، ان کی شرعی وضع اور ان کے ہنگامہ خیز " السلام علیکم " سے چونک کر پہلے سے سمجھ گیا تھا کہ آج پھر کوئی" خداوند" اپنے"ناچیز بندہ "کو سعادتِ جلوہ بخشنے کیلئے آیا ہے، اس لئے تعظیماً و احتراماً اٹھ بیٹھا، صدر میں جگہ دی اور مؤدب ہو کر خاموش بیٹھ گیا، پہلے تو وہ بڑی دیر تک نہایت غور سے میری صورت وو ضع کو دیکھتے رہے اور پھر ایک نہ چھپ سکنے والے خشونت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ " میں نے سنا ہے کہ تم معجزہ و کرامت کے قائل نہیں " میں نے عرض کیا کہ "یہ تو آپ نے غلط سنا ہے" کیوں کہ کل ہی میں کارنوال میں وان نار من کا معجزہ دیکھ چکا ہوں جو ۱۰۰ فِٹ کی بلندی سے ۳۰ فِٹ کی جست لگاتا ہوا آگ کے شعلوں کے اندر غائب ہو جاتا ہے علاوہ اس کے یہاں کے پروفیسر معشوق علی کی کرامتیں بارہا دیکھ چکا ہوں جو ایک رومال سے درجنوں رومال اور ایک روپیہ سے سیکڑوں روپے آن کی آن میں بنا دیتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور برہم ہو کر بولے تو کیا رسولوں کے معجزے اور اولیاء کی کرامات بھی کوئی شعبدہ بازی تھی۔ میں نے کہا" مجھے اس کا علم نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرے لئے تو ان لوگوں کے یہ تماشے بھی معجزے ہی کا حکم رکھتے ہیں کیوں کہ میں ویسا کرنے سے عاجز ہوں ------فرمایا------" مشق سے ہر شخص ایسا کر سکتا ہے" -----میں نے کہا کہ -----"ایک منکر مذہب معجزوں کے متعلق بھی یہی کہہ سکتا ہے" بولے ------" مگر اس کا یہ کہنا تو غلط ہو گا کیوں کہ وہاں مشق و اکتساب کا کوئی سوال نہ تھا اور معجزہ اصطلاح میں کہتے ہی اس کو ہیں جو ایک نبی سے بغیر کسی مشق و اکتساب کے سرزد ہو" میں نے کہا" بجا ارشاد ہوا، لیکن اگر آج کل کے شعبدے دکھانے والے بھی یہی دعویٰ کر بیٹھیں کہ جو کچھ وہ دکھاتے ہیں اس کا تعلق مشق و اکتساب سے نہیں ہے تو آپ کیا فرمائیں گے؟------کہنے لگے ------" ہم اسے جھوٹا کہیں گے اور سیکڑوں مثالیں ایسی بتا دیں گے کہ مشق سے لوگ ویسا کرنے میں کامیاب ہو گئے"۔ میں نے کہا" یہ درست ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے شعبدہ و معجزے میں

کوئی فرق مجھے نظر نہیں آتا، سوا اس کے کہ ایک شخص کسی وہبی قوت کی وجہ سے اس کے ظہور کا مدعی ہے اور دوسرا مشق واکتساب سے ------- اس سے اخلاق انسانی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔

بولے "معجزہ تو صرف اس لئے ہے کہ نبی کو نبی مانیں اور اس کے کہنے پر عمل کریں" ------میں نے کہا----- " تو خلاصہ یہ ہوا کہ نبی وہ ہے جس سے معجزہ سرزد ہو اور معجزہ وہ ہے جو نبی سے ظاہر ہو، کہنے لگے "بے شک"۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کے رہنماو قائد اس عقیدہ وخیال کے ہوں گے وہ کیوں نہ اعجوبہ پرست ہو گی اور اس کا یہ عقیدہ کہ "اسلاف" کے سے صاحبان علم و عزیمت، حاملان فضل و کرامت اب نہیں پیدا ہوسکتے اس کو کس درجہ مایوس اور ناکارہ بنادے گا۔ اس میں شک نہیں کہ عہد ماضی میں انسان کیلئے بہت کچھ دلچسپیاں ہوا کرتی ہیں اور گذرے ہوئے واقعات بعض دماغوں کیلئے ایک طلسم زار کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں لیکن اس کا تعلق صرف ہمارے جذبات، محبت، عقیدت سے ہے جو انسان کے عہد وحشت سے دراثتاً منتقل ہوتے چلے آئے ہیں اور اب ہم ان کو ایک حقیقت وواقعہ سمجھنے لگے ہیں۔

ادارۂ مذہب کے قیام کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کی بنیاد ہمیشہ کسی ایک مخصوص ہستی کے ساتھ جذبۂ خوف واحترام یا محبت وعقیدت پر قائم ہوئی اور اس ہستی کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے اپنی عقیدت وارادت کو وسیع و مستحکم بنانے کیلئے بہت سی ایسی باتیں اپنی طرف سے اضافہ کر کے بیان کرنا شروع کیں جو لوگوں کو مرغوب یا راغب کرنے والی تھیں، چناں چہ انبیاء کے معجزے، اولیاء کی کرامات، درویشوں کی خوارق عادات سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ صرف ہمارے ہی ارادت مندانہ جذبات یا مصالح تبلیغ کی پیداوار ہیں پھر جس طرح سو سال پیشتر کے کسی بزرگ کے حالات میں اس وقت ایک معتدبہ اضافہ اس کی کرامات کا نظر آتا ہے اسی طرح آج کسی بزرگ کے متعلق بھی سو سال بعد ایسی ہی روایتیں منسوب کردی جائیں گی اور جس طرح چار قرن پہلے کی پختہ قبر آج کسی نہ کسی بزرگ کا مزار بن گئی ہے اسی طرح نصف صدی بعد آج کی بنی ہوئی قبر پر بھی پھولوں کی چادر کا چڑھایا جانا مستبعد نہیں، اگر جہل وواہمہ پرستی کا یہی عالم رہا۔

ہمارے اسلاف نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ اس میں شک نہیں کہ لائق صد ہزار آفرین وستائش ہے لیکن یہ کہنا کہ جو کچھ وہ کر گئے ہیں اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں اور جو کچھ وہ کہہ گئے ہیں اس کو بلا چون وچرا آنکھ بند کر کے تسلیم کر لینا چاہیئے حد درجہ مُضر تعلیم ہے اور ایک قوم کی دماغی وذہنی ترقی کو خاک میں ملا دینے والی ہے۔

آیئے اپنے بعض اسلاف کی علمی تحقیق اور ذہنی ترقی کا ایک لطیفہ سن لیجئے:

علامہ قزوینی اور علامہ دمیری سے غالباً ہر وہ شخص واقف ہوگا جس نے تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے۔ علامہ قزوینی وہی ہیں جنہوں نے "تاریخ گزیدہ" مرتب کی، ظفر نامہ لکھا اور نزہۃ القلوب تصنیف فرمائی، یہ حُر بن یزید کی اولاد میں سے تھے جن کو میدان کربلا میں سید الشہداء کے ہم رکاب جہاد کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور مذہباً شیعہ تھے۔ علامہ دمیری آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ، محدث و مفسر تھے، جامع ازہر قاہرہ میں فلسفہ وادب کے لیکچرار تھے، خاص سرزمین مکہ میں سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھتے تھے، صاحب کرامات بھی مانے جاتے تھے اور منجملہ خطبات و دیگر کتب کے ایک مشہور کتاب حیات الحیوان کے بھی مصنف تھے۔

الغرض یہ دونوں ایسے صاحب فضل و کمال تھے کہ آج کوئی مولوی وعالم اُن کے مرتبہ تک پہنچنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن ان کی تحقیق انیق اور ان کی پختگی ذہن کا کیا عالم تھا حیاۃ الحیوان لے کر اسکول کے کسی طالب علم کو دے دیجئے اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دیجئے ----- مثالاً ان حضرات کی کاوش علمی کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ عقاب کی تحقیق کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"جب عقاب (چیل) سال خوردہ ہو جاتی ہے اور بینائی کھو بیٹھتی ہے تو وہ فضا میں بلند ہوتی ہے اور اس حد تک اوپر اڑ کر چلی جاتی ہے کہ اس کے پر تمازت آفتاب سے جل جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ نیچے گرتی ہے اور ایک شور و تلخ پانی کے کنوئیں میں غوطہ لگا کر از سر نوجوان ہو جاتی ہے" (قزوینی)

جب چیل ضعیف و کمزور ہو کر اندھی ہو جاتی ہے تو اس کے بچے اس کو چاروں طرف لادے پھرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک چشمہ تک پہنچتے ہیں اور اس میں غوطہ لگاتے ہیں، اس کے اثر سے چیل کی بینائی عود کر آتی ہے اور وہ از سر نوجوان ہو کر اپنی شکاری زندگی شروع کر دیتی ہے"۔

کرگس چیل کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اور چیل کرگس کے انڈے سے، تمام چیلیں مادہ

ہیں اور دوسری چڑیوں سے جفتی کھاتی ہیں یہ صرف تین انڈے دیتی ہیں لیکن تیسرے انڈے کو پھینک دیتی ہیں اور صرف دو سیتی ہیں، تیسرے انڈے کو ایک اور طائر جس کا نام کاسر العظام (ہڈی توڑ) ہے اٹھالاتا ہے اور اس سے بچہ نکالتا ہے۔ چیل، ہندوستان سے ایک پتھر لے آتی ہے اور گھونسلے میں رکھ دیتی ہے تاکہ انڈے دینے میں آسانی ہوا یہ پتھر کھوکھلا ہوتا ہے جس کے اندر ایک اور پتھر ہوتا ہے یہ پتھر عورتوں کے وضع حمل میں بھی آسانی پیدا کرتا ہے۔ (دمیری)

غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ عقاب کے متعلق جو کچھ ان محققین نے لکھا ہے وہ صرف نقل ہے قدیم یونانی روایات کی جو عہدِ قدیم سے ان کے یہاں رائج چلی آرہی تھیں پھر جب آٹھویں صدی ہجری تک ہمارے ہاں کے مورخین و مصنفین کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ وہ روایات قدیمہ سے ایک انچ ہٹ کو خود اپنے ذہن و عقل سے کام لینا گناہ سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ اس سے قبل اور کیا عالم رہا ہو گا اور ان کے علمی کارناموں کی زمانۂ موجودہ میں کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

یقیناً ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں کیوں کہ جو کچھ انہوں نے کہا وہ ان کی بساطِ عقل کے لحاظ سے بالکل درست تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ تفتیش و تحقیق نے غیر معمولی وسعت اختیار کرلی ہے کیوں کسی کو اس امر کے ماننے پر مجبور کیا جائے کہ اسلاف جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہم انہی کا اتباع کر کے ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہی وہ قدامت پرستی ہے جو اس سے قبل خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ و برباد کر چکی اور اب مسلمانوں کی جماعت اس کا شکار بنی ہوئی ہے۔

اعجوبہ پرستی کا دور گزر گیا، یہ دور ہے صرف تجربہ و مشاہدہ کا اس لئے اب نہ معجزہ و کرامات پر محض اس لئے یقین کیا جاسکتا ہے کہ قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہے اور نہ صرف خوارق عادات کی بناء پر کسی کی عظمت و بزرگی ثابت کی جاسکتی ہے کیوں کہ جب تک "طبیعات" کی دنیا تک انسان کا دسترس نہ تھا کسی کا دس فِٹ بلند جست کرلینا بھی معجزہ کہلایا جاسکتا تھا لیکن اب کہ طیاروں اور ہوائیوں کے ذریعہ سے ہم دوشِ ثریا ہو جانا بھی مستبعد نہیں، اولیاءِ کرام کی خوارق عادات کو ان کی بزرگی کے ثبوت میں پیش کرنا صرف یہی معنٰی رکھتا ہے کہ آج ہم یورپ کے ایک ایک موجد و مخترع کو صاحبِ کرامات یقین کرنے پر مجبور ہیں۔

کس قدر افسوس ناک امر ہے کہ اس وقت بھی جب تمام دنیا میں علم کا اُجالا پھیل گیا ہے اور انسان حقیقی معنیٰ میں ”خلافت الہیٰ“ کے دور سے قریب تر ہوا جارہا ہے ہم بدستور اسی زمانہ میں ہیں جب بقول قزوینی وومیری چیل کے گھونسلے میں پارس پتھر پایا جاتا تھا اور مستقبل کی امیدیں صرف نزول مسیح اور ظہور مہدی سے وابستہ کئے ہوئے ہیں۔

کاش ہم سمجھ سکتے کہ اس وقت دنیا کو حاجت نہ مہدی کی ہے نہ مسیح کی بلکہ ضرورت ہے ایڈیسن و مارکونی کی، رامان اور بوس کی، کیوں کہ انسان اب معجزہ و کرامات کی حدود سے گزر کر عالم جدوجہد کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں خود اس میں ”جذبہ الوہیت“ پیدا ہوتا نظر آرہا ہے اور انسانیت کبریٰ کا مشاہدہ ایک ایسی ”حقیقتِ ذاتی“ کا احساس اس کے اندر پیدا کررہا ہے جس کو اگر ہم چاہیں تو معرفت ربانی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں اور قرب الہیٰ سے بھی۔

اس لئے اگر تم قدامت پرستی کی لعنت سے آزاد ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو احمق و جاہل نہ سمجھو بلکہ ہوش گوش والا انسان باور کرکے ہر بات کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اپنے ذہن و دماغ کو نوامیس قدرت کی گتھیاں سلجھانے کا اہل بناؤ اور پرستش اسلاف ترک کردو کہ اس سے زیادہ سنگ گراں ترقی کی راہ میں اور کوئی نہیں ہوسکتا اسی کے ساتھ اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم میں بھی اسی کا لحاظ رکھو کہ ان کی عقلی آزادی مجروح نہ ہونے پائے اور دوسروں کی پیروی میں مطالعۂ اشیاء کی عادت ان کی ”حریت فکر“ کو تباہ نہ کردے پھر اگر تمہاری ایک نسل بھی اسی اصول کے تحت تربیت پاگئی تو سمجھ لو کہ تمہاری تمام مصیبتیں دور ہو گئیں ورنہ کل جو تم کو اور تمہاری اولاد کو دیکھنا ہے اسے آج میری زبان سے سن لو اور یاد رکھو کہ جس طرح اور ہزاروں اندھی قومیں اب سے قبل تباہ ہوچکی ہیں اسی طرح تم کو بھی تباہ و برباد ہو جانا ہے اور خدا اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ مسلمان کا وجود دنیا میں باقی رہے یا نہ رہے۔

مذہب والحاد

کبھی آپ نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ کیا وہ کوئی معمہ ہے جسے عقلِ انسانی اِس وقت تک حل نہیں کر سکی۔ کیا وہ کوئی دقیق علمی مسئلہ ہے جس کی حقیقت کا علم ابھی تک نوع انسانی کو نہیں ہو سکا۔ کیا وہ کوئی خیالی تارو پود ہے جس کی گتھیاں کبھی سلجھائی نہیں جا سکتیں۔ کیا وہ فطرت کا کوئی ایسا راز ہے جو کبھی بے نقاب نہیں ہو سکتا، اور کیا وہ کوئی شاعرانہ دعا ہے جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوا؟

یقیناً مذہب ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے نہ وہ کوئی معمہ ہے نہ دقیق علمی مسئلہ، نہ وہ کوئی خیالی چیز ہے نہ فطرت کا عمیق راز، نہ وہ شاعری ہے نہ محض لفاظی، پھر کیا ہے؟

اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے صرف خدا کی پرستش و نیایش کا، تو آپ کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہو گا۔ کیوں کہ اس سے نہ خدا کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ انسان کو، اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے بے چون وچرا ان صحائف پر ایمان لے آنے کا، جنھیں ملہماتِ ربّانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو آپ کو اس کے ماننے میں پس و پیش ہو گا۔ کیوں کہ بغیر سمجھے ہوئے کسی بات کی تصدیق کرنا، عقلِ انسانی کے منافی ہے۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ مذہب نام ہے چند متعین حرکات و مراسم کا، بعض مخصوص الفاظ کے زبان سے ادا کر دینے کا، تو آپ کو اس کی صحت سے اور بھی انکار ہو گا کیوں کہ ان باتوں سے تاثراتِ دماغی کو کیا واسطہ؟ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے احساسِ انسانیت کا، تو غالباً اصولی نقطۂ نظر سے نہ زاہدو متقشف کو انکار ہو گا اور نہ عقلیت پرست انسان کو، پھر آپ کا وقت تو ضائع ہو گا لیکن آیئے چند لمحات اس کے سمجھنے میں بھی صرف کر دیں کہ احساسِ انسانیت کیا چیز ہے۔

میں انسان پیدا ہوا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ واقعی انسان ہوں، لیکن اگر میں چھری لے کر اپنے کسی عضو کو مجروح کر ڈالوں یا کسی بلند دیوار پر چڑھ کر نیچے کود پڑوں تو کیا آپ اس وقت بھی مجھے انسان کہیں گے؟ غالباً نہیں۔

زید نہایت زیرک انسان ہے۔ لیکن دو اور دو کے مجموعے کو وہ ہمیشہ تین ہی سمجھتا ہے۔ تو کیا آپ اس کی صحت عقل و دماغ کا یقین کریں گے؟ غالباً نہیں۔

حامد بڑا صاحبِ عقل و فراست انسان ہے، لیکن کسی دوسرے شخص کو ذبح کر ڈالنے یا لوٹ

لینے میں مطلق تامل نہیں کرتا، توکیا آپ اس کی فراست ودانائی کو تسلیم کریں گے؟ غالباً نہیں۔

اس لیے معلوم ہوا کہ انسان اس مخصوص ہیئت والی مخلوق کو نہیں کہتے، جو خاص وضع کے جوارح واعضاء رکھتی ہے۔ بلکہ انسان نام ہے اس خاص کیفیتِ عقل و شعور کا:

(۱) جو خود اس کی ذاتی اہمیت کو متعین کرتی ہے۔

(۲) جو عقل کا صحیح استعمال سکھاتی ہے۔

(۳) جو افرادِ انسانی کا احترام کرنا بتاتی ہے۔

اور اسی لیے اگر ان میں سے کسی ایک حس کا فقدان کسی شخص میں پایا جائے گا تو ہم کہیں گے کہ وہ دائرۂ انسانیت سے خارج ہے۔

آیئے پھر غور کریں کہ مذہب والحاد کے موجودہ دورِ کشمکش میں انسان کہاں پایا جاتا ہے اور کس کا ساتھ دینے میں انسانی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخِ مذہب کا تعلق جس حد تک بانیانِ مذہب سے ہے ہمیں اس میں حرف گیری کا کوئی موقع نہیں ملتا اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یہ احساسِ یگانہ پوری قوت کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ کیوں کہ جس حد تک ذاتی اہمیت کا تعلق ہے وہ اپنے آپ کو فرستادۂ خدا اور مامور من اللہ کہہ کر انتہائی نقطہ تک کھینچ لائے اور جس حد تک استعمالِ عقل و فراست کا واسطہ ہے۔ اس کا بیّن ثبوت وہ ان جماعتوں کی صورت میں چھوڑ گئے جنھوں نے ان کو رسول و نبی مان کر ان کے کہنے پر عمل کیا اور جن کی عقلوں کو اپنے زمانے کے متقضاء کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ رہ گیا نوعِ انسانی کا احترام، سو اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مقالاً نہیں بلکہ عملاً ہمیشہ اسی کا درس دیا۔

لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر بانیٔ مذہب کے اٹھ جانے کے بعد اس کی تعلیم کا اثر ضعیف ہونے لگا اور یہ ضعف رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھ گیا کہ مذہب کا صحیح مفہوم ہی لوگوں کے دلوں سے محو ہو گیا

اور وہ چیز جس کا تعلق صرف فعل و عمل سے تھا محض لفظی و مقامی ادّعا ہو کر رہ گئی۔

مثالاً عہدِ سعادت کو لیجئے جب رسول اللہ زندہ تھے اور ان کی تعلیم زندہ تھی۔ اس وقت اپنے آپ کو "نحن مسلمون" کہنے والے کس نوع کے انسان تھے۔ اور آج کس انداز کے ہیں۔ اس وقت مسلم نام تھا ایک ایسے انسان کا جس کی ذاتی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ جب مستعد ہو کر اس نے اپنی آستین اُلٹ دی تو یہ سمجھیئے گویا زمانہ کا ورق اُلٹ دیا اور جب وہ دوسروں کی ہمدردی پر آمادہ ہوا تو اپنی جان قربان کرنے میں اس نے پس و پیش نہ کیا۔ رہ گئی عقلی آزادی سو اس کا ثبوت "لا إكراه في الدّين" سے زیادہ اور کیا پیش کیا جاسکتا ہے۔

بر خلاف اس کے کہ آج کل اُن اکابرِ اسلام کو دیکھئے جو اپنے بڑے بڑے عماموں اور لانبی لانبی عباؤں کے ساتھ تقدسِ اسلامی کا قدِ آدم اشتہار بنے پھرتے ہیں۔ ان علمائے کرام اور صوفیائے عظام کو دیکھئے جو اپنی طویل الذیل داڑھیوں اور ڈھیلے ڈھالے خرقوں کے ساتھ ہیئتِ اسلامی کا دیو پیکر مجسّمہ نظر آتے ہیں کہ اگر کسی ایسی بستی میں جو انسانی عصیاں کاری سے تباہ و برباد ہو چکی ہے عدوان و معصیت کا کوئی صحیح مجسّمہ نصب کیا جانا مقصود ہو تو ان سے بہتر "ماڈل" مل ہی نہیں سکتا۔ ان کے جسم کے ایک ایک ریشہ کی پرورش، ان کے خون کے ہر ہر قطرہ کی روانی ایک مستقل یادگار ہے۔ اس بدباطنی و کور نفسی کی ایک طویل داستان ہے۔ اس مکر و فریب اور زُور و ریا کی جس کو اسلام نے بدترین لعنت قرار دے کر دنیا سے مٹانا چاہا اور اس جماعت نے بہترین ذریعۂ فلاح و کامیابی سمجھ کر اختیار کیا۔

اس کے سر نمازوں میں اس لئے نہیں جھکتے کہ مقصودِ خدا کی پرستش ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ دوسروں کے سر ان کے سامنے جھکیں۔ وہ روزے اس لئے نہیں رکھتے کہ ابناءِ جنس کی عسرت و تنگ دستی کا اندازہ کر کے ان کے ساتھ ہمدردی کریں بلکہ صرف اس لئے کہ بہتر سے بہتر غذائیں ان کے سامنے پیش کی جائیں۔ وہ اپنے مواعظ میں بخشش و عطا کی فضیلت اس لئے بیان نہیں کرتے کہ اس کی اہمیت کا خود انہیں بھی عملی اعتراف ہے۔ بلکہ محض اس لئے کہ دوسرے اپنی دولت ان کے قدموں پر ڈال دیں۔

ان خدا سے ڈرنے والوں کی اندرونی زندگی کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو کہ وہ اپنی شبستانِ عیش میں کیسی شادکام اور عذابِ الٰہی کی طرف سے کیسی مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں۔ دنیا کی کوئی معصیت ایسی نہیں جو دوسروں کے لئے حرام اور ان کے لئے حلال نہ ہو اور فرائضِ اخلاق میں سے کوئی امر ایسا نہیں جو دوسروں کے لئے واجب اور ان کے لئے غیر ضروری نہ ہو، ان کا خدا قہار و جبّار ہے لیکن دوسروں کے لئے، ان کے لئے نہیں۔ ان کا خدا رحیم و کریم ہے مگر صرف ان کے لئے دوسروں کے لئے نہیں، ان کی فردوس بھی علیحدہ ہے اور ان کا حوض و کوثر بھی دوسرا، ان کی حوریں بھی مخصوص ہیں اور ان کے غلمان بھی منتخب، الغرض یہ جماعت جو جسم کے لحاظ سے "گاؤ پروری" اور نفس کے لحاظ سے "فرعون و نمرود" ہے، ایک مستقل عذاب ہے جو انسانیت و اخلاق پر نازل ہوا ہے، اور جو اصل سبب ہے موجودہ ارتداد و الحاد کا کیوں کہ اُن کی زندگی، ان کی تعلیم، ان کا عُجب و غرور نسلِ حاضر کے لئے جو یقیناً زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ اہلِ تنقید کی ہے ایک ایسا حجاب ہے قبولِ مذہب کے لئے جس کا دور ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان بتوں کو مسمار نہ کر دیا جائے۔ پھر یہ خصوصیت صرف عَلَم بردارانِ مذہبِ اسلام ہی میں نہیں پائی جاتی اور نہ میرا مخاطبہ صرف

انہیں سے مخصوص ہے بلکہ اس وقت تمام مذاہبِ عالم کے عالموں، پجاریوں اور راہبوں اور مؤیدوں کا یہی حال ہے اور اس لئے اگر ہم ان کی تعلیمات اور ان کے حالاتِ زندگی کو سامنے رکھ کر مذہب کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ "نجاتِ انسانی" کبھی مذہب سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ جس حد تک اعتمادِ نفس واحترامِ انسانیت کا تعلق ہے وہ یکسر نفس پرست خود غرض واقع ہوئے ہیں اور ان کی ذہنی غلامی کا یہ عالم ہے کہ مذہب کے باب میں عقل سے کام لینا وہ کسی طرح گوارا کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ اب مذہب نام صرف اس چیز کا رہ گیا ہے جسے عقلِ انسانی قبول نہ کر سکے۔

اب مذہب کے مقابلہ میں الحاد وارتداد کو دیکھئے جو اس وقت نہایت قوت کے ساتھ دنیا میں پھیل رہا ہے سو اس میں کلام نہیں کہ انسان کی ذاتی اہمیت اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا ہے اور اس کی تمام کارگاہ یکسر عقل وعلم پر قائم ہے، لیکن مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ وہ اجتماعی طور پر نوعِ انسانی کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور جب تک کوئی ادارہ حقیقتاً "احساسِ انسانیت" کو بیدار نہ کر سکے ہم اسے امن وسکون کا ضامن نہیں کہہ سکتے۔

ہو سکتا ہے کہ ایک ملحد ومنکر دنیا میں غیر معمولی دولت کا مالک ہو جائے، ممکن ہے کہ مذہب سے آزاد ہونے کے بعد انسان کی عقلی وذہنی آزادیاں علوم وفنون میں بیش بہا ایجاد واختراع کا سبب بن سکیں، لیکن کفر والحاد میں کوئی ادنیٰ سی علامت بھی اس امر کی نہیں پائی جاتی کہ وہ تمام بنی نوعِ انسان سے محبت کرنا سکھا سکے، اور ساری دنیا کے افراد کو کسی وقت ایک رشتہ سے وابستہ کر دینا اس کے امکان میں ہو، یورپ کی موجودہ علمی ترقیاں اور اسی کے ساتھ اس کا استعماری جذبہ اس کی تجارتی حرص اور انسانیت سوز جنگی تیاریاں کافی ثبوت اس امر کا ہیں کہ دنیا کو جس چیز کی ضرورت ہے اور عالمِ انسانی جس مقصود کے لئے تڑپ رہا ہے وہ نہ اس وقت کے بتائے ہوئے مذہب سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ الحاد ولا مذہبیت سے بلکہ ؏

مردِ ایں رہ را نشانے دیگر ست

پھر وہ نشان کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کون سا راستہ ہے جو منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب دنیا کی اس قوم کے لئے بہت مشکل ہے جو محکومانہ وغلامانہ زندگی بسر کر رہی ہے کیوں کہ عقل وروح کی آزادی حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے خیال کی آزادی ضروری ہے اور جب تک ہم اس منزل سے نہ گزر جائیں آئندہ منزل کی جستجو بے کار ہے۔

○○○

اکابرِ اسلام کے بعض خرافیات

جب کوئی مذہب اپنے ابتدائی دور سے گزر جاتا ہے اور قوتِ عمل ضعیف ہو کر صرف قوتِ خیال پر معتقدات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے تو بعض نہایت عجیب و غریب صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ایک محقق کے لئے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اصل ہیئت کسی مذہب کی کیا تھی اور بعد کو اس میں کیا کیا اضافے کئے گئے اور کس طرح اس کو مسخ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیاسات و توہمات اصلِ مذہب قرار دے دیئے جاتے ہیں اور صرف اعجوبہ پرستی ہی سے اس کا وقار قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چناں چہ مذہبِ اسلام پر بھی ایک ایسا ہی زمانہ گزر چکا ہے، جب چاروں طرف کا خار و خس لا لا کر اس چشمہ میں ڈالا گیا، یہاں تک کہ شفاف پانی کی سطح نظروں سے چھپ گئی اور لوگوں نے اس کی گندگی کو اصلِ مذہب قرار دے لیا۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

قاف ----ایک پہاڑ ہے جو تمام روئے زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ میں نے احاطہ کا لفظ صحیح استعمال نہیں کیا کیوں کہ قدیم عبرانیوں اور یونانیوں کی طرح اہلِ عرب بھی زمین کو چپٹا باور کرتے تھے مدعا یہ کہ کوہِ قاف زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چاروں طرف چلا گیا ہے لیکن اس کے اور زمین کے درمیان ایک ایسا زبردست حلقہ تاریکی کا ہے۔ جس کو انسان عبور نہیں کر سکتا اور اگر عبور کرے بھی تو کم از کم چار مہینے درکار ہوں[3]۔ بعض روایات کی رو سے یہ حلقہ تاریکی محض کا نہیں ہے بلکہ نہایت ہی متعفن و تاریک پانی کا ہے، جس کے ساحل ناپید ہیں۔ اس کا نام بحر المحیط یا اوقیانوس[4] ہے۔

کوہ قاف تمام زمین کو معہ اس کے سمندروں کے اس طرح احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جیسے انگوٹھی انگلی کا احاطہ کر لیتی ہے۔ قزوینی اور ابن الوردی کا بیان ہے کہ کوہ قاف زمرد

3-ملاحظہ ہو طبری جس نے اس کے ثبوت میں رسول اللہ کی حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔
4-ملاحظہ ہو ابو الفداء، القزوینی، ابن الوردی

سبز کا ہے اور آسمان کا نیلگوں نظر آنا اسی کے عکس کی وجہ سے ہے۔

بعض کی تحقیق یہ ہے کہ وہ چٹان، جس پر یہ پہاڑ قائم ہے زمرد کی ہے اس چٹان کو وتد[5] کہتے ہیں کیوں کہ خدا نے اسی کے ذریعہ سے زمین کو تھام رکھا ہے۔

طبری کا بیان ہے کہ اگر کوہ قاف زمین کو تھامے نہ ہو تو زمین ہر وقت لرزش میں رہتی اور کوئی شخص اس پر سکونت نہ کر سکتا۔

قزوینی کا بیان ہے کہ زمین ہر وقت ہلتی ڈلتی رہتی تھی اس لئے خدا نے ایک فرشتہ[6] پیدا کیا جس نے اسے اپنے شانہ پر رکھ کر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ یہ فرشتہ ایک مربع قطعۂ یاقوتِ زعفرانی پر کھڑا ہے جسے ایک بڑا بیل سینگوں پر سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ بیل ایک مچھلی کی پشت پر قائم ہے جو پانی پر تیرتی ہے۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ قاف دنیا کے تمام پہاڑوں کی بیخ و بُن ہے اور سب پہاڑ اندر ہی اندر آکر اس سے مل گئے ہیں اور جب خدا کسی قطعۂ زمین کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اندرونی سلسلۂ کوہ کو جنبش میں لے آتا ہے جس سے زلزلہ پیدا ہو کر لوگ مر جاتے ہیں۔ بعض نے زلزلہ کی حقیقت بیان کی ہے کہ بیل جو زمین کو سنبھالے ہوئے ہے کبھی کبھی کانپ اٹھتا ہے اور اس کی کپکپی سے زمین بھی تھرّا اٹھتی ہے۔

کوہ قاف زمین کی انتہائی حد ہے اور کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہے۔ لیکن ابن الوردی کا بیان ہے کہ ماوراء قاف دوسرا عالم یہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی زمین چاندی کی ہے اور فرشتے یہاں قیام رکھتے ہیں، ایک حدیث نبوی کی بناء پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماوراءِ قاف اور بہت سی زمینیں ہیں ایک زمین سونے کی، ستر زمینیں چاندی کی ہیں، سات مشک کی ہیں اور ہر زمین دس ہزار دن کی مسافت کی ہے جہاں فرشتے ہی فرشتے رہتے ہیں۔

آپ نے کرۂ ارض کی حقیقت، کوہِ قاف کی اصلیت اور زلزلہ کی ماہیت سن لی جسے ہمارے یہاں کے مؤرخین و محققین بیان کرتے ہیں اور جس کے ثبوت میں قرآن کی آیات واحادیث نبوی پیش کی جاتی ہیں، اچھا اب غور کیجئے کہ اس سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے:

ا- ہر وہ شخص جو مسلمان ہو یا مسلمان رہنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ان باتوں

5- سورۂ نبا أَلَمْ نَجْعَلِ ٱلْأَرْضَ مِهَـٰدًا ۝٦ وَٱلْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝٧ کیا ہم نے زمین کو برابر مسطح اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا۔

6- قدیم یونانیوں کے یہاں بھی اس قسم کی روایت پائی جاتی ہے کہ اٹلس دیوتا، زمین اپنے شانے پر لئے ہوئے ہے۔

پر ایمان لائے کیوں کہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اکابرِ اسلام کی تحقیق ہے اور تحقیق بھی وہ جس کی بنیاد قرآن و احادیث پر قائم ہے۔ ان باتوں سے انکار کرنا گویا قرآن وحدیث سے انکار کرنا ہے اور قرآن وحدیث کا منکر، کافر ہے۔

۲- اگر آج کوئی شخص کہے کہ یہ تمام روایتیں بالکل لغو و مہمل ہیں، نہ قرآن سے ان کا ثبوت مل سکتا ہے، نہ احادیث سے تو فوراً یہ جواب دیا جاتا ہے کہ کیا ہمارے یہاں کے اکابر جو سب سے بہتر نقاد قرآن و حدیث کے تھے، تمہارے برابر عقل نہ رکھتے تھے اور کیا انہوں نے بغیر غور و تحقیق کے یوں ہی اس قسم کی احادیث کو صحیح باور کر لیا تھا۔

۳- ایک شخص کے سامنے جب اسلام پیش کیا جاتا ہے تو مع اُن تمام روایات کے پیش کیا جاتا ہے جو اس میں پائی جاتی ہیں اور یہ کہہ کر کہ اب مزید تحقیق و کاوش کی ضرورت نہیں کیوں کہ اسلام اور اسلامی لٹریچر کے سمجھنے والے اب موجود نہیں ہیں اور ہم کو آنکھیں بند کر کے ان کی تحقیق پر عمل کرنا چاہیئے۔

۴- مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی مذہبی روایات میں دیگر مذاہب کے خرافیات (میتھا لوجی) نہیں پائے جاتے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا علم الاصنام کسی اور چیز کا نام ہے؟ کیا خرافیات، ان روایتوں سے علیحدہ کوئی اور چیز ہو سکتی ہے؟ اور کیا مسلمانوں میں جو اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں وہ واقعی دوسرے مذاہب کی خرافیات سے استعارہ نہیں کی گئی ہیں؟

آیئے ایک اسی کوہ قاف کی روایات پر غور کیجئے ان کا اصل ماخذ کیا ہے:

قدیم ایران کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کوہِ البرز جسے قدیم پہلوی زبان میں اونچا پہاڑ کہتے تھے، بالکل اسی قسم کی روایات اس سے متعلق تھیں۔ اور قدیم یونانیوں کے کوہِ اولمپس کی طرح اسے بھی خداؤں یا دیوتاؤں کا مسکن بتایا جاتا تھا۔

اس پہاڑ کے متعلق اوستا لٹریچر میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ زمین کے تمام پہاڑوں کی بنیاد ہے جو زمین کے اندر ہی اس سے نکل کر پھیل گئے ہیں۔ اسی پہاڑ میں ایک جھیل وروکشا بھی پائی جاتی ہے۔ اس پہاڑ کا دوسرا نام قاف بھی ہے، صاحبِ معجم البدان نے بھی لکھا ہے کہ قاف کو پہلے البرز کہتے تھے، ہندوؤں کے پران میں بھی ایک ایسے ہی پہاڑ کا ذکر موجود ہے جس کا نام لوکا لوک ہے، ان کا خیال تھا کہ یہ پہاڑ اس

دنیا کو اس دنیا سے علیحدہ کرتا ہے اور اس کے دوسری طرف سوا تاریکی کے کچھ نہیں ہے۔ چینی مذہب والوں کی روایات میں بھی ایک پہاڑ مالو سونر ایسا پایا جاتا ہے، جو انسانی آبادی کی آخری حد سمجھا جاتا ہے۔

مندائی قوم میں بھی ایک روایت پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو چپٹا سمجھتے تھے اور تین طرف پانی سے گھرا ہوا باور کرتے تھے، شمال کی طرف وہ ایک ایسے پہاڑ کا وجود مانتے تھے جو زمرد کا بنا ہوا تھا اور جس کے انعکاس سے آسمان نیلگوں نظر آتا تھا۔

الغرض تمام مشرقی قوموں میں شمال کی طرف ایک پہاڑ پایا جانا باور کیا جاتا تھا اور غالباً یہ خیال اہلِ بابل سے لیا گیا تھا۔ قدیم عبرانیوں میں بھی قریب قریب اسی قسم کی روایتیں رائج تھیں جیسا کہ توریت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

متذکرۂ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ کوہِ قاف وہی ہے جسے ایرانی البرز کہتے تھے اور جو روایات اس کے متعلق ان کے یہاں پائی جاتی تھیں وہ مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیں اور متعدد حدیثیں رسول اللہ سے ایسی منسوب کر دیں جن سے ان روایتوں کی تصدیق ہوتی ہے لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اور مذاہب کی تو تمام روایات خرافیات میں شامل کی جائیں گی لیکن اپنی روایات کو بالکل صحیح بتایا جائے گا۔ کیوں کہ رسول اللہ نے ایسا بیان کیا ہے۔ پھر اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو بحیثیت مسلمان ہونے کے کوہ قاف کو انہی خصوصیات کے ساتھ تسلیم کیا جائے جو احادیث میں پائی جاتی ہیں یا ان سے انکار کر کے کافر و مرتد بننا گوارا کیا جائے۔

اب رہا یہ امر کہ لفظ قٓ جو قرآن پاک میں آیا ہے اور جس کو سمجھانے کے لئے یہ تمام روایتیں گھڑی گئیں ہیں کیا مفہوم رکھتا ہے، غالباً ہمارے موضوع سے علیٰحدہ ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے یہ لازم نہیں کہ ایک شخص ان تمام روایتوں پر ایمان لائے۔

عزرائیل

اب ہم عزرائیل یا ملک الموت کی حقیقت پر اکابرِ اسلام کی تحقیق پیش کرتے ہیں جو کوہ قاف کی تحقیق سے کم حیرت انگیز نہیں۔

۱۔ عزرائیل اتنا چوڑا چکلا اور اتنا زبردست فرشتہ ہے کہ اگر دنیا کے تمام سمندروں اور دریاؤں کا پانی اس کے سر پر ڈالا جائے تو ایک قطرہ بھی زمین تک نہ پہنچے، اس کا

نورانی تخت چوتھے یا ساتویں آسمان پر ہے جہاں اس کا ایک پاؤں ٹکا ہوا ہے اور دوسرا پاؤں وہ پل ہے جو دوزخ اور بہشت کے درمیان بنایا گیا ہے۔اس کے ستّر ہزار پاؤں ہیں۔

۲۔ اوّل اوّل عزرائیل بھی دوسرے فرشتوں کی طرح تھا۔ لیکن جب اللہ نے انسان کو پیدا کرنا چاہاتو اس نے جبرئیل کو حکم دیا کہ جاؤ اور زمین سے ایک مٹھی عناصر یا ان اجزاء کی لے آؤ جن سے انسانوں کی تعمیر ہو سکے لیکن جب جبرئیل زمین پر پہنچے تو ابلیس مانع آیا اور جبرائیل ناکام واپس آئے اس کے بعد میکائیل اور اسرافیل بھیجے گئے لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ آخر میں عزرائیل کو بھیجا گیا اور یہ کامیاب واپس آیا اور اللہ نے اس کو فرشتہ موت بنادیا کیوں کہ اس میں رحم کی کمی تھی۔

۳۔ جب اللہ نے موت کو پیدا کیا تو تمام فرشتوں کو طلب کیا اور کہا کہ اس کی طرف دیکھو، لیکن جب انہوں نے اس کی غیر معمولی قوّت کو دیکھا تو حیران رہ گئے اور بیہوش ہو کر زمین پر ہزاروں سال تک گرے ہوئے پڑے رہے اس کے بعد جب انہیں ہوش آیا تو یک زبان ہو کر بولے "بے شک موت بڑی زبردست تخلیق ہے" خدا نے یہ سن کر فرمایا کہ "میں نے عزرائیل کو اس پر قابو دے دیا ہے"

۴۔ عزرائیل کے پاس تمام انسانوں کی فہرست موجود رہتی ہے، لیکن اسے یہ معلوم نہیں رہتا کہ کب کس کی موت آئے گی۔ وہ لوگ جو نجات پانے والے ہیں ان کے نام کے گرد ایک نورانی حلقہ ہوتا ہے اور جو دوزخی ہیں ان کے نام کے گرد سیاہ حلقہ ہوتا ہے۔

۵۔ جب موت کا دن آتا ہے تو اللہ اس درخت سے جو عرش کے نیچے ہے ایک پتّہ توڑ کر گرا دیتا ہے جس پر مرنے والے کا نام منقوش ہوتا ہے اور یہ پتّہ عزرایل کی آغوش میں آگرتا ہے، یہ نام پڑھ لیتا ہے اور ۴۰ دن کے بعد روح نکال لیتا ہے۔

۶۔ مرنے والوں میں بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو عزرائیل کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ عزرائیل نہایت سختی سے جان نکالتا ہے، عزرائیل اس مقابلہ کو دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور سارا حال بیان کرتا ہے، خدا یہ سن کر فردوس کا ایک سیب اس کو دیتا ہے، جس پر بسم اللہ لکھی ہوتی ہے۔ عزرائیل یہ سیب لے جاکر اس جھگڑالو مرنے والے کو سنگھا دیتا ہے اور وہ فوراً

جان دینے کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ عمل صرف نیک بندوں کے لیے جائز رکھا جاتا ہے۔ کافروں کی جان چاہے کیسی ہی سختی سے نکلے پرواہ نہیں ہوتی۔

۷- بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب عزرائیل روح نکالنے کے لئے حلق کے اندر جانا چاہتا ہے تو بندہ کسی "ذِکر" کے ذریعہ سے حلق کے اندر جانے کا راستہ بند کر دیتا ہے، فرشتہ یہ دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور تمام حال عرض کرتا ہے، وہاں سے حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اس کے ہاتھ دیکھو، اگر اس نے اپنی عمر میں صدقہ دیا ہے تو بھی جان نکالنا دشوار ہوتا ہے اور پھر عزرائیل اس کے ہاتھ پر اللہ کا نام لکھ دیتا ہے اور وہ لقاءِ ربانی کے شوق میں حلق کا راستہ کھول دیتا ہے اور فرشتہ اندر گھس کر روح نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

۸- جب کسی مسلمان یا مومن کی روح نکالی جاتی ہے تو ملک الموت نہایت نرمی و آہستگی سے کام لیتا ہے اور روح نکال کر اپنے نائب فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے جو اسے حُلّۂ بہشتی میں لپیٹ کر آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور ساتوں آسمانوں کو عبور کر کے جب عرشِ خداوندی تک پہنچتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ اس روح کو اس قبر میں لے جاؤ جہاں وہ مومن دفن کیا گیا ہے لیکن اگر کوئی غیر مسلم کافر مرنے والا ہوتا ہے تو اس کی روح نہایت سختی و بے رحمی سے نکالی جاتی ہے اور جب آسمان کے دروازے اس کے لئے نہیں کھلتے تو فرشتہ اسے وہیں زمین کی طرف پھینک دیتا ہے۔

۹- ادریس، الیاس، عیسیٰ اور خضر، موت سے آشنا نہیں ہوئے اور اب تک زندہ ہیں۔ موسیٰ کے پاس جب ملک الموت آیا تو انہوں نے ایک تھپڑ مارا، جس سے اس کی ایک آنکھ مجروح ہوگئی، جب فرشتہ یہ شکایت لے کر خدا کے پاس آیا تو خدا نے بہشت کا سیب اس کو دیا اور سونگھ کر وہ جان دینے پر راضی ہوگئے۔

۱۰- بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی جان نکالنے والا فرشتہ اور ہوتا ہے اور دوسرے آدمیوں کی روح نکالنے والا کوئی اور۔ اسی طرح مومن و کافر کی جان نکالنے کے لئے علیحدہ علیحدہ فرشتے ہوتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے اکابرِ اسلام کی تحقیق، فرشتہ موت کے متعلق جو حسب ذیل کتابوں میں پائی جاتی ہے: مشکوٰۃ شریف (حدیث)، بخاری شریف (حدیث)، مروّج الذہب (المسعودی)، درّ الفاخرۃ (الغزالی)، عجائب الملکوت (الکسائی)، تاریخ طبری، تاریخ ابن

اثیر، تاریخ الخمیس (دیار بکری)، قصص الانبیاء (ثعلبی)، کتاب الانس الجلیل (مجیر الدین حنبلی) کتاب البدءوالتاریخ (طاہر مقدسی)

تماشہ یہ ہے کہ یہ تمام بیانات رسول اللہ سے منسوب کئے جاتے ہیں اور کسی کا خیال اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ سب باتیں بعد کی گھڑی ہوئی ہیں اور رسول سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔

ملک الموت کے متعلق اس طرح کی حیرت انگیز روایات یہود میں رائج چلی آ رہی تھیں کہ اس کے چار ہزار بازو ہیں، اس کے جسم میں زبان اور اور آنکھ کے سوا کچھ نہیں ہے، یعنی جتنے آدمی ہیں اتنی ہی آنکھیں اور زبانیں اس کے جسم میں بھی ہیں، اس کے چار چہرے ہیں وغیرہ وغیرہ اور بعد کو مسلمانوں نے انہی روایات پر اعتماد کرکے اپنے یہاں لے لیااور لوگوں کو یقین دلانے کے لئے رسول سے منسوب کردیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس زمانہ میں بھی ان روایات پر یقین کیا جا سکتا ہے اور کیا ادنیٰ فہم و عقل کا انسان بھی کبھی باور کر سکتا ہے کہ روح نکالنے کے لئے یہ تمام لایعنی حرکتیں کی جاتی ہیں۔

پھر افسوس ہے ہمارے علماء کرام پر جو اب بھی مواعظ میں اس طرح کی روایتیں بیان کرتے ہیں اور صد ہزار افسوس ہے ان کی جسارت پر کہ ایسی باتوں کو رسول اللہ سے منسوب کرکے ان کی عظمت وعزت کو بھی خاک میں ملانا چاہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے جتنی تحقیقاتِ علمی و تاریخی کی ہے اس کی نظیر اب مل نہیں سکتی۔ پھر اگر ان کی تحقیقات کا یہی عالم ہے اور ان کی علمی تفتیش وہی ہے جو کوہ قاف اور عزرائیل کے حالات بیان کرنے میں ان کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے تو خوشی کی بات ہے کہ اب دنیا میں ایسے احمق پیدا ہونا بند ہو گئے جو ایسی باتوں پر ایمان لائیں اور ایسے مذہب کا خدا حافظ ہے جو اس قسم کی روایات ماننے پر کسی انسان کو مجبور کرے۔

ہمارا مستقبل

پیشین گوئیاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ ایک وہ جو انبیاء و اولیاء کی زبان پر جاری ہوتی ہیں، اور دوسری وہ جو علم و تجربہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ قسمِ اول کی پیش گوئی وحی و الہام ہو یا دور بینی (Telepathy) ہمیں اس سے بحث نہیں کیوں کہ اول تو ایسی پیشین گوئیاں کرنے والے اب موجود نہیں اور اگر ہوں بھی تو اس دورِ تعقل میں کون ان کی سنتا ہے لیکن قسم دوم کی پیشین گوئی ہر صاحبِ عقل آسانی سے کر سکتا ہے اور اکثر و بیشتر وہ صحیح بھی نکلتی ہے کیوں کہ کاروبارِ عالم مقررہ اصول پر چل رہا ہے اور اسباب و علامات کو دیکھ کر نتائج پر حکم لگانا زیادہ دشوار نہیں۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک انسان نے کہاں کہاں اور کس کس طرح زندگی بسر کی، حیات اجتماعی کے لئے اس نے کیا کیا اصول مقرر کئے، ارتقاء کی کیا کیا صورتیں ہم نے اختیار کیں اور اقوامِ عالم، عروج و زوال کی منزلوں سے کیوں کر گزرتی رہیں، یہ اور اسی طرح کے بہت سے موضوع ہیں جن سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس وقت کوئی قوم عروج و ترقی سے گزر رہی تھی، اس کو کبھی ایک لمحہ کے لئے یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ اسے انحطاط و زوال کی منزل سے گزرنا پڑے گا اور آخر کار ایک دن فنا ہو جائے گی؟ کبھی نہیں -----

دنیا میں سب سے بڑی حکومت جس کی سطوت و جبروت نے تقریباً تمام کرۂ ارض کا احاطہ کر لیا تھا سلطنت رومہ تھی، لیکن آج وہ کہاں ہے؟ چنگیز و ہلاکو جنھوں نے سارے عالم کو لرزہ بر اندام کر رکھا تھا آج ان کی اولاد کہاں اور کس عالم میں ہے؟

بابل و سیریا کے محیر العقول تمدن کی بنیاد ڈالنے والے فرماں رواؤں کے نشانات کیا ان کھنڈروں کے علاوہ کچھ اور ہیں جو اب صرف درندوں کو پناہ دے سکتے ہیں۔ اسی طرح تم فراعنۂ مصر، اکاسرۂ عجم، اور دیگر جبابرۂ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ جب وہ دورِ ترقی سے گزر رہے تھے تو اپنے کو غیر فانی سمجھتے تھے، لیکن جب کہ وہ فنا ہو چکے ہیں ہمیں یہ تسلیم کرنے میں بھی تامل ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تھے بھی یا نہیں۔

زیادہ نہیں صرف چودہ سو سال قبل کی بات ہے کہ ایک صحرا نشین اُمّی ریگ زار عرب سے پیدا ہوتا ہے اور اپنے بعد ایک ایسے تمدن کی بنیاد چھوڑ جاتا ہے کہ اس کے جانشین مغرب و مشرق پر چھا جاتے ہیں، لیکن آج اس قوم کا کیا حال، اس کے تمدن و تہذیب کا کیا رنگ ہے اور وہ انحطاط کے کس دور سے گزر رہی ہے؟

ایں سخن را چہ جواب است تو ہم می دانی

لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا اس کا یہ دور ختم ہو گیا ہے اور کیا اس کے انجام کے متعلق حکم لگانا کوئی ایسی پیشین گوئی کرنا ہے جو صرف انبیاء کے لئے مخصوص تھی؟ اگر اقوامِ عالم کی ترقی اسباب کی محتاج ہے تو ان کے تنزل کو بھی اصولاً اسباب کا پابند ہونا چاہیئے اور اس لئے تاریخ عالم کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ ایک قوم کا مستقبل ہمیشہ اس کے حال میں پوشیدہ ہوا کرتا ہے اور مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

اسلامی تہذیب دنیا کی تمام گزشتہ تہذیبوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی اور وہ حیثیت صرف یہ تھی کہ اس نے انسانی زندگی کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی کا بھی ضامن تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی تمام مادی ترقیاں منحصر تھیں صرف اخلاق کی بلندی پر۔

موجودہ تہذیب میں مادی ترقی کی جو صورتیں نظر آ رہی ہیں وہ یقیناً تمام ازمنۂ گزشتہ سے زیادہ وسیع ہیں لیکن چوں کہ اخلاق کا پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے اسی لئے وہ نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اور زیادہ نقصان پہنچا رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ مادی ترقی جو خود بنی نوعِ انسان کی تباہی کی طرف منجر ہو کبھی صحیح معنٰی میں ترقی نہیں کہلائی جا سکتی۔

اسلام نے اس توازن کے قیام کے لئے سب سے پہلے جس تعلیم کو پیش کیا وہ یہ تھی کہ تمام انسان برابر ہیں اور دولت کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے جذبۂ مساوات و اخوت کو متاثر نہ ہونا چاہیئے۔ پھر یہ تعلیم صرف زبانی نہ تھی یا کسی علمی نظریہ کے طور پر پیش نہیں کی گئی تھی، بلکہ عملاً روز پانچ وقت شاہ و گدا کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے اس کا درس دیا جاتا تھا۔

جب یہ تعلیم رائج ہو گئی تو ان کو بتایا گیا انسان دنیا میں صرف کام کرنے کے لئے آیا ہے اور اس کو بے کار کبھی نہ بیٹھنا چاہیئے اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ دنیا میں ترقی کی جتنی راہیں ہو سکتی ہیں ان سب کو اختیار کرنا چاہیئے۔

پھر یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو قوم اس اصول پر کاربند ہو وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتی

اور اگر آج مسلمان پستی کے عالم میں ہیں تو اس کا سبب سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس نے تعلیم کی روح کو پس پشت ڈال دیا اور اگر یہی حالت رہی تو اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔

تعلیمِ مساوات سے بے خبری و بے تعلقی کا یہ عالم ہے کہ نوعِ انسانی تو خیر بڑی چیز ہے وہ خود اپنی ہی قوم کا شیرازہ پراگندہ کر چکے ہیں اور محض فروعی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے تیار ہیں، عملی زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ تقدیر پر بھروسہ کر کے ہاتھ پاؤں ڈال دینا ہی جزوِ مذہب قرار دیا جاتا ہے اور اس کا اصطلاحی نام صبر و توکل رکھا گیا ہے۔

رہ گیا دنیاوی ترقی میں زمانہ کا ساتھ دینا، سو اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جب ایک زمانہ تک علومِ جدید کا حصول کفر کے مترادف سمجھا گیا اور اب بھی ہمارے یہاں کے مذہبی علماء اور قائدینِ امت ان سے بالکل نابلد ہیں اور نابلد رہنے ہی میں اپنی اخروی نجات سمجھتے ہیں۔

پھر غور کیجئے ایسا کیوں ہے؟ تاریخ کے صفحات اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کی ابتداء علمائے مذہب سے نہیں ہوئی اور کیا ذہنی غلامی کی بنیاد ڈالنے والی کوئی اور جماعت تھی؟ بنوامیہ کی سلطنت کو تباہ کرنے والے، بنوعباس کی حکومت کا تختہ الٹ دینے والے یہی لوگ تھے جو شاہانِ وقت کی ناجائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور جنہوں نے صرف طمعِ نفس کی بنا پر رفتہ رفتہ اسلام کے لٹریچر کو اس قدر گندگی سے آلودہ کر دیا کہ آج اس کے صحیح خط و خال کا مطالعہ ازبس کہ دشوار ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ جب قرونِ اولیٰ میں اس جماعت کا یہ رنگ تھا تو عہدِ حاضر میں اس کی بے بصری کا کیا عالم ہو گا اور جو قوم اپنا مستقبل ان کی تعلیم و ہدایت پر منحصر رکھے گی اس کی تباہی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

یقیناً اس وقت تمام دنیا کے مسلمان ایک رشتہ سے وابستہ نہیں ہیں اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے لیکن اس کا علاج نہ پان اسلام ازم سے ممکن ہے اور نہ فلسطین میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے بلکہ اس کا تعلق صرف احساسِ وطنیت سے ہے اور افسوس ہے ہندوستان کا بدنصیب مسلمان اس احساس سے محروم ہے اور اب تک یہ سودا اس کے دماغ سے نہیں نکلا کہ وہ ہندوستان میں حکمران ہو کر آیا تھا۔ اور حکمران قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے

اس کو ایسا تفوّق حاصل ہے جس کے سامنے یہاں کے تمام باشندوں کو اس کے سامنے گردن جھکا دینا چاہئے۔

ہندوستان میں صدیوں تک قیام کرنے کے بعد یہ اجنبیت کیوں ہے؟ اس کا سر رشتہ بھی علمائے مذہب ہی کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے سرزمین ہند کو دارالحرب و کفرستان اور یہاں کے رہنے والے کو ہمیشہ کافر کہہ کر اختلاف و دشمنی کی وسیع خلیج حائل کر دی درآں حالِ کہ نہ ہندوستان کفرستان ہے اور نہ ہندو کافر و مشرک۔

ایک ہندو مندر میں جا کر بت کے سامنے جھک جاتا ہے تو کافر ہے لیکن ایک مسلمان مسجد میں جا کر محراب کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے تو کافر نہیں، ایک ہندو پتھر کی مورتی کو بوسہ دیتا ہے تو مشرک ہے لیکن ایک مسلمان طوافِ کعبہ کے وقت سنگِ اسود کو چومتا ہے تو شرک نہیں۔ کیوں؟

اگر مسلمان کے یہ مذہبی مراسم خالصۃً للہ ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو کا مقصود اس سے علیحدہ ہو۔ اگر ایک مسلمان سنگِ اسود کو صرف اس لئے چومتا ہے کہ وہ ایک بڑے شخص کی یادگار ہے تو آپ کیوں یقین کریں کہ بتوں کی پرستش کسی اور جذبہ کے تحت کی جاتی ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کون سا ہندو ہے جو بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرتا ہے اور اگر بعض جاہل افراد ان میں ایسے ہیں تو پھر ان مسلمانوں کو کیا کہا جائے گا جو قبروں کی خاک چاٹ چاٹ کر تعزیوں اور مقبروں کی جالیوں میں منّت کی دھجیاں باندھ باندھ کر ہندؤوں سے زیادہ کفر و شرک میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

بہر حال مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی آبادیوں میں تفریق و اختلاف کا سبب صرف مذہب کی وہ غلط تعبیر ہے جو ہندوستان میں دونوں کے علمائے مذہب کی طرف سے پیش کی گئی اور اب بھی پیش کی جا رہی ہے۔

اس لئے اگر ہندوستان کی ترقی و آزادی کے لئے ہندو مسلمان کا اتحاد ضروری ہے تو سب سے پہلے دونوں جماعتوں کو مذہبی تعصب ترک کر کے اپنا شعار صرف انسانیت کی پرستش قرار دینا چاہئے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب پنڈتوں کی گرفت سے ہندو اور علماء کے چنگل سے مسلمان آزاد ہو جائیں۔

عیش یا مسرّت

فرماں روائے خلد آباد کا خزانہ لعل و گہر سے مالا مال ہے اس کی حکومت لاکھوں مربع میل تک پھیلی ہوئی ہے لطف و تفریح کے جتنے اسباب، دولت سے فراہم ہو سکتے ہیں وہ سب مہیاہیں۔ اِسی کے ساتھ دولتِ حسن بھی موجود ہے، دولتِ شباب کی بھی کمی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ مسرور اور کون ہو سکتا ہے لیکن دفعتاً قصر کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے، طبیبوں کے چہرے سے سخت فکر کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں کیوں کہ بادشاہ جو ایک زمانے سے بیمار ہے دفعتاًنہایت شدید قسم کے درد قلب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی----- بادشاہ تڑپ رہاہے اور کہہ رہاہے کہ "کوئی میری سلطنت لے لے، میری تمام دولت پر قبضہ کر لے، لیکن اس عذاب سے لمحہ بھر کے لئے کسی طرح نجات دلا دے"----- ایک غریب لکڑہارا باہر قصر کے پاس سے گذرتا ہوا دل ہی دل میں کہتاہے کہ " دولت بھی کیا چیز ہے، کاش مجھے بھی حاصل ہوتی اور میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتا جیسی بادشاہ بسر کررہاہے۔"

ملکہ نسرین جو دولت کے لحاظ سے پھُولوں کی رانی مشہور ہے، اپنے پاس کیا کچھ نہیں رکھتی۔ وہ ہمیشہ مخمل و حریر کی نرمی میں سوئی اور لعل و الماس کی روشنی میں بیدار ہوئی، اس نے ہمیشہ پھولوں کی چادروں پر قدم رکھا اور نغمہ و رنگ کی فضا میں آنکھ کھولی----- حسن و جمال کا عالم یہ کہ ؏

جو در پہ آگیا اسے دیوار کر دیا

شباب کا یہ رنگ کہ جس نے ایک بار دیکھا، جی سے بیزار ہو گیا۔

سنگِ مرمر کے حوضوں میں بلّوریں فوارے چاروں طرف موتی بکھیر رہے ہیں، باغ کے کُنجوں میں ہر جگہ تلاطمِ نکہت برپا ہے، پھولوں کی کثرت نے قصر کے گوشہ گوشہ کو سیلابِ رنگ سے لب ریز کرر کھا ہے، بربط و رباب کے تاروں سے راگنیاں بلند ہو ہو کر فضا میں مستی کی کیفیت پیدا کر رہی ہیں ------- مگر ------- ملکہ نسرین ایک کمھلائے ہوئے پھول کی سی افسردگی لئے ہوئے سیج پر پڑی ہوئی ہے اور ریشمی تکیئے اس کے نہ تھم سکنے

والے آنسوؤں سے تربتر ہو رہے ہیں، کنیزیں التجائیں کر رہی ہیں، سمجھا رہی ہیں، لیکن اس کی ہچکیاں بند نہیں ہوتیں، کیوں؟

صرف اس لئے کہ شاہزادہ نیلوفر جس کے عشق میں وہ برسوں سے مبتلا تھی کسی اور سے محبت کرنے لگا ہے-------- ٹھیک اسی وقت ایک غریب کسان کی بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر قصر کے سامنے سے یہ کہتی ہوئی گزر جاتی ہے کہ-------- "ملکہ نسرین بھی کیسی خوش نصیب عورت ہے، کاش میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتی۔"

حقیقتوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور پردوں کے نقش و نگار کو حقیقت باور کیا جاتا ہے----- یہ ہے انسانی تمناؤں کی ذہانت اور یہ ہے ہماری آرزوؤں کی انتہائی فراست----- ایک غریب تمنا کرتا ہے کاش وہ دولت مند ہوتا، ایک دولت مند اپنے بہت سے روحانی آزار دور کرنے کے لئے غریب ہونے کی آرزو کرتا ہے، ایک فقیر بادشاہ کی جاہ و ثروت کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور ایک بادشاہ اس آزادی کے لئے تڑپ رہا ہے جو فقیر کو حاصل ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان عیش کا خواہش مند ہے یا مسرّت کا کیوں کہ سامانِ عیش سامانِ مسرّت نہیں، اسبابِ مسرت اسبابِ عیش نہیں۔ پھر اکثر ایسے ہیں جو عیش کو مسرّت جان کر اُسی کی تمنا کرتے ہیں اور کم تر ایسے ہیں جو صرف مسرّت کے طلب گار ہیں اور عیش کے خواہش مند نہیں۔

عیش نام ہے جسم کی آسائش کا اور خواہشِ ظاہری کی لذّت کا۔ مسرّت نام ہے نفس کے اطمینان اور روح کی راحت کا-------- پھر یہ تو ٹھیک ہے کہ اسبابِ عیش حاصل ہونے کے بعد انسان مسرّتِ روح کے لئے تڑپتا رہے لیکن راحتِ روح سے آشنا ہونے کے بعد سامانِ عیش کی جستجو کرنا کیا معنی؟

اس وقت جب کہ دنیا میں مادہ، روح سے برسرِ پیکار ہے، عیش کی خواہش مسرّت کے صحیح مفہوم کو دنیا سے محو کر دینا چاہتی ہے یعنی اس وقت جب کہ زر و دولت کی محبت نے دنیا کے اقتصادی و معاشی وسائل کو یکسر آئینِ زندگی بنا رکھا ہے کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے اور جس عمیق غار کی طرف "انسانیت" کو ڈھکیلا جا رہا ہے اس سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے یا نہیں؟

امریکہ بے تاب ہے کہ ساری دنیا کی دولت اس کے قبضے میں آجائے، فرانس مضطرب ہے کہ جرمنی پر اس کا تسلط قائم ہو جائے، جرمنی بے قرار ہے کہ فرانس کو فنا

کردے، اٹلی بے چین ہے کہ رومہ کی قدیم سطوتِ استبداد کو پھر زندہ کردے، جاپان کوشش کررہاہے کہ وہ ایشیاء کو محکوم بنالے----- لیکن کیا کوئی ایسی قوم بھی ہے جس نے جغرافی اور ملکی امتیاز کو مٹاکر صرف "انسانیت" کی خدمت کو اپنا مقصود قرار دیا ہو؟

یہ ہے مادی ترقی کا وہ پہلو جس پر آج فخر کیا جاتا ہے اور یہ ہے علم و حکمت کی کاوشوں کا وہ منظر جسے انسان کا منتہائے نظر قرار دیتے ہیں----- پھر آج تو نہیں کل وہ وقت آئے گا جب انسانیت کا خون آلود چہرہ لوگوں کی نگاہ سے اِس حجاب کو دور کرے گا اور بتائے گا کہ عیش کی راہیں مسرّت کی راہوں سے بالکل مختلف ہیں اور وہ جسم جو عرصہ تک پھُولوں پر لوٹتے رہتے ہیں اُن کے لئے آخرکار پنکھڑیاں بھی خار ہو جایا کرتی ہیں۔

یقیناً حصولِ مسرّت، حصولِ عیش کا منافی نہیں، بشرطِ کہ عیش انفرادی حیثیت نہ اختیار کرے، لیکن انسان کی اس خود غرضی کو مٹانے والا کون ہو سکتا ہے؟ کیا وہ انسانی قانون جو صرف تیغ و تفنگ کی مدد سے ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب قرار دیتا ہے؟ کیا مادی علوم و فنون کی ترقی جو سب سے زیادہ مہلک گیس تیار کرکے انسان پر عرصۂ حیات تنگ کردینا چاہتی ہے؟ کیا سرمایہ و دولت کا وہ نظامِ استعماری جو کمزور و ضعیف انسانوں کا صرف خون نچوڑ سکتا ہے؟--- نہیں--- بلکہ صرف وہ بلند تعلیم جو تمام نوعِ انسان کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کرنا چاہتی ہے، وہ نظامِ اخلاق جو رنگ و نسل کے امتیاز کو مٹاکر جملہ افرادِ انسانی کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے۔ وہ اصولِ حیات جو اسپارٹا والوں کی طرح ضعیف و کمزور کو ہلاک کردینے کا حامی نہیں ہے۔ وہ طریقِ ہدایت جو ترقی کا مفہوم زر و دولت کا انبار نہیں بلکہ صرف دنیا کا امن و سکون قرار دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایسی بلند تعلیم صرف ایک ہے، ایسا نظامِ اخلاق صرف ایک ہے، یہ اصولِ حیات صرف ایک مسلک نے بتایا، یہ طریقِ ہدایت صرف ایک مذہب نے پیش کیا۔ لیکن اب اس تعلیم و مذہب کی جستجو کہاں کی جائے۔ کتابوں میں؟ مگر عمل کو کتابوں سے کیا تعلق---- ان انسانوں میں جواب موجود نہیں ہیں؟ مگر اس سے نتیجہ -----! اُن مدعیانِ بلند بانگ کی زندگی میں جو اس وقت موجود ہیں------ ہاں، مگر اس لئے نہیں کہ اُن سے کوئی درس حاصل کیا جائے، بلکہ صرف اس لئے کہ اس تعلیم پر آنسو بہایا جائے جس کے یہ علم بردار ہیں اور اِس مذہب کے جنازے پر ماتم کیا جائے جس کو دفن کرنے کے لئے یہ نہایت تیزی سے اپنے شانوں پر اٹھاکے لئے جارہے ہیں۔

○○○

خدا-لامذہبیت کے زاویۂ نگاہ سے

جتنے مذاہب اِس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں، اُن سب کے معتقدات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "خدا سے ڈرنا چاہئے"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِنسان نے آخر اس تعلیم کو مان کیوں لیا، اِس درس میں کون سی ایسی بات تھی جس نے اس قدر مضبوطی کے ساتھ اسے خدا کی طرف سے خائف بنادیا۔

اِس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ اوّل اوّل انسان نے جب اِس دنیا میں قدم رکھا توچاروں طرف دشمن ہی دشمن اس کا احاطہ کئے ہوئے تھے اور صحرا کے خون خوار درندوں سے ہر وقت مقابلہ رہتا تھا۔ پھر چوں کہ فطرت کی طرف سے اس کو قوّتِ جسمانی کے مقابلے میں قوّتِ دماغی بھی عطا ہوئی تھی،اس لئے وہ اپنی تدابیر سے اِن دشمنوں سے جنگ کرتا تھا اور اکثر و بیشتر کامیاب بھی ہوجاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُن سے ڈرتا تو ضرور تھا لیکن ان کی پرستش پر مجبور نہیں تھا کیوں کہ پرستش نام ہے انقیاد کامل کا، پورے اظہارِ عجز کے ساتھ سپر ڈال دینے کا، اور درندوں کے مقابلے میں اس حد تک اس کی توہین نہیں ہوئی تھی۔ لیکن انسانوں کا ایک زبردست دشمن اور بھی موجود تھا جسے ہم "حوادثِ طبیعی" کہتے ہیں، یعنی وہ دیکھتا تھا کہ دفعتہً افق سے نہایت ہی گہرا سیاہ بادل اُٹھتا ہے اور آن ہی آن میں اس کے جھونپڑے کو بہالے جاتا ہے، وہ شکار سے واپس آتا ہے اور اچانک اس کا بدن آگ کی طرح جلنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ مرجاتا ہے۔ وہ کھیتیاں کرتا ہے لیکن بارش نہ ہونے سے وہ سب کی سب خشک و تباہ ہوجاتی ہیں۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ باوجود تمام اسبابِ ظاہری فراہم کرنے کے بعض اوقات نتیجہ خاطر خواہ حاصل نہیں ہوتا، وہ حیران رہ جاتا تھا۔ کیوں کہ اس "رجم عن الغیب" کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا اور وہ ان تمام باتوں کو ان بڑی بڑی روحوں کا کرشمہ خیال کرتا تھا جو اس کے نزدیک آسمان میں رہتی تھیں، چناں چہ وہ ان کے خوش کرنے کے لئے قربانیاں کرتا تھا، روتا تھا، گڑگڑاتا تھا تاکہ اس کی امیدیں پامال نہ ہوں----- یہ تھی اولین بنیاد

مذہب کی جو سب سے پہلے ارواح پرستی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ پھر جب انسان پر کچھ زمانہ اور گزر گیا تو اس نے اپنے خیال کے مطابق ان ارواح کی صورتیں بھی قائم کیں اور بُت بنا بنا کر پوجنا شروع کیا۔ یہ تھا دوسرا دور مذہبیت کا، لیکن اس کے بعد جب انسان میں زیادہ معقولیت پیدا ہوئی تو اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خدا کو ایک "قوتِ مجرّدہ" قرار دے کر یزداں پرستی شروع کی جو یقیناً مذہب کی نہایت اچھی ارتقائی صورت ہے، لیکن جو تصور اس نے خدا کی عظمت و جلالت، ہیبت و سطوت کا پہلے قائم کر لیا تھا وہ علیٰ حالہ باقی رہا۔

الغرض خدا کی طرف جس چیز نے انسان کو مائل کیا وہ صرف حوادثِ طبیعی تھے، لیکن کیا یہ امر حیرتناک نہیں کہ وہی چیز جس نے کسی وقت انسان سے خدا کے وجود کو تسلیم کرالیا تھا، آج اسی کی بنیاد پر خدا سے انکار کیا جارہا ہے اور جس تاثرِ بےچارگی نے اس کو ایک قوتِ برتر و اعلیٰ کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا آج وہی اعتراف عجز و بےکسی اس قوت کے انکار پر مائل کر رہا ہے، پھر اگر انسان کا یہ میلان واقعی سرکشی ہے تو بہت بڑی سرکشی ہے اور اگر کسی حقیقت کا انکشاف ہے تو بڑی حقیقت کا انکشاف ہے۔

خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے یوں تو بڑے بڑے دلائل پیش کئے جاتے ہیں لیکن اس سے انکار کرنے والے، اس کو نہ ماننے والے کیا کہتے ہیں۔ آیئے آج کی صحبت میں اس پر مختصر گفتگو کریں۔

منکرین خدا کے خیالات

۱- کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمام چیزیں پیدا کیں اور وہی اِن سب کا رکھوالا ہے (مدبر السماوات والارض) اس لئے مخلوق کو اس کا شکر گزار و مطیع ہونا چاہئے اور اسی اظہار شکریہ و اطاعت کا دوسرا نام مذہبیت ہے جو تمام اقوامِ عالم میں رائج ہے۔

۲- ہزاروں لاکھوں سال تک یہ عقیدہ قائم رہا کہ خدا قربانیاں چاہتا ہے اور ان قربانیوں کے عوض وہ مینہ برساتا ہے، کھیتیاں اگاتا ہے، اگر قربانیاں نہ کی جائیں تو پھر قحط، وبا، طوفان و زلزلہ بھیج کر اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے۔

۳- اس وقت تک تمام مذہبی اقوام کا عقیدۂ راسخ یہی ہے کہ خدا التجاؤں کو، دعاؤں کو سنتا ہے اور پورا کرتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی کہ وہ ایمان لانے والوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور اُن کی روحوں کو عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔

یہ ہے گویا اصل روح، مذاہبِ عالم کی تعلیمات کی۔

اب ان تعلیمات کو سامنے رکھ کر ایک منکر خدا، منکرِ مذہب سوال کرتا ہے کہ:

۱- کیا مذہب کی بنیاد حقائقِ مسلّمہ پر مبنی ہے؟ کیا واقعی خدا کوئی چیز ہے؟ اور اس نے ہمیں تمہیں پیدا کیا ہے؟ کیا حقیقتاً وہ دعاؤں کو قبول کرلیتا ہے اور قربانیوں سے خوش ہوتا ہے؟

۲- پھر اگر واقعی خدا بنی نوعِ انسان کا پیدا کرنے والا ہے تو اس نے کوڑھی، اپاہج، دیوانے، فاترالعقل لوگ کیوں پیدا کئے، مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کی تخلیق کیوں کی۔ اور کیا کوئی ایسی قوت جو بہر نوع مکمل ارفع و اعلیٰ ہو، اس سے ایسی ناقص مثالیں تخلیق کی ظاہر ہوسکتی ہیں؟

اگر خدا تمام نظامِ عالم اور دُنیا کے جملہ کاروبار کا سنبھالنے والا ہے، یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ ایک ذرّہ بھی بغیر اس کی مرضی کے حرکت میں نہیں آسکتا تو کیا وہ نیرو اور چنگیز کی تخلیق کا ذمہ دار نہیں اور کیا وہ تمام انسانی لڑائیاں جن میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون پانی کی طرح بہہ جاتا ہے، بغیر اس کی مرضی کے ہوجاتی ہیں؟ کیا وہ اس کا ذمّہ دار نہیں کہ اس کی مخلوق کا بڑا حصّہ صدیوں تک غلامی کے بوجھ سے دبا ہوا کراہتا رہا اور کوڑوں کی مار اس کی پیٹھ سے خون کے فوارے بلند کرتی رہی۔ اور کیا خدا کا مدبر الامر ہونا اس امر کی اجازت دے سکتا تھا کہ ماؤں کی گود سے اُن کے شیر خوار بچے چھین کر فروخت کردیئے جائیں، اور وہ تڑپنے کے لئے بے یارومددگار چھوڑ دی جائیں۔

کیا اہلِ مذاہب نے جو نوعِ انسانی کے ساتھ مظالم روا رکھے ہیں وہ خدا کی مرضی کے خلاف تھے اور کیا خدا اس کو گوارا کرسکتا تھا کہ اس کا نام لے لے کر لوگوں کے ناخنوں میں کِیلیں ٹھونک دی جائیں، ان کو زندہ جلایا جائے اور خاردار پہیوں میں دبا کر ان کے جسم کا ریشہ ریشہ علیحدہ کردیا جائے۔

کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ ایک ظالم و کمینہ انسان دوسرے شریف و نیک انسان کو پامال کردے۔ اور کیا محبانِ وطن کے ساتھ دار و رسن کے معاملہ کے علاوہ کوئی اور معاملہ پسند نہیں کرتا؟

اگر واقعی خدا نظامِ عالم کا ذمہ دار ہے تو:

۱- طوفان و زلزلہ اور قحط و وبا کے مصائب لانے سے کیا فائدہ اس نے سوچا ہے۔

۲- خون خوار درندوں اور زہریلے کیڑوں کی تخلیق سے کیا نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے۔

۳- ناخن وچنگال کو دنیا میں کیوں پیدا کیا؟ کیا شیر کا اسی لئے قوی پنجہ بنایا کہ وہ غریب ہرنوں کو ہلاک کرتا پھرے، کیا عقاب کی چونچ اس لئے نکیلی بنائی کہ وہ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دے۔

۴- کیا مہلک بیماریوں کے لاتعداد جراثیم اسی لئے پیدا کئے گئے کہ وہ انسانوں کو ہلاک کرتے رہیں اور کیا خدا کے لئے مناسب تھا کہ سل و دق کے جراثیم کی غذا اِنسانی پھیپھڑے کو قرار دے۔

اِن واقعات پر غور کرنے کے بعد لازماً ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ صرف یہ کہ مذہب نام ہے صرف بے بنیاد خوف کا جسے خود انسان کے واہمہ نے پیدا کیا۔ یہی خوف ہے جو اس سے معابد و قربان گاہ کی تعمیر کراتا ہے اور یہی ڈر ہے جو اُسے دوزانو کرکے اس کے جسم پر کپکپی طاری کردیتا ہے (جس کا دوسرا نام طاعت و عبادت ہے) پھر ظاہر ہے کہ جو تعلیم صرف جذبۂ خوف وہراس کی پیدا کرنے والی ہوگی وہ کبھی بنی نوعِ انسان کی ترقی کی ذمہ دار نہیں ہوسکتی۔ اور اس لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مذہب نام ہے اُس غلامانہ ذہنیت کا جسے صرف خوف وبزدلی، یاس و بے چارگی اور غربت و مسکنت پیدا کرتی ہے اور جو جرأت و ہمت کے ان جذبات سے جن پر تمام ترقیوں کا انحصار ہے انسان کو محروم کردیتی ہے، مانا کہ خدا سب سے بڑا آقا ہے اور انسان اس کا سب سے حقیر غلام۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا غلامی خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو خوشگوار چیز ہو سکتی ہے؟ آقا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا!--- اچھّا اب اور آگے چلئے!

اگر خدا کا وجود مان بھی لیا جائے تو یہ بات کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ رحیم و کریم بھی ہے، محبّت و شفقت والا بھی ہے۔ لاکھوں بندگانِ خدا ایسے ہیں جو دوپہر کی گرمی میں ہل چلا رہے ہیں، سر کا پسینہ ایڑی تک بہہ رہا ہے، جسم تھکن سے چور چور ہے اور وہ ان تکالیف کو صرف اس لئے برداشت کر رہے ہیں کہ جب ان کی کھیتیاں لہلہا اُٹھیں گی تو ان کے تمام مصائب کا نعم البدل مل جائے گا، لیکن ٹھیک اُس وقت جب کہ تکمیلِ آرزو کا زمانہ آتا ہے، آسمان کو دیکھتے دیکھتے اُن کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور بارش کا ایک قطرہ ان کی خشک کھیتیوں پر نہیں گرتا، یا یہ کہ طوفانی بادل اٹھتا ہے اور ان کی تمام محنتوں کو چشمِ زدن میں بہالے جاتا ہے---- یہ کیا نظام ہے؟ کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ ہزاروں

بے گناہ انسان بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہو کر فنا ہو جائیں، لاکھوں معصوم بچے اپنی ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لپٹ کر تڑپتے اور بلکتے رہیں۔ اگر غریب کسانوں پر یہ عذاب اُن کے کسی گناہ کی پاداش میں ڈالا گیا تو ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا قصور تھا جو دودھ کے ایک ایک قطرہ کے لئے ترسا ترسا کر یوں ہلاک کر دیئے گئے۔

ساتھ بادِ سموم کو دیکھو جو ریگزاروں میں گاؤں کے گاؤں تباہ کر جاتی ہے۔ زلزلہ کی تباہ کاریوں پر غور کرو جو ہزاروں انسانوں کو زندہ نگل جاتی ہیں، کوہ آتش فشاں کا خیال کرو جو بستیوں کی بستیاں جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے، وبائی بیماریوں کو دیکھو جو لاکھوں کا سَتھراؤ کر کے رکھ دیتی ہیں---- پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا یہ تمام مصائب نازل نہ کرتا تو کیا بنی نوع انسان یہ خیال قائم کر لیتی کہ خدا اُن کی پرواہ نہیں کرتا اور کیا خدا کی شفقت و مہربانی صرف قحط و زلزلہ، وبادِ گرسنگی سے ہی پہچانی جاسکتی تھی۔

ہم کو بتایا گیا ہے کہ تمام انسان یکساں عقل و دماغ کے پیدا نہیں کئے گئے، ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے لیکن کیا اس تفریق و امتیاز کا کوئی سبب بتایا جاسکتا ہے؟--- اگر اچھی عقل رکھنے والی قوموں کو خدا کے اس عطیہ پر اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے، تو کیا ادنیٰ درجہ کی قوموں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ صرف اس لئے کہ وہ جانور نہیں بنائے گئے۔

اگر خدا نے قوموں میں یہ امتیاز روا رکھا تھا تو یقیناً وہ اس سے بھی آگاہ ہو گا کہ اعلیٰ قومیں ادنیٰ کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ اِن کے لاکھوں افراد کو غلام بنا کر کوڑوں کی مار سے تڑپایا کریں گی، میدان کے میدان ان کی لاشوں سے پاٹ دیں گی اور ہزاروں معصوم بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کریں گی۔ پھر اگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے خدا نے یہ امتیاز روا رکھا تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایسے خدا کو کون محبت و شفقت کرنے والا خدا کہے گا۔

وہ تنگ و تاریک قید خانے جہاں شریف الاخلاق انسان تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں وہ سولیاں جن پر ہمیشہ خدا کے نیک بندوں کا ہی خون بہایا جاتا ہے، وہ بے یارومددگار غلام جن کے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں، وہ بہت سے خدا کا نام بلند کرنے والے جن کا جسم شکنجوں میں ڈال کر پیس ڈالا جاتا ہے، وہ بہت سی دکھیاری مائیں جن کی گودیں تیغ و تفنگ کی قوت سے خالی کر دی جاتی ہیں، وہ بہت سے معصوم شیر خوار بچے جن کے نرم و نازک جسموں کو تلوار دو نیم کر دیتی ہے، وہ بے شمار فاقہ زدہ

انسان جن کے جسم میں سوا پوست و استخواں کے کچھ نظر نہیں آتا، وہ مہلک امراض میں تڑپنے اور کراہنے والی لاتعداد انسانی مخلوق، وہ طوفان و سیلاب سے سیکڑوں تباہ ہو جانے والے گاؤں، وہ امساکِ باراں یا ژالہ باری سے خشک و افسردہ ہو جانے والی کھیتیاں، وہ جبابرۂ عالم جو ذبح کئے ہوئے ہزاروں انسانوں کے جمجموں کا مینار بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں، وہ ظالم و سفاک سلاطین جن کا اپنی عیش کوشی پر قوم کی قوم کو قربان کر دینا ادنٰی مشغلہ ہے، وہ بے شمار موذی جانور جن کے دانتوں سے دوسرے غریب جانوروں کا خون ہر وقت ٹپکتا رہتا ہے، وہ لاتعداد زہریلے سانپ جو ہلاکت پھیلانے کے لئے اپنے تالوؤں میں زہر کی تھیلیاں لئے اِدھر اُدھر رینگتے پھرتے ہیں، وہ ہر جگہ ہر وقت قوی کا ضعیف کو پامال کرتے رہنا، وہ مکر کا صداقت پر، جھوٹ کا سچائی پر، بدی کا نیکی پر غالب آجانا----- یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ سب اُسی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے جسے رحیم و کریم کہتے ہیں، جو بڑا شفقت کرنے والا بتایا جاتا ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو مذہب کے بتائے ہوئے وجود خداوندی کو نہیں مانتے لیکن وہ ایک ایسی قوت برتر و اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں جو انسان کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ یہ قوّت کیا ہے؟ آیئے اس پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈال لیں، انسان کی گزشتہ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ وہ برابر ترقی کر رہا ہے اور اس کی ترقی نتیجہ ہے محض اس کے تجربات کا------ایک شخص سفر کر رہا ہے اور دورانِ سفر میں وہ ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں دو راستے علیٰحدہ علیٰحدہ پھوٹتے ہیں۔ وہ قیاس سے کام لے کر ایک راستہ کو اختیار کرتا ہے، لیکن جب وہ اس غلطی سے آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر واپس آتا ہے اور دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے جو اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

ایک بچّہ شعلہ کی رنگینی کو دیکھ کر اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن جب اس کا ہاتھ جلنے لگتا ہے تو ہٹا لیتا ہے اور پھر کبھی اس کی جرات نہیں کرتا----- اس قسم کی ہزاروں مثالیں ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی تجربہ ہی وہ قوت ہے جو اس کی رہنمائی کرتی رہتی ہے اور یہ قوت ضمیر نہ انسانی سے متعلق ہے نہ خدا کی رہبری سے، نہ وہ کسی ارادہ کی مالک ہے نہ کسی مقصد کی متمنّی، بلکہ وہ محض نتیجہ ہے انسانی تجربات کا جسے واقعات و حادثات سے کسی طرح علیٰحدہ نہیں کر سکتے۔

اِس لئے خدا کے وجود کو ایک ایسی قوت تسلیم کر لینا جس نے ہمارے اندر اخلاق کی

حسن ودیعت کر دی ہے، ضمیر کی شمع روشن کر دی ہے، درست نہیں کیوں کہ یہ سب کچھ ہم کو تلخ تجربوں کے بعد حاصل ہے اور کسی دوسری قوت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

انسان فطرتاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور قبیلہ و خانوادہ کی زندگی بسر کرنے پر طبعاً مجبور ہے، پھر اگر کسی خاندان، قبیلہ یا قوم کے افراد اجتماعی مسرّت کا باعث ہوا کرتے ہیں تو ان کی تعریف کی جاتی ہے ورنہ بُرائی، اور یہی وہ چیز ہے جو ایک قوم کی زندگی اور اس کے تمدن کا مخصوص معیار مقرر کر دیتی ہے اور اس میں کوئی" مافوق العادت" بات نہیں پائی جاتی۔

فرض کیجئے کہ خدا موجود ہے جو غیر محدود و لامتناہی ہے، پھر ظاہر ہے کہ جو چیز غیر محدود ہو گی وہ کیف وہ کم سے بے نیاز ہو گی اور جو کیف و کم سے بے نیاز ہے وہ نفع و مضرت سے بلند ہے۔ اس کو نہ کسی چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے اور نہ اس پر کوئی تاثر طاری ہو سکتا ہے، اس لئے اگر انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک غیر محدود خدا کو حمد و تعریف کی ضرورت ہوتی ہے یا وہ انسانی تعریف سے خوش ہوتا ہے تو اس کو سوا حماقت کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

کیا نظامِ عالم کسی کی دعا سے بدل سکتا ہے، کیا ہم عبادت سے سمندر کے مدوجزر کو روک سکتے ہیں، کیا قربانیوں سے ہوا کا رخ بدلا جا سکتا ہے۔ کیا سربسجود ہو جانے سے کسی کو دولت مل سکتی ہے اور کیا الحاح وزاری سے کوئی بیمار اچھا ہو سکتا ہے؟

مذہب کی بنیاد اس عقیدے پر قائم ہے کہ نظامِ عالم کا کوئی مدبر ضرور ہے اور وہ مدبر یا مالک انسانی التجاؤں کو سنتا ہے، اپنے بندوں کو انعام و سزا دیتا ہے اور عبادت و تعریف سے خوش ہوتا ہے لیکن کیا یہ عقیدہ کسی واقعہ و حقیقت پر مبنی ہے، کیا کوئی ایسا نظریہ موجود ہے جو ہم کو ایسا باور کرنے پر مجبور کر دے، یقیناً نہیں ہے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے محض وہم و قیاس کا، ظن و تخمین کا یا پھر اُن مصالح کا جن کی بناء پر لوگوں کی تخویف یا تشویق ضروری سمجھی گئی۔

اب اس کے مقابلہ میں لامذہب دہریہ کو دیکھئے کہ اس کا نظریہ کیا اور کیسا ہے، اور اس کے اعتقاد کی تعمیر کن چیزوں پر قائم ہے، پہلی چیز مادہ ہے جو فنا پذیر نہیں، دوسری چیز قوّت ہے اور یہ بھی فنا نہیں ہو سکتی، تیسری چیز یہ ہے کہ مادہ اور قوّت دونوں جدا نہیں ہو سکتے، یعنی نہ مادہ بغیر قوت کے پایا جا سکتا ہے نہ قوت بغیر مادہ کے اور چوتھی یہ ہے کہ جو چیز فنا نہیں ہو سکتی وہ کبھی پیدا بھی نہیں ہوئی------ اور اس طرح گویا ثابت ہو گیا کہ مادہ اور قوت

ازلی وابدی چیزیں ہیں اور ان کا خالق کوئی نہیں۔ پھر جب کائنات کا وجود صرف مادہ و قوت کا ممنون ہے تو ظاہر ہے کہ خدا کے ماننے کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سلسلۂ تخلیق اسی طرح ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔ اور انسان کی تخلیق بھی اسی سلسلہ کی چیز ہے جس کا تعلق کسی خاص ارادۂ خداوندی سے نہیں ہے۔ جو کچھ ممکن تھا وہ قوت و مادہ کے امتزاج سے واقع ہوا۔ جو ممکن ہے وہ واقع ہو رہا ہے اور جو ممکن ہو گا وہ ظہور میں آئے گا----- اجرامِ فلکی کی تخلیق، موسموں کا تغیر و تبدل، نباتات و حیوانات کا وجود، قوتِ ذہن و اِدراک، اور تمام وہ باتیں جو عالم کیف و کم سے تعلق رکھتی ہیں، سب نتیجہ ہیں مادہ کے فعل و انفعال کا اور اسی سے یہ تمام تنوع کائنات میں نظر آتا ہے اور ابد الآباد تک نظر آئے گا۔

ہزاروں سالوں سے نوع انسانی کی اصلاح کے لئے کوشش ہو رہی ہے اور اسی اصلاح کے لئے لوگوں نے خدا کا خیال پیدا کیا، مذہب کی بنیاد ڈالی، صحف الہامی پیش کئے، دوزخ و جنت پر یقین دلایا، معابد تعمیر کئے، عبادتیں کرائیں، لیکن اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ جس چیز کا وجود ہے یعنی مادہ کا، وہ بالکل بے حس ہے۔ نہ اس کے سامنے کوئی تصور ہے نہ ارادہ، نہ تاثر ہے نہ اِدراک۔ بغیر قصد کے وہ پیدا کرتا ہے اور بغیر کسی وجہ کے ہلاک کر ڈالتا ہے۔

اس لئے اب سوال یہ ہے کہ نوع انسانی کی نجات کیوں کر ممکن ہے۔ یعنی اصلاح اخلاق و تمدن جسے مذاہب عالم اب تک پورا نہ کر سکے، کیوں کر تکمیل تک پہنچ سکتی ہے؟ اس کے جواب میں صرف سائنس کو پیش کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اسی کے ذریعے سے مادہ پر فتح پا سکتے ہیں اور اسی کی روشنی میں ہم پر یہ حقیقت واضح ہو گی کہ نیک کام خود آپ اپنی جزا ہے اور بُرا کام خود آپ اپنی سزا۔

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ خلاصہ ہے اُن لوگوں کے خیالات کا جو خدا اور مذہب کے قائل نہیں ہیں۔ اب آپ اس پر ایک بسیط تبصرہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کوئی حقیقت پائی جاتی ہے یا نہیں۔

جس حد تک دلائل کا تعلق ہے خدا کے اثبات و انکار کا مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ شائد ہی انسان کبھی اس گتھی کو سلجھا سکے۔ اُس شخص سے جو خدا کا ماننے والا ہے، دریافت کیجئے کہ وہ کن دلائل کی بنا پر خدا کے وجود کا قائل ہوا ہے تو وہ سوا اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اتنا بڑا عالم بغیر کسی صانع کے آپ ہی آپ کیوں کر وجود میں آ سکتا ہے۔ بظاہر یہ دلیل اتنی

صاف و صریح، اتنی روشن و واضح ہے کہ اس میں چون و چرا کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، لیکن ایک منکر خدا سوال کرتا ہے کہ جب بغیر وجودِ صانع کے کائنات کا پایا جانا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا، تو خدا کا آپ ہی آپ ظہور میں آجانا کس طرح سمجھ میں آجاتا ہے، تو اس کا کوئی تشفّی بخش جواب نہیں دیا جاسکتا اور عقل انسانی گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

اسی طرح جب منکرِ خدا سے پوچھا جاتا ہے کہ مادہ اور قوت کیوں کر وجود میں آئے تو وہ جواب دیتا ہے کہ از خود پیدا ہو گئے۔ اور جب اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے "خدا کا از خود پیدا ہو جانا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتا، لیکن مادہ و قوت کا آپ ہی آپ ظہور میں آجانا سمجھ میں آجاتا ہے، یہ کیا بات ہے" تو وہ بھی گھبرا جاتا ہے اور اس کے پاس بھی اس کا کوئی تشفّی بخش جواب نہیں ہوتا۔

الغرض وہ خدا ہو یا مادہ، آپ ہی آپ پیدا ہو جانا ہم کو اس قدر عجیب و غریب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک انسان خود تو آنکھ بند کر کے بغیر کسی دلیل و حجت کے شاید مان بھی لے اگر اس کا ضمیر اس یقین کی طرف رہبری کرتا ہے لیکن کسی ایسے شخص کو باور کرانا جو ہم سے قطعی و اذعانی دلیل کا طلب گار ہو بالکل محال ہے۔

اِس لئے جس حد تک دلائلِ عقلی کا تعلق ہے اس مسئلہ کی نوعیت صرف یہ قرار پاتی ہے کہ اگر آپ ہی آپ کسی چیز کا ظہور میں آنا سمجھ میں آسکتا ہے تو خدا اور مادہ دونوں پر منطبق ہو سکتا ہے، ورنہ ایک پر بھی نہیں----- اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس باب میں دونوں جماعتیں اِس درجہ کمزور واقع ہوئی ہیں اور بہ لحاظ وجودِ خدا اور مادہ دونوں ایک حیثیت کی مانی جاتی ہیں تو خدا کے ماننے والے کیوں مادہ کی قدامت پر ایمان نہیں لے آتے یا مادہ پرست جماعت کیوں خدا کے ماننے سے احتراز کرتی ہے۔

اس کا جواب اہلِ مذاہب کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ اگر خدا کو چھوڑ کر صرف مادہ کی قدامت پر ایمان لایا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان کو اخلاقی لحاظ سے بالکل درندہ بنا دیا جائے اور وہ کسی قوتِ برتر و اعلیٰ کے خوفِ بازپرس سے مطمئن ہو کر جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ ایک ملحد و منکر کہتا ہے کہ اگر خدا کا ماننا انسان کی درستیٔ اخلاق و اصلاحِ تمدن کو مستلزم ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پُورا نہیں ہوا اور اگر خدا واقعی قادر و مطلق ہے تو اس نے کیوں اس وقت تک تمام بربادیوں، ہلاکتوں، معصیتوں اور بدعنوانیوں کو روا رکھا۔ اس کا جواب اہلِ مذاہب زیادہ سے زیادہ یہی دے

سکتے ہیں کہ وہ مالک و مختار ہے اور اپنے مصالح کو وہی خوب جانتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ فریقِ مخالف کو اس جواب سے تسکین نہیں ہو سکتی اور اس طرح گویا دونوں فریق ایک دوسرے کو مطمئن کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

منکرینِ خدا کی جماعت تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ پکا منکر و ملحد گروہ ہے جو انتہائی یقین کے ساتھ خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے مثلاً فیور بیش (Feuerbach) جو کہتا ہے کہ "خدا رات یا دن کی طرح واضح اور آفتاب کی طرح روشن نہیں" یا فلورنس(Flourence) جس نے ایک جگہ صاف صاف لکھ دیا کہ "خدا کے وجود کا خیال نوعِ انسانی کے ساتھ سخت دشمنی ہے"۔ دوسرا گروہ مشرکین کا ہے جن کا یہ کہنا ہے کہ انسان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں اور یہ ارتیابیت اس کی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ تیسرا گروہ ناقدین کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کے وجود کا جو ثبوت پیش کیا جاتا ہے وہ مفید علم و یقین نہیں۔

اوّل الذکر گروہ تو خارج از بحث ہے کیوں کہ انکارِ محض کا ثبوت آج تک نہ کوئی دے سکا ہے نہ دے سکتا ہے، علاوہ اس کے جب تک تمام کائنات اور اس کے موجودات کا استقصاء نہ کر لیا جائے کیوں کہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے وجود کی کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی، بالکل ممکن ہے کہ مادہ کی قدامت پر ایمان لانے والے اب آیندہ کوئی ایسی دلیل پا سکیں جو ان کے نظریہ کو بدل دینے والی ہو اور وہ مادّہ و قوّت کی ازلیت و ابدیت سے انکار کرنے پر مجبور ہوں۔ مؤخر الذکر باقی دو جماعتیں ضرور قابلِ لحاظ ہیں، اور اس وقت مغرب کا بڑا حصّہ انھی دو میں سے کسی ایک خیال کا مؤیّد ہے۔ پھر دیکھنا یہ ہے کہ اہلِ مذہب یا خدا کے ماننے والے ان کے تذبذب کو دُور کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کیوں کر؟

جواب کی بظاہر دو ہی صورتیں ہوا کرتی ہیں، یا تو کوئی شخص اپنے دعوے و بُرہان کو ثابت کر دے یا مخالف پر بھی اسی قسم کا اعتراض کر دے۔ اوّل الذکر صورت جواب کی اثباتی ہے جو یقیناً بہترین صورت دوسرے کو قائل کرنے کی ہوا کرتی ہے لیکن دوسری صورت جواب کی الزامی ہے جو مخاطب کو خاموش تو کر سکتی ہے لیکن مطمئن نہیں کر سکتی۔

یقیناً ہم ایک منکر خدا کے مقابلہ میں کوئی ایسا بدیہی ثبوت تو پیش نہیں کر سکتے جو اُسے وجودِ باری کے یقین پر مجبور کر دے، لیکن اگر ہم خود اسی کے نظریوں سے یہ ثابت کر سکیں کہ وہ باوجودِ انکارِ خدا کے کسی نہ کسی طرح خدا کا قائل ہے تو شاید ایک حد تک

کامیاب ہو سکتے ہیں۔

آپ کسی بڑے سے بڑے منکر خدا سے سوال کیجئے کہ کیا اس کا خدا سے انکار کرنا اس بنا پر ہے کہ وہ خدا سے نفرت کرتا ہے یعنی اگر واقعی کسی خدا کا وجود ہو تو وہ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا، ظاہر ہے کہ اس کا جواب وہ نفی میں دے گا کیوں کہ نفرت و استکراہ کی کوئی وجہ موجود نہیں اس لئے خدا سے انکار کرنے کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے وجود کی دلیل اس کے پاس نہیں ہے۔ یا یہ کہ اس کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک چیز اپنے آپ کیوں کر پیدا ہو گئی لیکن اسی کے ساتھ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ وہ خدا سے انکار کرنے کے باوجود خدا ہی کی طرح ایک دوسری چیز مادہ کے از خود پیدا ہونے کا بھی قائل ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ حقیقی معنٰی میں منکرِ خدا تو کوئی نہیں ہے، بلکہ خدا کو جس مفہوم میں پیش کیا جاتا ہے، وہ بعض کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اس کو تسلیم نہ کر کے وہ دوسرے نام اور دوسرے مفہوم کے ساتھ خدا کو پیش کرتے ہیں اس لئے حقیقتاً دنیا میں یہ اختلاف خدا کے وجود یا عدمِ وجود میں نہیں ہے بلکہ اس تعبیر یا اس مفہوم میں ہے جو خدا کے تصوّر سے متعلق ہے۔ یعنی ایک اگر اس کا تصوّر اس طرح کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ وجود میں آیا ہے، قادر مطلق ہے، خلّاقِ عالم ہے، ہر وقت ہر آن اختیارِ کامل کے ساتھ بنانے بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے، نیکی پر انعام دیتا ہے، بُرائی پر سرزنش کرتا ہے، اس سے بازپرس نہیں کی جا سکتی وغیرہ وغیرہ تو دوسرا بھی جو بجائے خدا کے مادہ و قوّت کا ماننے والا ہے کم و بیش اسی خیال کا مؤید ہے کیوں کہ وہ بھی مادہ کو از خود پیدا ہو جانے والا تسلیم کرتا ہے، اسی کو تخلیقِ عالم کا سبب قرار دیتا ہے، اسی کی مختلف کیفیات کو وہ اشیاء کے بننے بگڑنے سے تعبیر کرتا ہے۔ پھر بھی اگر کوئی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ ایک اپنے خدا کو ارادہ کا مالک سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں، یعنی ایک کا خدا اگر جاننے بوجھنے والا ہے، سمیع و بصیر ہے تو دوسرے کا ایسا نہیں ہے لیکن اگر ہم اہلِ مذہب میں سے اس جماعت کے اعتقاد کو اپنے سامنے رکھیں جو مقادیرِ الٰہیّہ میں تغیر و تبدّل کا قائل نہیں ہے تو یہ فرق بھی دُور ہو جاتا ہے کیوں کہ اگر ایک مقدّرات کو بدلنے کی قدرت رکھنے کے باوجود نہیں بدلتا[7] تو دوسرا بدل نہیں سکتا اور ان دونوں کا نتیجہ وہی ایک نکلتا ہے۔

اب رہ گیا سوال انعام و سرزنش کا سو میری رائے میں یہاں بھی باہم کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں اِس کو ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں۔

7۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيْلًا

اہلِ مذاہب کہتے ہیں کہ خدا کی عبادت کرو کہ نجات اسی سے متعلق ہے، مادئین کہتے ہیں کہ علم حاصل کروکیوں کہ ترقی اسی سے وابستہ ہے، اس لئے اب مقابلہ ہوا درمیانِ عبادت و علم کے اور نجات وترقی کے۔ پھر آیئے غور کریں کہ کیا اِن دونوں میں واقعی کوئی اصولی تضاد پایاجاتاہے یاصرف تعبیرات کا اختلاف ہے۔

اگر آپ عبادت کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ خدا کی محض ظاہری پرستش یعنی خاص مراسم وحرکات کی پابندی کبھی کسی مذہب کا مقصودِ حقیقی نہیں رہاہے۔ کیوں کہ خدا کو بے نیازِ مطلق سمجھنے والے یہ اچّھی طرح جانتے ہیں کہ خدا کو نہ عبادت سے کوئی فائدہ پہنچ سکتاہے نہ ترکِ عبادت سے کوئی نقصان، اس لئے ظاہر ہے کہ عبادت کا مقصود اگر کوئی ہو سکتاہے تو صرف یہ کہ ہمیں کو اس سے فائدہ پہنچے اور یہ فائدہ اُسی وقت مترتب ہو سکتاہے جب عبادت سے خود ہمارے اندر کوئی ذہنی تبدیلی ہو اور ذہنی تبدیلی سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنی حقیقت کو سمجھیں اور اپنی اس اہلیت کو بروئے کار لائیں جو مظاہرِ قدرت اور نوامیسِ فطرت سے استفادہ کا باعث ہوا کرتی ہے۔اس لئے آپ دیکھیں گے کہ عبادت کے ساتھ ہی ساتھ اچھے کام کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے اور غوروفکر، تدبّر و تعقل کا بھی حکم دیا گیا ہے، تاریخِ مذاہب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتاہے کہ سب سے پہلے جو صورت عبادت کی متعین کی گئی وہ نوامیسِ طبعی سے متعلق تھی اور مظاہرِ قدرت ہی پر غور کرنے کا دوسرا نام عبادت تھا۔ چناں چہ آفتاب کی پرستش، آگ کی پوجا، دریا کا احترام اور اسی طرح کے اور بہت سے معتقدات اسی لئے پیدا ہوگئے اور اب تک بعض قوموں میں پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے آفتاب کی پرستش سے مقصود صرف اس امر کا اعتراف تھا کہ وہ نہ صرف انسانی زندگی بلکہ انسانی ترقی کے لئے کس درجہ ضروری چیز ہے اور اسی طرح آگ اور دریاؤں کی پوجا سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ کارِ حیاتِ انسانی میں کیسے زبردست ممدّ ومعاون ہیں۔ اس کو سالہاسال کے تجربوں نے بتادیا تھا کہ اگر سورج نہ ہو تو کھیتیاں بارآور نہیں ہو سکتیں، اگر دریا اور چشمے نہ ہوں تو امساکِ باراں کے وقت نہ زراعت کی آب پاشی ہو سکتی ہے نہ مویشیوں کو پانی میسر آسکتا ہے،اسی طرح وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ آگ کتنی اہم و ضروری چیز ہے، الغرض مظاہرِ قدرت کی پرستش بھی اسی اصولِ فطرت کے تحت جاری ہوئی کہ انسان کو ان کا علم حاصل کرکے اپنی ترقی میں کام لینا تھا۔

اب اس کے بعد آپ اس زمانہ کو لیجئے جب انسان آہستہ آہستہ ترقی کر کے پختگی عقل و دماغ کو پہنچا اور اس نے خدا کا ایک بلند مفہوم پیش کر کے پرستش قرار دیا تفکّر و تدبّر کو جو تمام کائنات کو محیط تھا اور انسان کی عظیم الشان اہلیت کو جس کا دوسرا نام خلافتِ خداوندی تھا، وراثتِ الٰہی تھا اور جس کو صاف صاف کھول کر یوں کہہ دیا کہ " عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا[8] (یعنی آدمی کو ہم نے سب کچھ بتادیا ہے) یہ بڑی زبردست پیشین گوئی تھی انسان کے دماغی ارتقاء اور ذہنی استعلاء کی، جو آخر کار پوری ہو کر رہی اور جس کا ثبوت عہدِ حاضر کے اختراعات سے بخوبی مل سکتا ہے۔

اِس بیان سے غالباً یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ مادہ و قوّت کے ماننے والے جس چیز کو علم و سائنس کہتے ہیں مذہب اس کو لفظ عبادت و پرستش سے تعبیر کرتا ہے یعنی اگر وہ کہتے ہیں کہ انسانی فلاح علمی جستجو پر منحصر ہے تو یہ بھی یہی کہتے ہیں کہ انسان کی نجات وابستہ ہے تفکّر و تدبّر سے اور مظاہرِ قدرت کے اس عمیق مطالعہ سے جو انہماک و انقیاد کی کیفیت انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے، البتہ نجات کے مفہوم میں تھوڑا سا فرق وہاں آکر ضرور پیدا ہو جاتا ہے جہاں سوال تمام نوع انسان کی اجتماعیت کا ہے اور مذہب قومیت کے تنگ مفہوم سے بلند تر انسانیت کا مفہوم پیش کرتا ہے۔

یقیناً جو مفہوم نجات کا ہے وہی ترقی کا ہے اور یہ سب کچھ اسی دنیا سے متعلق ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان نے تمام موجودہ ترقیوں کے ساتھ اس مقصود کو حاصل کر لیا ہے جسے حقیقتاً نجات یا ترقی کہا جاسکتا ہے، غالباً نہیں۔ کیوں کہ نجات یا ترقی کے مفہوم میں سب سے پہلے جو چیز ایک متمدن انسان کے سامنے آسکتی ہے وہ دنیا کا امن و سکون ہے۔ کیوں کہ جب تک یہ حاصل نہ ہو مادی یا ذہنی ترقی کی کوئی غایت متعین نہیں ہو سکتی اور دنیا کے امن و سکون کی جو حالت اس زمانہ میں ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ ایک ہی قوم، ایک ہی مسلک و مشرب، ایک ہی ذوق و معاشرت والی جماعتوں میں کتنا اختلاف نظر آتا ہے اور اور بظاہر کوئی صورت اس کے دور ہونے کی نظر نہیں آتی۔

علمی ترقیاں بجائے اس کے کہ نوع انسانی کے تمام افراد کو کسی ایک مرکز پر لائیں آپس میں جنگ و جدال کی نئی نئی راہیں پیدا کر رہی ہیں اور خدا کی عطا کی ہوئی وہ اہلیت جو رشتۂ اخوت و محبت استوار کرنے کے کام آنی چاہیئے تھی، فساد و ہلاکت کی اشاعت میں

8- اسماء سے مراد یہاں چیزوں کے نام نہیں ہیں بلکہ تعینات فکر و دماغ مقصود ہیں۔

صرف ہورہی ہے اور اسی نقطہ پر پہنچ کر ہم کو مذہبی نجات اور دنیاوی ترقی کا فرق محسوس ہوتا ہے۔مذہب کہتا ہے انسانی نجات منحصر ہے پُر امن ترقی پر اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ نجات نام ہے صرف فراہمی زرودولت کا، مذہب بتاتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ محبّت و خلوص کا برتاؤ کرو، ان کا کہنا ہے کہ دوسرے کی ہلاکت پر اپنا قصر حیات تعمیر ہوتا ہے، مذہب کی ہدایت یہ ہے کہ نوامیس فطرت کی تحقیق کرو افادۂ عام کے لئے اور ان کا عمل یہ ہے کہ قوت ایجادواختراع صرف کرو بربادی وویرانی پھیلانے کے لئے۔

یقیناً فن پرواز انسانی ترقی کا قابل فخر کارنامہ ہے، لیکن کیا اس کے ذریعہ سے بم گرا کر خدا کی بے گناہ مخلوق کو ہلاک کرنا ترقی کی علامت قرار دیا جائے گا؟ عناصر کی تحقیق اور کیمیائی اختراعات کے افادہ سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن کیا اس سے زہر آلود گیس پھیلا کر ہزاروں بندگان خدا کو موت کی آغوش میں دے دینا انسانی ترقی کہلائے گی؟ صنعت و تجارت کو ترقی دے کر مال و دولت حاصل کرنا یقیناً پسندیدہ امر ہے، لیکن کیا جذبۂ مسابقت سے مغلوب ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو لوٹنے کی فکر میں رہنا اور مسئلہ زر کو اتنا پیچیدہ بنادینا کہ خود انسانی دماغ بھی اس کو سُلجھا نہ سکے، ترقی وفلاح کا باعث ہو سکتا ہے۔

الغرض اس وقت کی تمام اختراعات و ایجادات، جملہ اقتصادی اور معاشرتی مسائل نے ایک ایسا اضطراب دنیا میں پیدا کر دیا ہے کہ امن و سکون تو کجا، انسان کو جینا بھی دشوار ہو گیا ہے اور دنیاوی ترقی کا یہی وہ نقصان رساں پہلو ہے جس سے بچنے کے لئے خدا اور مذہب کا وجود ضروری ہے اور بقول والٹیئر "اگر خدا نہیں ہے تو بھی ہمیں خدا پیدا کرنا پڑے گا"۔

منکرینِ خدا کا ایک زبردست اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر خدا رحیم و کریم ہے، شفقت ورأفت والا ہے تو وہ طوفان و سیلاب سے، وبائی امراض سے کیوں لاکھوں بندگانِ خدا کو ہلاک کرڈالتا ہے، ایک ظالم کو ظلم کرنے کے لئے کیوں زندہ رکھتا ہے، دنیا میں محکومی و غلامی کو کیوں قائم رہنے دیتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔

یہ امر تمام اہلِ مذاہب کے نزدیک مسلم ہے کہ انسان نتیجہ ہے عالمِ خلق کی تدریجی ترقی کا اور اس کے ذہن و دماغ کا ارتقاء بھی اسی تدریج کا پابند رہا ہے اور رہے گا- فرض کیجئے کہ خدا ایک ایسا عالم پیدا کرتا جہاں سب کو ہر وقت راحت ہی راحت ہوتی، خلش و اضطراب، خوف و اندیشہ کا نام نہ ہوتا، تو ظاہر ہے کہ ایک انسان اُس جانور سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا جسے ایک جگہ پابند رکھ کر دونوں وقت بہترین غذا دی جارہی ہے اور کیا اس

صورت میں خدا پر یہ اعتراض نہ ہوتا کہ انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

پھر جب انسان تدریجی ترقی ہی کے لئے پیدا کیا گیا تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے ویسے ہی اسباب پیدا کرنا بھی ضروری تھے اور وہ اسباب سوا اس کے کچھ نہ ہو سکتے تھے کہ اس کی راہ میں مواقع پیش کئے جاتے اور وہ ان کے دور کرنے کی تدبیریں سوچنے میں اپنے دماغ سے کام لیتا۔

اگر سیلاب نہ آتے تو انسا اپنی اور اپنی کھیتیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بند اور پُل وغیرہ کی تعمیر کیوں کر معلوم کرتا۔ اگر امساکِ باراں نہ ہوتا تو اس کا دماغ چاہ و نہر کی تعمیر کی طرف کس طرح متوجہ ہو سکتا۔ اگر بیماریاں نہ ہوتیں تو اُن سے بچنے کے لئے علم العقاقیر و علم الکیمیا کے وجود میں آنے کی کیا صورت تھی۔ اگر دنیا مستبد بادشاہ اور ظالم آقا سے خالی ہوتی تو آزادی اور حرّیت کے جذبات کیوں کر پیدا ہوتے۔ الغرض آپ عہد حاضر کی کسی علمی و دماغی ترقی کو لے لیجئے، وہ یقیناً نتیجہ ہو گی کسی نہ کسی ایسی کیفیت کا جو ناموافق حالات سے پیدا ہوئی تھی، اور اس لئے موجودہ ترقیاں ممنون ہیں صرف انہی چیزوں کی جن کے پیدا کرنے کا الزام خدا پر قائم کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قدرت کے اس نظام میں تعمیر کے ساتھ تخریبی پہلو بھی شامل ہے، یعنی پہلے تخریب ہے پھر تعمیر، لیکن یہ بھی محض ہم اپنے تاثرات کے لحاظ سے کہتے ہیں ورنہ وہاں یہ بھی کوئی چیز نہیں۔ کیوں کہ خدا، جسے بے نیاز مطلق سمجھا جاتا ہے، عالم تاثر سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور جو اصول رحم و کرم کے ہم نے اپنے دنیاوی تعلقات کی بنا پر قائم کر لئے ہیں وہ اِس پر منطبق نہیں ہو سکتے۔

اِس بیان سے غالباً یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً مذہب و سائنس دونوں ایک چیز ہیں اور جو چیز مادیّین کے نزدیک علم و ترقی سے تعبیر کی جاتی ہے وہی اہلِ مذہب کی زبان میں عبادت و نجات ہے۔ البتہ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ منکرین خدا کی علمی ترقی میں اخلاق کو نظر انداز کر کے اس کی اجتماعی حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اور اہلِ مذاہب اس ترقی میں اخلاق کو بھی شامل کرتے ہیں کہ بغیر اس کے نوع انسانی کی نجات یا دنیا کا امن و سکون کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

○○○

بقائے روح و مَعاد

مسٹر عبدالمجید حیرتؔ بی،اے شملہ کے جواب میں

محترمی--------------- السّلام علیکم

(۱) آپ یہ باور نہیں کرتے کہ خدا(فعال لمایرید) ہے اور عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرّے کی نگرانی کرتا ہے۔

(۲) آپ بقائے رُوح،حیات بعد الموت یا معاد کے قائل نہیں بہر حال آپ اس کے تو قائل ہیں کہ اسلام دنیا کا آخری اور فطری مذہب ہے، پھر اگر یہ وہ ہی اسلام ہے جسے قرآن مجید پیش کرتا ہے تو کیا آپ قرآن مجید سے نمبر (۱) اور (۲) پر کوئی دلیل پیش کر سکیں گے ؟

بقائے روح کے باب میں آپ غالباً مغرب کے تازہ اکتشافات سے بے خبر نہ ہوں گے۔

میں آخرت کا قائل ہوں اسلئے کہ:

(۱)لفظ دُنیا آخرت پر دلالت کرتا ہے۔

(۲)آخرت دنیا کے لئے انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کئے جانے کی تعلیم ہے پھر جب یہ نہیں کہا جاسکتا اور یقیناً نہیں کہا جاسکتا کہ ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب، یا آپ کے رنگ میں ہر طاعت کا واقعی عذاب اور ہر گناہ کا واقعی ثواب انسان کو اسی دنیا میں مل جاتا ہے،تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس شک کو یقین سے بدلنے کے لئے ایک یومِ آخرت تسلیم نہ کر لیا جائے۔

بلا اجر آخر آخرت پر جناب علی کرم اللہ وجہہ کے اس منطقی استدلال کو دیکھئے جسے سُن کر ایک یہودی حلقہ بگوشِ اسلام ہوا یعنی اگر اس دنیا کے بعد کچھ نہیں تو نیک وبد کی جزا و سزا میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں لیکن اگر آخرت ایک امر واقعی ہے تو پھر نقصان میں کون رہتا ہے اور نفع میں کون؟

چناں چہ میں اگر آخرت کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہوں تو اس میں کیا ”حرج“ ہے میں حیران ہوں کہ اس عقیدہ کے رکھنے والے پر بچے اور چاقو کی دُور از کار مثال کیوں کر چسپاں ہو سکتی ہے۔

(**نگار**) میرا یہ کہنا کہ ”خدا ایک ایک چیز ایک ایک ذرہ کی نگرانی نہیں کرتا“ صرف یہ معنٰی رکھتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر (Individually) کائنات کی ہر ہر چیز کے لئے

اپنی قوّت کو منقسم نہیں کرتا، بلکہ مجموعی طور پر تمام نظامِ عالم کے لئے چند اصول و ضوابط مقرر کر دیئے ہیں اور انہی کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

آپ کپڑا بننے کے کسی بڑے کارخانے میں ضرور کبھی نہ کبھی تشریف لے گئے ہوں گے اور آپ نے دیکھا ہو گا کہ وہاں ہزاروں "کرگھے" خود بخود چل رہے ہیں کپڑا بنا جا رہا ہے۔ رولر اپنے کپڑے کو لپیٹ رہے ہیں۔ درآں حالِ کہ وہاں کوئی انسانی ہاتھ موجود نہیں۔ پھر یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ کارخانہ کا انجینئر بجلی یا بھاپ کی مدد سے مشین کو حرکت دے کر عمومی طور پر ہر ہر کام کی نگرانی کر رہا ہے لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مشین کے ہر ہر پرزے کی جنبش، کرگھے کی ہر ہر تار کا اوپر نیچے ہونا، ایک ایک بنولے کا روئی سے علیحدہ ہونا، ایک ایک پونی کا تیار ہونا، ان سب پر انجینئر کی نگاہ ہے۔

پھر چوں کہ انجینئر کے ہاتھ میں بھاپ یا بجلی کی وہ قوت موجود ہے جس سے تمام کام انجام پا رہے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام کارخانوں کا نگراں ہے لیکن یہ کہنا کہ کارخانہ کے ہزاروں لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی علیحدہ علیحدہ اس کی نگاہ ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

۲۔ بقائے روح اور معاد کے متعلق آپ کا مجھ سے مطالبہ ہے کہ اگر میں اسلام کو دنیا کا آخری فطری مذہب تسلیم کرتا ہوں تو مجھے قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہئے کہ بقائے روح اور معاد دونوں خیال صحیح نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے نمبر ا کا بھی ثبوت قرآنِ پاک سے طلب کیا ہے۔

میرے عزیز دوست! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تو ان باتوں کا منکر ہوں یعنی میں آپ کے اس دعویٰ کو نہیں مانتا کہ خدا ہر ہر ذرّہ پر انفرادی طور سے نگرانی کرتا ہے اور اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ روح باقی رہتی ہے اور حیات بعد الممات کوئی چیز ہے۔ اس لئے اصولاً پہلے آپ کو اس دعویٰ پر دلیل پیش کرنا چاہئے نہ کہ مجھے۔ آپ جس سے پوچھیں گے وہ بتا دے گا کہ ثبوت پیش کرنا اس شخص کا کام ہے جو کسی بات کا اقرار کرتا ہو یا کرانا چاہتا ہو، منکر یا تو آپ کی دلیل سے قائل ہو کر آپ کا ہمنوا ہو جائے گا یا آپ کے دلائل کی کمزوری کو ثابت کر کے دوسرا ثبوت آپ سے چاہے گا، اس لئے براہ کرم پہلے آپ ہی کلام مجید سے یہ ثابت کیجئے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ درست ہے، پھر میں بتاؤں گا کہ آپ کے دلائل کن وجوہ کی بنا پر نا قابلِ تسلیم ہیں۔

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ رُوح کے باب میں مغرب کے تازہ اکتشافات سے یقیناً میں بے

خبر نہ ہوں گا۔ یقیناً میں بے خبر نہیں ہوں اور نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مکرو فریب کا اتنا بڑا جال شاید ہی دُنیا میں کبھی پھیلایا گیا ہو۔ اگر سائیٹفک امریکن کی شائع کی ہوئی وہ رپورٹ آپ کے سامنے ہے جو ایک کمیشن نے عام بلادِ یورپ کی سیاحت کرنے کے بعد مرتب کی تھی تو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اِس وقت تک جتنے روحانئین یورپ میں پائے جاتے ہیں ان میں سے ۹۰ فیصدی مکّار و شعبدہ باز ہیں اور باقی دس فی صدی وہ ہیں جو اس فریب میں مبتلا ہونے کے بعد قصورِ فہم کی وجہ سے فریب کو حقیقت باور کرنے لگے ہیں۔

۳۔ آپ نے آخرت کے وجوب پر تین دلیلیں پیش کی ہیں اور معاف فرمایئے اگر میں یہ کہوں کہ ان میں سے ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو فریق ثانی کو قائل کر سکے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ لفظ دنیا، آخرت پر دلالت کرتا ہے اس لئے آخرت کا ماننا ضروری ہے۔ لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ لفظ دنیا کا وہ مفہوم جو آخرت پر دلالت کرتا ہے کس کا متعین کیا ہوا ہے۔ کیا آپ ہی اس کے واضع اور آپ ہی اس کے مفسر نہیں؟

میرے سامنے اگر لاکھ مرتبہ لفظِ دُنیا بولا جائے تو کبھی ایک بار بھی اس کو سُن کر آخرت کا یقین نہیں ہوتا۔ آپ دُنیا کو آخرت کا نقیض بتاتے ہیں۔ میں اسے انعدام کا نقیض سمجھتا ہوں یعنی جس طرح لفظ دنیا بول کر آپ کا خیال اس کے نقیض و آخرت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یوں مردے اٹھیں گے، اس طرح ان کا حساب و کتاب ہوگا، یوں عتاب میں مبتلا کئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ اسی طرح لفظ دُنیا بول کر میرا خیال اسی کے نقیض، انعدامِ محض کی طرف جاتا ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو وہ حالتِ عدم میں چلا جاتا ہے گویا کہ وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔

آپ کی دوسری دلیل اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "آخرت انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم دیتا ہے" درآں حالِ کہ آخرت کا جو مفہوم پیش کیا جاتا ہے اس میں سوائے غرض و طمع کے کچھ اور ہے ہی نہیں۔ کیا اچھّے کاموں کے عوض میں سونے، چاندی کے محلوں، دودھ شہد کی نہروں، حسین و جمیل دوشیزہ حوروں اور بے ریش و بروت لڑکوں کے دیئے جانے کا وعدہ کرنا بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہو سکتی ہے اور کیا برے کاموں کی پاداش میں شعلہ زار جہنّم کا منظر پیش کرنا ایک شخص کو بے نفسی کے ساتھ نیکی کی طرف مائل کر سکتا ہے؟ جب کہ بے نفسی کا تعلق نہ لالچ سے ہونا چاہیئے نہ خوف سے۔ اگر ہم کسی کے ساتھ کچھ احسان کرتے ہیں اس ڈر سے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم کو قید و بند میں ڈال دیا جائے گا یا اِس لالچ سے کہ اس احسان کا معاوضہ زیادہ بہتر صورت

میں ملے گا۔ تو کیا دُنیا میں کوئی شخص ہمارے اس فعل کو بے نفسی پر محمول کر سکتا ہے؟ اسی نکتہ کو غالبؔ نے اس طرح بیان کیا ہے ع

طاعت میں تا رَہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اگر آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ جنت و دوزخ کا بیان صرف تشبیہی بیان ہے اور حقیقت کچھ اور ہے تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بیان میں ترغیب و تخویف ضرور پائی جاتی ہے، جو بے نفسی کے بالکل منافی ہے، میں کہتا ہوں کہ مطلق جزا و سزا کا خیال ہی بے نفسی کو محو کر دینے والا ہے اور جب تک عذاب و ثواب کی تمام کارگاہ کو باطل ٹھہرا کر یہ اصول نہ قرار دیا جائے کہ ''نیکی ایک فرضِ انسانی ہے جو بلا خیالِ مُزد یا بغیر اندیشۂ تعزیر ظاہر ہونی چاہیئے'' بے نفسی کا خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

اس ضمن میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب اس دنیا میں نہیں ملتا تو کیا وجہ ہے کہ یومِ آخرت نہ تسلیم کیا جائے۔

اِس میں بھی آپ نے خود ہی ایک بات فرض کر لی ہے اور خود ہی اس کو دلیل بنا کر پیش کر دیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ کوئی طاعت ایسی نہیں جس کا ثواب یہاں نہ مل جاتا ہو اور کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی سزا انسان کو یہاں نہ بھگتنا پڑتی ہو بشرطِ آں کہ آپ طاعت کا مفہوم ''اچھا کام'' قرار دیں اور گناہ کا مفہوم بُرا کام۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فرض شناسی و ادائے فرض کہ بعد ضمیرِ انسانی کو جو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے اس سے زیادہ مسرّت کسی اور چیز میں ہو سکتی ہے؟ اور حق تلفی و ناحق کوشی کے بعد جو اضطراب نفسِ انسانی میں پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ عذاب کوئی اور ممکن ہے؟ لیکن اگر کسی کا ضمیر بالکل محو ہو چکا ہے اور حق و باطل کی تمیز کسی میں باقی نہیں رہی تو تاریخِ عالم اٹھا کر دیکھئے کہ اسی دنیا میں اس کا کیا انجام ہوا، افراد کو چھوڑیئے میں تو قومی و اجتماعی زندگی میں بھی اسی اُصول کو کارفرما دیکھتا ہوں اور قرآن پاک کی اس آیت پر پوری طرح ایمان لاتا ہوں کہ هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْفَـٰسِقُونَ پھر بتایئے کہ اس آیت میں جس ہلاکتِ قومی کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور دنیا سے متعلق ہے؟ اور کیا یہ عذاب آپ کی مفروضہ اخروی زندگی سے تعلق رکھتا ہے؟

ممکن ہے ابھی آپ کی تسکین نہ ہوئی ہو، لیکن اگر میں خود کلام مجید سے یہ ثابت کر دوں کہ عذاب و ثواب کا تعلّق اسی دنیا سے ہے تو پھر آپ کیا کہیں گے؟ اچھا تکلیف تو ہو گی کلام مجید اٹھایئے اور سورہء ہودؔ کی آیات ۱۰۶ و ۱۰۷ و ۱۰۸ ملاحظہ فرمایئے ارشاد ہوتا ہے:

فَأَمَّا ٱلَّذِينَ شَقُوا فَفِى ٱلنَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ۝١٠٦ خَٰلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ
ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلْأَرْضُ إِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝١٠٧ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ
سُعِدُوا فَفِى ٱلْجَنَّةِ خَٰلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلْأَرْضُ

جن لوگوں شقاوت کی وہ آگ میں پڑے کراہ رہے ہوں گے اور اسی حالت میں رہیں گے، جب تک آسمان وزمین کا وجود ہے اور جن لوگوں نے اچھے کام کئے وہ جنت میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین کا وجود ہے۔

کیا عذاب وثواب کو اس دنیا سے متعلق سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ روشن وواضح الفاظ کی ضرورت ہے کیا؟ مَا دَامَتِ ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلْأَرْضُ کے الفاظ اس بات کا ثبوت نہیں کہ جنت ودوزخ اس دنیا سے علاوہ کسی اور عالم سے متعلق نہیں کیوں کہ اگر آپ عذاب وثواب کو عالمِ آخرت سے متعلق کریں گے تو پھر مَا دَامَتِ ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلْأَرْضُ کہنا کوئی معنیٰ رکھے گا؟ عالم آخرت تو آپ کے نزدیک قیامت یاماوراءِ عالم دنیا سے واسطہ رکھتا ہے، جب یہ زمین وآسمان کچھ نہ ہوں گے۔

آپ کی تیسری دلیل جس میں آپ نے جنابِ امیر اور یہودی کی گفتگو کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق سوا اس کے کیا عرض کروں کہ ع

بر تمناہائے عرفی خندہ می آید مرا

اسی قسم کا ایک واقعہ امام جعفر صادق کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کسی ملحد نے آپ سے سوال کیا کہ مرنے کے بعد رُوح کہاں چلی جاتی ہے، آپ نے جواب دیا چراغ گُل ہونے کے بعد اس روشنی کہاں چلی جاتی ہے راوی کا بیان ہے کہ جواب سُننے کے بعد وہ ایمان لے آیا۔ درآں حالِ کہ نہ جنابِ امیر کے جواب پر یہودی کو آخرت پر ایمان لانے کی ضرورت تھی اور نہ ملحد کو جناب امام جعفر صادق کے استدلال پر مسلمان ہونے کی۔

میرے نزدیک یہ دونوں روایتیں نادرست ہیں اور میں کبھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ جنابِ امیر یا جناب امام جعفر صادق نے ایسی بچوں کی سی باتیں کی ہوں گی، کیوں کہ تھوڑی دیر کے لئے ہم مان بھی لیں کہ جناب امیر کا جواب مُسکت تھا اور یہودی بھی جنّت پر ایمان لے آیا تو کیا اس کا آخرت کے وجود کو تسلیم کرنا حقیقتاً اطمینانِ قلب کے ساتھ تھا؟ یعنی اس دلیل سے کوئی اذعانی کیفیت اس کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی؟ ہر گز نہیں! اس نے اگر مانا بھی تو صرف اس لئے کہ ایسا ماننے میں کوئی حرج نہیں اور مصلحت اسی میں ہے پھر مصلحت و یقین میں جتنا فرق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

فرض کیجئے میں آپ کے پاس آؤں اور کہوں کہ مجھ میں اتنی قوّت موجود ہے کہ چاہوں تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگادوں اور واقعی میں آگ لگادوں گا۔ اگر آپ نے میری اس قوت کا اعتراف نہ کیا، آپ کو اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے، لیکن آپ کا ایک دوست آتا ہے اور کہتا ہے کہ "مان بھی لو تمہارا کیا حرج ہے، اگر اس میں ایسی قوت نہیں ہے تو مان لینے میں تمہارا کیا نقصان ہے" لیکن خدا کے لئے بتایئے کہ کیا آپ کا یہ اعتراف تصدیقِ قلب کے ساتھ ہو گا؟ ہر گز نہیں! پھر اگر جناب امیر کی اس دلیل پر یہودی ایمان لے بھی آیا تو کیا واقعی وہ مسلمان ہو گیا ہو گا؟ جب کہ اسلام و ایمان کے لئے تصدیق بالقلب ضروری ہے، یہی حال جناب امام جعفر صادق کی دلیل کا ہے۔ ایک ملحد جو بقاءِ روح کا منکر ہے، آپ سے سوال کرتا ہے کہ مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے؟ آپ چراغ کی روشنی کا حوالہ دے کر خود اُسی سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ وہ کہاں چلی جاتی ہے؟ آپ ہی انصاف فرمایئے کہ اس میں بقائے روح کے لئے کون سی دلیل پیش کی گئی، بلکہ اس سے تو اور اسی ملحد کے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جس طرح چراغ گل ہونے کے بعد اس کی ضوء فنا ہو جاتی ہے، اسی طرح مرنے کے بعد رُوح بھی فنا ہو جاتی ہے، اکابرِ اسلام سے اس قسم کی روایتوں کو نسبت دینا حقیقتاً ان کی توہین کرنا ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف اُن ادنیٰ درجہ کی ذہنیتوں کا جو اپنی دماغی اُپج کو اہمیت دینے کے لئے خواہ مخواہ بڑے بڑے لوگوں سے اس کو منسوب کر دیتے ہیں۔ جناب امیر اور جناب امام جعفر صادق کا کیا ذکر ہے؟ احادیث اُٹھا کے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ خود رسول اللہ کی ذات گرامی سے ایسے افعال منسوب کئے جاتے ہیں کہ آج ان کو دیکھ کر شرم آتی ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کیا ایک رسول کے اخلاق واقعی ایسے ہو سکتے ہیں اور کیا ایک مُلہم من اللہ ہستی سے ایسی باتوں کا اظہار ہونا کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ میں آخرت کو کیوں نہیں مانتا، یعنی قیامت اور جزا و سزا کے نظریہ کو کیوں قابلِ قبول نہیں جانتا۔ اس کے متعلق آپ مجھ سے کوئی استفسار نہ کیجئے۔ بلکہ خود اُن تمام روایات کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیجئے، جو اس باب میں بیان کی جاتی ہیں کہ مرنے کے بعد سے لے کر دوزخ یا جنت میں پہنچنے تک کیا کیا مراحل و منازل سامنے آتے ہیں اور پھر خود ہی اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کیجئے کہ باور کرنے کے لائق ہیں یا نہیں؟

○○○

بُعد المشرقین

جناب ملک محمد سمیع اللہ خان صاحب تحصیل دار کالپی کے ایک خط جواب

معاف فرمایئے یہ چند سطور جذبۂ دل سے متاثر ہو کر آپ کو لکھ رہا ہوں یوں تو آپ کا نامِ نامی عرصہ سے سنتا تھا مگر اس سے قبل نہ تو آپ کے متعدد و مسلسل مضامین دیکھے تھے اور نا کبھی شرفِ نیاز کا موقع حاصل ہوا تھا، ایک شوق تو پورا ہو رہا ہے، دوسری تمنا دیکھئے کب بر آئے، اخباروں میں آپ کے علم وِ عقائد کے متعلق بہت پروپیگنڈا ہوتا رہا مگر میں نے آپ کے مضامین دیکھنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اتفاق سے میرے ایک دوست نے جو یہاں ڈاکٹر ہیں، **نگار** کا ایک مضمون دکھلایا اس کا پڑھنا تھا کہ شوق و جستجو کا یہ عالم ہوا کہ بہت سے پرانے پرچے **نگار** کے منگوا کر اور چُن چُن کر آپ ہی کے مضامین دیکھے۔ اس میں شک نہیں کہ لطفِ بیان آپ کا حصہ ہے اور واقفیتِ عامّہ سے اکثر مضامین آپ کے لب ریز ہوتے ہیں۔ آپ کے بعض بعض اصول اور عقائد سے گو مجھ کو اتفاق نہیں، تاہم پھر بھی آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہت ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں کہوں کہ جس طرح ایک طرف مولویوں کی جماعت اپنی کوتاہ نظری میں نقطۂ بُعد پر ہے، اسی طرح وسعتِ خیال اور آزادروی میں جناب دوسرے کنارے پر ہیں۔ اگر کاش بین بین کے نیک اصول پر آپ اُتر آئیں تو شاید مسلم سوسائٹی کے واسطے جوہرِ بے بہا ثابت ہوں، اِس میں شک نہیں کہ آپ کا علم، آپ کی فراست آپ کی ذہانت اور آپ کی قوتِ اِستدلال ایسی ہے کہ آپ جو چاہیں ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر خدارا یہ تو فرمایئے کہ صحیح راستہ سوائے ایک کے دوسرا کیسے ہو سکتا ہے جیسا کہ آپ کا خیال ہے؟ میں مانتا ہوں کہ اعمالِ حسنہ اچھی چیز ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بار گاہ میں رسائی نہیں ہو سکتی ہے، اگر رہبر صحیح ہے تو منزلِ مقصود پر آدمی پہنچ جائے گا ورنہ باوجود کوشش اور محنت کے بھٹک جائے گا۔ بہر طور میرے خیال میں قربِ الٰہی بھی ضروری ہے۔ معاف کیجئے گا میری اِس جسارت کو کہ آپ جیسے جید عالم متبحّر کے مضامین پر ایک قسم کی رائے زنی کرتا ہوں، لیکن یہ الفاظ محض ایک رو میں قلم سے نکل گئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرے دل کو آپ کی طرف سے نادیدہ اُنسیت کیوں پیدا ہو گئی ہے۔

(**نگار**) مجھے یہ معلوم کر کے ازبس مسرّت حاصل ہوئی کہ آپ نے میرے عقائد اور مقاصدِ **نگار** کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ **نگار** کا مطالعہ کرنے کے

بعد قائم کی ہے اور آپ نے عوام کی طرح محض مولویوں کے غلط پروپیگنڈے پر اعتبار کر کے مجھے کافر و ملحد سمجھنے کا ثواب حاصل نہیں کیا۔

آپ اپنی تحریر میں ایک جگہ ظاہر فرماتے ہیں کہ میرے بعض اصول و عقائد سے آپ کو اتفاق نہیں، بہتر ہوتا اگر آپ ان کی صراحت فرما دیتے کیوں کہ تحریرِ گرامی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کا جو اعتقاد میں نے معلوم کیا ہے بعینہ وہی اعتقاد میرا بھی ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اصولاً آپ کو میرے کس خیال سے اختلاف ہے۔

ممکن ہے کہ آپ نے بعض فروعی مسائل کو اصول میں شامل کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو یا یہ کہ میری بعض تعبیرات کو ناپسند فرماتے ہوں۔ بہر حال آپ ہی کے دو مقرر کردہ اصول کو سامنے رکھ کر خیال کی اجازت چاہتا ہوں ممکن ہے یہ پردہ اٹھ جائے اور پھر آپ مجھے بھی اسی جگہ پائیں جہاں آپ کا پائے ثبات قائم ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اعمالِ حسنہ اچھّی چیز ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے دوسرے یہ کہاپ کے خیال میں قربِ الٰہی بھی ضروری چیز ہے۔

معاف فرمایئے اگر میں سب سے پہلے آپ سے یہ سوال کر دوں کہ ''کسی بارگاہ میں رسائی ہونے'' کا کیا مفہوم ہے اور ''قرب الٰہی'' سے آپ کا کیا مقصود ہے؟ اگر قربِ الٰہی اور بارگاہ کی رسائی سے آپ کا مدعا ایک ہے (اور غالباً ایسا ہی ہو گا) تو آیئے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کر لیں کہ مذہبی زبان میں یہ الفاظ بول کر کیا مفہوم مراد لیا جاتا ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ کیا ہیں؟ اتنا تو غالباً آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ ''قربِ الٰہی'' سے وہ نزدیکی یا مواصلت مراد نہیں ہو سکتی جیسی اس دنیا میں دو انسانوں یا دو مادی اشیاء کے درمیان پائی جاتی ہے اور نہ ''بارگاہ کی رسائی'' سے اس نوع کا قرب مقصود ہو سکتا ہے جیسا ایک غریب کسان کو کبھی کبھی آپ کے حضور میں حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر جب حقیقت یہ نہیں ہے تو غور کرنا چاہئے کہ اہلِ مذہب کی اس سے کیا مراد ہے اور وہ اس پند و موعظت سے کس نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں؟

میں اس وقت ذات باری کی حقیقت سے بحث نہیں کروں گا اور نہ اس اُلجھن میں پڑوں گا کہ اس کی ذات و صفات میں تفریق ممکن ہے یا نہیں! بلکہ نہایت سادگی کے ساتھ صرف اس تعلق پر غور کروں گا جو خدا یا قدرت کے ساتھ نوعِ انسانی کو حاصل ہے۔

یہ امر یقیناً محتاجِ صراحت نہیں کہ خدا جس کو بے نیازِ مطلق کہا جاتا ہے، وہ

آفرید گارِ اعظم جو اپنی ذات سے کامل و اکمل ہے اور وہ قوت جو بلا کسی رعایت کے ہر وقت مصروفِ کار ہے، کسی فانی مخلوق کی کبھی محتاج نہیں ہوسکتی اور نہ ہمارا کوئی فعل اس کو کسی طرح متاثر کرسکتا ہے۔ پھر جب حالت یہ ہے تو ظاہر ہے ہمارے اعمال کا اثر ہماری ہی ذات پر ہونا چاہیئے، ہماری ہی زندگی کو اُن سے متاثر ہونا چاہیئے اور ہماری اچھائیوں یا برائیوں کا دائرۂ اثر ہماری معاشرتی و تمدنی زندگی سے آگے نہ بڑھنا چاہیئے۔ یعنی اگر ہم اچھے کام کریں گے تو اس کا نتیجہ ہمارے ہی لئے بہتر ہوگا اور اگر معاصی و بداخلاقی میں مبتلا ہوں گے تو ہم خود تباہ و برباد ہوں گے۔ یہی ہے وہ نقطہ جس کو کلام مجید میں کہیں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے انَّ اللهَ لَایُغَیِّرُمَا بِقَوْمٍ حَتّیٰ یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ کسی جگہ اِنَّ اللهَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ[9] کہہ کر اس کی توثیق کی گئی ہے اور کہیں طرزِ بیان بدل کر اسی حقیقت کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے کہ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْفَـٰسِقُونَ اور کسی جگہ أَنَّ ٱلْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ ٱلصَّـٰلِحُونَ سے اس راز کو کھول دیا گیا ہے۔

بہر حال آپ تمام کلام مجید کا مطالعہ کر جایئے۔ کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملے گی جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ ہمارے اعمال خدا کو بھی کسی طرح متاثر کرسکتے ہیں اور اس کی برہمی یا خوشنودی کا مفہوم ہماری تباہی یا فلاح کے علاوہ کچھ اور ہے۔ اِس لئے قربِ الٰہی یا رسائی بارگاہ کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ٹھہرتا کہ اگر ہم اچھے اعمال کے پابند ہوں گے تو فلاح و ترقی کی صورت میں جو نتیجہ پیدا ہوگا۔ اسے مذہبی زبان میں قربِ الٰہی سے تعبیر کریں گے اور اس کے برعکس اگر ہمارے اخلاق ذلیل و ردّی ہوں گے تو تباہی و بربادی میں مبتلا ہوجائیں گے اور یہی ہے خدا سے دُوری یا اس کی برہمی و ناخوشی۔ پھر اگر آپ اس خیال کو اور زیادہ وسیع کریں اور خدا و انسان کے تعلق پر زیادہ غائرانہ نگاہ ڈالیں تو بآسانی یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ دوزخ و جنت بھی اپنی اسی اہلیت و نااہلیت سے متعلق ہے اور قومی خوش حالی و بربادی کے اظہار کے لئے "جَنَّاتُ النَّعِیْمِ" اور "أَسْفَلُ السَّافِلِیْنَ" سے بہتر الفاظ کوئی اور ہو ہی نہ سکتے تھے۔

بہر حال اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ انسان کو عقل و ہوش عطا کئے جانے کا اقتضاء یہی ہونا چاہیئے کہ اِس سے اچھے کاموں کی توقع کی جائے جو مقصودِ آفرینش ہے۔ پھر جب اصل چیز صرف اعمالِ حسنہ قرار پائے تو یہ کہنا کہ بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی

9-عام طور پر اس کے یہ معنیٰ لئے جاتے ہیں کہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، حالانکہ یھدی کا مفعول پورا فقرہ من یشاء واقع ہوا ہے اور یشاء کا فاعل من ہے، اس لئے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے۔

کیسے ہو سکتی ہے صرف یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ ہم کو درستیٔ اخلاق کے لئے کوئی صحیح و مؤثر طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہئے لیکن اسی طریقہ یا وسیلہ کو اصل مقصود نہ قرار دینا چاہئے۔

الٰہیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ آلہ یا ذریعہ صرف ایک آلہ یا ذریعہ ہونے کی حد تک قابلِ اختیار ہوتا ہے نہ کہ اصل مقصود کی حیثیت سے اور یوں بھی روز کی زندگی میں ہم اِس حقیقت کا مطالعہ کر سکتے ہیں کہ وسیلہ و مقصود یا جادۂ منزل میں کتنا فرق ہے۔

اگر آپ نے اِس حد تک میرے صحیح مدّعا کو سمجھ لیا ہے تو بآسانی آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ میرے اور مولوی کے اِعتقادات میں کیا فرق ہے۔ میں کیا کہتا ہوں اور وہ کیا سمجھانا چاہتا ہے، اصولِ مذکورہ بالا کی بناء پر میرا کہنا یہ ہے کہ تمام مذاہبِ عالم کا مقصد انسان کے اخلاق کو درست کرنا تھا اور ان میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ وقت و زمانے کے لحاظ سے ہر نیا دین اپنے پہلے دین کے لحاظ سے زیادہ مربوط و مستحکم آئین لے کر آتا تھا حتیٰ کہ اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے ایک حرفِ آخر کی صورت سے ہمیشہ کے لئے انسان کو کسی اور مذہب کے استمداد سے بے نیاز کر دیا۔ لیکن اسلام کا مذہب کیا تھا، اسلام کی تعلیم کیا تھی؟ (یہاں ایک بہت باریک نکتہ ہے جسے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں) صرف یہی کہ محض اخلاقِ حسنہ پیدا کرنا ہی اصل مذہب ہے اور کسی مذہب کی پابندی صرف اس خیال سے کہ محض اس کی پابندی نجات و فلاح کے لئے کافی ہے بالکل بے اصل چیز ہے۔ یہی وہ راز تھا جس کو غالب نے یوں بیان کیا ہے کہ ع

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یعنی اصل ایمان نام ہے مذہبِ "ترکِ مذہب" کا، محض درستیٔ اخلاق کا اور اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ اب اسلام کے ظہور کے بعد کسی اور مذہب کی ضرورت دنیا میں باقی نہیں رہتی، کیوں کہ اس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ بغیر کسی پابندیٔ رسم و رواج یا شعائرِ ظاہری کے صحتِ اخلاق کو مطمح نظر قرار دیا جائے۔

پھر اگر حقیقت یہ نہیں ہے تو بتائیے کہ اسلام کا فطری مذہب ہونا کیا معنیٰ رکھتا ہے، رسول اللہ کا ا رحمۃ للعالمین ہونا کیا مفہوم رکھ سکتا ہے اور مسلمان کیوں کر اخوتِ عامہ کے عالم گیر رشتہ سے شرق و غرب کے تمام انسانوں کو باہم دِگر وابستہ کر سکتے ہیں۔

میں نے کبھی نہیں کہا کہ نماز، روزہ بری چیز ہے بل کہ ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ اگر ان سے درستیٔ اخلاق مقصود ہو تو ان کا اختیار کرنا ضروری ہے، لیکن میں اس کا قائل کبھی

نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہوں کہ محض نماز پڑھ لینا یا ایک مہینے کے روزے رکھ لینا ہی اصل ایمان ہے، یہ سب ذرائع و وسائل ہیں مقصودِ حقیقی تک پہنچنے کے، اس لئے اگر یہ منزل تک پہنچانے والے ثابت نہ ہوں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور ہماری تمام عبادات، جسد بے روح ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر عباداتِ اسلام بجائے خود ضروری نہ ہوں اور محض اخلاقِ حسنہ ہی پر انحصار ہو نجات کا، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ غیر مسلم افراد بھی پاکیزہ اخلاق رکھتے ہیں ناجی نہ ہوں اور اس طرح اسلام کی خصوصیت پھر کوئی باقی نہیں رہتی۔ میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ بے شک یہی ہونا چاہئے کیوں کہ میں نجات کا مفہوم وہ لیتا ہوں جو اسی دنیا کی فلاح و ترقی سے متعلق ہے اور وہ یومِ آخرت، یومِ میثاق وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں، جن کا میں قائل نہیں ہوں اور نہ کوئی عقلی دلیل ان کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے علی الخصوص اس وقت جب کہ خود کلام مجید سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔

اگر آپ تعلیماتِ اسلام کی روح پر غور کریں گے (اور یقیناً آپ نے غور کیا ہو گا) تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس سے زیادہ سادہ چیز کسی مذہب نے پیش نہیں کی۔ رہا اس کا روح کو پیدا کرنا سو اس کے لئے بے شک عوام کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ایک خاص لٹریچر پیدا کرنا پڑا اور اسی طرح آخرت، معاد، عذاب، ثواب، دوزخ، جنت، قربِ الٰہی وغیرہ کی سیکڑوں اصطلاحات جاری ہو گئیں، ورنہ حسنك واحد و عباراتنا شتی

اس میں کلام نہیں کہ میں بھی وسعتِ خیال کے لحاظ سے انتہائی نقطہ پر ہوں اور مولوی بھی تنگیٔ خیال میں جواب نہیں رکھتا لیکن یہ "بین بین" کیا چیز ہے؟ اگر مذہب نام اسی چیز کا ہے جو مولوی بتاتا ہے سو اس کو آج نہیں تو کل مٹ جانا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی بقاء کی صورت وہی ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ پھر اب یہ آپ کی خوشی ہے کہ جو چیز کل مٹنے والی ہے اسے آج ہی ترک کر دیں یا کل پر اٹھا رکھیں

جاں بجاناں دِہ و گرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل ایں بکن یا آں بکن

○○○

دشمنِ اسلام کون ہے؟

مذہب یا دین اگر کوئی ایسی حقیقت ہے جو خدا کی طرف سے ظاہر کی گئی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حقیقت کبھی بدل سکتی ہے اور کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے میں وہ موانع حائل کرتا رہے؟

آپ کسی پابندِ مذہب شخص سے سوال کیجئے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ مذہب یقیناً خدا کی ظاہر کی ہوئی حقیقت ہے اور وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرتا کہ انسان کو حقیقت تک پہنچنے سے باز رکھا جائے۔

اچھا اب آپ مختلف مذاہب والوں سے علیحدہ علیحدہ پوچھئے کہ جب مذہب خدائی حقیقت ٹھہرا تو اس میں تنوّع کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس نے مختلف مذاہب پیدا کرکے انسان کو کیوں الجھن میں ڈال دیا۔ اس کا جواب ایک آتش پرست یہ دے گا کہ حقیقت تو ایک بار زردشت کے ذریعہ ظاہر کی جا چکی ہے۔ ایک یہودی کہے گا کہ حقیقت تو صرف موسوی تعلیم کا نام ہے، ایک عیسائی دعویٰ کرے گا کہ صداقت کی تبلیغ تو صرف عیسیٰ نے کی، اسی طرح بودھ مت والا، بودھ کی تعلیمات کو، ایک ہندو کرشن کی ہدایت کو اور ایک مسلمان محمدؐ کے بتائے ہوئے معتقدات کو حقیقت و صداقت سے تعبیر کرے گا اور باقی تمام مذاہب کو حقیقت سے دور ظاہر کرکے لغو و باطل قرار دے گا۔

اب غور کیجئے کہ ایک شخص جو مذہب کے خیال سے بالکل خالی الذہن ہے یہ سن کر کیا اثر قبول کرے گا۔ وہ اگر زیادہ آزادی سے کام لے کر سب کو لغو نہ کہہ دے گا تو وہ تحقیق و جستجو ضرور کرے گا تاکہ خود کوئی فیصلہ کرکے کسی ایسے نتیجہ پر پہنچے جو اس کے لئے قابلِ قبول ہو۔

اچھا آیئے ہم آپ بھی بالکل خالی الذہن ہو کر جستجو کریں کہ صداقت کس مذہب کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے اور مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ کسی مذہب کو خدا کی بتائی ہوئی

حقیقت و صداقت کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ خدا براہ راست اپنے خدائی الفاظ اور اپنی الہانہ زبان میں اس کی تلقین فرمائے یا اپنے کسی خاص بندے میں غور و تامل کی غیر معمولی کیفیت پیدا کر کے اصولِ مذہب وضع کرنے کی طرف مائل کرے۔ بہر حال جو صورت بھی ہو اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب کی صداقت کا تعلق ماحول و زمانہ سے ہوا کرتا ہے اور وقت و حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل ہونا ضروری ہے کیوں کہ مذہب نام ہے ان اصولوں کا جو اصلاحِ اخلاق و معاشرت کے کام آئیں اور چوں کہ اخلاق و معاشرت کے معیار کا امتدادِ زمانہ کے ساتھ بدل جانا ضروری ہے اس لئے وقتاً فوقتاً اصولِ مذہب کا تغیر بھی لازم ہے۔

انہی اصولِ زندگی پر لوگوں کو مستحکم کرنے کے لئے بعض معتقداتِ دینی وجود میں آئے جو لوگوں کو معاشرتی قانون کی پابندی پر مجبور کرنے کے لئے ذریعہ و سیلہ کا کام دیتے تھے، مثلاً یہ کہ جو قانون پیش کیا جاتا ہے وہ خدا کا نازل کیا ہوا ہے اور جس شخص کے ذریعے سے نازل ہوا ہے وہ خدا کا خاص بندہ ہے اور معجزات کا مالک ہے یا یہ کہ جو شخص اس کی پابندی کرے گا اسے مرنے کے بعد طرح طرح کے نعائم و لذائذ حاصل ہوں گے اور جو پابندی نہ کرے گا وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص جو صرف ان معتقدات کا ماننے والا ہے اور ان سے بڑھ کر اپنے اخلاق کو متاثر نہیں ہونے دیتا، بہ لحاظِ نتیجہ اس کے یہ دینی عقائد بالکل بے کار ہیں، کیوں کہ مقصود تو شارع کا جسے آپ نبی، رسول، مرشد، رشی، دیوتا وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں، پورا ہی نہیں ہوا اور عقائد محض عقائد ہونے کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

الغرض اصل مقصود صرف اصلاحِ اخلاق و معاشرت ہے اور اس کے حصول کے لئے بعض غیر معمولی دماغ رکھنے والے لوگوں نے دین یا شریعت کو رائج کر کے بعض مخصوص عقائد پیدا کئے تا کہ لوگوں کو ترغیب و تخویف سے حقیقی مدعا کی طرف لا سکیں۔

اس جگہ یہ سوال اٹھانا کہ اگر عقائدِ دینی کوئی حقیقت نہیں رکھتے تو کیا انبیاء نے ان کو حقیقت ظاہر کر کے غلط بیانی سے کام لیا، درست نہیں، کیوں کہ اول تو اس امر کا امکان ہے کہ ان میں سے اکثر نے عقائد کو واقعی حقیقت باور کر کے پیش کیا ہوا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر بعض نے ایسا نہیں سمجھا تو دوسروں کی اصلاح کے لئے ایسا کرنا قرینِ مصلحت جانا ہو گا اور

مصلحت کے لحاظ سے کوئی بات ایسی کہہ دینا جو واقعہ کے خلاف ہو کبھی موردِ الزام نہیں ہو سکتا۔

وہ عقائدِ دینی جو آج معرضِ بحث میں ہیں، زیادہ تر مابعد الطبیعات سے متعلق ہیں یا خدا کے مفہوم سے، یعنی اہلِ مذاہب ایک بات تو یہ کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہو گی اور وہاں عذاب و ثواب، دوزخ و جنت وغیرہ کے معاملات پیش ہوں گے اور دوسری یہ کہ خدا نام ہے ایک ہستی کا جس نے تمام عالم کو اس طرح پیدا کیا جس طرح ایک صناع اپنے قائم کئے ہوئے ارادہ کے ساتھ کسی چیز کو تیار کرتا ہے اور وہ خدا قادر ہے، جس وقت جو چاہے تغیر و تبدل کر کے کائنات کے نظام کو بدل دے۔

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہو گا کہ یہ عقائد مع تمام جزئیات کے کسی ایک قوم یا ملک سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ کم و بیش ہر اس قوم یا ملک میں پائے جاتے ہیں جہاں کوئی مذہب پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ امر غور طلب ہے کہ مہملاتِ عقائد دنیا کی تمام مذہبی قوموں میں کیوں تقریباً ایک ہی سے پائے جاتے ہیں اور وہ کون تھا جس نے اول اول ان کو حقائق جان کر پیش کیا، ہرچند امر ثانی کی کوئی تعیین دشوار ہے، لیکن امرِ اول کی نسبت یہ کہنے میں قطعاً تامل نہیں ہو سکتا کہ ہر جدید مذہب نے اپنے ماسبق مذہب کے معتقدات سے فائدہ اٹھایا اور یہ سلسلہ عہدِ قدیم تک پہنچ کر اس زمانۂ وحشت تک پہنچ جاتا ہے، جب انسان کے تجربات دنیا میں بہت تھوڑے تھے اور اس کا علم حد درجہ ناقص و نامکمل تھا۔

مثالاً آپ جنت اور حور و غلمان کو لیجئے۔ کیا کوئی مسلمان دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام سے قبل یہ خیال یا عقیدہ کسی اور مذہب میں نہ پایا جاتا تھا؟ اگر آپ قدیم ایرانی اور آرین لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ تقریباً یہی عقیدہ اس زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ فارسی زبان میں ایک لفظ "پری" ہے جو قدیم ایرانی زبان میں "پیرک" تھا اور پیروانِ زردشت کا عقیدہ تھا کہ یہ آسمانی دیویاں ہیں جو ہوا میں رہتی ہیں اور اس قدر جمیل ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی انسان فریفتہ ہو جاتا ہے، چناں چہ خود عربی کا لفظ "فردوس" ایرانی لفظ ہے۔

لفظِ "حور" کے متعلق ہمارے علماء کا خیال ہے کہ وہ خالص عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنٰی میں سفیدی و پاکیزگی کا مفہوم غالب ہے، در آں حالِ کہ اس کا ماخذ اوستا کا لفظِ "ہورہ" ہے جسے پہلوی زبان میں "ہورا" اور موجودہ فارسی میں "خور" کہتے ہیں۔ جس کے معنٰی نور، روشنی اور مجازاً آفتاب کے ہیں۔ حور و غلمان کا عقیدہ ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے اور ان کے لئے "اپسرا" اور "گندھرپ" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

کسی غزوہ میں مارے جانے پر شہید ہونے اور جنت میں جانے کا خیال بھی آرین خیال ہے، چناں چہ دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ "جنگ میں جو لوگ بہادری سے لڑتے ہیں اور پیٹھ نہیں دکھاتے وہ بہشت میں جاتے ہیں" اسی طرح اندر، راجہ نل سے جس وقت خطاب کرتا ہے تو بہشت کا ذکر کرتا ہے۔

اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں تمام روحیں پیدا ہو چکی تھیں اور انہوں نے "قالوا بلیٰ" کہا تھا۔ پارسیوں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اوستا میں اس کے لئے لفظ "فروشی" پایا جاتا تھا اور پہلوی زبان میں اس کو "فیروہر" کہتے ہیں۔ الغرض یہ عقیدہ کہ روحیں پہلے سے موجود ہیں، مجوس کے یہاں پایا جاتا تھا۔

اسی طرح ملک الموت کا خیال بھی مجوس کا خیال ہے اور ان کے یہاں بھی ایک فرشتہ "استوویدھوتوس" کے نام سے پایا جاتا تھا جو روح کو جسم سے جدا کرتا تھا۔

عزرائیل کے متعلق مسلمانوں میں جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی بہت کچھ قدیم ایرانی روایات سے ملتی جلتی ہیں اور آدم و ابلیس، سانپ اور طاؤس کے متعلق جو کچھ مسلمانوں میں بیان کیا جاتا ہے وہ بھی مجوسی روایات میں نظر آتا ہے، اسی طرح میزان، صراط، نورِ محمدی، حشر و نشر، حساب و کتاب، دوزخ و جنت، وغیرہ کے متعلق جو اعتقادی مسائل اسلام میں پائے جاتے ہیں وہ قبل اسلام میں بعض مذاہب میں پائے جاتے تھے اور اگر حمامِ مذاہب کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک وقت نامعلوم سے یہ خیالات نوعِ انسانی میں پرورش پاتے چلے آرہے ہیں اور انسان کی بالکل ابتدائی ذہنی نشوونما کی یادگار ہیں۔

ابتدائے عہدِ انسانی میں جب کوئی شخص غیر معمولی عقل و ذہانت رکھنے کی وجہ سے اپنے قبیلہ کا سردار بن جاتا تھا تو اس پر دو فرض عائد ہوا کرتے تھے، ایک یہ کہ وہ قبیلہ کے تمدنی و معاشرتی نظام کو قائم رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ افرادِ قبیلہ کے دل میں پیدا ہونے والی الجھنوں کو دور کرے۔

لوگ رات کو خواب دیکھتے تھے اور اس سے آکر پوچھتے تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ کوئی مر جاتا تھا تو اس سے دریافت کیا جاتا تھا کہ وہ کہاں گیا؟ کسی کو کوئی مرض لاحق ہوتا تھا تو اس سے استصواب کیا جاتا تھا، الغرض ان کی ہر خواہش و جستجو کا مرکز سردارِ قبیلہ ہوا کرتا تھا اور اسے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواب دینا پڑتا تھا۔

کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی قائدانہ حیثیت ختم ہو جاتی اور قبائلی نظم و نسق

میں وہ کام یاب نہ ہو سکتا۔

پھر چوں کہ مرنے والوں کے ساتھ زندگی میں محبت ورفاقت کا جذبہ متعلق ہوتا تھا اور ان کی جدائی سے لوگوں کو تکلیف پہنچا کرتی تھی اس لئے بقائے روح کے خیال سے ان کو تسکین دی گئی اور روح کو عذاب وثواب کا محل قرار دے کر ترغیب وتخویف کی وہ صورتیں اختیار کی گئیں جو اصلاحِ قبائل اور اصولِ معاشرت کے قیام کے لئے ضروری تھیں۔

اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ جتنے مذہبی معتقدات دنیا میں پیدا ہوئے وہ سب نتیجہ ہیں قیاس کا اور چوں کہ قیاس کا تعلق موجودات کے تصورات سے ہوا کرتا ہے اس لئے حیات مابعد الموت کے متعلق بھی ایک انسان نے اپنے قیاس سے کام لے کر وہی باتیں کیں جو دنیاوی زندگی میں پیش آتی ہیں۔

خدا کا وہی قہرمانی تصور جو دنیاوی بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے، اسی کا وہی مختارِ کل ہونا، ایک مستبد حکم ران انسان کی خصوصیت ہے۔ بہشت میں انہی لذائذ ونعائم کا ذکر کرنا جن کی خواہش دنیا میں ہوا کرتی ہے اور دوزخ کے وہی دل دہلا دینے والے مناظر بیان کرنا جن سے عالمِ آب وگِل میں ایک انسان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ سب اسی قیاس کی بناء پر تھے جو تجرباتِ دنیا کے سلسلہ میں قائم کئے گئے اور جس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مثالاً آپ اسلام ہی کو لیجئے کہ جس سرزمین میں اس کا ظہور ہوا وہاں کے باشندوں کی کیا حالت تھی؟ دنیاوی لذائذ ونعائم میں عورت، شراب، دودھ، شہد اور فواکہ ان کا انتہائی نقطۂ نظر تھا اور ان کی قساوت وسنگ دلی کا یہ عالم تھا کہ گرم پتھروں پر لٹالٹا کر ایک آدمی کو مار ڈالنا ان کا روز کا مشغلہ تھا، جہل ولا علمی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بے علمی وبے خبری پر فخر کیا کرتے تھے اور باہم دِگر معمولی معمولی باتوں پر سالہا سال تک کُشت وخون جاری رہنا وہاں کا معمولی منظر تھا، باوجود ایک ہی سرزمین میں سانس لینے کے ہر قبیلہ کا معبود جدا تھا اور افتراق کی وہ تمام مکروہ صورتیں جو بھائی کو بھائی سے اور گوشت کو ناخن سے جدا کرتی ہیں ان میں بدرجۂ کمال پائی جاتی تھیں۔

ظاہر ہے کہ اس حالت میں ایک مصلح یا رِفارمر کا اولین فرض یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ ان کو ایک مرکز پر لائے اور سب کو ایک خیالِ مشترک سے وابستہ کر دے، چناں چہ سب سے پہلے ان کو خدا کی توحید کی طرف دعوت دی گئی۔ ہر چند کہ اللہ اور اللہ کی توحید کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے اہلِ عرب واقف نہ رہے ہوں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ

اس چیز کو بالکل بھلا چکے تھے اور اسی لئے ان کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا تھا۔

ظاہر ہے کہ محض خدا کو ایک کہنا تو سود مند نہ ہو سکتا تھا اس لئے اصلاحِ معاشرت کے لئے اور وہ صورتیں بھی اختیار کی گئیں جو اس سے قبل مفید ثابت ہوئی تھیں اور عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، حشر و نشر وغیرہ کے وہ تمام عقائد علیٰ حالہا قائم رکھے گئے جن کے بغیر اصلاح ناممکن تھی، اگر جاہل عربوں کے سامنے اظہارِ حقیقت کے طور پر بہشت و دوزخ کا مفہوم صرف روحانی مسرت یا روحانی اذیت بتایا جاتا تو ظاہر ہے کہ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا کیوں کہ اس مفہوم سے وہ آشنا ہی نہ تھے اور ان کے ذہن اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ اس کی بلندی کو سمجھ سکتے۔

لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ نعائمِ فردوس میں وہی تمام لذتیں شامل ہیں جن کے لئے وہ بے چین رہتے ہیں اور عذابِ دوزخ اس قسم کی سخت گیریوں کی انتہائی صورت ہے جن سے انہیں یہاں واسطہ پڑتا ہے تو ان کی سمجھ میں مذہب کی اہمیت بھی آئی اور وہ ان اصول کے بھی پابند ہو سکے جن کی تبلیغ ایک مصلح کا حقیقی مقصد ہوا کرتا ہے۔

اس لئے مذہبی معتقدات کے متعلق یہ گُفت گُو کرنا کہ وہ حقیقتاً لغو و باطل تھے ان معتقدات کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا کیوں کہ ان سے جو کام لینا مقصود تھا وہ پورا ہو کر رہا اور اگر آج ان معتقدات سے ہٹ کر کوئی دوسرا ذریعہ اصلاحِ اعمال و اخلاق کا اختیار کیا جا سکتا ہے تو مذہب کے حقیقی مقصود کے منافی نہیں اور یہ ایسا باریک نکتہ ہے جس کو سب سے پہلے اسلام اور بانیٔ اسلام نے ظاہر کیا۔

جیسا کہ ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کیا ہے ایک، مذہب والا ہمیشہ دوسرے مذہب والے کو گم راہ کہنے کا عادی ہے لیکن قرآن کی تعلیم یہ نہیں ہے اور اس نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوا کرتا ہے جو اس قوم کی خصوصیات اور زمانہ کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر تمدن و معاشرت کے اصول قائم کرتا ہے اور لوگوں کو امن و سکون کی طرف بلاتا ہے۔ آں حضرتؐ نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں تم لوگوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں لایا، آپ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آپ سے مافوق الفطرت معجزات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ آپ نے مذہب کے باب میں کبھی جبر و اشتداد کو پسند نہیں کیا اور آپ نے اگر بہشت و دوزخ کا وہ عام مفہوم پیش کیا جو جاہلوں کے لئے قابلِ قبول تھا تو دوسری طرف اہلِ علم و فضل کے لئے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ سب تشبیہات و استعارات ہیں اور حقیقت سے

انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔

پھر آپ تمام مذاہبِ عالم کی تاریخ ڈھونڈ ڈالئے اور بتایئے کہ کیا محمد کے سوا کوئی اور نبی یا مصلح ایسا ہوا ہے جس نے انسان کی فطری سطح پر آکر کسی مذہب کی بنیاد ڈالی ہو، جس نے اپنے آپ کو "أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ" سے زیادہ اہمیت نہ دی ہو، جو معجزات اور خرقِ عادات پیش کرنے سے انکار کرتا ہو، جس نے مذہب کے لئے تلوار اٹھانا حرام قرار دیا ہو، جو تمام دوسرے مذاہب کی عزت کرتا ہو، جو واہمہ پرستی ولایعنی مراسمِ عبودیت کا مخالف ہو اور جو مذہب کا مفہوم صرف اخلاق کی پاکیزگی اور ذہنی ترقی و آزادی قرار دے۔

اگر انصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ محمد کی ذات اس باب میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور اس لئے مذہب ہونے کے لحاظ سے تکمیل کا دعویٰ صرف اسلام ہی کر سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ اصلی خط و خال اسلام اور اس کی تعلیمات کے جو ہر شخص کو غائر مطالعہ کے بعد نظر آ سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ آج اگر میں ان کو ایک مسلمان کے سامنے بیان کروں تو وہ بھی ان کو صحیح باور نہ کرے گا، چہ جائے کہ غیر مسلم، کیوں کہ آج خود ہمارے علماء کرام اور واعظانِ ذی احترام کے نزدیک رسول اللہ انسان نہ تھے بلکہ ایک دیوتا تھے جن کے جسم کا سایہ نہ تھا، جن کی پشت پر مہرِ نبوت ثبت کرکے خدا نے بھیجا تھا جن کے ہاتھ میں سنگ ریزے بولنے لگتے تھے جن کی رسالت کا اقرار درخت بھی ایک انسان کی طرح کیا کرتے تھے۔ جب وہ جنگ کرتے تھے تو مدد کے لئے آسمانوں سے فرشتے اترا کرتے تھے اور جب آپ کسی مجمع میں ہوتے تو ہمیشہ آپ سب سے بلند نظر آتے، خواہ ان سے زیادہ لانبے قد کے آدمی کتنے ہی وہاں موجود ہوں، وہ ایک براق پر سوار ہو کر ساتوں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرشِ اعظم تک پہنچے اور ذاتِ خداوندی سے ہم کلام ہوئے۔ جبرئیل نے آپ کا سینہ چیر کر دل سے خون کی پھٹکی نکال لی تا کہ معاصی کی اہلیت باقی نہ رہے اور آپ ایک اشارے سے پہاڑ کے پہاڑ سونے چاندی میں تبدیل کر سکتے تھے پھر یہ واہمہ پرستی یہیں تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ صوفیائے کرام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ احمد اور احد میں تو میم کا پردہ مصلحتاً رکھا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محمد اور خدا میں کوئی فرق نہیں اور اس طرح صنمیات کا پورا لٹریچر اسلام میں داخل ہو گیا۔

آپ کسی مجلسِ میلاد میں جا کر شریک ہوں تو آپ کے لئے اس قسم کے معجزات و

خوارقِ عادت سننا ناگزیر ہو گا اور پوری صحبت میں مشکل ہی سے دوچار واقعات اخلاقِ محمدی کے سننے میں آئیں گے۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں جب کہ مذاہب کے خلاف ایک عام تحریک دنیا میں پیدا ہو رہی ہے، اسلام کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ وہ اغیار کے حملہ سے کیوں کر محفوظ رہے، بل کہ سوال یہ ہے کہ خود اسی کے حامی و علم بردار جو دشمنی اس کے ساتھ کر رہے ہیں اس کو کیوں کر دفع کیا جا سکتا ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں: ایک یہ کہ ترکی و ایران کی طرح حکومت اپنی ہو اور بزورِ شمشیر مولویانہ ذہنیت کو ختم کر دیا جائے یا خود عوام میں علم کی اشاعت اتنی ہو کہ وہ نقد و نسیہ میں تمیز کر سکیں لیکن چوں کہ ہندوستان میں اول الذکر صورت کا امکان نہیں اس لئے صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے جو دیر طلب تو یقیناً ہے لیکن کسی نہ کسی دن بہر حال اسے پورا ہو کر رہنا ہے۔

میرے مذہبی خیالات

جناب سیّد عبدالحکیم صاحب گجرات کے جواب میں

آپ کا یہ خیال یا نتیجۂ مطالعہ بالکل صحیح ہے کہ میرے مذہبی خیالات میں رفتہ رفتہ تغیر پیدا ہوا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اب اس تغیر نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ بعض افراد اس کو کفر وارتداد سے تعبیر کرنے لگے ہیں لیکن آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ ابتدائے اجرائے **نگار** سے تاایں دم کبھی ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اپنے خیال کے مطابق حق و صداقت سے دیدہ و دانستہ اعراض کیا ہو یا میری نیت خدمتِ اسلام کے علاوہ کچھ اور ہی ہو۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ پہلے میں اسلام کے مفہوم کو زیادہ محدود سمجھتا تھا اور قدرے متعصب تھا، لیکن اب اس کو زیادہ وسیع سمجھتا ہوں اور کیش و مسلک کے امتیاز سے گزر گیا ہوں۔

هم کعبه دهم بت کده سنگ ره ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

اس میں شک نہیں کہ میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور نہایت سخت مذہبی ماحول میں میری تعلیم و تربیت ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تعلیم و تربیت سے فارغ ہونے کے بعد کافی زمانہ اسی تقشف اور تعصب میں بسر ہوا لیکن اب اس کو عقل و ضمیر کی رہنمائی کہئے یا طاغوتی کارفرمائی کہ مذاہبِ عالم کی تاریخ، حکومتوں کی داستانِ فتح و ظفر اور اسی کے ساتھ طبیعیات و فلکیات کے مطالعے نے ایک عجیب انقلاب ذہن میں پیدا کر دیا اور سب سے پہلا حجاب دور ہونے کے بعد جو منزل آئی وہ مَاعَرفناك حقّ معرفتك کی تھی۔

پہلے میں یقین رکھتا تھا کہ خدا ایک مستبد و جبار ہستی ہے جو سوائے مسلمان کے کسی اور کو نجات دینے والی نہیں۔ وہ ہمارے دنیاوی سلاطین ہی کی طرح ایک قہرمانی قوت ہے جو سزا و عطا کے لحاظ سے مسئول نہیں ہو سکتی اور جو ہماری عبادت سے (بشرطِ آں کہ اسلامی طریقہ سے ادا کی جائے) خوش ہوتی ہے اور ترکِ عبادت سے برہم۔ لیکن جوں جوں کائنات کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا اور علم اور عقل کی نارسائیاں واضح ہونے لگیں تو مسلمانوں کی اس تنگ ذہنیت کو رفتہ رفتہ خدا کی توہین سمجھنے لگا۔ یقیناً دیگر مذاہب بھی اس عصبیت میں مبتلا ہیں لیکن ایک مسلمان ہونے کی

حیثیت سے کم از کم اسلام کو میں اس داغ سے پاک دیکھنا چاہتا تھا اور آخر کار اس احساس کی شدّت نے میرے ضمیر اور میرے علم و یقین کو جس اقدام کی طرف مجبور کیا وہ یہ تھا کہ:

بیا کہ روئے بہ محراب گاہ نور نہیم — بنائے کعبۂ دیگر سنگِ طور نہیم
حطیمِ کعبہ شکست و اساس قبلہ بریخت — بتازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم

پھر یہ "کعبۂ دیگر" کیا تھا، یہ "قصرِ بے قصور" کیا ہو سکتا تھا؟ یہی تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑنا، تفریقاتِ شعائر و رسوم کی خلیج کو پُر کرنا اور ایک ایسی بلند چوٹی پر اسلام کا جھنڈا نصب کرنا جس سے زیادہ رفعت اور کسی مذہب کے پرچم کو میسر نہ آسکے۔ پھر چوں کہ میں اسلام کو حقیقت کے لحاظ سے اخلاق کی دنیا میں آخری آواز سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اسلام نام مخصوص وضع و شکل بنانے کا نہیں ہے بلکہ وہ مسمّیٰ ہے ارتفاعِ نوعِ انسانی کا، عروج فضل و کمال کا اور اخلاق کی انتہائی رفعت کا۔ اس لئے میں مجبور تھا کہ موجودہ مزعومات مذہبی و مفروضاتِ دینی کی تنگ و تاریک فضا سے بلند ہو کر کوئی نصب العین ڈھونڈھتا اور شکر ہے کہ میری عقل نے اس باب میں رہبری کی اور جوں جوں حجابات دور ہوتے گئے میری آواز میں بلندی، میرے عزائم میں سختی اور میرے مسلک میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ حتّٰی کہ آج خدا میرے نزدیک نام ہے ایک ایسی قوّتِ غیر متاثرہ کا جو کافر اور مسلمان کے بے معنی اصطلاحوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، جو مسجد و کلیسہ، کاشی و کعبہ، اذان و ناقوس، طواف و پیکر ان سب سے بے نیاز ہے اور وہ انعام و انتقام، جزاو سزا کے لئے یہ نہیں دیکھتا کہ فلاں اسے اللہ کے نام سے پکارتا ہے اور فلاں رام کے نام سے، یا وہ مندر میں گھنٹا بجا کر اس کی یاد تازہ کرتا ہے یا یہ کان میں انگلی دے کر اذان کی آواز سے اسے پکارتا ہے۔ اگر وہ خدا ہے تو سب کا خدا ہے اور اس نے ہر شخص کو جزا و سزا، ہر قوم کی دوزخ و جنّت خود اسی شخص یا قوم کے اندر پنہاں رکھ دی ہے خواہ وہ اِسے اختیار کرے یا اُسے۔

پھر جو شخص تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر لانا چاہتا ہو اور جو صرف صحت اخلاق کو غرض مشترک قرار دے کر دنیا سے عصبیت کو مٹا دینا پسند کرتا ہو اس کے خیالات و عقائد میں اگر آپ یہ تغیّر محسوس کریں تو جائے عجب نہیں اور پھر یہ منزل ابھی صرف قیل و قال اور حجت و استدلال کی ہے۔ کسے خبر ہے کہ کل اگر میں اس منزل سے گزر کر صرف عمل کی منزل میں آگیا تو میرے منہ سے کیا نکلے گا؟ اور آج جو صرف کافر و مرتد کہہ کر مجھ سے نفرت کرتے ہیں کل مجھے دیوانہ و مجنوں جان کر پتھر نہ ماریں گے؟

أجد الملامة فی هواك لذیذة
حبّا لذِكرك فلیلمنی اللــؤم

گُزشتہ و آئندہ

تو خود حدیثِ مفصل، بخواں ازیں مجمل

آفتاب کا طلوع و غروب، روز و شب کا تسلسل، اور اسی طرح کے تمام فطری مناظر زمانۂ نامعلوم سے یکساں طور پر رونما ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اور اگر کائنات نام صرف انہی نقوش کا ہوتو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کسی انقلاب و تغیّر کو قبول نہیں کرتی لیکن حقیقت امر شاید اس کے خلاف ہے کیوں کہ اہلِ علم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ "عالم حادث ہے، متغیر ہے"۔

پھر کیا اس حدوث و تغیر کا علم ہم کو بغیر کسی غور و فکر کے الہامی طور پر حاصل ہوا ہے۔ غالباً نہیں۔ تو پھر اس بات کو تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہو کہ اہم ترین تغیر عقلِ انسانی کا تغیر ہے جو ہر آن و ہر لحظہ حجابات دور کرتا جارہاہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ کس نقطہ پر پہنچ کر اس کو اپنی تگ ودو ختم کرنا ہے۔

انسان فطرت کی طرف سے اپنے اندر وہ حس لے کر آیا ہے جسے "حسِّ اجتمائی" (Herd Instinct) کہتے ہیں اور اسی احساس کا نتیجہ نظامِ تمدّن ہے جس کا آغاز عہدِ حجری سے ہوا اور اب "عہدِ برق و شعاع" کہلاتا ہے۔ یعنی جس کی ابتدا زمین کے جمادات سے ہوئی تھی وہ اب آسمان سے باتیں کررہاہے---- الغرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ذہنِ انسانی برابر ترقّی کرتا جارہاہے اور کل کے بوڑھے آج صرف بچّوں کی صف میں جگہ پاسکتے ہیں۔ جس طرح آج کے بوڑھوں کا شمار کل کے بچّوں میں ہونے والا ہے۔

پھر کیا یہ انسان کی توہین ہے کہ اب سے ہزار سال قبل جو تحقیق و جستجو اس نے کی تھی وہ آج غلط ثابت کی جارہی ہے۔ اگر ہمارے اسلاف کے علمی، اخلاقی و تمدّنی نظریئے آج کے مشاہدہ وضروریات کے لحاظ سے ناقص ونامکمل نظر آتے ہیں تو کیا اس کا اظہار ان کی تنقیص ہے؟

نظامِ بطلیموس کا ماننے والا آج کوئی نہیں۔ لیکن بطلیموس کی عزّت و عظمت اسی طرح

قائم ہے۔ نیوٹن کا نظریہ کشش ممکن ہے آئن اسٹائن Einstein کے نظریۂ اضافیت کے سامنے غلط ثابت ہو جائے۔ لیکن نیوٹن کا نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زرّیں حروف میں نظر آئے گا۔

جس طرح ازمنۂ قدیمہ میں انسانی ذہن و دماغ نے اپنے حاسّۂ اجتماعی کے اقتضا پر اور بہت سی باتیں دریافت کیں۔ اسی طرح اس نے مذہب کے بنیاد ڈالی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے اس کا مقصود نوعِ انسان کی خدمت اور تشکیل تمدن کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ پھر اگر ضروریات زمانہ اور انسان کی عقلی ترقیوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علمی نظریئے تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہبی عقائد میں تغیر نہ پیدا ہو۔

لیکن اس تغیر کا مطالبہ و احساس یقیناً کسی پیمبر کی توہین نہیں، کیوں کہ جس عہد و زمانہ میں جو مذہب پیدا ہوا وہ اس وقت کے لحاظ سے واقعی آخری لفظ کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن پاک میں بھی ارتقاءِ خیال کے لحاظ سے اصولِ مذاہب کی تبدیلی کی ضرورت کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے:

مَا نَنسَخْ مِنْ ءَايَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ أَوْ مِثْلِهَآ

جب حقیقت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ عقائدِ مذہبی میں تغیر و تبدل کی خواہش پر لوگ کیوں چراغ پا ہوتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ مسلمان کہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی اس اصول پر قائم ہوتی ہے کہ خذ ما صفا پر عمل کیا جائے اور زمانہ کا ساتھ دینے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کی جائے۔

مذاہبِ عالم کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز تو وہ تھی جسے ہم پیمبرانہ روح (Prophetic Soul) کہتے ہیں اور دوسری جو اس کے بعد پیدا ہوئی وہ "نفسِ مولویانہ" (Priest Mind) تھا۔ یعنی ایک تو وہ نفوسِ پاکیزہ تھے جن کے ذہنِ خلاّق نے انسانی سوسائٹی کی فلاح کے لئے کچھ اصول وضع کئے اور دوسرے وہ تھے جو ان کا نفاذ کرنے والے تھے اور پھر ان میں اکثر وہی تھے جنہوں نے اس پیمبرانہ روح کے حقیقی منشا سے ناآشنا رہ کر محض الفاظ کو لے کر ان کی پرستش شروع کر دی اور کم تر ایسے تھے جن کے دماغوں نے ہادیِ اوّل کی عقلِ سلیم کے متوازی چل کر اس کی تعلیم کی حقیقت کو دریافت کیا۔ یہ ہی رونا پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے اور اسی لئے اس سے قبل بھی عقل و مذہب میں جنگ جاری رہی اور اب بھی جاری ہے فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ پہلے ذہن و

عقل کی اس آزادی کو بزورِ شمشیر فنا کرکے اسے زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا اور آج یہ مجبوری اٹھ جانے سے عقلِ انسانی زیادہ سنگین محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اب آیئے اس جنگ پر ذرا اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں۔

اہلِ سائنس کہتے ہیں کہ سائنس ہمیں صرف ان باتوں کا یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے جن کو ہم صحیح ثابت کرسکتے ہیں، بر خلاف اس کے مذہب مشتمل ہے چند مزعومات پر جن کا کوئی علمی یا استقرائی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا اور اگر اہلِ مذاہب سے سوال کیا جاتا ہے کہ ان کی باتوں پر ایمان لانے کے کیا اسباب ہیں تو وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے اسلاف ایسا ہی یقین کرتے تھے دوسرے یہ کہ ہمارے اسلاف جو دلائل پیش کر چکے ہیں وہ کافی ہیں اور تیسرے یہ کہ اصولِ مذہب پر گفتگو کرنا ناجائز و ممنوع ہے۔ کیا یہ دلائل واقعی کوئی وزن رکھتے ہیں؟

اگر دو ہزار قبل مسیح کے انکشافاتِ علمیہ کو عقلِ انسانی نے آج بالکل بدل کر رکھ دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس وقت کا مذہب جوں کا توں باقی رہے اور اس کے اصول اب بھی مفید و کارآمد ثابت ہوں۔ پھر اگر تمام دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہوتا تو بھی کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کبھی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوا لیکن جب دنیا میں سیکڑوں مذاہب قائم ہوئے اور ہر ایک نے اپنے سوا تمام دیگر مذاہب کو جھٹلایا تو ایک طلب گارِ حق کے لئے چارۂ کار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان سب کو عقل کی کسوٹی پر کَسے اور کسی ایک کی صحت پر ایمان لائے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا تعلق عقل سے نہیں، کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ سائنس اس وقت تک کسی ایسی حقیقتِ راسخہ تک نہیں پہنچ سکی جس سے آگے بڑھنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جو دن گزرتا ہے وہ حقیقت سے قریب تر ہوتا جارہا ہے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کے باب میں اصولِ ارتقاء کو نظر انداز کر دیا جائے۔

سائنس واقعات کی جستجو کرکے حقیقت تک پہنچنا چاہتی ہے اور مذہب چند باتوں کو پہلے ہی حقیقت باور کرکے واقعات کو ان پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ اگر ہم کسی مذہب کے پیرو ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہمارے آباء و اجداد اس مذہب کے ماننے والے تھے لیکن سائنس کے یہاں باپ دادا کوئی چیز نہیں۔ وہ ہر انسان

سے انفرادی طور پر عقل و تمیز کے صَرف کا مطالبہ کرتی ہے۔ عقلِ انسانی نے عقائدِ مذہب میں جس جس تغیّر کو قبول کیا وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ ابتدائی حالت میں جب انسان وحشی و جاہل تھا وہ خدا کو ایک ایسی ہی خود مختار فرماں روا ہستی سمجھتا تھا جیسی کسی دنیاوی صاحبِ جبروت بادشاہ کی ہوتی ہے یعنی نہ وہ کسی قانون کا پابند ہے نہ کسی اصول پر کاربند، جو اور جس طرح چاہتا ہے بناتا بگاڑتا ہے۔ اس کے بعد جب سترھویں صدی میں ڈیکارٹ، کپلر، گیلیلو اور نیوٹن پیدا ہوئے اور انہوں نے کائنات کو ایک بڑی مشین کی طرح نظم و اصول کے ساتھ چلتے ہوئے تسلیم کیا تو خدا کے اس قدیم عقیدہ میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور لوگوں نے باور کیا کہ دنیا کا کاروبار بے شک خدا چلاتا ہے لیکن مخصوص مشینری کے ذریعے سے جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ مدعا یہ کہ خدا کی خدائی کسی قانون و اصول کی پابند ضرور ہے۔ جب یہ دور بھی ختم ہوا اور اٹھارویں صدی آئی تو اس مشینری میں کسی خارجی قوّت کی مداخلت کو بھی تسلیم نہ کیا گیا۔ مدعا یہ کہ خدا حکمراں تو ہے لیکن نظم ونسق سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

زمانۂ حال کی جو کیفیت ہے وہ سب پر ظاہر ہے کہ سرے سے خدا کا وجود ہی معرضِ خطر میں پڑ گیا ہے۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ دیگر علوم وفنون کے ساتھ مذہبی نظریوں میں بھی غیر معمولی تغیر پیدا ہوا ہے اور وہ وقت آنے والا ہے جب اس کی انتہا کچھ اور ہوگی، یعنی مذہب کا نام لینا ہی گناہ سمجھا جائے گا اور جس طرح کسی وقت دین نے بے دینی کا استیصال تیغ و خنجر سے کیا تھا بالکل اسی طرح بے دینی دین کو محو کر دینے کی کوشش کرے گی، کیوں کہ اس وقت مذہبی اہمیت صرف سیاست کے رجحان پر قائم ہے اور اس کی حیثیت سرمایادرانہ پروپیگنڈا سے زیادہ کچھ نہیں۔

جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے مذہب جس میں ظاہری مراسم و شعائر کی پابندی ضروری ہے، کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ مادی نظر سے اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں کہ آج تک وہ قوی کے مقابلہ میں ضعیف کو پامالی سے نہ بچا سکا۔ نفسیاتی زاویہ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی خصوصیات علمی و تمدنی ترقی کے لئے بہت حارج ہوئیں۔ رہی وجدانی ومابعد الطبیعاتی تسکین سو یہ علم و اخلاق کی وسعت سے حاصل ہو سکتی ہے جو عام "اخوتِ انسانی" کے رشتے کو قائم کرنا چاہتی ہے۔

الغرض اس وقت مغرب کی علمی دنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جارہا ہے وہ

"اشتراکیت" ہے جس کا پیغمبر لینن اور جس کی شریعت سائنس ہے۔

پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ ہیجان صرف یورپ و امریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے۔ ترکی اپنی قومی ترقی و اصلاح کے لئے اسلام کو پسِ پشت ڈال چکا ہے۔ چناں چہ ۱۹۲۷ء میں مصطفٰے کمال نے اپنی تقریر کے دوران میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "کانسٹیٹیوشن میں اس امر کا اظہار کہ ترکی اسلامی حکومت ہے ایک ایسی بات کا اظہار ہے جس کو اولین مناسب فرصت میں کالعدم ہو جانا چاہیئے"۔

یہی حال تقریباً ایران و مصر کا ہے۔ چین و ہندوستان میں بھی اس انقلاب کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں کیوں کہ اس وقت دنیا کے سامنے اہم ترین فکر یہ نہیں ہے کہ انسان گناہوں سے کس طرح باز رہے، بلکہ یہ ہے کہ تمدنی و معاشرتی نظام میں کون سی ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ انسان بھوکا نہ مرے اور چوں کہ مذاہبِ عالم کا موجودہ نظام انسانیت کے اس دکھ درد کا علاج اب تک نہیں کر سکا، اس لئے لامحالہ یا تو اس کو پسِ پشت ڈالنا پڑے گا یا اس میں کوئی ایسا تغیر پیدا کیا جائے گا جو اس گتھی کو سلجھا سکے۔ بہر حال اس دورِ انقلاب میں مذاہب کو ضرور صدمہ پہنچے گا اور اگر حامیانِ مذہب نے اپنے اصولِ کار میں اقتضاءِ زمانہ کے لحاظ سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو ان کا منصبِ شریعت سے ہٹ جانا ناگزیر ہے۔

اگر شخصِ ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے بشرطِ آں کہ اس کی اصل روح کو پیش کیا جائے اور ظاہری شعائر و مراسم کی پابندی پر زور نہ دیا جائے۔

اس وقت اصولاً تقریباً تمام ممالک نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت و سلطنت کی بہترین صورت جمہوریت ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے جو مصائب دنیا پر توڑ رکھے ہیں ان کا علاج سوا اشتراکی اصول کے اور کوئی نہیں ہو سکتا پھر کیا سوا اسلام کے دوسرا مذہب کوئی اور ہے جو اس بات کا حامی ہو۔ سوال نہ بنو عباس کا ہے نہ بنو امیّہ کا نہ دولتِ فاطمیہ کا نہ ہندوستان کے دورِ مغلیہ کا، بلکہ غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے۔ اگر عہدِ رسالت کے بعد اس پر عمل نہ کرکے لوگوں نے بجائے جمہوریت کے مستبدانہ حکومتوں کی بنیاد ڈالی ہو تو اسلام موردِ الزام نہیں ٹھہرتا۔ اور اگر آج بھی اس تعلیم کو پیش نہیں کیا جاتا تو اس میں قصور ہمارے قائدینِ مذہب کا ہے نہ کہ اسلام کا۔

تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جو جذبہ عملاً کوئی خدمت کر سکتا ہے وہ

"اخوتِ عامہ" کا جذبہ ہے۔ اور اگر اس کے خلاف کوئی تعلیم پیش کی جاتی ہے، خواہ وہ اصول سے تعلق رکھتی ہو یا فروع سے، شعائر سے وابستہ ہو یا عقائد سے، کبھی صحیح اسلامی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

اس وقت اسلام کے اصطلاحی معنیٰ خواہ کچھ ہی کیوں نہ قرار دے لئے گئے ہوں، لیکن حقیقتاً وہ ایک بسیط مفہوم رکھتا ہے اور اس کو ہم کسی طرح محدود کر ہی نہیں سکتے۔ کیوں کہ اسلام نام ہے صرف استعلاء کا، عروج و ترقی کا، جدوجہد کا، کردار و عمل کا، ایک ایسی "لا مذہبیت" کا جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے اور شعائر و مراسم سے بے نیاز ہو کر صرف پاکیزگیٔ اخلاق اور تکمیلِ تمدن کی حامی ہے۔ پھر چوں کہ اس نکتہ کو مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم کو انسان کی خود غرضانہ ذہنیت خراب کر چکی ہے اس لئے عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ ساری خرابیاں تعلیمِ مذہب کی ہیں اور اسی بناء پر تمام اسلامی ممالک میں وہ ردِّ عمل ظاہر ہو رہا ہے جس کا دوسرا نام کفر وار تداد رکھا گیا ہے لیکن باور کیجئے کہ یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہے گی اور اس انقلاب کا نتیجہ استیصال مذہب کی صورت میں ظاہر ہو گا اگر اس کے اصلی خط و خال پیش نہ کئے گئے۔

ممکن ہے جو مفہوم میں نے اسلام کا پیش کیا ہے وہ اس وقت تعجّب و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، لیکن وہ وقت آنے والا ہے جب ایک ایک شخص وہی کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں اور اسلام تمام دنیا پر حاوی ہو کے رہے گا۔

پھر ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت دوسری ہو۔ اس کا نام کچھ اور ہو لیکن اس کا مفہوم وہی ہو گا جو آج میں کہہ رہا ہوں اور اس کے خدوخال وہی ہوں گے جنہیں آج میرا قلم پیش کر رہا ہے۔

خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا؟

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہندو سوسائٹی نے مجھ سے کیا ہے

یہ سوال خالص مذہبی ہے۔یعنی یہ جستجو اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو خدا کے وجود کا قائل ہے اور ایشور کا پایا جانا تسلیم کر چکا ہے۔ لیکن جو منکرِ خدا ہے وہ "کون" اور "کس نے" کی گفتگو نہیں کرتا بلکہ اس کی تلاش یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم کیوں کر ظہور میں آیا اور اس کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے؟

ایک پابندِ مذہب انسان چوں کہ خدا کو بالکل اسی طرح کا صنّاع و خلّاق مانتا ہے جس طرح ایک کمہار یا بڑھئی کو کہ جو برتن اس کے جی میں آیا بنا دیا جس طرح کی چوکی چاہی اس نے تیار کر دی۔ اس لئے اصولاً اس کے سامنے کیوں کر کا سوال نہیں آ سکتا کیوں کہ ایک قادر مطلق اور مختار کل ہستی کو ہر وقت قدرت و اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے بغیر کسی ذریعہ و سبب کے اپنے ارادے سے ہیزدہ ہزار عالم پیدا کر دے اور جب اس کے جی میں آئے آناً فاناً محو کر دے۔ لیکن ایک منکر چوں کہ دنیا کی پیدائش کو کسی ہستی کے ارادہ سے متعلق نہیں سمجھتا بلکہ اس کو مخصوص اسباب سے وابستہ جانتا ہے اور تدریجی ارتقاء کا قائل ہے اس لئے لا محالہ اسے غور کرنا چاہئے کہ اصول آفرینش کیا ہیں اور کن اسباب کے تحت کائنات نے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔

بہر حال اس بات میں ایک مذہبی انسان کا نقطۂ نظر، منکر کے نقطۂ نظر سے بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے اگر مندرجہ بالا عنوان سوال دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ دونوں کا جواب ایک دوسرے سے مختلف ہو گا۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کیا واقعی دونوں اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہیں؟ ایک مذہبی شخص جو پیدائشِ عالم کے لئے کسی علت و سبب کے وجود کو ضروری نہیں سمجھتا وہ نتیجہ و غایت پر غور کرنے کا مستحق کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے، یعنی جب اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ خدا قادر مطلق ہے وہ جو چاہے، پیدا کر دے اور جب چاہے فنا کر دے تو پھر کیوں کا کیا سوال؟ یہ "چون و چرا" تو اسباب و علل سے متعلق ہوا کرتی ہے اور جب وہاں سرے سے اسی کا انکار کیا جاتا ہے تو استفسار کیوں؟ البتہ ایک منکر کے

متعلق خیال ہو سکتا ہے کہ اس نے اس پر غور کیا ہو گا، لیکن اگر انصاف سے پوچھئے تو کہنا پڑے گا "کیوں" کا جواب نہ خدا کا اقرار کرنے والا دے سکتا ہے نہ انکار کرنے والا، کیوں کہ جس طرح مذہب آج تک غایتِ آفرینش کو نہیں سمجھ سکا، اسی طرح سائنس بھی اس معمہ کو حل نہیں کر سکی، یعنی اگر ایک پابندِ مذہب شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کے پیدا کرنے سے خدا کا کیا مقصود ہے تو بڑے سے بڑا سائنس داں بھی نہیں کہہ سکتا کہ مادہ و قوت کے اس ہیجان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے لیکن کس قدر حیرت ناک امر ہے کہ باوجود اس نااہلی کے دونوں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک اصرار کرتا ہے کہ وہی حق پر ہے، در آن حالِ کہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ادنیٰ دلیل بھی اس دعوے کے لئے موجود نہیں ہے۔ اہلِ مذاہب میں ایک جماعت تو علماء ظواہر کی ہے جو اپنے آپ کو مخصوص شریعت کا پابند کہتے ہیں اور جو مذاہب کو صرف ان کتابوں سے سمجھنا چاہتے ہیں جو ان کے اسلاف لکھ گئے ہیں اور جن کی بناء پر سوسائٹی کا نظام مقرر کیا گیا تھا۔ دوسری جماعت اہلِ تصوف کی ہے جنھوں نے اپنے مسلک کا نام شریعت نہیں بلکہ طریقت رکھا ہے اور جو تمام مسائل کو روحانیت سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں میں اوّل الذکر جماعت کے پاس اس سوال کا کھلا ہوا جواب موجود ہے اور ان کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ قرآن نے کھلے ہوئے الفاظ میں اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے کہ "ما خلقت الجن و الإنس إلّا لیعبدون" یعنی ہم نے انسان وجنات کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت کریں، اس لئے اگر آج عبادت کی کیفیت وہیئت متعین ہو جائے تو ایک مسلمان کے پاس اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں۔ عام طور پر عبادت کا مفہوم نہ صرف اسلام بلکہ تمام دیگر مذاہب میں وہی ہے جسے پوجا پاپرستش سے ظاہر کیا جاتا ہے لیکن چوں کہ دنیا میں کوئی فعل، ارادہ و نتیجہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اس لئے ہر شخص کا خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہو، فطری حق ہے کہ وہ ان دونوں باتوں پر غور کرے یعنی یہ کہ وہ کس ارادہ و نیت سے خدا کی پوجا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ جو غرض و غایت اس نے سمجھ رکھی ہے وہ عبادت سے کس حد تک پوری ہوتی ہے مذہبی اقوام میں بلا استثناء کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اس ارادہ و نیت سے عبادت نہ کرتی ہو کہ اس سے خدا خوش ہو گا اور وہ ہماری مشکلات کو دور کرے گا پھر اگر واقعی کبھی کسی کے مصائب دور ہو جاتے ہیں تو وہ اس کو اسی عبادت کا نتیجہ خیال کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ پر الزام قائم کرتا ہے کہ جو حق عبادت کرنے کا تھا وہ ادا نہ ہوا اور خدا کی خوش نودی حاصل نہ ہو سکی۔ اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک انسان کے

جذبات و تاثرات کا تعلق ہے اس خیال سے اس کو کافی تسکین ہو جاتی ہے اور وہ مایوسی کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے لیکن جب جذبات کی دنیا سے علیٰحدہ ہو کر سوال صرف علمی تحقیق کا ہوتا ہے یا کسی ایسے شخص کی تسکین کا جو کسی معلول کا وجود بغیر علت کے ماننے کے لئے تیار نہیں تو لامحالہ غور کرنا پڑتا ہے کہ عبادت سے خدا کا خوش ہونا کیا معنیٰ رکھ سکتا ہے اور خدا کی خوشی یا رضامندی کا ہمارے دنیاوی حالات و اسباب سے کیا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے علمِ حقیقتِ خدا کا مسئلہ سامنے آتا ہے یعنی یہ کہ جب تک ہم کو پہلے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ خدا کیا ہے، اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے اس وقت تک نہ ہم عبادت کی کوئی علمی توجیہ کر سکتے ہیں، اور نہ اس سے کسی نتیجہ کے پیدا ہونے پر حکم لگا سکتے ہیں۔ خدا کے متعلق انسان کا اولین تصور بالکل وہی ہے جو دنیا کے کسی مستبد بادشاہ حکمران کے متعلق ہو سکتا ہے یعنی خوشامد و تملق سے خوش ہونا، تحائف و نذرانہ قبول کر کے نظرِ التفات صرف کرنا اور سرتابی و نافرمانی سے غضب آلود ہو کر سزائیں دینا۔ اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ نفسِ خدا کی ماہیت و حقیقت پر بعض مذاہب کے خیالات زیادہ بلند و لطیف ہو گئے ہیں، لیکن جس حد تک پرستش کا تعلق ہے خدا کی ہستی اب بھی وہی ناخوش یا ناخوش ہو جانے والی بتائی جاتی ہے اور اپنے بندوں کو سزا یا انعام دینے سے بدستور وہی دل چسپی اس کو باقی ہے۔

ایک طرف تو یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا زمان و مکان سے علیٰحدہ، احساس و تاثر سے بے گانہ اور بے نیازِ مطلق ہے اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ وہ برہمی و خوش نودی کا محل ہے اور انعام و انتقام کا جذبہ اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک وقت میں خدا کو دو(۲) متضاد صفات کے ساتھ متصف کرنا کیوں کر ممکن ہے اور اس کی خوش نودی یا برہمی کیا معنیٰ رکھ سکتی ہے جب وہ خود نہ کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے اور نہ اسے پوجا یا پرستش کی ضرورت ہے۔ بعض اہلِ مذہب کہتے ہیں کہ عبادت سے خدا کو خوش کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ خود عبادت کرنے والا اس سے فائدہ اٹھائے یعنی خدا کی پرستش کا مفہوم خود اپنی اصلاح ہے، بالکل درست، لیکن یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ عبادت سے جو اپنی اصلاح وابستہ ہے وہ ہمارے اعمال و افعال سے بھی کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں۔ یعنی محض ہمارا عبادت کر لینا کافی ہے یا اسی کے ساتھ اپنی زندگی میں بھی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؟

ظاہر ہے کہ محض عبادت خواہ کسی صورت میں ہو بے کار ہے اگر وہ ہمارے اخلاق و اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی، اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ عبادت کا مدعا اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے اور اسی کو خدا کی خوش نودی سے تعبیر کیا گیا ہے تا کہ لوگوں کو اس طرف توجہ ہو اور وہ

اسے ترک نہ کر بیٹھیں۔ بظاہر یہ بیان بہت قرینِ عقل و صواب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ انسان کی گمراہی و شقاوت کا بڑا سبب یہی ہے۔ چوں کہ اہلِ مذاہب نے ہمیشہ یہی لوگوں کو سمجھایا کہ خدا کی خوشنودی ہی حاصل کرنا عین مدعا ہے اس لئے یہ بات کبھی ان کے ذہن میں نہ آئی کہ عبادت کا تعلق خود اپنی اصلاح اعمال سے ہے اور گر ہم اپنی زندگی میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں تو عبادت بے کار ہے۔ اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ عبادت نام قرار دیا گیا ہے صرف چند مخصوص حرکات و مراسم کا اور دوسری طرف لوگوں کے اخلاق پر یہ خرب اثر پڑا کہ خدا کو عبادت سے خوش رکھنے کے اعتماد پر وہ دنیاوی معاملات میں ہر قسم کی بے عنوانی پر آمادہ ہو گئے اور اخوت و ہم دردی کا جذبہ جو نظامِ تمدن کی جان ہے، ان کے اندر ضعیف ہونے لگا۔

اگر ابتداء ہی سے اس امر پر زور دیا جائے کہ خدا تمہاری عبادت سے خوش نہیں ہوتا بلکہ تمہاری اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے اور عبادت کا مدعا بھی یہی ہے تو شائد دنیا کی حالت آج دوسری ہوتی۔ ہر چند بعض مذاہب نے عبادات کی ماہیت و غایت بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان بار بار کیا ہے، لیکن چوں کہ عبادت و پرستش میں حیات بعد الموت کی راحت کا خیال بھی شامل کر دیا گیا ہے اس لئے اس دنیاوی زندگی میں اس کا نتیجہ خاطر خواہ بر آمد نہیں ہوا اور عام طور پر لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اصل زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہو گی اور چوں کہ اس کے متعلق عبادت کے بعد اطمینان ہو ہی گیا ہے، اس لئے دو(۲) روزہ زندگی کی اصلاح میں کیا سر کھپایا جائے۔ میری رائے میں مذاہب کی سب سے زیادہ خطرناک تعلیم یہی ہے کہ دنیا فانی ہے، انسان فانی ہے اور بقا اس زندگی کو حاصل ہے جو مرنے کے بعد شروع ہو گی اور اسی کو سنوارنے کی ضرورت ہے گویا انسانوں کا یہ اجتماع سرائے کے مسافروں کا اجتماع ہے جسے صبح یا شام منتشر ہو جانا ہے، پھر ظاہر ہے کہ جب تعلیم یہ ہو گی تو باہم دِگر کیا ہم دردی پیدا ہو سکتی ہے اور دنیاوی زندگی کی ترقی و اصلاح کے لئے کون سا جذبہ کام کر سکتا ہے۔ مسلمانوں میں نماز کا طریق عبادت اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک اجتماعی کیفیت لئے ہوئے ہے لیکن چوں کہ وہاں بھی وہی آخرت و معاد کا خیال ساتھ ہی ساتھ آتا ہے اس لئے مسلمان اگر یک جا جمع ہوتے ہیں تو صرف انفرادی طور پر اپنی اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال ان کے سامنے نہیں ہوتا، چناں چہ آپ کسی بڑی سے بڑی مسجد کا اجتماع جا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ بہت سے جانور کسی احاطہ کے اندر جمع کر دیئے گئے ہیں اور ایک ہی صف میں پاس پاس بیٹھنے

والوں کو بھی ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر نہیں ہے۔ اگر مسجدوں کا یہ اجتماع بجائے روزانہ پانچ مرتبہ کے ہفتہ میں صرف ایک ہی بار ہو اور سجدہ ورکوع کی جگہ وہ آپس میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کریں اور اپنے اپنے محلہ کے بچوں کی تعلیم، بیواؤں کی پرورش، ضعیفوں اور بیماروں کی نگرانی، مفلسوں اور ناداروں کی امداد، جماعتی تنظیم، اقتصادی مشکلات اور سیاسی مسائل پر گفتگو کرکے لائحہ عمل بھی تیار کرتے رہیں تو کتنا فائدہ عظیم مترتب ہو سکتا ہے۔

ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ان کے دارالاجتماع تھے، جہاں قوم کے تمام معاملات پر گفتگو ہوتی تھی لیکن آج مولوی کہتا ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر کوئی بات دنیا کی نہ کرو یعنی صرف اُس دنیا کی بات کرو جس کا علم تمہیں تو نہیں ہے لیکن اس مولوی کو ضرور ہے جو خدا کے "خلوتیانِ راز" میں سے ہے اور جس کے اختیار میں ہے خواہ تم کو جہنم میں ڈال دے یا فردوس بریں میں بھیج دے۔ علماء ظواہر کے مفہومِ عبادت نے جو مذموم صورت اختیار کرلی ہے اس کا حال تو آپ کو اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا اب رہ گئے اہلِ دل جو بجائے شریعت کے طریقت پر کاربند ہیں تو اس میں شک نہیں کہ جس حد تک خدا کے تصور کا تعلق ہے وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور انہوں نے عقیدہ "ہمہ اوست" سے خدا کی تعبیر بڑی حد قابل قبول صورت میں پیش کی، لیکن عبادت کے مسئلہ کو وہ بھی حل نہ کر سکے اور چوں کہ معاد و آخرت کی زندگی ان کے یہاں بھی اصل چیز ہے اس لئے باوجود گانے بجانے کا شوق رکھنے کے وہ عبادت کے مسئلہ میں علماء ظواہر کی پابندیوں سے علیٰحدہ نہ ہو سکے اور شریعت کے مقابلے میں ان کی طریقت اپنا کوئی مستقل ادارہ جداگانہ قائم نہ کر سکی۔ الغرض مسلمانوں کی طرف سے اس سوال کا جواب دینا کہ خدا نے انس و جن کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں عام متبادر معنٰی کے لحاظ سے انسانی دنیا کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا۔

دنیا میں ترقی یافتہ مذاہب دو (۲) طرح کے ہیں: ایک وہ جنھوں نے زندگی یا مذہب کا کوئی فلسفہ پیش کیا اور دوسرے وہ جنھوں نے صرف عملی زندگی کو سامنے رکھ کر چند اصول سوسائٹی کے مرتب کرنے پر اکتفا کی۔ ہرچند اوّل الذکر مذاہب کی تعلیم کا بھی حقیقی مقصود وہی سوسائٹی کی اصلاح تھا، لیکن جس طرح براہ راست عملی زندگی کا درس دینے والے مذاہب حیات بعد الموت کے قائل ہو کر مراسم و شعائر میں الجھ کر رہ گئے اسی طرح فلسفہ پیش کرنے والے مذاہب بھی نفسیاتی گتھیوں کے سلجھانے میں محو ہو کر ایسے دور از کار قیاسات میں مبتلا ہوگئے کہ سوسائٹی کا مفاد بالکل نظر انداز ہو گیا اور ان کی فلسفیانہ عقل آرائیاں مادی حقیقتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی لائحہ عمل بنی نوع انسان کے سامنے نہ کر

سکیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ مذہب کا تعلق کسی قومی عروج و ارتقاء سے نہیں ہے جس کے لئے تیغ و تفنگ کا جارحانہ یا مدافعانہ استعمال ضروری ہو بلکہ فلسفۂ حیات پر غور کرنے اور خاموشی سے رموزِ زندگی حل کرنے سے ہے تو بتایئے کہ ہندوؤں کے فلسفۂ ویدانت، نروان، اہمسا اور مکتی نے دنیا کو کیا فائدہ پہنچایا؟ یعنی اگر تلوار ہاتھ میں لے کر دنیاوی جاہ و حشم کو اپنے لئے مخصوص کر لینے سے دنیا کو نقصان پہنچا تو بودھ کی طرح کاسۂ گدائی لے کر در در کی بھیک مانگنے سے نوعِ انسانی کو کیا نجات حاصل ہوئی۔ اگر کسی قوم نے اسے تلوار سے مجروح کیا تو دوسری نے اسے اپاہج بنایا اگر ایک نے نفس پرستی و خود غرضی کو رواج دیا تو دوسری نے نفس مدعا اور غرض مشترک کو محو کر کے انسانی عزائم کو سرد کر دینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا۔ الغرض نوع انسانی کو نہ ان مذاہب سے کوئی فائدہ پہنچا جو یکسر عمل ہونے کے مدعی ہیں اور نہ ان مذاہب سے جو صرف عقائد پیش کرنا منتہائے نظر سمجھتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا سبب مسئلہ "روحانیت یا مابعد الطبعیات" ہے جس نے انسان کی دنیاوی زندگی کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور حقیقی زندگی کو اس عالم سے متعلق ہی نہ سمجھا، اگر یہاں کی زندگی کو اہمیت دی جاتی تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ بھی کی جاتی لیکن بلا استثناء تمام مذاہب نے مادی حیات کی تخفیف کی اور اس کو نا قابل اعتناء سمجھا، اس لئے اصولاً کوئی مذہب دنیاوی لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور انسان کے نفسیاتی میلان نے جو ہنگامہ یہاں برپا کر رکھا ہے اس کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

یہی تلخ تجربہ تھا جس نے دنیا میں مادہ پرست جماعت پیدا کر دی اور دنیا کو دنیا کے اصول سے سمجھنے اور کاربند ہونے پر مجبور کر دیا۔

پھر ہر چند ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادئین نے جو کچھ سمجھا وہ بالکل درست ہے یا ان کے مقرر کئے ہوئے اصول دنیا کے امن و نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصود بالکل بر محل ہے اور "قضیۂ زمین بر سر زمین" کے اصول پر کاربند ہوتے ہوئے وہ انسانی دماغ کی بہت سی تشویشوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے نہ ایسے خدا کا سوال ہے جس نے قادر مطلق اور فعّالٌ لِما یرید ہونے کی حیثیت سے انسان کو دنیا میں عضو بے کار بنا رکھا ہے اور نہ وہ اپنا وقت اس بات پر غور کرنے میں ضائع کرتے ہیں کے دنیا کیوں پیدا کی گئی۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کے دنیا پیدا ہو چکی ہے اور اس میں ہم کو زندگی بسر کرنا ہے اس کے بعد کچھ نہیں ہے اس لئے ہم کو ہر ممکن کوشش کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور ترقی کی جتنی راہیں ہیں ان پر چل کر دنیا کو اپنے لئے جنت بنا لینا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مادی تحریک اخلاق کی ضامن نہیں ہے اور اس سے خود غرضی کا جذبہ قوی ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو ہلاک کرنا مستبعد نہیں لیکن اگر صرف اس دلیل پر اس تحریک کو رد کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کی حمایت کی جائے جب کہ اس نے بھی یہی کیا اور اس کے ہاتھ بھی ہمیشہ خون سے رنگین نظر آئے فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ ایک نے خدا کا نام لے کر تلوار اٹھائی اور دوسرا خدا کو بدنام نہیں کرتا اور اپنی ہی اغراض کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

علاوہ اس کے ایک مسئلہ اور اس جگہ قابل غور ہے وہ یہ کہ مادئین کا مذہب ہنوز ارتقاء کی حالت میں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ آئندہ کوئی صورت ایسی پیش آئے کہ انسان خون ریزی سے باز رہنے پر مجبور ہو جائے---- یہ حالت موجودہ نظامِ تمدن نے جو ہمیشہ مادی ترقی پر قائم ہے وسیع ہو کر ایسی عجیب و غریب صورت اختیار کر لی ہے کہ آہستہ آہستہ تمام قومیں، تمام جماعتیں، بلکہ جملہ افراد ایک دوسرے وابستہ ہوتے جاتے ہیں یعنی اغراض کی تکمیل روز بروز باہمی تعاون پر منحصر ہوتی جا رہی ہے پھر کیا یہ امر خلافِ عقل ہے کہ ایک ایسا وقت آئے جب باہمی تصادم کی تمام صورتیں مسدود ہو جائیں اور تمام نوع انسانی ایک نظام سے وابستہ ہو کر ایک جماعت ایک سوسائٹی بن جائیں اور باہمی جنگ، خون ریزی کا امکان باقی نہ رہے۔

اس وقت جس چیز نے دنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی جنگ ہے، یعنی دنیا اب اس کو برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان انسان میں تفریق صرف اس بنیاد پر قائم ہو کہ ایک کے پاس دولت کا انبار ہے اور دوسرا اس سے محروم ہے، دولت انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ایک مفروضہ قوت ہے جس سے اس وقت تک کام لیا جا سکتا ہے جب تک سب یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں لیکن اگر یہ مساوات مفقود ہو جائے اور دولت انسانیت کو پامال کرنے میں صرف ہونے لگے تو اس کو مٹ جانا چاہئے چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت یورپ کا ہر ملک اس جذبہ سے متاثر ہو رہا ہے اور تمام وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ نظام پہ قائم تھیں ایک ایک کر کے اشتراکی اصول پر کاربند ہونے کے لئے مجبور ہو رہی ہیں پھر اگر ساری دنیا میں اشتراکیت پھیل جائے اور دولت مندی و افلاس کا مفہوم ہی بالکل بدل جائے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ایک انسان دوسرے انسان سے اور ایک جماعت دوسری جماعت سے برسرِ پیکار ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ کیوں کہ سارا اختلاف تو اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ فلاں سرمایہ دار ہے اور فلاں تہی دست، لیکن یہ اختلاف مٹ کر تمام انسان ایک سطح پر آجائیں تو مخالفت کی کوئی وجہ نہیں رہتی اور اس امن و سکون کو حاصل کر

سکتی ہے جسے مذاہبِ عالم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکے۔

اس لئے بہ حالاتِ موجودہ ہمارا یہ سوچنا کہ خدا نے کائنات کو کیوں پیدا کیا؟ حد درجہ تضییعِ اوقات ہے، سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب ہم اس دنیا میں آ گئے ہیں تو ہم کو زندگی کیوں کر بسر کرنا چاہیئے اور اپنا وقت کس طرح صرف کرنا چاہیئے۔

خدا کی حقیقت کیا ہے؟ دنیا سے اس کا تعلق کیا ہے، اس تعلق کی بنا پر ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں، یہ سب ایسے دوراز کار سوالات ہیں کہ نہ اس وقت تک ان کا کوئی شافی جواب دیا جا چکا ہے اور نہ آئندہ ممکن ہے۔ انسان واقعات و حوادث کا بندہ ہے۔ اسباب و علل کی دنیا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، اس لئے اسے انہی باتوں پر غور کرنا چاہیئے جس سے اس کی زندگی متعلق ہے---- اگر خدا دنیا میں آ کر ہمارے کاموں میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتا تو ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کے متعلق گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع کرتے رہیں۔ اگر اس نے ''کُن'' کہہ کر دفعتاً عالم کو پیدا کر دیا تو کیا؟ تاریخی ارتقاء کے ساتھ عالم کو سنوارا تو کیا؟ اور تدریجی ارتقاء کے ساتھ عالم کو سنوارا تو کیا؟ -------- انسانی درد و دکھ کا علاج ان میں سے کسی اعتقاد سے متعلق نہیں --- پھانس اگر چبھی ہے تو اس کی تکلیف نکالنے ہی سے دور ہو سکتی ہے نہ کہ اس بات پر غور کرنے سے کہ پھانس کی حقیقت کیا ہے اور کیوں کر گوشت کے اندر پہنچ گئی۔

گھر میں جس وقت آگ لگتی ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے سے پہلے اس کے بجھانے کی فکر ہوتی ہے اس لئے وہ لوگ جو حقیقی معنی میں نوع انسانی کے خیر خواہ ہیں ان کو نہ خدا کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ سوچنے کی کہ اس نے دنیا کو کیوں پیدا کیا بلکہ صرف ان تدابیر پر غور کرنے کی کہ تمام انسان باہم مل کر صلح و آشتی کی زندگی کیوں کر بسر کرتے ہیں۔

مذاہب تو اس تجربہ میں ناکام رہے اس لئے لا محالہ ہمیں ان سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ خواہ وہ اشتراکیت ہو یا کچھ اور --- پھر اب دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ زمانہ کا رخ کیا ہے۔ سیلاب کا بہاؤ کس طرف ہے اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا تو بے شک ہم کو نجات حاصل ہو سکتی ہے ورنہ خس و خاشاک کی طرح بہہ جانا یقینی ہے اور مذاہب کا تنکا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں کا یومُ النبی

مسلمانوں میں ۱۲ ربیع الاول کو (حالاں کہ ولادتِ نبوی کی صحیح تاریخ ۹ ربیع الاول ہے) وہی اہمیت حاصل ہے جو ہندوں کے یہاں جنم اشٹمی کو۔ یعنی جس طرح ان کے یہاں کرشن جی کی ولادت پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی جماعت ولادتِ نبوی پر جذبات مسرت ظاہر کرتی ہے۔

لیکن ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ جنم اشٹمی کے منائے جانے پر ہندوں کے اکابر کی طرف سے نہ کوئی تحریک کی جاتی ہے۔ نہ اخباروں میں نشر و اعلان ہوتا ہے اور یوم النبی کے لئے علماء اسلام کو کافی پروپگنڈا کرنا پڑتا ہے تا کہ مسلمان اس تقریب کی پذیرائی میں زیادہ جوش و ولولہ سے کام لیں۔

یوم النبی کی تحریک مسلمانوں میں کوئی قدیم تحریک نہیں کیوں کہ اس کا پتہ قرون اولیٰ میں کہیں نہیں چلتا۔ خاص کر لفظ ''یوم النبی'' تو بالکل مغربی تتبع میں اختیار کیا گیا ہے جو ترجمہ ہے Prophet Day کا ورنہ اب سے کچھ زمانہ قبل اس کو ''ذکرِ میلاد''، ''میلادُ النبی'' اور عوام میں ''مولود شریف'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا

لیکن یہ تحریک قدیم ہو یا جدید، اس کا نام ''یوم النبی'' قرار دیا جائے یا کچھ اور، اس کے مفید ہونے سے بہر حال انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی اس سے ہماری عملی زندگی میں کوئی تغیّر پیدا ہو۔ لیکن سوال یہی ہے کہ کیا کبھی اس سے کوئی فائدہ اس قسم کا مرتب ہوا ہے اور کیا آئندہ کوئی توقع اس کی کی جاتی ہے۔ مجھے اس باب میں سخت مایوسی ہے اور میرا یقین ہے کہ اگر مسلمان بجائے سالانہ احتفال و اجتماع کے ہر مہینے اور ہر ہفتہ یوم النبی منائیں تو بھی کوئی فائدہ ان کو نہیں پہنچ سکتا اور جس اسلوب سے اس تقریب میں اظہار جذبات کیا جاتا ہے وہ بجائے مفید ہونے کے اور نقصان رساں ہے

کسی مذہب میں تہواروں یا خاص تقریبوں کا پیدا ہو جانا حقیقتاً اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دورِ انحطاط سے گزر رہا ہے اور اب اس کے پاس سرمایۂ عمل یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف یا اپنی گزشتہ تاریخِ عروج کے بعض واقعات کبھی کبھی یاد کر لیا کرے۔ آپ

کسی مذہب و قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ابتدائی زمانۂ عروج میں نہ کوئی خاص تہوار تھا اور نہ کسی واقعہ کی یاد میں کوئی تقریب منائی جاتی تھی، لیکن جوں جوں اس میں انحطاط پیدا ہوا اس قسم کے مراسم بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ مجموعی روایات سے زیادہ کوئی چیز نہ رہ گیا اور صرف انہی روایات کا زبانی تحفظ اصل مذہب قرار پایا۔ جب کوئی قوم اول اول کسی مقصد کو لے کر پورے جوش کے ساتھ اٹھتی ہے تو اس کے سامنے سوا اقدام و عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن جب وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کی فتوحات انتہا کو پہنچ گئیں یا یہ کہ منزل مقصود اس کو حاصل ہوگئی تو اس کے قواء میں اضمحلال، عزائم میں کمزوری اور عملی زندگی میں ضعف پیدا ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ چند دن تک وہ اسی سطح پر قائم رہنے کے بعد پھر نیچے کی طرف گرنے لگتی ہے اور تن آسانیوں کی عادت اسے محسوس نہیں ہونے دیتی کہ وہ کس طرح تیزی سے مائل بہ انحطاط ہے۔ کہا جاتا ہے دنیا میں ہر کمال کے لئے زوال ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جس حالت کو کمال سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً کمال ہے بھی یا نہیں۔ دنیا میں ترقی و عروج کی انتہا نہیں، تکمیل و ترقی کی راہیں غیر محدود ہیں۔ اس لئے کمال کی تعیین محال ہے اور زوال، کمال کے لئے لازم نہیں ہے بل کہ وہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے کمال حاصل کر لیا یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انحطاط نام ہے تعیینِ منزل کا، -------- اور اس منزل تک پہنچ کر یہ سمجھنے کا کہ اب آگے ہم کو بڑھنا نہیں لیکن اگر کوئی مقصود متعین نہ کیا جائے یا یہ کہ ہر مدعا کی تکمیل کے بعد دوسرا مدعا پیش نظر رکھا جائے تو کبھی زوال ہو ہی نہیں سکتا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں خیر عہدِ رسالت کو تو چھوڑیئے کہ وہ تو بالکل ابتدا کی بات تھی اور اصولاً اس وقت نہ تعیینِ منزل کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا، نہ تکمیلِ مدعا کا۔ لیکن اس کے بعد جب فتوحات وسیع ہوئیں سلطنت کی حدود میں وسعت پیدا ہوئی تو کیا ہوا؟ عہد عباسیہ کو عربوں کی فتوحات کا دور زرین کہا جاتا ہے لیکن کیا اس دور زرین کی معنیٰ یہ تھے کہ جو کچھ ان کو کرنا تھا کر چکے اور کیا اس احساس میں ان کا زوال پنہاں نہ تھا۔

اس طرح ترکوں کے لیجئے کہ ان کا انتہائی نقطہ نظر قسطنطنیہ فتح کر لینا تھا اور جب محمد خان ثانی اس میں کامیاب ہو گیا تو ان کی فتوحات کا بڑھتا ہوا سیلاب اُسی جگہ رک گیا اور اُسی دن سے ان کا زوال شروع ہو گیا ورنہ اگر وہ کسی منزل کی تعیین نہ کرتے اور اپنے اقدامات کو برابر اسی طرح جاری رکھتے تو آج سارا یورپ مسلمان ہوتا اور سرزمین مغرب

کا کوئی حصہ ایسا نہ رہ جاتا جہاں ہلالی پرچم نہ لہراتا۔ الغرض قومیں جب آگے بڑھتے بڑھتے ایک جگہ ٹھہر جاتیں ہیں اس وقت سے ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ انحطاط کے اس دور میں پہنچ جاتی ہیں کہ خود ان میں کوئی قوتِ عمل باقی نہیں رہ جاتی اور نکبت و ذلت کا احساس شروع ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو فخریہ بیان کرنے لگتے ہیں اور اسی کو ذریعہ ترقی سمجھتے ہیں۔

یہ ہے حقیقت قوموں کے تہواروں اور تقریبوں کی اور یہ ہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت مسلمانوں میں بھی بہ سلسلہ "یوم النبی" اظہار مسرت کیا جاتا ہے اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ کی ذات گرامی جن صفات کی حامل تھی وہ کبھی فراموش کئے جانے کے قابل نہیں یہاں تک کہ اگر آج تمام مسلمان دنیا سے محو ہو جائیں تو بھی ان کا ذکر کیا جائے گا اور تاریخ کے صفحات ان کے ذکر سے لبریز نظر آئیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ جن اصولوں اور انداز پر ان کے یوم ولادت کی یاد ہر سال تازہ کی جاتی ہے وہ واقعی ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں اور اس وقت تک مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ پہنچا ہے۔

یہ تقریب آج نہیں بلکہ صدہا سال قبل اس وقت سے منائی جا رہی ہے جب مسلمانوں کی حکومت تھی لیکن کیا ذکر "میلا د النبی" کے جلسے اس قوم کو انحطاط سے روک سکے اور اب جب کہ زوال کی انتہا ہو چکی ہے کیا پھر اسے اُبھارنے کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

تمام عالمِ اسلامی کے علماء کرام کی طرف سے اعلان شائع ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو "یوم النبی" حد درجہ جوش و اہتمام سے منانا چاہئے چناں چہ اس ارشاد کی تعمیل میں اونچے اونچے دروازے نصب کئے جاتے ہیں، رنگین جھنڈوں سے در و دیوار کی آرائش ہوتی ہے تجلی کے قمقمے لٹکائے جاتے ہیں شیرینی کا انتظام کیا ہوتا ہے نوجوانوں کے گروہ ہاتھوں میں جھنڈیاں لئے، سینے پر ریشمی کپڑوں کے بیج لگائے اللہ اکبر کے پرزور نعرے مارتے ہوئے نکلتے ہیں اور رات کو جب واعظ اپنا وعظ ختم کر چکتا ہے تو شیرینی لے لے کر لوگ اپنے گھر واپس آتے ہیں اس حال میں کہ رات بھر وہ اس جنت کا خواب دیکھتے رہتے ہیں جس کا ذکر واعظ نے کیا تھا اور صبح کو جب بیدار ہوتے ہیں تو کاہلی و بے کاری کا وہ ہی جمود ان پر طاری ہوتا ہے جو اس سے قبل طاری تھا اور کسی قسم کا کوئی اضافہ اپنی ہمت و جرأت میں نہیں پاتے۔

اسلاف پرستی یقیناً اچھی چیز ہے اور قوموں کو ابھارنے کے لئے یہ ذریعہ بلاشک کارآمد ثابت ہو سکتا ہے، لیکن اسلاف پرستی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے وہ بالکل غلط

ہے۔ میں پوچھتا ہوں کے کیا سکندر کے مرنے کے بعد محض اس کی یاد سلطنت رومہ کو تباہی سے بچا سکی؟ کیا سلطان محمد ثانی اور سلیمان اعظم کے کارناموں کا ذکر سلطنت ترکی کو زوال سے بچا سکا؟ کیا عبدالرحمان کی جرأت وہمت کی داستانیں ہسپانیہ میں مسلمانوں کی حکومت کو زوال سے روک سکیں۔

اکاسرۂ عجم کی شوکت وجبروت کا ذکر ہر ایرانی کے لب پر تھا لیکن ایران تباہ ہو کر رہا، رام وکرشن کے ولولہ وعزم کی کہانیاں ہمیشہ سے ہندوؤں کو یاد تھیں لیکن مسلمانوں نے ان کو مغلوب کر کے چھوڑا۔ سطوتِ مغلیہ کے آوازہ سے فضا گونج ہی رہی تھی کہ انگریزوں نے آکر ان کا تختہ الٹ دیا، پھر یاد رکھو کہ تم ہر سال کیا معنی اگر ہر مہینے "یوم النبی" مناکر رسول اللہ کی ولادت پر اظہارِ مسرت کرتے رہوگے تو بھی مٹنے سے نہیں بچ سکتے کیوں کہ قوموں کے عروج وزوال کا ہمیشہ ایک فلسفہ رہا ہے اور جب تک کہ کوئی نپولین وہنی بال پیدا نہ ہو جائے محض ان کی یاد کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔ پھر یہ وقت رستم و سہراب کی داستانیں دہرانے کا نہیں بلکہ رضا شاہ کے پیدا کرنے کا ہے۔ باب عالی کی گزشتہ سطوت وجبروت بیان کرنے کا نہیں بلکہ مصطفیٰ کمال کے وجود میں لانے کا ہے اور اگر ہندوستان کے مسلمان میں بھی روح پھونکنے کی ضرورت ہے تو اس لئے کسی نہ کسی خالد وعمر، حسین وعلی کا ظہور میں آنا ضروری ہے اور یہ نہ کسی احتفالِ اجتماع سے پیدا ہو سکتی ہیں نہ وعظ وتبلیغ سے بلکہ اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے سے آگ کے اندر کُود جانے سے اور ہتھیلی پر سر لے کر باہر نکل آنے سے۔

رسول کی ولادت وسیرت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس رسول کا جس کی زندگی یکسر عمل، سراپا ایثار وقربانی تھی، اس ہستی کا جس میں سوائے صداقت وخلوص کے نمود ونمائش کا کہیں پتہ نہ تھا اس ذات گرامی کا جو صرف ہم دردی ومحبت کے لئے وضع ہوئی تھی لیکن حال یہ ہے کہ سوا قول کے عمل کا کہیں نام نہیں، بجز نمود ونمایش کے صداقت کا کوسوں پتا نہیں، سوائے خود غرضی وطمع نفس کے، ایثار وقربانی سے کوئی واسطہ نہیں پھر خدارا کوئی بتائے کہ یہ کیا تماشہ ہے، یہ کس قسم کی یادگار ہے یہ کس انداز کا اجتماع ہے اور ہمارے قائدین عظام اس سے کس فائدہ کی توقع رکھتے ہیں؟

اگر اسوۂ رسول کی عظمت کو ہم صرف رنگین جھنڈیوں سے ظاہر کر سکتے ہیں، اگر اس کی پاکیزہ سیرت کے اظہار میں صرف بجلی کے قمقموں کا روشن کرنا کافی ہے اگر اس کی

مقدس تعلیم کا نشر و اعلان محض شیرینی تقسیم کرنے سے پورا ہو سکتا ہے اور اگر ہم اس کے باطنی و اخلاقی علوؔ کو جھنڈیاں لے لے کر سڑکوں پر گشت لگانے سے ثابت کر سکتے ہیں اور اگر اس کی صداقتِ عمل کی تبلیغ میں ظاہری نمود و نمائش کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تو بے شک یہ سب کچھ درست ہے بل کہ اس سے بھی زیادہ لہو و لعب کا مظاہرہ نامناسب نہیں لیکن اگر خود رسول نے کبھی وہ نہیں کیا جو ہم کر رہے ہیں اور کبھی اس کی اجازت نہیں دی جو ہماری طرف سے ظاہر ہو رہا ہے تو پھر اس کو "یوم النبی" کی یادگار کہنا یقیناً رسول اللہ کی توہین ہے، اسلام کی تذلیل ہے، اور مسلمانوں کے اندر اِک ایسے جذبہ کی پرورش کرنا ہے جو بت پرستی کی طرف تو منجر ہو سکتا ہے لیکن خدا پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں۔

یہ تو ہوئی عملی پہلو کی کمزوری یا اس کا فقدان جو یوم النبی کے سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے، اب رہ گئی تاریخی یا مذہبی حیثیت جس کو سامنے رکھ کر ہمارے علمائے کرام ذکرِ میلاد فرماتے ہیں، سو اس کا حال اس سے بھی بدتر ہے، کیوں کہ ان کا مقصود رسول اللہ کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کرنا کبھی نہیں ہوتا بل کہ ایک مافوق الفطرت ہستی کی ضرورت سے پیش کرنا ہوتا ہے، وہ ابھی پیدا نہیں ہوئے کہ ان کا نور لاکھوں سال قبل خدا جانے کہاں کہاں چکر کھاتا پھرتا ہے، وہ جس وقت پیدا ہوتے ہیں تو اکاسرہ کے محل اور صنم کدوں کے بت سرنگوں ہو جاتے ہیں، وہ ابھی عالمِ طفلی میں ہوتے ہیں کہ فرشتہ ان کا سینہ چاک کرکے آلائش سے پاک کر دیتا ہے، وہ دعوائے نبوت کرتے ہیں تو سنگ ریزے اس کی شہادت دیتے ہیں، جب آپ چلتے ہیں تو جسم کا سایہ نظر نہیں آتا اور کبھی جوشِ نبوت میں انگلی کا اشارہ کر دیتے ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

پھر میں حیران ہوں کہ جب ذکر میلاد کے سلسلہ میں قولاً و عملاً کوئی بات بھی کام کی نہیں ہوتی تو کیوں اس پر ہزاروں روپیہ ضائع کیا جاتا ہے اور کیوں اس طرح کے ظاہری مراسم و شعائر کی طرف متوجہ کرکے ان کے قوائے عمل کو اور ضعیف بنایا جاتا ہے۔ اس وقت سب سے ضروری امر جس کی طرف اکابرِ اسلام کو توجہ کرنا ہے وہ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری ہے جو نہ نمازیں پڑھنے سے دور ہو سکتی ہے نہ یوم النبی منانے سے بل کہ صرف ایک ایسی تنظیم سے جو اُن کی معاشرت و معیشت کو اجتماعی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لے اور نہایت آسانی سے ممکن ہے اگر ہمارے یہاں کے علماء و اکابر طرف زکٰوۃ کے مسئلہ پہ توجہ کرکے ایک قومی بیت المال قائم کر سکیں، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان کی تن

آسانیاں اور خود غرضیاں کبھی اس کی اجازت نہ دیں گی اور وہ "یوم النبی" کی تقریب میں مقالاً مزخرافات کا ایک طومار اور عملاً لہو ولعب کا دلچسپ پروگرام ضرور پیش کر سکیں گے لیکن کام کی کوئی بات کبھی نہ کریں گے۔

اس وقت مسلمانوں کی کروڑوں آبادی میں سے اگر ایک کروڑ مسلمان بھی اوسطاً ایک روپیہ سالانہ دینے والے مل جائیں اور یہ رقم ایک جگہ جمع ہو کر قومی اداروں میں صرف ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ربع صدی کے اندر کتنا عظیم انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور فقر وفاقہ وبے کاری جس میں مسلمانوں کی اکثر تعداد مبتلا نظر آتی ہے، کتنی آسانی سے دور ہو سکتی ہے۔

یوم النبی کی تقریب ہندوستان کے ہر گاؤں، ہر قصبہ اور شہر کے ہر محلہ میں منائی جاتی ہے اور اس لئے اس سے بہتر کوئی موقعہ عام تنظیم کے لئے نہیں ہو سکتا۔ ہر محلہ میں ایک ایک کمیٹی چند آدمیوں کی بنادی جائے جو ماہوار وصولِ زکوٰۃ کے ذمہ دار ہوں اور ان کمیٹیوں کا تعلق شہر کی صدر کمیٹی سے ہو۔ اسی طرح شہر کی کمیٹیاں صوبہ کی مرکزی کمیٹی سے متعلق ہوں اور صوبائی کمیٹیاں بیت المال عمومی سے وابستہ ہوں جو سارے ملک کا ایک ہو۔

اس کا سالانہ جلسہ ہر جگہ یوم النبی کی تقریب میں منعقد کیا جائے اور رپورٹ پیش کی جائے کہ سب کمیٹیوں نے سال بھر میں کیا کام کیا اور یہ تمام رپورٹیں بیت المال عمومی کے صدر کے پاس جائیں گی جو ایک بورڈ کے مشورہ سے ہدایات جاری کرے گا، ہر محلہ کے مستحقینِ امداد کی فہرست باقاعدہ مرتب کی جائے اور ایک خاص حد تک شہر کی کمیٹی کو خرچ وامداد کے اخراجات دیئے جائیں۔

الغرض یہ اور اسی طرح کی بہت سی صورتیں اس سلسلہ میں ایسی پیدا ہو سکتی ہیں جو مسلمانوں کے بہت سے نادار طلبہ کو تعلیم دلانے میں مدد دے سکتی ہیں اور خدا جانے کتنے صنعتی مدارس اور تجارتی ادارے قائم کرکے لاکھوں بے کار مسلمانوں کو کام میں لگایا جا سکتا ہے مگر ہمارے اکابر کو کیا غرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور ہمارے علمائے کرام کو کیا پڑی ہے کہ وہ یہ دردِ سر مول لیں۔

عالم گیر مذہب

تاریخ تمدّنِ انسانی پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طلوعِ آفتاب کے ساتھ انسان کا قدم ترقی کی طرف اٹھ رہا ہے اور عقائدِ مذہبی کی گرفت ڈھیلی ہوتی جارہی ہے۔ اس لئے یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب ترقی کے منافی ہے، کیا اس کے اصول انسان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور کیا مذہبی تعلیم دماغی نشو نما اور ذہنی ارتقاءء کا ساتھ دینے سے عاری ہے؟

اس کا جواب ڈھونڈنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں مذاہبِ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یقیناً مذہب، انسان کی ترقی میں حائل ہے اور اسے حائل ہونا چاہئے تھا کیوں کہ مذاہبِ عالم کی پیداوار نتیجہ تھی صرف مقامی اور نسلی اقتضاء کا اور اس کے ذہن میں تمام نوعِ انسانی کی فلاح و ترقی کا سوال آ ہی نہ سکتا تھا اگر کوئی مذہب ایشیا کے مغرب میں پیدا ہوا تو اسے مشرق کے باشندوں کا حال معلوم نہ تھا اور اگر مشرق میں اس کا نشوو نما ہوا تو وہ اہلِ مغرب کے لئے خالی الذہن تھا صرف ایک مخصوص جماعت ایک محدود ملک کی اصلاح کا مقصد ان کے سامنے تھا اور اس لئے قدرتاً وہ ایسے اصول بنا ہی نہ سکتے تھے جو کرۂ ارض کے تمام باشندوں کے لئے ان کے ماحول ان کی معاشرت اور ان کی طبعیت و مزاج کے لحاظ سے مناسب و ضروری ہوں۔ میری مراد مذہب سے یہاں صرف وہ چند معتقدات ہیں جن کا تعلق نہ صرف خدا کی ہستی یا مابعد الطبیعات سے ہے بلکہ اس شریعت یا اصولِ اخلاق و معاشرت سے بھی ہے جو ایک مذہب کے تحت کسی قوم میں رائج ہو جاتے ہیں اور جن کا اختلاف اصولی اختلاف قرار دیا جا کر باہم دگر کشت وخون کا باعث ہوا کرتا ہے۔

دنیا میں سب سے آخری قابل ذکر مذہب اسلام ہوا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مذاہب کی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ اپنے معتقدات دینے کے لحاظ سے وہ سب کے لئے قابل قبول ہے اور نہ شریعت کے اعتبار سے اُسے مکمل کہا جا سکتا ہے

اس میں شک نہیں کے دنیا میں جتنے بھی انبیاء ظاہر ہوئے ان سب نے یہ ہی کہا کہ وہ نوعِ

انسانی کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے ہیں لیکن عملاً وہ اس سے زیادہ کامیاب نہ ہوئے کہ ایک محدود جماعت و مخصوص ملک میں کچھ زمانہ تک تو بیداری ضرور پیدا ہوئی لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ فنا بھی ہوگئی۔ اس کا سبب صرف یہ ہی تھا کہ زمانہ کی ترقی کا ساتھ کوئی مذہب نہ دے سکا اور انسان کے ذہن و عقل میں جو نشو و نما پیدا ہو رہا ہے اس کے اقتضاء کو وہ پورا نہ کر سکا۔

مذہب نام نہ صرف خالص اصلاح اخلاق کا ہے اور نہ ترقی تمدّن و معاشرت کا، بل کہ اس میں وہ اعتقادات بھی شامل ہیں جو خدا کی ہستی، اس کی عبادت اور حیات بعد الموت سے متعلق ہیں اور اس لئے ایک مذہب صرف ہمارے اصولِ معاشرت و اخلاق، منضبط کرنے کا مدعی نہیں ہے بل کہ وہ انسان کو اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ خدا اور اس کی ہستی کی نسبت بعض متعین و مخصوص عقائد کو تسلیم کرے یعنی وہ عقل انسانی پر بھی حکمرانی کرنے کا دعوے دار ہے در آں حالِ کہ عقولِ انسانی میں جو تدریجی ارتقاء پید ہو رہا ہے اس کا ساتھ دینے کی اہلیت اس میں نہیں ہے اور غالباً یہی وہ کمی ہے جس کو یوں کہہ کر پورا کیا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

ایک طرف ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے یعنی عقلِ انسانی خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے مذہب کے اصول و عقاید متزلزل نہیں ہوسکتے اور دوسری طرف یہ تاکید بھی ہے کہ مذہب نام ہے بغیر استعمالِ عقل کے ان باتوں کو بے چوں وچرا تسلیم کر لینے کا جن کو ہمارے اکابر و اسلاف تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور ان دونوں میں جو تضاد و تباین پایا جاتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کے مذہب بالکل مقامی و تمدنی چیز ہے یعنی ایک مخصوص قوم و ملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر وضع کیا جاتا ہے اور اس کا قوی ترین ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں ہر مذہب سوا اپنے دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے متبعین میں دوسری اقوام یا دیگر مذہب والوں سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں عالم کا امن و سکون اس سے کسی طرح وابستہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس وہ باہمی اختلافات و تصادم پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

ہر چند مذہب کی اس حقیقت کا انکشاف کوئی جدید انکشاف نہیں ہے اس سے قبل بھی اس تلخی کا علم لوگوں کو تھا لیکن چوں کہ ترقیٔ تمدن اس حد تک نہ ہوئی تھی کہ تمام کرۂ ارض کے امن وسکون اور جملہ نوعِ انسانی کی مرکزیت کی طرف خیال منجر ہوتا ہے اس لئے چنداں پرواہ بھی نا کی جاتی تھی۔ لیکن اب کہ علمی اکتشافات و ذرائع نقل و حمل اور تجارتی و

اقتصادی وسعت نے دنیا کے ہر ملک کو دوسرے ملک کا محتاج بنادیا ہے، سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ دنیا کا امن وسکون کیوں کر قائم رکھا جائے اور باہمی جذباتِ مخالفت ومنافرت کو دور کر کے کسی طرح تمام نوعِ انسانی کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر دیا جائے۔

یقیناً مذہب اس مقصد کو پورا کر سکتا تھا اگر اس کے عقائد و قانون میں اتنی لچک ہوتی کہ وہ ذہنِ انسانی کی ترقی کا ساتھ دے سکتا لیکن چوں کہ مذہب نام ہے صرف قدامت پرستی کا اور انہی اصول پر کاربند ہونے کا جو صدیوں اور ہزاروں سال قبل وضع کئے گئے تھے اس لئے وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہو سکتا اور ایک مذہب پر کیا موقوف ہے اس وقت کوئی نظامِ عمل جو ذہنِ انسانی کی تشویش کو دور کرنے اور دنیا میں عام امن وسکون پیدا کرنے کے ناقابل ہے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب اسی کے ساتھ ایک سوال اور بھی غور طلب ہے، یعنی یہ کہ اگر آج دنیا سے مذہبیت یکسر فنا ہو جائے اور مذہبی عصبیت بالکل محو کر دی جائے تو کیا مدعا حاصل ہو جائے گا اور کیا کرۂ ارض کے تمام باشندے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بن کر رہنے لگیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً مدعا اس وقت بھی حاصل نہ ہو گا کیوں کہ مذہبیت کے علاوہ دو (۲) بلائیں اور نوعِ انسانی پر نازل ہوئی ہیں۔ ایک امتیازِ رنگ و نسل کی اور دوسری جذبۂ سرمایہ داری کی یعنی جس طرح مذہب لوگوں میں جذبۂ منافرت کی پرورش کر رہا ہے بالکل اسی طرح گورے کالے کے امتیاز اور فراہمیٔ دولت کی حرص نے انسانیت کو پامال کر رکھا ہے چناں چہ امریکہ میں جو سلوک حبشیوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اور سرمایہ داروں کی طرف سے مزدوروں کی محنت و عرق ریزی کا جو صلہ ملتا ہے وہ بھی دنیا کو معلوم ہے۔ وہ اہلِ نظر جن کی نگاہ ان تمام مسائل پر ہے ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ رنگ و نسل کا امتیاز بھی مذہب ہی نے پیدا کیا ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت بھی نتیجہ ہے مذہبیت کا جس نے اخلاق کی آڑ میں سلطنت و حکومت کی بنیادیں قائم کیں۔ اس لئے مذہبیت کے ساتھ ان کو بھی ختم ہو جانا ہے، مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں اور ان کو جداگانہ امراض تصور کرتا ہوں جن کا علاج بھی بالکل جداگانہ ہونا چاہئے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جب تک کلیۃً تمام امراض کے دور کرنے کی صورتیں پیدا نہ ہو جائیں، کسی ایک مرض کا بھی مداوا نہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کا اندفاع دوسری بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت ہم میں پیدا کر دے اور اس لئے اگر دنیا سب سے پہلے مذہبیت ہی کو دور کرنا چاہتی ہے تو بے جا نہیں جب کہ حقیقتاً سب سے زیادہ سخت و سنگین مرض یہی ہے۔

اس کے متعلق دنیا میں فی الحال دو (۲) قسم کے خیال رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو موجودہ مذاہب میں اصلاح کر کے کسی ایک عالم گیر مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو سرے سے مذہب کے خیال ہی کو محو کر دینا پسند کرتے ہیں۔

ان میں اول الذکر صورت یقیناً بہتر ہے لیکن تقریباًنا ممکن العمل، دوسری صورت البتہ زیادہ آسان ہے اور لوگوں کے موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ چند ہی صدی کے بعد مذہب تو یقیناً ختم ہی ہو جائے گا، گو سرمایہ و عمل کی جنگ اور رنگ و نسل کا امتیاز علیٰ حالہ قائم رہے۔

پھر جب آثار یہ ہیں اور حالات کی نزاکت اس حد تک پہنچ گئی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان جو اختلافِ مذہب کے لحاظ سے دنیا کا حد درجہ بدنصیب ملک ہے کیا کرنا چاہتا ہے اور اس کے اندر بسنے والوں نے اپنے وطن کو غلامی و ذلت، پستی و نکبت سے نکالنے کی کیا تدبیریں سوچی ہیں؟ اس سے یقیناً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ملک کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا حق جو اس کے فرزندوں پر عائد ہوتا ہے، یہ ہے کہ وہ اس کو کسی اور کی غلامی میں نہ دے دیں، یعنی ایک ملک و قوم کا تنہا فخر و امتیاز صرف یہ ہے کہ اس کی گردن جھکی ہوئی نہیں ہے اور اس کی دولت پر دوسروں کا قبضہ نہیں ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے تمام افراد کسی ایک غرضِ مشترک سے وابستہ ہوں، ایک مرکز پر جمع ہو کر صرف ایک ہی نصب العین کی طرف ان کے متفقہ قدم اٹھتے ہوں، پھر کس قدر بدنصیب ہے وہ ملک جس کے فرزند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، صرف اس لئے کہ ان میں ایک مسجد میں جا کر عبادت کرتا ہے اور دوسرا مندر میں، ایک کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور دوسرے کے گلے میں زنّار۔

دنیا میں اور بہت سے ملک ہیں لیکن اس باب میں ہندوستان سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں اور مذہب و مذہبیت کا استعمال جس بری طرح یہاں کے لوگوں نے کیا ہے اس کی مثال اس وقت روئے زمین کے کسی حصہ میں نہیں مل سکتی، لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرف توجہ کون کرے؟ آیا پنڈتوں اور مولویوں کی وہ جماعت جس کے وجود نے یہاں کی فضا کو اس قدر گندہ کر رکھا ہے؟ یا ہماری موجودہ نسل کے وہ نوجوان جو مغربی علوم سیکھنے کے بعد اپنے آپ کو روشن خیال اور آزاد طبع کہلانا پسند کرتے ہیں؟

اصلاح، خواص سے شروع ہوتی ہے یا عوام سے؟ یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ جب تک عوام میں بیداری پیدا نہ ہو اور پبلک کی اصلاح نہ ہو ہیئت اجتماعی کی تشکیل دشوار ہے۔ پھر غور کیجئے کہ عوام کا کیا حال ہے اور ان پر کس کا اثر غالب ہے اگر

ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے طلبہ جدید تہذیب وترقی کے تمام نظریوں سے آراستہ ہوکر اصلاح ملک کے لئے آمادہ ہوجائیں تو بھی مولوی کے اس ایک افسوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو وہ ملک کی جاہل آبادی پر کسی واقعۂ معجزہ وکرامت کی صورت میں پڑھ کر پھونک دے گا۔ عوام کی اس کورانہ ذہنیت کا بدل دینا جو صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آرہی ہے آسان کام نہیں۔ اس کے لئے یا تو اپنی حکومت ہونی چاہئے جو بزور شمشیر اس تمام فاسد مواد کو دور کردے جیسا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال، یا ایران میں رضا شاہ پہلوی نے کیا۔ یا پھر تعلیم اتنی عام اور صحیح ہونی چاہئے کہ پبلک خود دوست دشمن میں تمیز کرسکے جو یقیناً صدیوں کا کام ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کے سلسلہ میں تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو سامنے آتے ہیں اور عام طور پر تعمیری پروگرام بنانا ہی زیادہ پسند کیا جاتا ہے حالاں کہ اصولاً سب سے پہلے تخریبی فرائض سے سبک دوش ہونا ضروری ہے۔

اگر کوئی عمارت اس حد تک شکستہ وخراب ہوجائے کہ معمولی مرمت اس کے لئے کافی نہ ہو تو اس کا گرادینا ضروری ہے اور جب تک اس کو پہلے زمین کے برابر نہ کردیا جائے اس پر دوسری عمارت قائم نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کی تنظیمی حالت کا بھی بالکل یہی حال ہے کہ اس کی اصلاح کے لئے فی الحال تعمیری پروگرام پیش کرنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا جب تک پہلے اس سبب کو نہ محو کردیا جائے جس نے اس کی بنیاد کو متزلزل کررکھا ہے اور یہ سب مذہبیت کا وہ غلط مفہوم ہے جسے مولویوں اور پنڈتوں نے پیدا کیا اور جو ان کے فنا ہونے کے بعد ہی دور ہوسکتا ہے۔

دنیا میں جسمانی غلامی کو بہت برا سمجھا جاتا ہے درآں حالِ کہ جسمانی غلامی نتیجہ ہے ذہنی غلامی کا۔ اس لئے ضرورت تو سب سے پہلے ذہنی غلامی کو دور کرنے کی ہے اور غالباً اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مذہبی عصبیت سے زیادہ ذہنی غلامی پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں۔

اس وقت زمانہ میں علم وعقل کا ایک طوفان برپا ہے، مادی ترقی کا سیلاب موجیں مارتا چلا آرہا ہے اور اس لئے اب اگر کوئی بات منہ سے نکالنے کی ہے تو صرف یہ کہ "مرغابی شوکہ کار باطوفان است"

پھر اگر دنیا کا کوئی مذہب ایسا ہے جو ہماری نجات کا ذمہ دار ہوسکتا ہے تو سامنے آئے اور ہمیں اپنی دوش پر بٹھا کر ساحل تک پہنچادے ورنہ خس وخاشاک کی طرح اس کا بہہ جانا بھی یقینی ہے، خواہ آج ہو یا کل۔

حیات وماوراءِ حیات

اس دور کے علماء طبیعات میں سر آلیورلاج بڑے مرتبہ کا شخص سمجھا جاتا ہے اور اس نے حیات بعد الموت کے متعلق جو عملی تحقیقات کی ہے،وہ خواہ کتنی ہی ناقص وناتکمل کیوں نہ ہو لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ "خیال و قیاس" کا اتنا ضخیم دفتر اپنے بعد چھوڑ گیاہے کہ اس کو ٹھکرا کر آگے گزر جانا آسان نہیں۔ وہ نہ صرف اس بات کا قائل تھا کہ مرنے کے بعد روح قائم رہتی ہے،بلکہ وہ یہ بھی کہتاہے کہ روح کا تعلّق دنیا اور اہلِ دنیا سے باقی رہتاہے اور وہ اپنے تاثرات سے بھی مطلع کرتی رہتی ہے۔ چناں چہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنے مرنے والے بیٹے کی روح سے گفتگو کی۔

بہر حال،اس نے کسی روح سے واقعی گفتگو کی ہو یا خود اس کا استہواءِذاتی[10] Autosuggestion ہو۔اس کے نظریوں کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے عتقاد ویقین کی کوئی علمی توجیہ نہیں کر سکتا تھا جو انکار کی گنجائش نہ چھوڑے۔اور اس نے جو کچھ کہا اپنے ذوق و وجدان کے لحاظ سے کہا جس کا دوسرا نام(Common Sence) ہے اس لئے بحث ونقد کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ دوسرے کے ذوق کا مطالعہ اپنے ذوق کے لحاظ سے کیا جائے۔

وہ بھی دوسرے مفکرین کی طرح روح کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے کائنات کے معمّہ کو حل کرنا چاہتاہے اور جس وقت وہ اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ نوعِ انسانی نظام کائنات میں ایسے مختصر سیارہ کی رہنے والی ہے جس کو دوسرے اجرام سماوی کے مقابلہ میں کسی قسم کی کوئی اہمیت حاصل نہیں تو دفعتاً اس کا خیال کائنات کی عظمت کے ساتھ ہی ساتھ انسانی عظمت کی طرف بھی منتقل ہو تا ہے اور اس کا دل قبول

10- عمل مقناطیسی یا مسمریزم میں ایک عمل کانام Suggestion ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو قوتِ ارادی سے اس حد تک متاثر کیا جائے کہ وہ عامل ہی کی خواہش کاپابند ہو جائے۔اس کا اصطلاحی ترجمہ عربی میں عام طور پر استہواء کیا جاتا ہے جو اپنے معنٰی کے لحاظ سے پوری طرح اس لفظ کے مفہوم پر حاوی ہے Autosuggestion سے مراد خود اپنے ہی خیال سے متاثر ہو جاناہے اس لئے اس کا ترجمہ استہواءِذاتی کیا گیا۔

کرنا نہیں چاہتا کہ جس قوت نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ اسے یوں دفعتاً فنا کر دے۔

اس رنگ سے سوچنے والوں کی رفتار خیال یہ ہوتی ہے۔

(۱) انسان باوجود اس قدر ترقی کر جانے کے، ہنوز انتہائی مدارجِ ارتقاء تک نہیں پہنچا لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ یقیناً اس کو منزلِ حقیقی تک پہنچنا ہے، کیوں کہ اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو پھر غایتِ آفرینش کوئی نہ رہے گی اور یہ سب کچھ فعلِ عبث قرار پائے گا۔

(۲) اگر انسان کی دنیاوی زندگی کو دیکھا جائے تو ستر، اسّی سال سے زیادہ نہیں ہے جو دقیانوسی زمانہ کو دیکھتے ہوئے ایک قطرہ کے لاکھویں حصّہ سے بھی کم ہے۔ پھر کیا انسان کو عقل و فراست اس لئے دی گئی ہے کہ وہ چند سال تک زندہ رہ کر فنا ہو جائے اور مرنے کے بعد اس کا کوئی مستقبل متعین نہ ہو۔

(۳) زندگی آتی کہاں سے ہے؟ کسی کو معلوم نہیں، چلی جاتی ہے کہاں؟ اس کی بھی خبر نہیں، پھر کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کسی شخص کا وجود عبارت ہے صرف اس مختصر مدّت سے جو اس آنے جانے کے درمیان بسر ہوتی ہے یقیناً نہیں، بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیاوی حیات ایسا سلسلہ ہے جو دو چیزوں کو ملاتا ہے جن میں سے ایک ازل اور دوسری ابد ہے۔

(۴) عالم طبیعی کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ صرف اس کی صورتیں یا حالتیں بدلتی رہتی ہیں جن کو ہم اپنے حواس سے محسوس نہیں کر سکتے۔ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد فنا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے وجود کی حیثیت بدل جاتی ہے جنہیں حواسِ ظاہری کے علاوہ کسی اور حس سے محسوس کیا جا سکتا ہے اور جب تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مرنے کے بعد انسانی روح سے مخاطبت ممکن ہے تو پھر یہ مسئلہ ظن و تخمین کا نہیں رہتا بلکہ واقعہ و حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

(۵) ہم ایتھر کے قائل ہیں۔ مادہ و قوت کے باہمی تغافل کو مانتے ہیں۔ درآں حالِ کہ ہم کو نہ ایتھر نظر آتا ہے اور نہ کیفیت تغافل محسوس ہوتی ہے۔ آج حرات و نور، برق و کہربا وغیرہ تمام طبیعی کیفیات حقائقِ مسلمہ میں داخل ہیں لیکن کیا کوئی شخص ان کی حقیقت کی علمی توجیہ و تعلیل کر سکتا ہے؟

بعض علمائے کرام کا دعویٰ ہے کہ عقل و زندگی دونوں مادہ کے وظائف میں سے

ہیں۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ جسم سے علیٰحدہ ہونے کے بعد اس کی زندگی کی نوعیت بدل جائے جو اس وقت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

الغرض وہ لوگ جو معاد کے قائل ہیں۔ ان کی طرف سے اس قسم کے دلائل پیش کئے جاتے ہیں جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو سب کا عنصرِ مشترک اعترافِ "جہل و لا علمی" کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ یا بالفاظ دیگر کہنا چاہیے کہ ان کے دلائل کی بنیاد صرف اس خیال پر قائم ہے کہ جس طرح ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اس وقت یہ سب کچھ کیوں کر ہورہا ہے اسی طرح ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ جو کچھ ہوگا، کیوں کر ہوگا؟ یعنی اگر انسان اس دنیا میں اپنے مادی جسم کے ساتھ زندہ رہتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ جسم فنا ہونے کے بعد بھی اس کی زندگی کسی اور صورت سے قائم رہے۔

وہ آلیور لاج ہوں یا کینن ڈائل یا کوئی اور شخص، علمی دنیا میں اس کے علاوہ کوئی اور دلیلِ معاد کے ثبوت میں پیش ہی نہیں کی جاسکتی اور چوں کہ اس نوع کے دلائل جن میں صرف امکان سے بحث ہوتی ہے، مخاطب کے لئے باعث تسکین نہیں ہوا کرتے۔

اس لئے انہوں نے عملی طور پر بھی وجودِ روح کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس حد تک دعویٰ کر بیٹھے کہ وہ روحوں سے گفتگو کرتے ہیں، روحیں ان سے گفتگو کرتی ہیں اور حیات بعد الموت کا بھی تقریباً وہی نظام ہے جو اس دنیا کے عالم حیات کا ہے، یعنی جسم سے جدا ہونے کے بعد روحیں محبت کرتی ہیں، نفرت کرتی ہیں، کھاتی ہیں، پیتی ہیں، چلتی پھرتی ہیں اور جو تصویریں ارواح کی شایع ہوئی ہیں، ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریشمی کپڑے بھی پسند کرتی ہیں، ٹیڑھی مانگ بھی نکالتی ہیں اور اونچی ایڑھی کا جوتا بھی پہنتی ہیں۔

اس لئے جب معاملہ عقلی نظریوں سے گزر کر اس حد تک حواسِ ظاہری کے تحت آجائے تو پھر سوا تسلیم کر لینے کے کیا چارہ ہے مگر سوال یہی ہے کہ کیا روحوں سے گفتگو کرنے اور ان کے ظاہر ہونے کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ واقعی صحیح ہیں؟ کیا حقیقتاً جو صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں یا جو آوازیں کان میں آتی ہیں وہ روحوں کی ہیں؟

اس باب میں کافی تحقیق ہو چکی ہے اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سو میں اسّی دعویٰ کرنے والے تو بالکل جھوٹے ہیں، باقی بیس میں سے دس ایسے ہیں جو قوتِ مقناطیسی سے کام لے کر دوسروں کو فریب نظر میں مبتلا کر دیتے ہیں اور دس ایسے ہیں جو خود اپنے اعتقاد و یقین سے مسحور ہو گئے ہیں۔

پھر اگر آلیور لاج وغیرہ کی انتہائی رعایت کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ان کا شمار اسی آخر الذکر جماعت میں کیا جائے اور ان کو "سودازدہ" سمجھ کر معاف کر دیا جائے۔ اگر روحوں کو جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی انہیں تمام منازل حیات سے گزرنا ہے جو تعلق جسم کی حالت میں ان کو پیش آئے تھے تو پھر اس تغیر و تبدل کے معنیٰ کیا ہوئے۔ اس دنیا میں اس جسم کے ساتھ انہیں کیوں نہ باقی رہنے دیا گیا اور قدرت نے کیوں فضول اتنی زحمت گوارا کی۔

البتہ عقلی توجیہ کے سلسلہ میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ جب مادی دنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ مختلف صورتیں اختیار کرتی رہتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ روح کو فانی کہا جائے۔ مگر گفتگو سب سے پہلے اس باب میں ہونی چاہئے کہ جس کا نام ہم نے روح رکھا ہے وہ بجائے خود کوئی جوہر ہے یا صرف عرض، یعنی اس کا کوئی وجود علیٰحدہ پایا جاتا ہے یا اک کیفیت کا نام ہے جو عناصر کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے، مثالاً یوں سمجھئے کہ ہم جس وقت پانی میں شکر حل کر دیتے ہیں تو پانی میں ایک کیفیت حلاوت و شیرینی کی پیدا ہو جاتی ہے لیکن شیرینی کوئی علیٰحدہ مستقل چیز تو نہیں۔ اگر ہم پانی سے شکر کو علیٰحدہ کر دیں تو یہ کیفیت جاتی رہے گی تو اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پانی اور شکر کے جدا جدا کر دیئے جانے سے فنا ہو گئی۔

بالکل یہی صورت روح کی ہے کہ بعض مادی اجزاء کے باہمی تفاعل یا عناصر کے امتزاج سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا نام زندگی یا روح ہے اور جب وہ امتزاج باقی نہیں رہتا تو کیفیت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس میں کون سا استحالہ عقلی ہے اور ایسی معمولی بات سمجھنے میں کیوں پس و پیش ہوتا ہے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ اگر انسان کی آفرینش کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ چند دن کی عارضی زندگی بسر کر کے فنا ہو جائے تو اس کے پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ سو یہ سوال بجائے خود اتنا لغو و مہمل ہے کہ ہر شخص ادنیٰ تامل کے بعد اس کی لغویت کو سمجھ سکتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ کائنات کے بنانے والی کوئی ایسی قدر مطلق ہستی ہے جسے خدا کہتے ہیں تو اس کی حقیقت و عظمت کو سامنے رکھ کر یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہو سکتا کہ اس کے نزدیک ایک کیڑا جو فراست و تعقل سے بالکل بے بہرہ ہے اور ایک انسان جو فہم و عقل کا پتلا ہے دونوں برابر ہیں اور اگر روح کو فانی تسلیم کرنے کی حالت میں خدا پر یہ

الزام عائد ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان کو پیدا ہی کیوں کیا تو ایک کیڑے کی طرف سے بھی یہ احتجاج ہو سکتا ہے کہ اگر عقل و فہم سے بیگانہ رکھنا تھا تو کیوں وجود سے عدم میں لایا گیا اس قسم کے دلائل حقیقتاً کوئی وجود نہیں رکھتے کیوں کہ ان کا تعلّق ان معتقدات و مزعومات سے ہے جو صرف "امکان" کی بنیاد پر قائم ہیں اور حقائق کی جستجو کرنے والوں کے نزدیک محض "ممکن ہونا" کوئی چیز نہیں ہے کیوں کہ امکان میں جتنی گنجائش اثبات کی ہے اتنی ہی "نفی" کی بھی ہے۔

اب رہ گیا بحث کا یہ پہلو کہ جب مادی دنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی تو روح کو کیوں فانی مانا جائے۔ اس میں بھی سخت مغالطہ منطقی پایا جاتا ہے کیوں کہ جب روح بجائے خود کوئی مستقل مادی چیز نہیں ہے تو پھر اس کا دوسری مادی اشیاء کے ساتھ کیوں ذکر کیا جائے۔ وہ صرف ایک کیفیت کا نام ہے اور کیفیات کا فنا ہو جانا ہر شخص کے نزدیک مسلّم ہے۔

انسان میں مادی چیز اس کا جسم ہے سو اس کے اجزاء بے شک فنا ہونے والے نہیں۔ وہ ضرور کسی نہ کسی حالت و کیفیت میں پائے جائیں گے۔ جب تک انسان زندہ ہے اس جسم میں ایک کیفیت ایسی پائی جاتی ہے جسے زندگانی یا روح سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ کیفیت باقی نہیں رہتی (خواہ اس کا کچھ سبب ہو) تو اجزاء میں انحلال ہو کر دوسری صورت قبول کر لیتے ہیں۔

جب جسم زیر زمین دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے اجزاء کیڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس کا جسم فنا تو نہیں ہوتا لیکن وہ صورت دوسری اختیار کر لیتا ہے پھر ان کیڑوں کو دوسرے بڑے کیڑے کھا لیتے ہیں، ان کیڑوں کو چڑیاں ہضم کر جاتی ہیں، چڑیوں کو دوسرے جانور کھا جاتے ہیں اور اس طرح ازل سے یہ سلسلہ انحلال و تفاعل کا جاری ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی چیز ہمیں تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتی کہ روح کا وجود علیٰحدہ پایا جاتا ہے اور جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کے لئے بھی ----زمان و مکان کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی دوسری مادی اشیاء کے لئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس کی بقا کے لئے مکان و زمان کی ضرورت نہیں تو پھر وجود کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا اور یہ لفظ مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔

بقائے روح و معاد کا خیال مذہب کا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ روح باقی رہتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ روح پھر جسم انسانی میں داخل کی جائے گی اور قیامت

کے دن وہ سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔

آئیے ذرا ماضی کے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کریں:

کرۂ زمین پر انسانی آبادی کا وجود پانچ لاکھ سال سے پایا جاتا ہے لیکن اگر اس میں مبالغہ سمجھا جائے تو آیئے ڈھائی لاکھ سال فرض کر لیں۔

اس وقت آبادی ۱۷۴۷۰۰۰۰۰۰ / نفوس پر مشتمل ہے اور اموات کی تعداد سالانہ ۴۳۳۶۹۸۱۳ ہوتی ہے اگر گزشتہ ڈھائی لاکھ سال کی اموات کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت عالم برزخ میں کم از کم ۱۰۸۴۲۵۵۳۲۵۰۰۰۰ روحیں چکر لگا رہی ہیں۔ اگر روح کے لئے کم از کم ۸/۱ انچ کے برابر جگہ درکار ہو تو اس وقت تک روحوں نے اتنی جگہ گھیر رکھی ہے کہ اگر ان کو برابر رکھ کر فیتہ تیار کیا جائے تو ۲۱۳۹۰۷۹ میل ہو گا۔ اور اگر ان روحوں کو جمع کر کے کوئی ستون یا منارہ بنایا جائے تو ساڑھے انیس میل لمبا تیار بنے گا جس کے چاروں ضلع میں ہر ضلع ساڑھے نو میل کا ہو گا۔ یہ حساب تو اِس وقت تک کی روحوں کا ہوا، آئندہ معلوم نہیں کب تک کرۂ ارض قائم رہے گا اور یہ ہجوم ارواح کس حد تک پہنچے گا۔

کہا جاتا ہے کہ بچھڑی ہوئی روحیں وہاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں لیکن کیا یہ کہنا بالکل ایسا ہی نہیں ہے جیسا آپ کسی ریگستان کے تمام ذروں کو ہوا میں منتشر کر کے کسی ایک ذرّہ سے کہیں کہ جاؤ اور اس ذرّہ کے ساتھ مل جاؤ جس کے پاس سے تم کو اٹھایا گیا تھا۔

اب اسی کے ساتھ اس عتقاد کو بھی شامل کیجئے کہ حشر بالا جساد ہو گا یعنی اس دنیا میں جس جسم کے ساتھ روح متصل تھی وہ جسم پھر پیدا کیا جائے گا تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے لئے کتنی وسیع فضا کی ضرورت ہو گی اور کتنی کروڑ زمینوں کے برابر چٹیل میدان اس کے لئے درکار ہو گا۔

حیرت ہے کہ بقائے روح کو مان کر اس قسم کے مضحک خیالات خدا سے وابستہ کرنے میں تو تامل نہیں ہوتا لیکن سیدھی سے یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ جو خدا ایک بار عدم سے وجود میں لایا ہے وہ پھر وجود سے عدم تک بھی پہنچا سکتا ہے۔

علم و یقین - اعتقاد و مذہب

آپ روز سورج کو طلوع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، جتنا وہ اُفق سے بلند ہوتا جاتا ہے اس کی حرات کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ آپ کے سر سے گزرتا ہوا دوسری سمت کی طرف ڈھل جاتا ہے اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟------آپ اسے واقعہ کہتے ہیں کیوں؟ اس لئے کے آپ کا مشاہدہ ہے۔ آپ اپنے حواس کے ذریعہ ایسا محسوس کرتے ہیں اور متواتر و پے درپے اتنی بار محسوس کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ سے آکر یہ کہے کہ آج آفتاب نے طلوع نہیں کیا۔ یا یہ کہ طلوع کرنے کے بعد غروب نہیں ہوا تو آپ اسے جھوٹا کہہ دیں گے، اور آپ باہر نکل کر اس کی تصدیق بھی نہیں کریں گے۔

انسان کی اس کیفیت کا نام یقین ہے اور یقین بھی ایسا جس کے لئے برہان و دلیل کی حاجت نہیں۔ انسان کی زندگی پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ وہ ایک سلسلہ ہے بیشمار "لمحاتِ احساس" کا، یہاں تک کہ اگر آپ اس کو "احساسِ مسلسل" کہہ دیں تو بے جا نہ ہو گا لیکن احساس محض بے کار ہے اگر دنیا میں محسوسات کا وجود نہ ہو، اس لئے انسان فطرتاً مجبور ہے کہ وہ اپنے "ذوقِ احساس" کو پورا کرنے کے لئے محسوسات کا مطالعہ کرے۔ انسان فطرتاً سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور سکون نام ہے صرف "یقین" کا۔ ریب و شک، ایک بے چینی ہے، ایک اضطراب ہے اور انسان اس الجھن کے دور کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور ہے اس لئے اگر اس کے "احساسات" مطمئن نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سکون یقین کی منزل سے نا آشنا ہے۔ اور "احساس" کا اطمنان اگر ہو سکتا ہے تو صرف محسوسات کی جستجو کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے سے۔

عام طور پر محسوسات کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک محسوسات خارجی دوسری محسوسات ذہنی۔ یعنی ایک وہ جو خارج میں موجود ہیں جیسے درخت، پتھر، پانی وغیرہ اور دوسرے جن کا بظاہر وجود نہیں پایا جاتا۔ لیکن ہم انہیں محسوس کرتے ہیں جیسے

گرمی، سردی وغیرہ مگر میرے نزدیک یہ تقسیم صحیح نہیں کیوں کہ محسوسات جتنی بھی ہیں تمام تر خارجی ہیں اور جن کو "ذہنی" کہا جاتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی واسطہ سے محسوسات خارجی ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یقیناً گرمی، سردی کوئی مادی محسوس چیز نہیں لیکن جن اسباب کے تحت گرمی یا سردی محسوس کی جاتی ہے وہ "خارجی" محسوسات سے باہر نہیں، بے شک محبّت اور نفرت کا احساس بالکل ذہن سے متعلق ہے لیکن کیا وہ چیز جن سے یہ جذبات متعلق ہیں خارج میں موجود نہیں؟ مادہ اور اعراض دو علٰیحدہ علٰیحدہ چیزیں بتائی جاتی ہیں، درآں حالِ کہ عرض کا وجود مادہ سے کہیں علٰیحدہ نہیں۔

پھول ہے تو رنگ بھی ہے، بو بھی ہے، وہ نہیں تو یہ بھی نہیں۔ یقین کے کئی مراتب و مدارج ہیں۔ ہم دور سے دھواں اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ وہاں آگ کا وجود ہے۔ لیکن آگ کی نوعیت کیا ہے۔ اس کی خبر نہیں ہوتی ہم چل کر وہاں جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کسی نے خس و خاشاک جمع کر کے اس میں آگ لگا دی ہے ---- ہم وہاں سے واپس آتے ہیں لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ آگ کیسی ہے؟ ہم بتا دیتے ہیں، وہ سن کر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن کیا ان کا یہ اطمینان اس درجۂ یقین کو پہنچ سکتا ہے جو ہمیں حاصل ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہم کہہ دیتے کہ کسی نے لکڑی جلائی ہے اور وہ یقین کر لیتے۔

ہمیں ایک گھڑا مٹی کا نظر آتا ہے۔ اس کی تازگی دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں پانی ہے، قریب جا کر پانی کو دیکھتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے۔ لیکن جب گلاس میں پانی لے کر پی لیتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سرد ہے یا گرم۔

غور کیجئے کہ یقین کے ان تمام مدارج میں "مطالعۂ محسوسات" کو کتنا دخل ہے اگر خود اپنی سعی و کوشش سے کام لے کر خود اپنی عقل و احساس کو ذریعہ بنا کر کوئی علم حاصل ہو تو وہ ایک "یقینِ ذاتی" ہے جسے کوئی قوت متزلزل نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر ہم نے صرف دوسروں کی زبانی سن کر کسی بات کو باور کر لیا ہے تو وہ محض "یقینِ روایتی" ہے جس میں ریب و تزلزل کا زیادہ امکان ہے اور تصدیق قلب کا بہت کم۔

تصدیق کی یہ منزل اور سکونِ نفس کا یہ مرتبہ از خود حاصل ہونے والی چیز نہیں، بلکہ پیدا ہوتا ہے محسوسات و موجودات کے مطالعہ سے، پھر یہ مطالعہ جتنا غائر ہو گا اتنا ہی بلند ہو گا اور یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا میں علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اور انسان کے اقتدار کو تمام

روئے گیتی پر قائم کرکے اسے خلافتِ الٰہی کی منزل سے روشناس کیا۔

آیئے ذرا مدارجِ خلافت پر بھی ذرا غور کرلیں:

میں ایک وزنی گیند ہوا میں اچھالتا ہوں۔ وہ فوراً نیچے آجاتی ہے۔ بار بار پھینکتا ہوں وہ بار بار زمین پر آکر گرتی ہے۔ میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ بھاری چیز کبھی اوپر نہیں ٹھہر سکتی۔ دوسرا شخص اس پر زیادہ غور کرتا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وزن خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نام ہے صرف کشش زمین کا۔ تیسرا ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور سوچتا ہے کے زمین کی کشش کا مقابلہ کیوں کر ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ غبارہ اور ہوائی جہاز بناکر اس مقاومت میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آج دنیا کا تمام ہنگامۂ ترقی اس مطالعہ پر قائم ہے اور اسی یقین کی سرزمین سے ارتقاءء کے چشمے پھوٹے ہیں، ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان کو خود اپنے ملک کی خبر نہ تھی آج وہ نہ صرف کرۂ ارض بلکہ فضا میں تیرنے والے کروڑوں اور اربوں میل دور کے کُرّوں کا حال معلوم کرچکا ہے۔ یہ سب کرشمے ہیں یقین کے، جو نتیجہ ہے علم کا۔

ایک شخص سوال کرتا ہے کہ اس تمام جدوجہد سے فائدہ؟ جب کہ انسان کو بہر حال فنا ہونا ہے۔ سوال ممکن ہے صحیح ہو لیکن استدلال غلط ہے۔ انسان انفرادی حثیت سے فانی ہے لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کو بقائے دوام حاصل ہے۔ انسان کی موجودہ صورت بدل سکتی ہے۔ اس کی عادات و اطوار میں میں تغیر ہو سکتا ہے۔ اس کے افراد یقیناً فنا ہوتے جائیں گے۔ لیکن انسان بہر حال باقی رہے گا۔ کرۂ ارض پر نہ سہی کسی اور کرۂ میں، انسان فطرت کی تخلیق کا مظہر اتمّ ہے اور اگر آفرینش کو فنا ہے تو انسان کو بھی، ورنہ نہیں، اس لئے انفرادی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنا مقتضائے فطرت کے خلاف ہے۔ قدرت کی مرضی کے منافی ہے۔

آپ سمندر کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک نامتناہی سلسلہ ہے موجوں کا درآں حالِ کہ ہر موج اپنی جگہ اٹھ کر فنا ہو جاتی ہے۔ پھر کیا سمندر کا وجود ان موجوں کے فنا ہونے سے ختم ہو جاتا ہے۔ جو موج اس لمحہ میں نمودار ہو کر فنا ہوئی ہے۔ اُسے پھر نہیں اُبھرنا لیکن کیا اس سے سمندر کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، بالکل یہی عالم انسان کا ہے کہ اس کے افراد مٹتے جاتے ہیں لیکن وہ علیٰ حالہٖ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔

دنیائے مذہب کے اصول مگر کچھ اور ہیں وہاں علم و یقین کا نام اعتقاد ہے اور اس کی

تعلیم "کلّ شئٍ حادثٌ" (ہر چیز فنا ہونے والی ہے) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے مذہب کے نزدیک انسان نہایت حقیر، حد درجہ بے بس اور مجبور و لاچار مخلوق ہے۔ اس کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی خیال اس کے اختیار میں نہیں۔ جو چاہتا ہے خدا کرتا ہے اور جو چاہے گا کرے گا۔ انسان کا کام صرف سرِ عجز جھکا دینا ہے اور آنکھ بند کر کے، ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر دوسری دنیا کے اس عمیق و تاریک غار کی طرف چلا جانا ہے جس کا علم صرف اس قدر حاصل ہے کہ کچھ معلوم نہیں۔

مذہب کہتا ہے کہ انسان دنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور خدا کی پرستش میں دن رات مصروف رہے۔ لیکن اس سے پوچھئے کہ خدا کیا، اور اس کی پرستش کیوں؟ تو وہ کہتا ہے کہ خدا کی حقیقت پوشیدہ ہے کسی کی قدرت نہیں کہ اس کو سمجھ سکے اور عبادت اس لئے کہ اس نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے، اس نے جس کا حال معلوم نہیں۔ الغرض مذہب کے تمام عقائد کا عنصر عظیم "عدمِ علم" ہے اور اسے نہ سمجھ سکنے، نہ جان سکنے کا نام وہاں یقین رکھا جاتا ہے۔

پھر اگر یہ "عدمِ علم" کوئی مستقل تعلیم ہوتی تو بھی ایک بات تھی۔ لیکن چوں کہ انسان کی فطرت جستجو پسند ہے اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اس کی یہ خلش دور نہ ہو، اس لئے مذہب اس پر بھی قائم نہ رہ سکا اور باوجود اس کے کہ وہ خود خدا کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ لیکن لوگوں کو اس نے سمجھایا باوصف اس کے کہ وہ دوسری دنیا سے بے خبر تھا لیکن دوسرں کو اس سے آگاہ کیا۔ اور اس شان سے اس اعتماد و یقین کے ساتھ کہ یہ سب کچھ گویا حقائق ثابتہ میں شامل ہے اور محسوسات ظاہری سے متعلق۔

چناں چہ وہی جس کی حقیقت کو وہ نہیں پا سکتا تھا دفعتاً خفاء سے ظہور میں آجاتا ہے اور اس انداز سے کہ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ چاروں طرف اس کے خدام (ملائکہ مقربین) حضوری میں حاضر ہیں۔ وہ اپنے خاص خاص بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے جس سے خوش ہوتا ہے اس کو باغوں میں بھیجتا ہے جس سے برہم ہوتا ہے اس کو آگ میں جھونک دیتا ہے وہ سنتا ہے لیکن کان نہیں رکھتا۔ وہ دیکھتا ہے مگر آنکھوں سے نہیں، وہ بولتا ہے مگر زبان سے نہیں۔ الغرض وہ دنیا ہی کے بادشاہوں کی طرح ایک جلیل القدر بادشاہ ہے اور اس پر کوئی اور حکمران نہیں۔

وہ بے نیاز مطلق ہے لیکن ہماری عبادتوں کی پرواہ ضرور کرتا ہے وہ احتیاج سے بلند و

ارفع ہے لیکن ہمارے عجز و نیاز کی اس کو ضرورت یقیناً ہے وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن نافرمانی سے اس کو غصّہ یقیناً آتا ہے۔ وہ بے انتہا رحم و کرم والا ہے مگر گناہ گار کو بغیر آگ میں جھونکے نہیں مانتا۔

وہ موجود ہے لیکن زمان و مکان سے بے نیاز، وہ ہر لمحہ میں قدیم ہے لیکن لمحہ فنا ہو جاتا ہے وہ نہیں۔ وہ عادل ہے لیکن عدل کا پابند نہیں۔ جس کو چاہے بخش دے اور جسے چاہے سزا دے۔ علم کہتا ہے کہ یہ اجتماعِ اضداد کیسا؟ مذہب کہتا ہے خدا کی مرضی، علم کہتا ہے کہ تمام باتیں کیوں کر معلوم ہوئیں؟ مذہب کہتا ہے خدا کے برگزیدہ بندوں کے کہنے سے، علم کہتا ہے کہ اس کی برگزیدگی کا علم کیوں کر ہوا؟ جواب ملتا ہے کہ انہی کے قول سے -----علم سوال کرتا ہے کہ کیا انسان بغیر تحقیق کئے ہوئے محض دوسروں کے کہنے پر اپنے نفس کو مطمئن کر سکتا ہے؟ جواب دیا جاتا ہے "کیوں نہیں" علم پوچھتا ہے کہ کیا یقین اسی کا نام ہے؟ مذہب کہتا ہے "بے شک"۔

مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دنیا جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے یعنی محسوسات کی یہ ٹھوس دنیا بالکل عارضی چیز ہے اور محض ایک پرتو ہے اس دوسری دنیا کا جو ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے----- مگر وہ دوسری دنیا کیسی ہے؟ اس میں بہشت ہے، دوزخ ہے، دیدارِ خداوندی ہے یا اس سے مہجوری، باغ و راغ ہیں، حور و قصور ہیں، فواکہ و اثمار ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں ہیں، کوئی فکر نہیں ہر وقت آزادی سے کھاؤ پیو اور وہ سب کچھ کرو جس سے دنیا میں باز رکھا جاتا ہے۔ یا پھر دہکتی ہوئی آگ کے غار ہیں، اژدہے ہیں، بچھو ہیں۔ خون و پیپ ہے۔ چیخ ہے کراہ ہے۔ پوچھئے: کیا وہاں رقص و سرور بھی ہے ----کیوں نہیں درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہوں گی۔

کیا وہاں موٹر، ہوائی جہاز، ریل بھی ہے ----بے شک ہے، انسان نے کسی جگہ پہنچنے کا خیال کیا اور فوراً پہنچ گیا۔ یعنی "آنکھ کی بند، ہوا کوچۂ جاناں پیدا"

کیا وہاں "زہرۂ صبح و جامِ بلور" بھی میسّر ہے----اس کا کیا ذکر کیوں کہ وہاں تو ہر وقت صبح صادق ہی رہے گی اور جام بلور کیا معنی، وہاں تو دنیا کے قیمتی سے قیمتی جواہر سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آئیں گے -----بالکل درست لیکن پوچھئے کیا انسان کو کسی شے کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا پڑے گی۔ کیا یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ ممکن ہے فلاں چیز ہم کو نہ ملے، یا ملنے کے بعد ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کا جواب بالکل نفی

میں ملے گا۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ فطرت انسانی تو بدستور اس دنیا میں بھی یہی رہے گی لیکن لذّت و الم کا مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ گویا ان کا وجود، احساسِ انسانی اور اس کی فطرت سے علیٰحدہ قائم ہے۔

اب ذرا گہرائی کی طرف جایئے اور غور کیجئے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک زمانۂ غیر معلوم تک عالم برزخ میں رہنا اور پھر بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز "پل صراط" پر چل کر دوزخ یا جنّت تک پہنچ جانا کیا غایت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصلحتِ خداوندی ہر جگہ اور ہر بات میں کار فرما ہے۔ لیکن موت کے بعد انسان کا تمام سخت و صعب مراحل سے گزر کر عذاب یا ثواب کی دائمی زندگی بسر کرنا کسی نتیجہ کے لئے ہے۔ بہشت و دوزخ سے کسی کو لوٹ کر پھر دنیا میں جانا نہیں کہ وہاں کے لوگوں کو ان کے حالات معلوم کرکے تخویف یا ترغیب ہو، پھر خدا کی اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو زندگی دوام عطا کرکے بقاء میں اپنا شریک تو بنالیتا ہے لیکن دنیا والوں کے لئے مایۂ عبرت و بصیرت بنانے کے لئے تیار نہیں۔

صدیاں گزر گئیں کہ مذہب کی یہ تعلیمات بدستور اسی طرح اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے دنیا میں کار فرما ہیں۔ یہاں تک کہ علم نے بڑھ کر اس کو چیلنج دیا، ظاہر ہے کہ مشاہدات کا جواب قیاسات سے اور "یقینیات" کا مقابلہ "ممکنات" سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لئے ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے عقائد مذہب کے ظاہری معنی سے عدول کرکے ایک باطنی مفہوم پیش کیا۔ اور بتایا کہ یہ صرف تشبیہات و استعارات ہیں لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے خطیبانہ انداز بیان ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ مراسم و شعائر میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ اور اس جواب کی حقیقت جان چھڑانے سے زیادہ اور کچھ نہ رہی، علم کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا، سیلاب کی طرح اٹھا اور درمیان کی تمام چٹانوں کو کاٹتا ہوا چلا گیا۔ جن چیزوں کو ساتھ دینا تھا وہ ساتھ چلی گئیں۔ جن کو یہ منظور نہ تھا وہ اپنے منتشر اجزاء لئے ہوئے پیچھے رہ گئیں اور مذاہبِ عالم کا یہی حشر ہوا۔

مگر دنیا کے تمام مذاہب میں ایک مذہب ایسا تھا جو اس طوفان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ علم کے اس سیلاب کا شناور بن سکتا تھا۔ لیکن اس کو دنیا فراموش کر چکی ہے خود اس کے ماننے والے اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اگر انہیں کوئی یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے تو وہ اسے باغی سمجھ کر نکال دیتے ہیں ---- اس مذہب نے کبھی اس بات کی تلقین نہیں

کی کہ تم بغیر سمجھے ہوئے لغو اعتقادات کا اتباع کرو بلکہ اس نے ہمیشہ اسی بات پر زور دیا کہ اپنی فکرو کوشش سے کام لو، غور و تدبّر کرو، کائنات کا مطالعہ کر کے حقائقِ اشیاء کا علم حاصل کرو۔ دنیا میں ہمیشہ آگے قدم بڑھاؤ اور ترقی کی اس چوٹی تک پہنچ جاؤ جہاں سے نیابت خداوندی کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ نیابت خداوندی کیا ہے وہ انسان کی انتہائی کامیاب تمناؤں کی بہشت ہے۔ استعلاء و ترقی کی سکوں بخش جنّت ہے۔ کامرانیوں کی سلسبیل ہے۔ مسسرتوں کی جوئبار ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر انسان نے یہ سب کچھ حاصل کرنے کے کوشش نہ کی تو ذلّت و نکبت کی آگ ہے، پستی و خسران کے دل جلا دینے والے شعلے ہیں اور پامالی کی وہ تکلیفیں ہیں کہ سانپوں کی پھنکار اور بچھو کی نیش بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

مگر ہے کوئی آج جو صرف اس تعلیم کو اساس مذہب بنائے، اور ہے کسی میں ہمّت جو پوست کو علٰیحدہ کر کے مغز پیش کرے۔ علم اپنے یقین کا پرچم لئے ہوئے آگے بڑھتا جارہا ہے۔ کائنات کو فتح کر کے بہشتوں اور جنّتوں کو اپنے لئے مخصوص کرتا جارہا ہے۔ نعائم و لذائذ کو سمیٹ سمیٹ کر دامنِ مراد بھر رہا ہے--- لیکن مذہب بدستور اپنی ممکنات کے اوہام میں مبتلا ہے۔ قیاسیات کی دلدل میں گرفتار ہے۔ اس نے منہ پشت کی طرف کر لیاہے اور کہہ رہاہے منزل اوپر ہے۔ وہ سکون کا طلب گار ہے۔ وہ سکون جس میں موت کی سی غفلت ہو۔ پتھروں کا سا جمود ہو، وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی پامالی دوسری دنیا کا عروج ہے یہاں کی ذلّت وہاں کی عزت ہے حالاں کہ بتانے والے نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُوْنَ سے اسی دنیا کی ہلاکت مراد ہے اور فاسق وہی ہے جس نے اسی آب و گل کی دنیا میں جدوجہد ترک کر دی۔

انسانی زندگی کا معیار
اور ہمارے علمائے کرام

عہدِ حاظر میں علومِ ریاضیہ کی ترقی نے ذہنِ انسانی میں عجیب قسم کی جستجو پیدا کر دی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر چیز کو ناپ تول سکے۔ اس کے عرض و طول اور بلندی و عمق کا اندازہ کر سکے۔ اور جب اس سے سوال ہو کہ فلاں امر کی حقیقت کیا ہے تو وہ بتا سکے کہ اس کے عدد یہ ہیں۔ اس کے ابعادِ ثلثہ کی پیائش یہ ہے اور اعداد و شمار کے لحاظ سے اس کو یوں بیان کر سکتے ہیں۔ پھر یہ ذوق انہی چیزوں تک محدود نہیں جو مادی ہیں، مرئی ہیں، جامد ہیں بل کہ کیفیاتِ و وجدانیات کی تحقیق بھی انہی خطوط پر کی جاتی ہے اور بالکل ریل کی رفتار کی طرح اخلاقِ انسانی اور تخیلِ دماغی کا بھی ایک مقیاس ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقیاس کیا ہے اور عام طور پر جو نظر یہ اس کی پیائش کا قائم کیا جاتا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے؟

ایک شخص کی زندگی پر جب گفتگو کی جاتی ہے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ اتنی مدت تک زندہ رہا، اتنے سال اور اتنے مہینے جیا، جوان مر گیا، بُوڑھا ہو کر مرا، لیکن کیا یہ معیار درست ہے؟ غالباً نہیں۔ کیوں کہ یہ معیار انسان کی زندگی کا نہیں بلکہ اس کی جسم کی زندگی کا ہے۔

سکندر صرف ۳۶ سال تک اس دنیا میں زندہ رہا حالانکہ وہ ۳۰۰ سال قبل مسیح سے اِس وقت تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مسیح صرف ۳۳ سال زندہ رہے لیکن اپنی زندگی کے اخیر تین سال میں وہ اس طرح جئے کہ اپنے آپ کو خلعتِ دوام بخش گئے۔ اسی طرح دنیا کے اور بڑے بڑے مفکرین اور تاریخ کے بڑے بڑے لوگوں کو لیجئے کہ وہ آج موجود نہیں ہیں لیکن ان کے کام ہنوز باقی ہیں اور روزانہ ہزاروں لاکھوں زبان پر ان کا نام آجاتا ہے۔

ممکن ہے بعض کا خیال ہو کہ حیاتِ انسانی کا معیار، لذت و عیش، جاہ و ثروت ہے یعنی زندگی نام ہے لطف و نشاط کے ساتھ عمر بسر کر دینے کا، جاہ و ثروت کے حصول کا۔ لیکن محض ذاتی لذت اور زر و دولت کا انبار اپنے بعد کوئی نقش چھوڑ جانے والا نہیں۔ اور اس لئے اجتماعِ بشری کی تاریخ ایسے لوگوں کی زندگی سے اعتناء نہیں کرتی۔ بنابر آں اگر صحیح معنی میں حیاتِ

انسانی کا کوئی معیارِ مقیاس ہو سکتا ہے تو وہ مقیاسِ اجتماعی ہے یعنی یہ کہ ایک شخص نے قوم کی کیا خدمت انجام دی۔ ملک وملت کی اصلاح و فلاح کے لئے کیا کیا قربانیاں کیں اور دوسروں کو اپنے ذہنی یا مادی اکتسابات سے کیا فائدہ پہنچایا۔

دُنیا کے جدید اجتماعی نظریئے زر و دولت کے مسئلہ کو صرف اسی حد تک اہمیت دیتے ہیں کہ وہ نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے والے ہیں۔ کیوں کہ دولت کا انبار بجائے خود بالکل مہمل چیز ہے۔ اگر اس کی اعتباری قوتِ کار برآری کو نظر انداز کر دیا جائے اور یہیں سے اختلاف کی دو (۲) راہیں پیدا ہوتی ہیں جن میں سے ایک کا نام سرمایہ داری اور دوسری کا مطالبۂ محنت و عمل ہے۔ پھر جس رفتار کے ساتھ یہ احساس قوی ہوتا جارہا ہے اس کو دیکھ کر یہ حکم لگانا دشوار نہیں کہ وہ وقت قریب ہے جب ایک تاجر کی تجارت، ایک سائنسدان کی ایجادات، ایک صناع کی صنعت گری سب کا مدعا صرف مفادِ جمہور کے لحاظ سے متعین کیا جائے گا اور اکتسابِ زر یا فراہمیٔ دولت کا کوئی سوال دنیا میں باقی نہ رہے گا۔ پھر آیئے اس سلسلہ میں غور کریں کہ مذہب اس امر میں کس حد تک نوع انسانی کا ساتھ دینے والا ہے؟

جس حد تک مقصود یا غایت کا تعلق ہے ہم کو ماننا پڑے گا کہ مذہب کی تعلیمات یکسر مفادِ جمہور پر مبنی ہیں اور تمدنی نطقۂ نظر سے وہ امن اور سکون ہی کا خواہش مند ہے۔ لیکن تاریخِ مذہب بالکل اس کے برعکس ہم کو یہ بتاتی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بدامنی وخون ریزی مذہب ہی کی بدولت ہوئی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہم کو اصولِ مذہب کی جستجو تاریخ سے ہٹ کر صرف اس کی تعلیمات میں کرنی چاہیئے اور اگر ایک بار یہ بات اصولاً متعین ہو جائے کہ دنیا کا امن وسکون یا نوع بشری کی فلاح صرف مذہب ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے اور یہ کہ مذہب سے زیادہ اس کا کوئی حامی نہیں، تو پھر اس کا فیصلہ چنداں دشوار نہیں کہ مذہب اپنے عمل یا تعلیماتِ زندگی کے لحاظ سے کسی ایک جگہ ٹھہر جانے والی چیز ہے یا ترقیٔ تمدن کی سطح کے ساتھ ابھرنے اور بلند ہو جانے والی۔

اس باب میں سب سے بڑی غلطی علم بردارانِ مذہب نے یہ کی ہے کہ انہوں نے عقیدہ، عمل اور مقصود کے باہمی ربط و تناسب کو بالکل پسِ پُشت ڈال دیا اور بجائے اس کے کہ مقصود کی اہمیت کو سامنے رکھ کر عمل و عقیدہ کو اس کا تابع یا ذریعہ قرار دیں صرف فرع کو اصل چیز سمجھ لیا اور مقصود کو اس کی تابعیت میں دے کر مذہب کو نیست و نابود کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مذہب سے اس کے عقائد کو علیحدہ کر دیں تو اس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا اور وہ کوئی مرکز ایسا نہ پیدا کر سکے گا جس پر کسی جماعت کے افراد کا اجتماع ہو سکے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ عقائد ہی اصل چیز ہیں بڑی کم فہمی کی بات ہے۔

مثلاً یوں سمجھئے کہ مذہب کے عقیدہ کا اصل الاصول ایک خُدائے قادرِ مطلق کے وجود کو تسلیم کرنا ہے لیکن صرف ذہن میں ایسا سمجھ لینا یا زبان سے اس کا اقرار کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر اس عقیدہ کے تحت ہم اپنے اعمال و افعال میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں اور یہ اعمال و افعال بھی بے کار ہیں، اگر ان سے ہمارے نظامِ تمدن یا ہماری اجتماعی زندگی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ یہی حال صوم و صلوٰۃ کا ہے کہ محض قیام و قعود یا صبح سے شام تک بے آب و نان بسر کر دینا فی نفسہ لایعنی حرکت ہے۔ اگر اس سے کوئی اخلاقی نتیجہ نہ بر آمد ہو، اور اخلاق کا تعلق چوں کہ صرف انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے اس لئے اعمالِ مذہبی اور اوراد و ظائف اور دعا اور توبہ کے ردّ و قبول کا معیار صرف یہ ہونا چاہئے کہ سب سے زیادہ پابند صوم و صلوٰۃ نے سب سے زیادہ خدمتِ خلق کی انجام دی ہے یا نہیں۔ اور وہ شخص جس نے تین لاکھ مرتبہ سورہ مزمل پڑھ کر اس کی زکوٰۃ ادا کی ہے اس نے سوسائٹی کیلئے کس قدر ایثار سے کام لیا۔ دنیا کے تمام مذاہب کا مقصودِ عبادت و نیایش یہ رہا ہو یا کچھ اور مجھے اس سے بحث نہیں لیکن اسلام کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اس کا نصب العین صرف یہی تھا اور اس نے عبادت کو محض عبادت کے لحاظ سے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اس نے نماز کی تعلیم دی۔ صرف اس لئے کہ باہمی اتحاد و تعاون پیدا ہو، اس نے روزہ فرض کیا محض اس غرض سے کہ ہم میں ابناءِ جنس کی اقتصادی مشکلات کا احساس پیدا ہو۔ اس نے حج کی ہدایت کی صرف اس مقصد کے ساتھ کہ اسلام کو بین الاقوامی چیز بنایا جائے۔ اس نے ادائے زکوٰۃ کو لازم قرار دیا فقط اس مدعا کے ساتھ کہ قوم کا ایک مرکزی بیت المال قائم رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ عہدِ رسالت قوم کے اس عظیم الشان تعمیری پروگرام کو پورا کرنے کیلئے بہت مختصر ثابت ہوا اور عہدِ خلفاء میں بھی بعض سیاسی اختلافات کی وجہ سے اس کی بنیاد مضبوط نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ آخر کار بنی اُمیہ کا دورِ ملوکیت شروع ہو گیا اور اسلام کی روحِ اجتماعیت و انسان پرستی، ہوس، ملک گیری اور تکمیلِ استبداد و سرمایا داری میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اسلام نے زعامتِ دینی و دنیوی (Temporal and spiritual power) کی تفریق اسی لئے گوارا نہیں کی کہ ملوکانہ استعارو استحصال کی خواہش لوگوں میں پیدا نہ ہو اور ایک قائد و رہنما یا سلطان یا فرمان روا کی خصوصیت یہ نہ قرار پائے کہ وہ ملک کا سب سے بڑا سرمایہ دار ہے بلکہ اس کے لئے وجۂ امتیاز یہ ہو کہ وہ ملک و قوم کا سب سے زیادہ جفاکش خادم ہے اور تقسیمِ دولت میں وہ اسی سطح پر نظر آتا ہے جہاں دوسرے افرادِ قوم پائے جاتے ہیں۔ پھر تاریخ شاہد ہے کہ اس لحاظ سے رسول اللہ کی زندگی کیا تھی اور آپ کے بعد خلفاءِ راشدین نے کس حد تک اس اصول کی پابندی کی۔ لیکن جب عہدِ امیر معاویہ شروع ہوا تو حکومتِ اسلام ختم ہو کر حکومتِ عرب قائم ہوئی اور اسلام کی

ظاہری پابندی صرف اس لئے قائم رکھی گئی کہ مصلحت کا اقتضاء[11] یہی تھا۔ الغرض اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس ہوئے دنیا کو مشکل سے ایک ربع صدی کا زمانہ گزرا ہوگا کہ واقعات و حالات نے اسے محو کرنا شروع کیا۔ اور زعامت دنیوی کے ساتھ ساتھ زعامت دینی سلاطینِ اسلام کی اتنی ضعیف ہوگئی کہ آخر کار پبلک پر اثر قائم رکھنے کے لئے ایک جماعت علمائے مذہب کی علیحدہ ایسی پیدا کی گئی جو حکومت کا ساتھ دینے والی ہو۔ اور جس وساطت سے دنیاوی حکومت کو مضبوط بنایا جائے چناں چہ تاریخ کے صفحات ایسے واقعات سے لبریز ہیں کہ علماءِ مذہب نے سلاطین و امراء کی اغراض پوری کرنے کے لئے حدیثیں وضع کیں۔ واقعاتِ تاریخ کو مسخ کیا اور شریعت میں بہت سی ایسی تبدیلیاں کیں جو فرمان روائے وقت کے اغراض و مصالح کی تکمیل کیلئے ضروری تھیں۔ ہر چند علماءِ سلف میں بعض ایسے نفوس بھی تھے جنھوں نے اپنے ضمیر کے خلاف کہنا کبھی گوارا نہیں کیا۔ (مثلاً جناب ابوحنیفہ کہ انہوں نے امویٔین و عباسیٔن دونوں کے کوڑے کھانا محض اس لئے گوارا کئے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف علوئین کو قرار دیتے تھے۔) لیکن عنصرِ غالب انہی علماء کا تھا جن کا علمِ دین حاکمِ وقت کی خواہشوں کے مطابق سانچہ میں ڈھل جاتا تھا اور جن کے احکام و فتاویٰ کو شاہانِ وقت بہ جبر ملک میں رائج کرتے تھے۔ چناں چہ فقہ حنفی کا ابویوسف کے فتاویٰ کے مطابق مدوّن ہونا اور ان کے استاد ابوحنیفہ کے اقوال پر عمل درآمد نہ ہونا اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔

الغرض جب فرماں روائے وقت کی دینی کمزوریوں کے اثرات کو دور کرنے کے لئے علمائے مذہب کی خدمات حاصل کی گئیں تو اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ اسلام کی وہ روح فنا ہو جائے جو شاہ و گدا کے امتیاز کو مٹانے والی تھی۔ جو بنی نوعِ انسان میں حرّیت و مساوات کا ذوق پیدا کرنا چاہتی تھی اور جو سرمایہ داری کی اسی لئے مخالف تھی کہ اس سے افرادِ قوم میں بالکل غلط اصول پر تفریق مدارج قائم ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب رفتہ رفتہ حکومتِ دنیوی ضعیف ہونے لگی اور اسی کے ساتھ علمائے مذہب کا وہ جاہ جلال بھی مٹنے لگا اور جو حمایتِ حکومت کی وجہ سے انہیں حاصل ہوا تھا تو انہیں فکر لاحق ہوئی کہ اس سیادت کو کیوں کر قائم رکھا جائے اور اس طرح اسلام میں سب سے پہلے ادارہ کہانت کی بنیاد پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام رفتہ رفتہ مذہب کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہوگئے اور دین اسلام نام رہ گیا صرف ان باتوں کا جو ہمارے علماء بتائیں اور مذہبی لٹریچر کو شجر ممنوع قرار دے کر عوام کو اس کے

11- امیر معاویہ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اہلِ مدینہ سے جن الفاظ میں خطاب کیا تھا ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے امیر معاویہ کو کتنی محبت تھی وہ الفاظ ملاحظہ ہوں "ولقد رضيت لكم نفسي على عمل ابن ابي قحافة (ابی بکر) و اردتها على عمل عمر فنفرت من ذالك نفارا شديدا و اردتها مثل ثنيات عثمان فابت علىّ فسلكت بها طريقا لى و لكم فيه منفعة (مو اكلة حسنة و مشاربة جميلة) فان لم تجدونى خيرلكم فانى خيركم ولاية"

مطالعہ سے روکا گیا تاکہ وہ ہمیشہ علمائے دین کے محتاج رہیں اور خود ان میں غور و فکر کی صلاحیت کبھی نہ پیدا ہو۔

اس وقت جو حالت ہمارے ہندوستان کے علمائے کرام کی ہے وہ اسی کاہنانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے نہ صرف بہ لحاظِ نفسیات بلکہ ظاہری وضع و صورت کے اعتبار سے بھی انہوں نے اپنے آپ کو قوم کے دوسرے افراد سے جُدا کرلیا ہے اور اس طرح اپنے اور عوام کے درمیان بینھما برزخ لا یبغیان کی ایسی زبردست حدِ فاصل کھینچ رکھی ہے کہ اس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس میں شک نہیں کہ ہر قوم اور ہر جماعت کیلئے ایک قائد و رہنما کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور عوام کی ذہنیت کو گمراہی سے بچانے کے لئے کسی نہ کسی ایسے دماغ کا پایا جانا لازم ہے جو ان پر خاص اقتدار رکھتا ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بالکل درست ہے کہ ایک پابندِ مذہب جماعت کے لئے یہ خدمت بہترین طور پر وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو مذہبی اقتدار رکھتا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مذہبی سیادت کا کیا مفہوم ہے اور ہندوستان کے علمائے اسلام اس سے کیا کام لے رہے ہیں۔

یوں تو مذہب بظاہر نام ہے صرف چند مخصوص عقائد کا لیکن مقصود بالذات محض عقائد نہیں ہیں بلکہ ان کی وساطت سے ایک غرضِ مشترک ایک مرکزِ اجتماع پیدا کرنا ہے اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر جب ہم اپنے علمائے کرام کے اعمال و افعال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے کہ انہوں نے اسلام کے مفہوم کو واقعتاً سمجھا بھی ہے یا نہیں۔ ہمارے علماء مختلف مدارج و اقسام کے ہیں۔ ایک تو سب سے ادنیٰ قسم وہ ہے جو قرآن حفظ کرکے اور فقہ کی چند کتابیں پڑھ کر امامت کی حد سے آگے نہیں بڑھتی اور مسجد کے حجرہ میں بظاہر راہبانہ زندگی بسر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ان علماء کا ہے جو درس تدریس کی چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرتے ہیں اور تعلیم قدامت پرستی سے قوم کے بچوں کا دماغ خراب کرنے کے لئے ایسا زیادہ معاوضہ بھی نہیں لیتے۔ تیسرا درجہ ان معلّمین و اساتذہ کا ہے جو قومی تعلیم گاہوں میں فضیلت کی پگڑی تقسیم کرنے کے ذمہ دار ہیں اور بہ سلسلہ مسائلِ شرعیہ وہ احکام صادر کیا کرتے ہیں جن کا تعلق صدہا سال قبل کے تمدن سے ہے۔ چوتھا درجہ ان علماء کا ہے جنہوں نے بیعت، توبہ و سلوک کے ادارے قائم کر رکھے ہیں اور جو خود تو "فنافی اللہ" ہونے کے مدعی ہیں لیکن اپنے مریدوں کو "فنافی الشیخ" کے درجہ سے آگے بڑھانا خلافِ مصلحت سمجھتے ہیں۔ پانچواں اور غالباً سب سے اعلیٰ درجہ ان علماء کا ہے جو سیاست میں حصہ لینے کے مدعی ہیں اور جنہوں نے اس غرض کیلئے جمعیتیں بھی قائم کر رکھی ہیں۔

خیر اول دو قسم کے مولویوں کو چھوڑیئے کیوں کہ ممکن ہے ان کو علماء کے گروہ میں شامل ہی نہ کیا جائے لیکن غایت و نتیجہ کے لحاظ سے مؤخرالذکر تین قسم کے علماء بھی ہم کو ویسے ہی نظر آتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس نے مسلمانوں کی تمدنی و معاشرتی اقتصادی واجتماعی زندگی کی اصلاح کو اپنے لائحہ عمل میں شامل کیا ہو۔ اول تو خود ان میں باہم دِگر ایسی حریفانہ کش مکش پائی جاتی ہے کہ عوام کیلئے یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کس کے خلوص پر اعتبار کیا جائے، جمعیۃ العلماء کانپور کی ہدایت پر عمل کیا جائے یا جمعیۃ العلماء دہلی کے مشورہ پر۔ لیکن اگر یہ اختلاف و تصادم نہ ہو تو بھی ان کے وجود کا کوئی افادی پہلو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر شہر کے بہشتی، معمار اور کفش دوز باقی نہ رہیں تو لوگوں کو واقعی بہت تکلیف پہنچے لیکن اگر مولویوں کی جماعت فنا ہو جائے تو قوم کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ نماز و روزہ کا رواج کم ہو جائے گا، مسجدیں ویران ہو جائیں گی یا بالفاظ دیگر یہ کہ روحانیت مفقود ہو جائے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روحانیت نام اسی نکبت و ذلت کا ہے جو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں پر طاری ہے اور صوم و صلوۃ کا رواج یا مسجدوں کی آبادی و رونق موجودہ علمائے کرام کی سرکردگی میں اسی قسم کی روحانیت پیدا کر سکتی ہے تو عذاب الٰہی کس چیز کا نام رکھا جائے گا اور قہرِ خداوندی کی اور کیا صورت قرار پائے گی؟

یہ امر غور طلب ہے کہ قرونِ اولیٰ میں بھی جب مسلمانوں کی ترقی سیلاب کی طرح بڑھ رہی تھی بالکل یہی نماز تھی بالکل یہی قیام و قعود، یہی روزہ تھا اور یہی اسحار و افطار، پھر اب کیا ہوا کہ اطاعت و گناہ کسی میں وہ لذت باقی نہ رہی۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ پہلے نمازیں پڑھی جاتی تھیں اصلاحِ نفس و اعمال کیلئے، احیائے قومیت کے لئے، احساسِ اجتماعیت کے لئے۔ اور اب اطاعت و عبادت بے روح ہے، بے مقصود ہے، کوئی منزل سامنے نہیں، کوئی ہدف پیش نظر نہیں، پہلے مسلمان نماز پڑھتا تھا تو دنیا ہی میں طرحِ فردوس ڈالتا تھا اپنے لئے یہیں حور و قصور پیدا کرلیتا تھا اور اب وہ سب کچھ "وعدۂ فردا" کی امید پر کرتا ہے اور اسلام کو اس دنیا سے بالکل علیحدہ کر کے اسے آخرت سے متعلق سمجھتا ہے جہاں نہ سوال جدوجہد کا ہے نہ سعی و عمل کا۔ اور یہ وہ ذہنیت ہے جو اسلام کے غلط مفہوم کی تبلیغ سے پیدا ہوئی ہے اور جس کے ذمہ دار حقیقتاً ہمارے مذہبی علماء ہیں۔

بعض حضرات انسانی ترقی کو دنیاوی فتوحات سے بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اسلام کا مدعا کسی سلطنت کا قیام یا حکومت کی بنیاد ڈالنا نہ تھا لیکن ایسا کہنا صرف واقعات کی تکذیب ہے بلکہ اسلامی تعلیم کی بھی مخالفت کرنا ہے رسول اللہ اور خلفاء کا جنگ

کر کے لوگوں کو مسلمان بنانا مالِ غنیمت کو مجاہدین میں تقسیم کرنا مفتوحہ ممالک کی آمدنی سے بیت المال قائم کرنا اسی لئے تھا کہ عربوں یا مسلمانوں کی حکومت دنیا میں قائم ہو اور غالباً یہ کوئی گناہ نہ تھا کیوں کہ ایک قوم کی ترقی کا کوئی مفہوم متعین ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کا کوئی خاص اقتدار قائم نہ ہو اور یہ اقتدار یقیناً اسی دنیا سے متعلق ہونا چاہیئے ورنہ مرنے کے بعد جب نہ سوال مسابقت ہو گا نہ سعی و نتیجہ کا۔ اگر محض عروج روحانی ہوا بھی تو بے کار ہے اور اس کی تعلیم و تلقین اس عالم میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ دنیا کے بعض مذاہب نے صرف روحانی پاکیزگی ہی کو اپنا اصل مقصد قرار دیا تھا اور اس دنیا میں تکلیفیں اٹھا اٹھا کر ختم ہو جانے کو حیاتِ ابدی بتایا لیکن اسلام کی تعلیم یہ نہ تھی اس نے اپنا مذہبی آئین اسی دنیا سے متعلق رکھا اور تمام وہ تدابیر بتائیں جو ایک قوم کی زندگی کو من حیث القوم کامیاب بنا سکتی ہیں۔ اس نے اگر اخوت و ہمدردی کی تعلیم دی تو دوسری طرف دشمنوں سے جنگ کرنے کا بھی حکم دیا اور اگر اس نے یہ بتایا کہ نجاتِ روحانی کا ذریعہ اخلاق کی پاکیزگی ہے تو اسی کے ساتھ یہ راز بھی ظاہر کر دیا کہ:

"جس نے اس دنیا میں اندھوں کی طرح زندگی بسر کی وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا"

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے تعلیماتِ اسلامی میں صرف روزہ و نماز کو تو لے لیا لیکن اس جوشِ عمل اور اس ولولۂ ترقی کو نظر انداز کر دیا جس کے پیدا کرنے کے لئے طاعت و عبادت کی پابندیاں پیدا کی گئی تھیں۔ انہوں نے دوزخ کے اژدہے اور جنت کی حوریں تو یاد رکھیں لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ جہنم میں جو چیز اژدہا بن کر ڈسنے والی ہے وہ اسی نکبت و ذلت کی دوسری صورت ہے جو اس دنیا میں کسی قوم پر مستولی ہو جاتی ہے اور جس لذت کو حور کہا جاتا ہے وہ اسی عروج و ترقی کا نام ہے جس کے بدولت ایک جماعت اسی دنیا کو جنت بنا لیتی ہے۔

آج ہمارے علمائے کرام ہم سے نمازیں تو پڑھوا لیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ کس نعمت کے شکریہ میں ان متواتر سجدوں کا خراج ہم سے وصول کیا جاتا ہے روزے تو ہم پر ہر سال مسلط کر دیتے ہیں مگر اس کی کوئی تدبیر نہیں بتاتے کہ احترامِ ماہ صیام کے احساس کیلئے گزشتہ گیارہ مہینوں تک شکم سیر ہو کر کھانے کے ذرائع مسلمان کو کیوں کر حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حصولِ نعمت و رزق کا ذریعہ یہی ہے تو پھر ہم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آج یہ ذریعہ کیوں بے کار ہو کر رہ گیا ہے۔ اور علمائے کرام کو چھوڑ کر وہی لوگ کیوں زیادہ نکبت زدہ نظر آتے ہیں جو زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مذہبی رہنماؤں نے اسلام کے فلسفہ کو سمجھا ہی نہیں اور غالباً وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ اسلام کا مفہوم یکسر

سعی و عمل ہے اور اصل عبادت وہی ہے جو ہر وقت ہمارے دماغ و جوارح کو متحرک رکھ کر ہمیں اپنی زندگی کا ثبوت دینے پر مجبور کرتی رہے۔

اسلام نے عاقبت کے بوریئے سمیٹنے کی تعلیم کبھی نہیں دی۔ اس نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ "نیکی کر اور دریا میں ڈال" اس نے زمین کی طنابیں کھینچ کر دنیا پر چھا جانے کا درس دیا۔ اس نے اچھے کام کر کے یہیں ان سے فائدہ اٹھانے کی ترکیبیں بتائیں اور یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ آخرت کی کھیتی اسی دنیا میں بوئی جاتی ہے اور فردوس کے تصورِ بلند بام کی بنیادیں بھی اسی عالم آب و گل میں استوار کی جاتی ہیں۔

پھر غور کرو تمہارے علماء تمہیں کیا بتاتے ہیں اور ان کی تعلیم کیا ہے؟ اگر وہ واقعی تمہارے اندر کوئی قومی احساس پیدا کر کے اس کارزارِ عالم میں تمہارے ساتھ رہ کر جنگ کرنے کے لئے تیار ہیں تو بے شک ان کی تقلید کرو اور کورانہ تقلید کرو لیکن اگر وہ تمہاری دنیا کو مٹا کر صرف تمہارے دین کے رہبر بننا چاہتے ہیں تو باور کرو کہ ان کی رہبری گمراہی ہے اور ان کی قیادت بربادی۔ ان کی طرف سے منہ موڑ لو۔ ان کے بتوں کو توڑ ڈالو اور خود سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہارے رسول نے تمہیں کیا بنانا چاہا تھا اور اب تم ان ہادیانِ غیر ہدایت یا فتہ کے زیر اثر بگڑ کر کیا ہو گئے ہو۔

○○○

افسانۂ روح وروحانیت

انسان کی زندگی اس میں شک نہیں کہ بہت سے معتقدات و مزعومات سے گھری ہوئی ہے اور ہر عقیدہ کے لئے وہ کوئی نہ کوئی دلیل بھی ضرور رکھتا ہے لیکن اگر ان دلائل کی قوت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سب سے زیادہ کم زور دلیل وہ ہے جو بقائے روح کے باب میں اس کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، قبل اس کے کہ آپ اس دلیل کو سنیں یہ معلوم کرنا مناسب ہے کہ بقائے روح کے معتقدین کہتے کیا ہیں؟

ان میں ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صرف روح کو بقاء ہے یعنی انسان میں جس چیز کو احساسِ تشخص، حافظہ اور تاثر سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مرنے کے بعد بھی قائم رہے گا۔ دوسری جماعت جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں وہ بقائے روح کے ساتھ حشرِ اجساد کے بھی قائل ہیں یعنی ایک دن ایسا آئے جب جسموں سے جدا ہو جانے والی روحیں پھر اپنے جسموں سے مل جائیں گی اور وہ تقریباً اسی قسم کی زندگی بسر کریں گی جیسی اس دنیا میں بسر کی ہے۔

حیات بعد الموت کا عقیدہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی نوعِ انسانی۔ اول اول جب انسان کی عقل بہت محدود تھی تو وہ اپنے مردہ عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھ کر سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کسی نہ کسی حیثیت سے اب بھی موجود ہیں اور پس ماندگان کے ساتھ ان کا وہی تعلق باقی ہے جو زندگی میں پایا جاتا تھا اور یہیں سے یہ اعتقاد پیدا ہوا کہ روح اور جسم دو بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور جب روح جسم سے جدا ہوتی ہے تو اس کی ہستی کسی نہ کسی طرح قائم رہتی ہے، چناں چہ اسی بناء پر ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں تا کہ اس کو حیات بعد الموت کے طویل سفر میں تشنگی اور گرسنگی کی تکلیف نہ پہنچے (مسلمانوں میں مرنے کے بعد فاتحہ وغیرہ کی رسمیں سب اسی عہدِ وحشت اور اسی اعتقادِ جاہلانہ کی یادگار ہیں)

خیر، اگر عہدِ قدیم کا جاہل انسان ایسا سمجھا جاتا تو جائے حیرت نہیں کیوں کہ وہ غریب، حیات کی حقیقت سے واقف ہی نہ تھا، لیکن اب کہ آغازِ حیات کے اسباب سے ہر شخص واقف ہو گیا ہے، روح کے بقاء کا قائل ہونا سخت حیرت ناک امر ہے۔

حیاتِ حیوانی کی تمام ترقی یافتہ شکلوں کی بنیاد صرف ایک خلیہ یا کویا (Cell) ہے لیکن حقیقتاً حیات کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کا پیوند دوسرے خلیہ سے ہو[12]۔ اس پیوند کے بعد بے شمار خلایا بنتے رہتے ہیں یہاں تک کہ حیوانی صورت ظہور پذیر ہوتی ہے اور ایک وقتِ معینہ کے بعد وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے، پھر حیاتِ دنیاوی میں بھی بے شمار خلایا اس کے جسم میں پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کسی بیماری یا حادثہ یا بڑھاپے کی وجہ سے خلایا کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر مناسب حالات کے تحت خلایا کا پیوند نہ ہو تو وجودِ حیات نہیں پایا جا سکتا، یہ درست ہے کہ سب سے پہلا خلیہ جو حیاتِ حیوانی کا باعث ہے خود جان رکھتا ہے لیکن وہ حیات ایسی نہیں ہوتی جو کسی دوسرے خلیہ سے ملے بغیر ظاہر ہو سکے۔

عورت میں تقریباً دس ہزار پہلی قسم کے خلایا موجود رہتے ہیں اور مرد میں ارب در ارب (بلکہ بے شمار) خلایا دوسری قسم کے پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سے صرف چند خلایا کا پیوند ہو کر حیات رونما ہوتی ہے۔ پھر اگر ان غیر پیوند شدہ بے کار خلایا میں بھی روح کا وجود مانا جائے اور مرنے کے بعد حیات مابعد کی وہی صورت تسلیم کی جائے جو ان غیر نتیجہ خیز خلایا میں پائی جاتی ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حیات سے کیا فائدہ ہے اور کیوں اس کی تمنا کی جائے؟

اگر وہ چیز جس کا نام ''روح'' ہے جسم سے بالکل علیحدہ کوئی شے ہے تو پھر لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب کہاں اور کیوں کر جسم کے اندر آ گئی، جب انسانی وجود عبارت ہے دو بے روح خلایا کے اتصال سے تو پھر روح ان میں کہاں سے آ گئی؟ اس کا جواب دینا ہمارا فرض نہیں۔

آپ نے سنا ہو گا کہ ایک جنین جس نے رحمِ مادر میں پوری پرورش پائی تھی اور جس میں جان پڑ گئی تھی کسی صدمہ سے بالکل بے جان پیدا ہوا لیکن بجلی اور دیگر آلات کی مدد سے اس میں جان پھر عود کر آئی اور وہ اپنی طبعی زندگی پوری کر کے مرا۔ اسی طرح آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ ایک شخص پانی میں ڈوب کر بالکل بے جان ہو گیا لیکن اس میں تنفس دوبارہ پیدا کر دیا گیا۔ پھر اگر روح واقعی جسم سے بالکل علیحدہ کوئی دوسری چیز ہے تو بتایا جائے کہ اس مردہ جنین اور اس غرق شدہ انسان میں اتنے عرصہ کے لئے روح کہاں

12- نباتات میں عام طور پر کسی دوسرے خلیہ سے پیوند ہونے ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی خلیہ ترقی پا کر اور اپنے اندر سے کثیر خلایا پیدا کر کے نشوونما کا باعث ہوتا ہے۔

چلی گئی تھی اور وہ کیوں ان تدابیر کا انتظار کر رہی تھی جو کہ اگر اختیار نہ کی جاتیں تو پھر روح کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ محض حیات کا وجود، وجودِ روح کے لئے ضروری نہیں اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہم جسمِ انسانی میں حیات سے تعبیر کرتے ہیں اسی کا دوسرا نام روح ہے کیوں کہ دیگر ذی حیات مخلوق اور انسان کے درمیان مابہ الامتیاز یہی امر ہے کہ انسان میں روح پائی جاتی ہے اور ان میں نہیں۔ ایک درخت میں "حیات" ہے لیکن روح نہیں، ایک جانور میں "زندگی" ہے لیکن روح نہیں۔ پھر یہ تو صحیح ہے کہ زندگی کا آغاز ایک خاص وقت سے شروع ہوتا ہے اور اس لئے اس کی انتہاء بھی ہونی چاہئے لیکن انسان کا حافظہ اور ادراکِ نفس مرنے کے بعد بھی قائم رہ سکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے روح کہتے ہیں۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے، انسان میں وجودِ روح کو تسلیم کرنا اور دیگر مخلوقات کو اس سے محروم سمجھنا ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی طرح اور ذی حیات اشیاء میں بھی ادراک و حافظہ نہ پایا جائے۔ گھوڑے، کتے اور بلّی کا برسوں کے بعد اپنے مالک کو پہچان لینا اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں قوتِ حافظہ پائی جاتی ہے اور ادراک بھی اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ادراک و حافظہ صرف انسان ہی کو میسر ہوا ہے تو پھر انسان کو اس وقت کی باتیں کیوں یاد نہیں رہتیں جب وہ رحمِ مادر میں تھا، یا جب دنیا میں آنے بعد اس نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا۔ اسی طرح ضعیف ہونے کے بعد انسان کیوں اپنے شباب کی بہت سی باتیں بھول جاتا ہے، اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ مرنے کے بعد یہ حافظہ و ادراک بھی ختم ہو جائے گا اور جس طرح پیدا ہونے سے پہلے عدم کی تاریکی تھی اسی طرح مرنے کے بعد طاری ہو جائے گی۔ نہ پہلے کچھ تھا نہ بعد میں کچھ ہو گا۔

عہدِ قدیم میں جب انسان نہ اپنے جسم کی تعمیری حقیقت سے واقف تھا اور نہ کائنات کی دوسری مخلوقات کا اسے علم تھا اس کا روحوں کے وجود کو جسم سے علیحدہ سمجھنا ٹھیک تھا کیوں کہ آسمانی جغرافیہ کی حقیقت اس کے نزدیک صرف یہ تھی کہ زمین کو آسمان گھیرے ہوئے ہے اور اس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ آسمان کے اوپر بہشت ہے جہاں فرشتے اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں لیکن اب کہ مکان و زمان کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے اور ہماری دور بینوں نے کرۂ ارض سے بہت زیادہ عظیم المرتبت اجرامِ سماوی

ہمارے سامنے پیش کر دیئے ہیں ہمارے لئے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لامتناہی فضا کی ان بے شمار دنیاؤں میں صرف کرۂ ارض ہی کے باشندوں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور انہی کی روحوں کو بقائے دوام کی خلعت سے سرفراز کیا گیا ہے پھر اور کرّوں کو جانے دیجئے خود اسی زمین کی اور تمام مخلوقات کو لیجئے کیا وجہ ہے کہ انسان کی روح کو بقا حاصل ہو اور جانوروں کی روحیں فنا کر دی جائیں اور اگر اس کا جواب صرف مصلحتِ خداوندی ہو سکتا ہے تو کیا وہی رضائے الٰہی و مصلحتِ ربانی، روحِ انسانی کو فنا نہیں کر سکتی، ایسا کرنے سے اسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اس میں کون سا استحالۂ عقلی ہے؟

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد روح، عالمِ برزخ میں رہتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسی وقت بہشت و دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ عالمِ برزخ یا بہشت و دوزخ ہیں کہاں؟ روح کا یہ سفر کس ذریعہ سے ہوتا ہے اور اپنی منزل تک پہنچنے کے بعد وہ کہاں اور کیوں کر رہتی ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملاقات ہو گی۔ گویا کوئی جگہ ایسی ہے جہاں ان سب کا اجتماع ہو گا اور وہ اسی دنیا کی طرح آپس میں تبادلۂ خیال کر سکیں گے۔ اب اسی اعتقاد کے ساتھ ان علمی حقائق کو بھی سامنے رکھئے کہ زمین اپنے محور پر نہایت تیزی سے گردش کر رہی ہے اور چوبیس ۲۴ گھنٹہ میں پوری ایک گردش کر لیتی ہے یعنی فی گھنٹہ ایک ہزار میل کی رفتار سے وہ گھوم رہی ہے، اسی کے ساتھ اس کی دوسری گردش آفتاب کے گرد ہے جو تقریباً ۹ کروڑ، ۳۰ لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ گردش پورے ایک سال میں پوری ہوتی ہے یعنی فی منٹ ایک ہزار میل کی رفتار سے زیادہ زمین کو آفتاب کے گرد چکر لگانا پڑتا ہے پھر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک اور تیسری گردش ہمارے نظامِ شمسی کی ہے جو قطب کے گرد ہوتی رہتی ہے اور چوتھی گردش نظامِ قطبی کی ہے جو خدا معلوم کتنے نظام ہائے شمسی کے ساتھ فضاءِ کہکشاں میں کسی اور مرکز کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ پھر کیا ان تمام چکروں اور گردشوں میں باشندگان کرۂ ارض کی روحوں کا جسم سے جدا ہو کر باہم دِگر ملنا یا کسی ایک جگہ قرار پانا باور کیا جا سکتا ہے؟

بعض نہایت سخت مذہبی قسم کے لوگ باور کرتے ہیں کہ انسان قیامت کے دن مع اپنے جسم کے اٹھایا جائے گا۔ اب سے دو ہزار سال قبل اہلِ فلسطین جب وہ نہ زمین کی حقیقت سے آگاہ تھے نہ کائنات کی وسعت سے، یقین رکھتے تھے کہ زمین کی عمر چار ہزار سال کی ہے اور طوفان کے بعد دنیا کو بسے ہوئے صرف دو ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے، اور

جلد ہی اس کو پھر تباہ ہو جانا ہے لیکن آج یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ انسان کا وجود کرۂ زمین پر لاکھوں سال سے پایا جاتا ہے اور اس دوران میں دنیا خدا معلوم کتنی مرتبہ بدل چکی ہے۔ کم از کم تین چار تو صرف برفیلے دور ایسے آ چکے ہیں جنہوں نے زمین کی تمام انسانی آبادی کو یا تو سمندر میں ڈبو کر رکھ دیا یا زمین کے اندر دفن کر کے ختم کر دیا۔

خدا جانے کتنی بار نوعِ انسانی جانوروں کی غذا بن کر ختم ہوئی اور پھر انہی سے پیدا ہوئی، الغرض موجودہ انسان میں معلوم نہیں کتنے گزشتہ انسانوں اور جانوروں کے اجزاء شامل ہیں اس لئے اگر حشرِ اجساد کو تسلیم کیا جائے تو وہ کون سا کیمیائی طریقہ ہو گا جو لاکھوں سال قبل کے انسانوں کے تقسیم شدہ اجزاء کو پھر فراہم کر سکے گا اور اگر میرا حشر ہوا تو کن کن جانوروں، کن کن درختوں اور کن کن انسانوں سے میرے اجزاء فراہم کر کے میرا اصلی جسم تیار کیا جائے گا۔

فطرت کے وہ تمام تغیرات جو انسانی ہیولیٰ میں نشو و نما، بیماری، ضعیفی اور موت وغیرہ کی صورتیں اختیار کرتے ہیں بالکل ایسے ہی ہیں جیسے ہم ایک جلنے والے کوئلہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ انگیٹھی میں کوئلہ ڈال دیتے ہیں اس کا کیا حشر ہوتا ہے؟ ایک حصہ اس کا دھواں بن کر غائب ہو جاتا ہے، ایک حصہ حرارت میں تبدیل ہو کر آپ کے کمرے کو گرم رکھتا ہے اور کچھ حصہ راکھ بن جاتا ہے بالکل یہی حالت انسان کی سمجھئے، فطرت ہر وقت جوڑنے، توڑنے ملانے اور منتشر کرنے میں مصروف ہے اور قوت و مادہ کو وہ اسی طرح نئی نئی عمارتوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان جو اسی دنیا، اسی نظام اور اسی مادہ سے متعلق ہے اس عمل سے بچا رہے گا۔ اگر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر فانی سمجھے تو ایک چیونٹی بھی یہی دعویٰ کر سکتی ہے، ایک گھاس کا تنکا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ روح ہم میں بھی ہے اور ان میں بھی اور اگر ہماری روح کو بقاء ہے تو ان کی روحوں کو بھی ہونا چاہئے۔

زندگی حقیقتاً نام ہے صرف اس توازن کا جو فطرت کی تعمیری و تخریبی دو متضاد قوتوں میں پایا جاتا ہے۔ فطرت کی تعمیری قوت ہمیں قائم رکھنا چاہتی ہے اور تخریبی وقت مٹانے پر تلی ہوئی ہے، جب تک ان دونوں میں توازن قائم ہے ہم صحیح و توانا کہلاتے ہیں، لیکن جب رفتہ رفتہ تخریبی قوت غالب آنے لگتی ہے تو ہم ضعیف ہو جاتے ہیں اور جب اس کا بالکل تصرف ہو جاتا ہے تو ہم مر جاتے ہیں لیکن ہماری قوت کے بعد فطرت کا یہ عمل بند نہیں ہوتا بلکہ برابر

جاری رہتاہے اور ہماری تخریب سے پھر تعمیر شروع ہونے لگتی ہے، خواہ وہ تعمیر کیڑوں کی ہو یا نباتات و حیوانات کی، اس لئے اب پھر ہمارے انہی اجزاء کا فراہم ہو کر یک جا ہونا اور اصل صورت و شکل سے رونما ہونا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

حشر و نشر یا بقائے روح کا عقیدہ صرف جذبۂ محبت کی بناء پر پیدا ہوا ہے جس سے مقصود اپنے آپ کو تسکین پہنچانا ہے۔ اول اول جب انسان نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ، اس کے بچے، اس کے بھائی بہن، اس کے سردار اور بزرگ دفعۃً مر گئے تو اسے سخت صدمہ ہوا اور اسے کسی طرح یقین نہ آیا کہ واقعی ہمیشہ کے لئے فنا ہو گئے ہیں اس کے بعد جب اس نے انہیں خواب میں بھی دیکھا، خواب میں ان سے باتیں بھی کیں تو اس کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ ان کی روحیں موجود ہیں اور ہم سے وہی تعلق محبت رکھتی ہیں۔ پھر یہ عقیدہ برابر اس وقت تک قائم رہا جب تک انسان نے حیات کی حقیقت کو نہیں جانا اور اب بھی انہی قوموں میں باقی ہے جو اس حقیت سے ناواقف ہیں یا ناواقف رہنا چاہتی ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کیا فی الحقیقت انہیں اس کا یقین بھی ہے؟ ممکن ہے وہ اس کا اقرار کریں، لیکن مجھے اس میں کلام ہے۔ اس سے قبل میں عقیدہ و یقین کا فرق بتا چکا ہوں اور ثابت کر چکا ہوں کہ تمام وہ عقائد جن کا تعلق مابعد الموت سے ہے وہ سب مزعومات و قیاسات ہیں۔ حقیقت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں کیوں کہ علمِ حقیقی کا تعلق صرف ہمارے حواس اور ہمارے ادراک سے ہے یا ان تجربات سے جو بربنائے تواتر محسوسات کا حکم رکھتے ہیں۔ اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔

اچھا اس فلسفیانہ موشگافی کو جانے دیجئے، وہ لوگ جو حیاب بعد الموت کے قائل ہیں اور حقیقی سکون و آرام کی زندگی اسی کو سمجھتے ہیں، ان سے پوچھئے کہ باوجود اس علم کے کہ دنیاوی زندگی ناپائیدار و مکلّف ہے اور اُخروی زندگی ابدی راحت، وہ کیوں یہاں کی زندگی پر جان دیتے ہیں؟ جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں علاج کراتے ہیں؟ تپِ دق اور سرطان میں مبتلا ہونے کے بعد انہیں موت کا یقین ہوتا ہے لیکن پھر بھی چارہ و علاج ضرور کرتے ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انہیں اخروی زندگی کا صرف اعتقاد ہے، یقین نہیں۔ اگر انہیں یقین ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے اس دنیا میں رہنا پسند نہ کرتے اور جلد سے جلد اس عالم میں پہنچنے کی کوشش کرتے جہاں بہشت کی راحتیں ہیں، حوروں کی آغوشیں ہیں، بچھڑے ہوئے احباب ہیں، چھوٹے ہوئے اعزّہ ہیں، جدا ہو جانے والی اولادیں ہیں اور وہ

سب کچھ ہے جو یہاں میسر نہیں آسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے سے ڈر اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے گناہوں کی سزا وہاں ملے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس خیال میں بھی وہی اعتقاد کام کر رہا ہے جسے یقین سے کوئی واسطہ نہیں، کیوں کہ اگر واقعی سزا کا یقین ہوتا تو قیامت تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ مرنے کے بعد نہ معاصی کی سزا کا یقین ہے اور نہ نیکیوں کی جزا کا، ورنہ ممکن نہیں کہ یہاں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو یا اس دنیا میں جیتے رہنے کی تمنا دل میں پائی جائے۔

وہ لوگ جو بقائے روح کے قائل ہیں وہ اپنے عقیدے کے ثبوت میں امریکہ و مغرب کے ان روحانئین کے بیان کو بھی پیش کرتے ہیں جنھوں نے روحوں سے ہم کلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی نسبت ہم اجمالاً پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں اور ان مدعیانِ روح و روحانیت نے کس کس طرح لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا کیا ہے اور جس چیز کو روحوں کا نامہ و پیام کہا جاتا ہے وہ کتنا بڑا مکر و فریب ہے۔

الغرض مسئلہ روح یا حیات بعد الموت مِن جملہ ان چند مسائل کے ہے جو صرف انسانی تمنا کی پیداوار ہیں، اور ان عقائد سے متعلق ہیں جن کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی بلکہ جو سراسر اصولِ فطرت و نظامِ عالم کے منافی ہیں۔ پس اگر مذاہبِ عالم کا انحصار صرف معاد یا حیات بعد الموت پر ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے تو اب کوئی امید نہیں کہ وہ عرصہ تک قائم رہ سکیں، کیوں کہ جوں جوں مادی و علمی ترقی بڑھتی جارہی ہے انسان میں خود اعتمادی کی کیفیت زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ کسی بات کو محض اس دلیل پر ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ اب سے پہلے کے لوگ ایسا کہہ گئے ہیں لیکن اگر مذاہب کی زندگی کا تعلق کسی ایسے درسِ اخلاق سے بھی ہے جو اسی دنیا میں کام آنے والا ہے اور اسی عالم میں داعیاتِ تمدن کو پورا کرنے والا ہے تو ان کے لئے لازم ہے کہ وہ صرف اسی پر اپنی بنیاد قائم کریں اور ان عقائد پر زور نہ دیں جو ان کی کمزوری کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ لیکن چوں کہ اس کی بظاہر کوئی امید نہیں ہے اس لئے مذاہبِ عالم کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور ڈیموکریسی و مشینری کی ترقی کے ساتھ ایک دن اس کو بالکل ختم ہو جانا ہے کیوں کہ اس وقت تک سب سے زیادہ دشمنی مذہب کے ساتھ انہی دو چیزوں نے کی ہے اور ان کی ترقی کا کھلا ہوا نتیجہ مذاہب کا زوال ہے۔

○○○

خودنمائی خدا شناسی است

ہمارے علماء ہمارے قائدینِ ملت اور ہماری جماعت کے وہ تمام افراد جو محراب و منبر کی بلندی سے صدائے موعظت بلند کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگر ان سب کی پند و نصیحت میں کوئی چیز ''قدرِ مشترک'' کی حیثیت سے نظر آتی ہے تو صرف یہ تعلیم کہ مسلمان اس وقت تک صحیح مسلمان نہیں بن سکتا جب تک وہ بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے نہ ہٹے لیکن یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس سے کیا مقصود ہے؟

ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تلقین کے سلسلہ میں سب سے پہلے ''خیر القرون قرنی'' کی تصویر ان کے سامنے آتی ہوگی۔ اس کے بعد صحابہ کا دور پیشِ نظر ہوتا ہوگا اور پھر تابعین و تبع تابعین کا، لیکن آپ کسی مولوی سے دریافت کیجیئے کہ وہ عہدِ نبوی کو تاریخِ انسانی کا کیوں بہترین دور قرار دیتا ہے تو وہ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہیں بتا سکے گا کہ اس وقت صدائے توحید بلند ہو رہی تھی۔ صنم کدے ویران کئے جا رہے تھے لوگ خشوع و خضوع سے نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور محض رسول اللہ کا دیدار ہی نجات کے لئے کافی تھا۔ اس کے بعد وہ دورِ صحابہ کی برکات کا ذکر کرے گا کیوں کہ یہ زمانہ عہدِ نبوی سے زیادہ قریب تھا۔ پھر وہ تابعین کے زمانہ کی تعریف کرے گا اور صرف اس بناء پر کہ اس عہد کے لوگوں نے صحابہ کو دیکھا تھا اور پھر تبعِ تابعین کا ذکر کرے گا کیوں کہ انہوں نے تابعین سے فیضِ صحبت حاصل کیا تھا۔ الغرض ایک مولوی کے سامنے وقت و زمانہ کی خوبی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ وہ عہد رسول اللہ سے قریب تر واقع ہو اور اس کے بدترین ہونے کی صورت یہ ہے کہ عہد نبوی سے اس کا بہت زیادہ بُعد ہو۔ چناں چہ دنیا جتنی آگے بڑھتی جائے گی اتنی ہی خراب ہوتی جائے گی۔ پھر حیرت ہے کہ ایک زمانہ کی سعادت و عدمِ سعادت صرف اس پر منحصر ہے کہ وہ کسی مخصوص انسان سے قریب واقع ہے یا دُور، ہم پیچھے ہٹ کر کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جب کہ وہ کسی طرح واپس نہیں آسکتا اور ہم اس کے دیدار سے دوزخ اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتے۔

میرا مقصود اس تمہید سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے جو تدابیر قائدین مذہب کی طرف سے بتائی جاتی ہیں وہ مقالاً خواہ کتنی ہی شاندار و امید افزا کیوں نہ ہوں لیکن معنا یکسر لغو و مہمل ہیں۔ ایک واعظ صدائے توحید کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کو ایک کہہ دینے سے انسان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ کفر و بت پرستی کے استیصال کا کارنامہ نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ پتھر کی مورتوں کو توڑ دینا کیوں انسانیت کا منتہائے ترقی قرار دیا جائے، وہ نماز و روزہ کی متفرعانہ کیفیت کا فسانہ دہراتا ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ جنبش اعضاء کی چند مقررہ صورتیں اور فقر و فاقہ کی تنگی کو کیوں سعادت انسانی سمجھا جائے۔ وہ صرف رسول اللہ کے دیدار کو کافی ذریعہ نجات قرار دیتا ہے حالانکہ رسول کے دیکھنے والے اگر ایک طرف ابو بکر و علی تھے، تو دوسری طرف ابو جہل و ابو لہب بھی پائے جاتے تھے۔ گو یہ فرق ضرور تھا کہ جنھوں نے آخری نجات حاصل کی ان میں شاید جذبہ شخص پرستی موجود تھا اور جو گمراہ کہلائے وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مجھ سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے بہتر زمانہ کون سا تھا تو میں بھی بلا تامل عہد نبوی کا نام لے دوں گا لیکن اس کا تعلق نہ رسول اللہ کی ذات سے ہو گا نہ ان کے دیدار سے بلکہ صرف اس روح سے جو اس انسان کامل نے پیدا کی اور اس عزم دارادہ سے جس نے ایک پست و جاہل قوم کو دفعتہً قعر مذلت سے نکال کر بام ترقی پر پہنچا دیا۔

یقینا رسول اللہ نے توحید کا درس دیا لیکن اس سے مراد محض خدا کو ایک کہنا یا سمجھنا نہ تھا کیوں کہ صرف یہ عقیدہ انسانی ترقی یا فلاح کو متلزم نہیں بلکہ اس سے مراد ایک عام جذبہ اتحاد و اخوت کو بیدار کرنا تھا، تمام نوع انسانی کو ایک رشتہ اجتماعیت سے وابستہ کرنا تھا اور اس موثر برتر اعلیٰ میں سے ہو کر (جو یقیناً ہر ہر ذرہ میں کارفرما ہے) ایک ایسی جمیل فضا پیدا کر دینا تھا، جہاں خدا سمٹ کر انسان اور انسان پھیل کر خدا بن جاتا ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ نے کفر و بت پرستی کے خلاف پوری جدوجہد سے کام لیا لیکن کفر سے مراد خودی کا انکار تھا، انانیتِ کبریٰ سے اعراض تھا اور بُت پرستی نام تھا اس کورانہ تقلید و جاہلانہ سرنگوئی کا، جو ایک انسان سے احساس انسانیت و برتری چھین لینے والی ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ سرکارِ نبوت سے طاعت و عبادت کی بھی ہدایت کی گئی لیکن اس کا مطمحِ نظر صرف اس قوت کو سراہنا تھا جو نظامِ کائنات کو تکمیل و تجمیل کی طرف

لے جا رہی ہے اور اس سے کسبِ فیضان کر کے خود اس وقت کا دست و بازو بن جاتا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زمین پر سر ٹیک دینے سے نہ خدا کے مرتبہ میں کوئی بلندی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس عجز و فروتنی کی اسے ضرورت۔

الغرض یہ بالکل صحیح ہے کہ عہدِ نبوی بہترین زمانہ تھا۔ لیکن اس کا تعلق نہ صرف روزہ نماز سے تھا نہ ظاہری مراسمِ نیایش و عبودیت سے، نہ زبانی تسبیح و تہلیل سے اسے کوئی واسطہ تھا نہ مسواک و مصلیٰ سے بلکہ وہ ایک زمانہ تھا جس نے سوتی ہوئی انسانیت کو جگایا جس نے فطرت کے قوائے کا منہ کو انسان کے لیے بے نقاب کیا اور جس نے نوامیسِ الٰہیہ کو دسترس انسانی سے قریب تر کر کے عالم کی ذہنیت کا رخ بدل دیا۔

پس یقیناً وہ عہد نہایت مبارک عہد تھا، جب آفتابِ حقیقت نے اوّل اوّل اس طرح طلوع کیا اور لاریب وہ زمانہ سراہے جانے کے قابل ہے جب شاہدِ مقصود سب سے پہلے برافگندہ نقاب سامنے آیا، لیکن اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس ابتداء کو کسی انتہا کی ضرورت نہ تھی، یہ آغاز و انجام سے بے نیاز تھا، اس آفتاب کا طلوع نصف النہار سے مستغنی تھا۔ تو یقینا اس کا دعویٰ غلط ہو گا، کیوں کہ دنیا کا کوئی تخم دفعتہً بارآور نہیں ہو سکتا کوئی تعمیر فوراً استوار نہیں ہوتی اور منزل تک پہنچنے کے لیے قطع سفر ضروری ہے رسول اللہ نے بے شک انسانیت کے دور جدید کی بنیاد قائم کی لیکن اس توقع کے ساتھ کہ آئندہ نوع انسانی اس کو عروج و کمال تک پہنچائے اور خدا کا وہ وعدہ جو ”جناتِ عدن“ کی صورت میں کیا گیا تھا پورا ہو کر رہے۔

پھر اب دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ کس قوم نے اس رمز کو سمجھ کر ان مدارجِ استعلاء کو حاصل کیا جو ایک سچے مومن و مسلم کو حاصل کرنا چاہئے اور وہ کون سی قوم ہے جو اس تعلیم کو نظر انداز کر کے -------- ھل یھلك الّا القوم الفاسقون کی تغریر میں مبتلا ہوئی یہ ہماری کوتاہ نظری ہے کہ ہم خدائی فیصلوں اور ربّانی اصول میں ملک و ملت، رنگ و نسل، کفر و اسلام کی تفریق کو سامنے رکھ کر خطا و صواب کا معیار قائم کرتے ہیں، جو فطرت مشرق میں جلوہ گر ہے وہی مغرب میں ہے، قدرت کی جو کار فرمائیاں شمال میں نظر آتی ہیں وہی جنوب میں بھی ہیں، شاہراہ صرف ایک ہی ہے جس کا دوسرا نام دینِ فطرت ہے اور یہ سب کے لیے یکساں کھلی ہوئی ہے، یہود و نصاریٰ کافر و مسلمان کی تفریق صرف ہماری بے بصری نتیجہ ہے اور یہ نام وہ ہیں جو خدا کی لوحِ محفوظ یعنی صحیفۂ قدرت

کے اوراق میں کسی جگہ نظر نہیں آتے۔ وہاں ان سب کو صرف ایک ہی نام لفظ ''انسان'' سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لئے صرف ایک پہچان ''كل مولود يولد على فطرة الاسلام" بتائی گئی ہے اور یہ فخر صرف بانئ اسلام ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اس نے اس راز کو ظاہر کیا اور اس طرح اس نے اوّل اوّل جملہ افراد نوعِ انسانی کو ایک ہی منزل کی طرف قدم بڑھانے اور ایک ہی مرکز پر جمع ہونے کی تعلیم دی۔ لیکن ہماری کوتاہ فہمیوں کی یہ داستان کتنی دردناک ہے کہ جس قوم پر سب سے پہلے اس کا راز افشاں کیا گیا اسی نے سب سے زیادہ اس کو ٹھکرایا اور انسانیت کو جس جماعت سے سب سے زیادہ توقع داد پانے کی تھی وہی سب سے زیادہ ''خستۂ تیغ ستم'' نکلی۔

اب سے اربوں سال قبل جس کرۂ ارض کی تخلیق ہوئی تھی، ہر چند وہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ اس کے شباب و بلوغ کا زمانہ آرہا ہے اس کی تحسین و تجمیل آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی ہے اور اس شراب کے رسا ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے، علوم و فنون کے چشمے ہر طرف اُبل رہے ہیں، کائنات کے تمام چھپے ہوئے راز کھلتے جارہے ہیں، قدرت کی جملہ برکات ہمارے لیے یسیر الحصول ہوتی جاتی ہیں، عناصرِ عالم نے انسان کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیا ہے استخلاف فی الارض کا وہ وعدۂ ربانی جو یوم الست میں کیا گیا تھا بہت جلد پورا ہونے والا ہے اور دنیا ایک زمانۂ دراز تک انتظار کے جہنم میں پھنکنے کے بعد قرب و وصال کی فردوس سے ہم آغوش ہونے والی ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سعادت و برکت ان کے لیے مقسوم نہیں ہے جنہوں نے دنیا کو ''سجن المؤمن'' سمجھ کر اس کو ٹھکرا دیا بلکہ ان خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے اس قید خانہ کو اپنے لئے رشک فردوس بنالیا خواہ اس کا نام آپ '' جنّۃالکافر'' ہی کیوں نہ قرار دیں۔

انسان اسی دنیا کا ایک جزو ہے، اور اسی کو آباد کرنے کے لیے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ قدرت نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ یہاں مفلوج و عاجز بے کس و مفلس، نادار و ناچار، محتاج و بیمار بن کر زندگی بسر کرے، دنیا خدا کا ایک باغ ہے جس کو اس نے پھولنے اور پھلنے کے لیے نصب کیا تھا نہ کہ ویران و برباد ہونے کے لیے، پھر جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ موسم بہار کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں، دور خزاں ختم ہو چلا ہے، تازہ کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، گلہائے رنگارنگ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہے ہیں اور بہت جلد خود ذاتِ ربانی اس کسوتِ نشاط و جمال میں رونما ہونے والی ہے جسے دستِ انسانی نے اپنے خالق کے

لیے تیار کیا ہے خدا غنی ہے اور وہ اس کا مہمان نہیں ہو سکتا جو محتاج و مفلس ہے، خدا غالب و قدیر ہے اس لیے وہ مغلوب و مفتوح کی دعوت قبول نہیں کر سکتا، خدا پاکیزہ و طاہر ہے اس لیے وہ کثیف و بدسلیقہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، خدا اجمل و اکمل ہے اس لیے وہ ناقص و بد صورت سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا، جس چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اسے مکمل دیکھنا چاہتا ہے اسے نقص سے نفرت ہے بدصورتی سے احتراز ہے حزن و ملال سے استکراہ ہے۔ اور اس لیے وہ قومیں جو درماندہ و عاجز ہیں، مغموم و ملول ہیں یقیناوہی ہیں جن کی طرف سے اس نے اپنا منہ پھیر لیا ہے اور جو قومیں غالب و فاتح ہیں، مسرور و شاد کام ہیں بے شک وہی ہیں جن سے خدا خوش ہے اور جن کو وہ دوست رکھتا ہے۔

اس زمانہ میں ایک متشائم (Pessimistic) قوم کو زندہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، وہ جماعت جو اپنی کاہلی اور قوتِ عمل کے فقدان کو "تقدیر و توکل" کے نام سے موسوم کرکے گدایانہ زندگی بسر کر رہی ہے، وہ یقینا ہلاک ہو کر رہے گی اور اسی ہلاک ہو جانا چاہیئے۔ دنیا فطرت کا وہ کارنامہ ہے جس میں اس کی انتہائی تمنائے نشاط صرف ہو رہی ہے اور اس لیے ایک حزین و مایوس ہستی کا اس میں گزر نہیں۔ باغ کے وہ تمام پودے جو بیمار ہو کر مضمحل ہونے لگتے ہیں ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے صحیح و توانا درخت متاثر نہ ہوں۔ بالکل اسی طرح وہ جماعتیں بھی فنا ہو جائیں گی جن کے قواء مضمحل، جن کے دماغ ضعیف اور جن کی ذہنیتیں بیمار ہیں تاکہ خدا کی یہ کھیتی لہلہا اُٹھے اور اس کی زمین تمام خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔

○○○

کیا مذہب فطری چیز ہے؟

ایک زمانہ انسان پر ایسا بھی گذرا ہے جب مذہب سے انکار تو خیر بڑی چیز ہے اس کی حقیقت پر غور کرنا بھی مصیبت خیال کیا جاتا تھا اور اس قسم کی بحث گویا توہین خداوندی کے مترادف تھی چناں چہ انیسویں صدی کے وسط تک اس مذہبی گرفت اور ذہنی غلامی کا یہ عالم تھا کہ کائنات کو انسان نے خدا اور شیطان کے درمیان تقسیم کر رکھا تھا۔ یعنی تمام اچھی باتیں خدا سے منسوب کی جاتی تھیں اور بُری باتیں شیطان سے، گویا انسان ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا جانور تھا جو نہ خود کچھ کر سکتا تھا اور نہ وہ کسی بات کا ذمہ دار قرار پا سکتا تھا۔

لیکن اب کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر کیفیت پر علمی و تحقیقی نقطہ نظر سے بحث کی جاتی ہے اور ایک ایک ذرہ سے لے کر پہاڑوں کی سر بفلک چٹانوں تک کوئی چیز ایسی نہیں جو مطالعہ علم و تحقیق سے باہر ہو، مذہب کا بچنا دشوار تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ علم درازدستی سے محفوظ رہ سکتا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علم سائنس کا تعلق صرف مادی چیزوں سے ہے اور مذہب چوں کہ روحانی چیز ہے اس لیے سائنس کی رسائی وہاں ممکن نہیں، لیکن یہ غلط ہے کیوں کہ سائنس کا تعلق جس طرح مادی چیزوں سے ہے اسی طرح غیر مادی اشیاء سے بھی ہے۔ اگر وہ کمیت سے بحث کرتا ہے تو کیفیت بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ چناں چہ نفسیات جس کا تعلق نفس سے ہے وجدانیات یا جمالیات جس کا تعلق حسن و جمال سے ہے اخلاقیات جو انسان کے اخلاق سے متعلق ہے اور اسی طرح کے دیگر علوم سب غیر مادی چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

سائنس فی الحقیقت نام ہے ایک صحیح اور بے لاگ انتقادی مطالعہ کا خواہ اس کا موضوع کوئی مادی چیز ہو یا غیر مادی اور اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب جو ہزاروں سال سے انسانی رجحانات پر حکمرانی کرتا چلا آرہا ہے محض اس لیے کہ اس کا تعلق روح و روحانیت سے ظاہر کیا جاتا ہے، تحقیق علمی کی حدود سے باہر رکھا جائے چناں چہ آج کی صحبت میں ہم اس موضوع پر خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کر کے دیکھیں گے کہ مذہب

کی حقیقت کیا ہے اور وہ انسانیت کے لیے ضروری ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ مسئلہ غور طلب ہے آیا کہ مذہب واقعی کوئی الہامی چیز ہے، یعنی کیا خدا کی طرف سے اس کی پابندی انسان پر عائد کی گئی ہے اور اس کے بعد یہ کہ اگر الہامی نہیں ہے تو اس کے وجود کے اسباب کیا تھے؟

اگر ہم اس کو تسلیم کرلیں کہ مذہب کا مقصود نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا نے انسان کی آفرینش کے ساتھ ہی ساتھ مذہب بھی الہام کیا ہو گا ورنہ اس کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ خدا نے اوّل اوّل تو ہدایت کو ضروری خیال نہ کیا تھا، لیکن بعد کو اس کی ضرورت اس نے محسوس کی جو یقیناً شان خداوندی کے منافی ہے اگر خدا کا مقصود انسان کی آفرینش سے کوئی بے معنیٰ کھیل نہ تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اولین عہد کے انسان کی پروانہ کرتا اور زمانہ بعد کے انسانوں کو قابلِ توجہ سمجھتا جبکہ اصولاً نو وارد انسان کو حقیقتاً زیادہ تنبیہ و ہدایت کی ضرورت تھی لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ عہد ما بعد کے تمام ترقی یافتہ مذاہب جن میں اسلام اور عیسویت کو زیادہ نمایاں درجہ حاصل ہے صرف اپنے ہی کو الہامی مذہب قرار دیتے ہیں اور قرون ماضیہ کو عہد تاریک، دور جاہلیت، زمانہ وحشت و بربریت کے ناموں سے یاد کر کے گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگ بالکل گمراہ تھے اور وہ کسی مذہب کے پابند نہ تھے پھر اس اعتراض کا جواب کہ خدا نے کیوں ایک طویل زمانہ تک انسان کو گمراہ رکھا اور کیوں نہ ان میں کوئی نبی یا پیغمبر بھیج کر صراطِ مستقیم سے آشنا کیا، ہم پر عائد نہیں ہوتا ہے بلکہ انہی جماعتوں پر عائد ہوتا ہے جو اپنے آپ کو الہامی مذاہب کا پابند بتاتی ہیں۔

وہ حضرات جو اثریات سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں معلوم ہو گا کہ انسان کے عہد حجری کی جو چیزیں (لاکھوں سال قبل کی) اِس وقت تک زمین سے برآمد ہوئی ہیں وہ مشتمل ہیں صرف چند مخصوص آلات و اوزار پر اور ان کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ خدا یا مذہب کے وجود کا بھی قائل تھا۔ البتہ اب سے 20 ہزار سال قبل کی چیزوں میں ضرور ہاتھی دانت یا پتھر کے ایسے نقوش یا بُت دریافت ہوئے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے وہ مذہبی خیالات کے زیر اثر بنائے گئے ہوں اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کے وجود کے ساتھ مذہب کا وجود ظہور میں نہیں آیا اور اس لیے یہ دعویٰ کرنا کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے یا یہ کہ

اس کا تعلق الہام خداوندی سے ہے کوئی معنٰی نہیں رکھتا۔

علوم جدیدہ سے مسائل میں مذہب کو سب سے زیادہ نقصان جس چیز نے پہنچایا ہے وہ مسئلہ ارتقاءہے کیوں کہ اس نے ثابت کر دیاہے کہ ہر چیز خواہ وہ مادہ سے متعلق ہو یا نفس سے ماحول کے زیر اثر تدریجاً آگے بڑھتی ہے اور پھر چوں کہ مذہب کا خیال غذا یا لباس کی طرح فطری مجبوری کا نتیجہ نہ تھا اس لیے ظاہر ہے کہ اس کا وجود بھی اسباب، معشیت وماحول کے زیر اثر ظہور میں آیا ہو گا اور ایک قوم پر جو زمانہ جس حال میں بسر ہوا ہو گا اسی کے تحت اس کے مذہبی خیال میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی ہو گی قیام مذہب کی بنیاد، وجود خدا کے عقیدہ پر قائم ہے اور خدا کا تصور جس جس طرح مختلف اوقات میں انسان نے کیاہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہو تاہے کہ خدا کو انسان کا خالق کہنا شاید اتنا موزوں نہیں ہے جتنا انسان کو خدا کا خالق کہنا۔

علم الانسان اور تاریخ مذہب کے ماہرین اس باب میں مختلف الخیال ہیں کہ خدا کا وجود ذہنِ انسانی میں سب سے پہلے کب اور کیوں کر آیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی ابتداء قواء فطرت یا فطری اشیاء کے مطالعہ سے ہوئی ہے یعنی آسمان وزمین میں جو چیز یا جو قوت انسان کو مفید یا عجیب نظر آئی اسی کو وہ پوجنے لگا۔ چناں چہ درخت، پتھر، پہاڑ، ستارے، چاند، سورج وغیرہ مختلف مظاہر فطرت کو انسان نے خدا سمجھا اور ان کی پرستش شروع کر دی، بعض کے نزدیک اس کا تعلق قبائل کے سرداروں اور اسلاف کی یاد سے ہے،یعنی قبائل کے جن لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور آباواجداد میں سے جو افراد مر گئے احتراماًان کو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرنے لگے۔

قدیم روماویونان میں بھی ایک جماعت متشککین و قائلین ارتقاء کی پائی جاتی تھی اور انہوں نے بھی قیاس آرائیوں سے کام لے کر عقیدۂ خدا کے متعلق مختلف نظریئے قائم کئے تھے، چناں چہ انہی میں سے ایک شاعر لکریٹیس کہتاہے کہ سب سے پہلے جس چیز نے زمین پر خدا کو پیدا کیاوہ انسان کا جذبہ خوف وہراس تھا۔ بجلی کی کڑک، طوفان کے شور، سمندروں کے تلاطم، آتش فشاں پہاڑوں کے خوفناک مناظرہ وغیرہ یہ تمام وہ چیزیں تھیں جن سے ڈر کر انسان کو خیال پیدا ہوا کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور قوت بھی موجود ہے۔

ہربرٹ اسپنسر کا نظریہ یہ ہے کہ "انسان اوّل اوّل سمجھتا تھا کہ انسان کا سایہ یا ہمزاد اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتاہے،اس لیے اگر کوئی سردار مر گیاہے تو اس کا ہمزاد

ضرور باقی ہے اور یہیں سے دیوتا کا وجود اس کے زہین میں آیا" الغرض خدا یا دیوتاوں کا وجود خود انسان کا پیدا کیا ہوا ہے جس کو اس نے اپنے جغرافی و معاشرتی ماحول کے لحاظ سے مختلف شکلوں اور رنگوں میں پیش کیا، چناں چہ اسپنسر کہتا ہے کہ " اگر مثلث کا کوئی خدا ہوتا تو وہ اسے مثلثی شکل کا تصور کرتا" رہا یہ امر کے خدا کے تصور میں خود انسان کا ذوق کس حد تک کار فرما ہے، سو مختلف قوموں کے دیوتاؤں اور بتوں کے دیکھنے سے اس کا حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

حبشیوں کے دیوتا کا رنگ کالا ہوتا ہے اور ناک چپٹی، اہلِ تھریس کا دیوتا نیلگوں آنکھیں رکھتا ہے اور سرخ بال، اور ہومر و ہیسڈ کا خدا تمام وہ معائب رکھتا ہے جو خود اس عہد کے لوگوں میں پائے جاتے تھے، مغرب میں زیادہ ارتقاءئی درجہ کا خدا دیکھنا ہو تو عہد عتیق کے خدا (Jehovah) کو دیکھئے جس نے دنیا کو چھ دن میں پیدا کیا اور تھک کر آرام کرنے پر مجبور ہوا۔ آدمیوں ہی کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں ہیں اور انسان ہی کی طرح وہ جذبات سے متاثر بھی ہوتا ہے، اس نے آدم کے لیے جانوروں میں سے رفیقِ زندگی پیدا کیا آدم و حوا کے لیے کھال کا لباس تیار کیا، برج بابل دیکھنے کیلیئے وہ خود زمین پر اتر آیا، وہ ظالم و خونخوار ہے، رشک و حسد کرتا ہے انسانی قربانیاں چاہتا ہے اور اپنے کئے پر پچھتاتا بھی ہے۔

الغرض خدا کا مفہوم ہمیشہ انسانی حالات کے تحت بدلتا رہا ہے استبداد و ملوکیت کے دور میں اگر وہ ایک بادشاہ ہے تو عہد جمہوریت میں اس کی حیثیت ایک پریسیڈنٹ سے زیادہ نہیں رہ سکتی، ترقیِ سائنس سے قبل وہ محیر العقول معجزے بھی دیکھاتا تھا لیکن اب ترقی علوم کے زمانے میں وہ بالکل قانون فطرت کا پابند ہے۔

بعض اسے مہربان محبت کرنے والے باپ کی طرح سمجھتے ہیں، بعض کے نزدیک وہ ایسا ظالم ہے کہ غیر بپتسمہ شدہ بچوں کو دوزخ میں ڈال دیتا ہے اور منکرین کو خواہ کتنے ہی اچھے اخلاق کے کیوں نہ ہوں ہمیشہ آتش جہنم کے عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ پھر اس "خدا تراشی" کے ساتھ ہی جب ہم اس کے نتائج کو دیکھتے ہیں تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کیوں کر اتنے عرصہ تک اسے برداشت کر سکی۔ بے زبان جانوروں کی قربانیوں کے علاوہ انسانی بچوں اور عورتوں کا ذبح کیا جانا، سحر و جادو کے الزام میں ہزاروں ضعیف عورتوں کو آگ میں ڈال دینا------ منکرین کو بے دردی سے تہ تیغ کر دینا، یہ تمام وہ مظالم تھے جو مذہب کے پردے میں روا رکھے گئے کیوں کہ جن لوگوں نے خدا کے تصور

کو دنیا کے سامنے پیش کیا ان کے دل یکسر نفرت و تعصب سے لبریز تھے، اور خدا کا مفہوم ہی وہ اس طرح پیش کرتے تھے کہ انہیں اپنے جزبات کی تسکین کا موقع ملے حقیقت یہ ہے کہ دیوتاؤں کا وجود خود انسان کے احساس وضروریات کی ایک مجسم صورت تھے، اور یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ خدا گویا ایک "مہیب سایہ" تھا خود انسان کے خیالات کا۔

اب اسی کے ساتھ اس کے ترقی یافتہ زمانہ کو دیکھئے کہ خدا کا مفہوم متعین کرنے کے لیے کس قدر عجیب و غریب ذہانت و انشاء سے کام لیا گیا ہے۔

ایک فلاسفر کہتا ہے کہ خدا عدیم التاثر قادر مطلق Passionless Absolute ہے۔ ایمرسن اُسے کائنات کی روحِ برتر و اعلیٰ Oversoul of the universe کہتا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر اسے ازلی و ابدی قوت Infinite and internal energy سے تعبیر کرتا ہے، ولیم جیمس اسے Divine force کے الفاظ سے سمجھنا چاہتا ہے، برگستان اسے محرک جو ہر Vital Impulse کے الفاظ سے ظاہر کرتا ہے۔ برنارڈ شا نے اس قوت حیات Life force کہا ہے۔ پرفیسر کرساپ اسے ایک غیر مادی حقیقت Immaterial reality سمجھتا ہے۔ ہوریس برجز، اسے "کائنات کا خیر کل" Totality of good in the world بتاتا ہے بعض اسے فضاءِ کو بی کی روح سے تعبیر کرتے ہیں، بعض اسے دنیا کا انکل سام[13] Uncle Sam اور بعض اسے ایسا "روحانی ایتھر" سمجھتے ہیں جو وسعتِ زماں کو معمور کئے ہوئے ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام تعبیرات کا واقعی کوئی مفہوم ہے، کیا کوئی شخص ان تعبیرات سے خدا کے مفہوم کو متعین کر سکتا ہے، کیا ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس نے خدا کی حقیقت کو سمجھ لیا۔

اس سے قبل جب انسان جاہل تھا اور اس کا ذہن زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اس نے خدا کو مادی و مرئی چیزوں کی صورت میں پیش کیا جو ہر چند قابل قبول نہ تھا لیکن قابل تصور و قیاس تو تھا، مگر اب اس دور علم و ترقی میں تو خدا کو اس قدر مبہم بنا دیا گیا ہے کہ سوائے ذہنی مالیخولیا کے ہم کسی اور چیز سے تعبیر کر ہی نہیں سکتے چناں چہ جو بیانات ابھی پیش کئے گئے ہیں، آپ ان کے سمجھنے کے لئے پوری قوت صرف کر دیجئے، لیکن آپ کسی متعین مفہوم تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے، صرف الفاظ و تراکیب ہیں جو مفہوم سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان پر غور کرنا سوائے لایعنی ذہنی کش مکش کے اور کوئی معنیٰ نہیں رکھتا،

13- انکل سام سے مراد امریکہ ہے

الغرض خدا صرف ذہنِ انسانی کی پیداوار ہے اور اختلاف ذہن کے ساتھ اس کا مفہوم بھی ہمیشہ بدلا ہے جب انسان کی نگاہ مادی چیزوں سے ہٹ کر کسی اور طرف نہیں جا سکتی تھی تو اُس نے درختوں، جانوروں، پہاڑوں، دریاؤں اور انسانی بتوں کی صورت میں خدا کو سمجھنا چاہا اور اب کہ عقولِ انسانی نے ترقی کر کے خالص کیفیات کی تحلیل شروع کر دی ہے خدا نام ہے صرف ان لغو و مہمل تاویلات کا جو دماغ کو اور زیادہ تشویش میں مبتلا کر دینے والی ہیں۔

مذہب یا خدا کے وجود کا خیال الہامی چیز ہے، اس کی تردید خود الہامی مذاہب کے بیانات سے ہوتی ہے کیوں کہ وہ عہد وحشت کے لوگوں کو گمراہ سمجھتے ہیں اور ان کی بت پرستی کو خلاف منشاء خداوندی قرار دیتے ہیں، اب رہ گیا یہ امر کہ وہ کوئی فطری چیز ہے اور انسان نے پیدا ہوتے ہی سمجھ لیا تھا کہ خدا کا وجود ضروری ہے سو میرے نزدیک اہلِ مذاہب اس کا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتے۔

اس مسئلہ کی چھان بین کیلئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود وحشی اقوام کی گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اس میں شک نہیں کہ وحشی اقوام کے زمانہ کو ہم "زمانۂ قبلِ تاریخ" سے موسوم کرتے ہیں اس کے لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ ان کے ابتدائی حالات معلوم کرنے کا نہیں ہے لیکن چوں کہ دنیا اس وقت بھی ان قوموں سے خالی نہیں ہے، اس لئے ان کی موجودہ حالت سے ان کے گذشتہ حالات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

اس وقت انتہائی پست درجہ کی قومیں ٹراڈل فگو، برازیل، لنکا، جزائر، فلپائن، جزیرہ نمائے ملایا اور جنوبی افریقہ میں پائی جاتی ہیں، ان کی پستی کا یہ عالم ہے کہ ان میں قبائل زندگی کا بھی کوئی نظام نہیں پایا جاتا اور دماغی پستی اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ گنتی بھی انہیں نہیں آتی اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آگ کیوں کر پیدا کی جاتی ہے۔

ٹراڈل فگو کی وحشی قوم یہگان کے متعلق کامل دو سال تک فرانسیسی علماء نے تحقیق کر کے جو رپورٹ شائع کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ خدا کے وجود کے قائل ہیں، نہ ان کے نزدیک خیر و شر کا کوئی مفہوم ہے، امید و خوف کا بھی کوئی جذبہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا اور موت کے بعد وہ کسی اور عالم کے قائل نہیں ہیں۔

وسط برازیل کی وحشی اقوام کے عقائد میں بھی کوئی مذہبی جھلک نظر نہیں آتی، سوا اس کے کہ وہ سورج کو اچھا سمجھتے ہیں اور چاند کو برا، جس کا سبب غالباً صرف یہ ہو سکتا ہے

کہ چاند کا تعلق رات سے ہے جب درندے جنگل سے باہر نکل آتے ہیں اور سورج کا دن سے، جب درندوں کا خوف نہیں رہتا۔ یہ کسی کی پوجا نہیں کرتے اور نہ ان کا کوئی بت ہے، لنکا کی قدیم وحشی جماعتوں میں بھی کسی مذہبی پرستش کا وجود نہیں پایا جاتا اور ان کی زندگی کے کسی شعبہ سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ خدا یا دیوتا کے قائل ہیں۔

ٹسمانیا کے صحرائی قبائل کے متعلق ڈاکٹر نکسن لکھتا ہے کہ ان میں کسی مذہبی رسوم کا پتہ نہیں چلتا اور یہ اپنے خیالات کے لحاظ سے بھی اتنے پست ہیں کہ ان کی زبان زیادہ تر اشارات پر مشتمل ہے، چناں چہ رات کے وقت تو یہ آپس میں باتیں کر ہی نہیں سکتے۔

جزائر انڈمان کے وحشی قبائل ہر چند دوسری قوموں سے بہت کچھ متاثر ہو چکے ہیں تا ہم مذہب یا عقیدۂ خدا کا وجود ان کے ہاں بھی نہیں پایا جاتا۔ جزائر فلپائن میں جن سیاحوں کے جانے کا اتفاق ہوا ہے ان کو معلوم ہے کہ وہاں کے قدیم باشندے بھی کوئی مذہب نہیں رکھتے، الغرض تمام وحشی قومیں جو دوسری قوموں کی تہذیب سے متاثر نہیں ہوئی ہیں اب بھی خدا یا مذہب کی قائل نہیں ہیں، اور اگر کسی قوم میں یہ خیال پیدا ہوا ہے تو وہ صرف دوسری قوموں سے ملنے جلنے کے بعد، اس لیے یہ کہنا کہ مذہب کا خیال انسانی فطرت میں داخل ہے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، اب رہا یہ امر کہ ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ کس کس رنگ میں عقیدہ ظاہر ہوا ہے سو اس بحث میں ہم کو ہر ملک و قوم کے جغرافی ماحول کو پیش نظر رکھنا ضرور ہوگا اور بنا بر اں یہ بحث کسی الہامی حقیقت سے متعلق نہ ہوگی بلکہ ماحول و اسباب ظاہری کی تاریخ سے تعلق رکھے گی اور اس صورت میں مذہبی مسئلہ کوئی خدائی مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ صرف ترقیٔ تمدن کی تاریخ کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔

چوں کہ خدا اور مذہب صرف عقل انسانی کی پیداوار ہے اور عقل انسانی مختلف حالات کے تحت ہمیشہ مختلف رہی ہے اس لیے اگر آج عقائد مذہبی میں تمام افراد نوع انسانی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں تو تعجب نہ کرنا چاہئے، البتہ اگر دنیا یہ سمجھ لے کہ مذہب کا وجود انسانی زندگی کے لیے ضروری نہیں ہے اور ہم خدا کو مانے بغیر بھی اچھی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو بے شک یہ ایک ایسے نقطہ کی طرف قدم بڑھانا ہوگا جو عقائد مذہبی کے تمام لغو اختلافات کو دور کر کے مذہبی رنگ اختیار کر سکتا ہے۔

○○○

مولوی ومولویت

جب کسی قوم کی اخلاقی حالت پست ہو جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ دورِ انحطاط سے گزررہی ہے، جب اس کے اخلاق بلند ہوتے ہیں تو ہم حکم لگاتے ہیں کہ وہ عروج پر ہے اور ہماری تنقید زیادہ سے زیادہ اسی حد تک پہنچ کر رہ جاتی ہے اور درآں حالِ کہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی پستی وبلندی کا تعلق کس چیز سے ہے یابالفاظ دیگریوں کہئے کہ ہمارے عروج وزوال کا ذمہ دار کون ہے؟

قوم نہ نام کسی ایک فرد کا ہے نہ بہت سے افراد کا، بلکہ اس جماعت کا جو کسی ایک قانون، ایک ضابطۂ زندگی کی پابند ہو اور جس کے تمام افراد کسی ایک غرضِ مشترک سے وابستہ ہوں، اسی پابندی کا نام ہیئتِ اجتماعی ہے اور یہی ہم آہنگی ویک رنگی سوسائٹی یاسماج کی جان ہے۔

دنیا میں جتنے مذاہب رونما ہوئے ان سب کی غایت سوسائٹی کی اصلاح تھی تاکہ اس کے افراد ایک شیرازہ سے بندھے رہیں اور ان میں انتشار پیدا ہو کر مقاومت کی قوت فنا نہ ہوجائے۔

یہاں اس بحث کی ضرورت نہیں کہ مذہب کوئی الہامی چیز ہے یاخود انسان کی دماغ کی پیداوار، اگر وہ خدا کا بنایا ہوا دستور ہے تو بھی اور اگر ذہن انسانی کی اختراع تو بھی، بہر حال اسے زمانہ کے حالات اور تمدن کی تدریجی ترقی کے لحاظ سے مرتب ہونا چاہئے تھا اور ہوا، صنم پرستی سے لے کر صمد پرستی تک جتنے دور مذہب پر گزرے ہیں ان سے اس تدریجی اقتضاء کا حال پوری طرح واضح ہو سکتا ہے۔

ہر چند جس زمانے میں جو مذہب ہوا ہے اس نے بغیر کسی ”اندیشۂ فردا“ کے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا کہ وہ ایک مکمل چیز ہے اور اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں لیکن زمانے نے ہمیشہ اس دعوے کو باطل کرکے دکھا دیا کہ دنیا کا کوئی قانون کوئی شریعت، کوئی مذہب، مستقبل کے حالات پر حاوی نہیں ہو سکتا اور انسان مجبور ہے کہ ”حال“ کے لحاظ سے اپنے اصول زندگی میں تبدیلی کرتا رہے۔

اس سے شاید انکار ممکن نہ ہو کہ سب سے آخر میں مذہب اسلام کا ظہور ہوا، اور گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال کے اندر کوئی تحریک اتنی قوی اور ایسی منظم رونما نہیں ہوئی جسے ہم ”مذہب“ کے لفظ سے موسوم کر سکیں، ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب صرف یہ ہو کہ اس دوران میں مذہب انسانی نے اتنی ترقی کر لی ہو کہ وہ مذہب کے وجود کو ضروری نہ سمجھتی ہو، لیکن مسلمانوں کا یہ دعویٰ بھی بالکل لغو و مہمل قرار نہیں دیا جا سکتا کہ ان کا مذہب اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اتنی مکمل چیز ہے کہ وہ ہر زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے اور اس میں اتنی اہلیت موجود ہے اگر دنیا چاہے تو اسے ایک عالمگیر سماجی قانون کی حیثیت سے اختیار کر سکتی ہے، یہ تو ہوئی وہ بات جس کا یقین دوسرے کو صرف اسی وقت آ سکتا ہے جب خود براہ راست تعلیمِ اسلام کا مطالعہ کرے اور مذہبی لٹریچر کے اس حشووزوائد کو نظر انداز کر دے جس نے اسلام کے چہرہ کو تو برقعہ و نقابات کے اندر چھپا رکھا ہے لیکن یوں بھی ہر شخص تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کر سکتا ہے کہ جتنی جلد اور جس قدر وسعت اسلام نے حاصل کی اتنی کسی اور مذہب کو اتنے تھوڑے زمانے میں نصیب نہ ہوئی۔ پھر اجتماعی ترقی کے تمام نفسیاتی رموز و غوامض کو جانے دیجئے، یوں بھی اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی حجت و برہان کی ضرورت نہیں کہ کسی قوم کا یہ استعلاء واستیلاء بغیر غیر معمولی جوش عمل اور ہم آہنگی کے ناممکن ہے۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو صحیح اسلام کی عمر سن ۳۳ھ پر ختم سمجھتے ہیں اور بنو امیہ و بنو عباس کے دور ملوکیت کو مذہبی ترقی سے علیحدہ کوئی اور چیز قرار دیتے ہیں، کیوں کہ اگر فتوحات ملکی محض اس لئے کہ ان کا تعلق دنیا سے ہے، خلاف مذہب قرار دی جائیں تو خود رسول اللہ اور خلفاء کے زمانہ کی فتوحات کی نسبت کیا کہا جائے گا؟ الغرض میرے نزدیک حکومت و ملک گیری قطعاً روح اسلام کے منافی نہ تھی لیکن رسول اللہ کی رحلت کے بعد ہی ایک اور چیز ضرور نئی پیدا ہوئی جو یقیناً بہت خراب تھی، اتنی خراب کہ آخر کار اس نے اسلام اور اہلِ اسلام کو تباہ کر کے رکھ دیا، وہ چیز کیا تھی؟---مولویت۔

”مولویت“ نام جزئیاتِ مذہب سے آگاہی کا نہیں ہے اور نہ اس کا تعلق مہارتِ علوم و فنون سے ہے بلکہ وہ عبارت ہے اس مخصوص ذہنیت سے جو سوا اپنے تمام دنیا پر عقل و فہم کا دروازہ بند کر دیتی ہے اور لوگوں کے ذہن و فراست پر قفل ڈال کر مذہبیت کے بہانہ سے اپنے بدترین اغراضِ نفسانی پورا کرنے میں تامل نہیں کرتی۔

یہ ایک عظیم بلا ہے جس نے ابتداء عہدِ اسلام سے لے کر تا ایں دم بے شمار ہلاکتیں دنیا میں پھیلائیں جن میں سب سے بڑی ہلاکت اجتماعِ قومی کے شیرازہ کو منتشر کرنا، بھائی بھائی کو لڑانا اور گوشت ناخن سے جدا کرنا ہے، چناں چہ حنبلی، مالکی، شافعی، حنفی مسالک کی تفریق، اشاعرہ و معتزلہ کی تقسیم، اہلِ قرآن و اہلِ حدیث کا باہمی اختلاف، شیعہ سنی کی جنگ اور اسی طرح کے اور بہت سے فتنے اسی "مولویت" کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ اور کتنا زہر اسے پھیلانا ہے۔

اسلام کی وہ خصوصیت جو یقیناً دنیا میں کسی اور مذہب کو حاصل نہیں ہے اور جس کا اعتراف ہر صاحب فکر نے کیا ہے صرف یہ ہے کہ وہ کوئی خیالی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد صرف فلسفہ کی ہفوات پر قائم ہو بلکہ وہ یکسر حرکت و عمل ہے اور اس قدر سادہ و آسان کہ مسلمان ہونے کے معنٰی ہی صرف ایک صلح جُو متمدن انسان ہونے کے ہیں، لیکن "خانہ مولویت خراب" اس نے اسلام کی جو راہ متعین کر رکھی ہے وہ اس قدر دشوار گزار ہے کہ ایک ذی عقل و ہوش انسان دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مسلمان کبھی نہیں بن سکتا کیوں کہ ان "مفتیان شرع متین" کی مرضی کے مطابق کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ پہلے عقل و فراست کو خیر باد نہ کہہ دے اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قربانی کے لیے ہر شخص کیوں کر تیار ہو سکتا ہے؟

اس جماعت کا سب سے بڑا حربہ "حربۂ تکفیر" ہے جو اس سے قبل (اس لیے کہ لوگ زیادہ جاہل تھے) واقعی کوئی اہمیت رکھتا بھی تھا لیکن اب اس کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہ گئی ہے جیسے آپ کسی متمرّد گداگر کے سوال کو پورا نہ کریں اور وہ الٹ کر گالی دے بیٹھے۔ حال ہی میں ایک نہایت دلچسپ "منظرِ تکفیر" بعض علمائے دیوبند کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر ممکن ہے بعض لوگوں کو افسوس ہوا ہو لیکن مجھے بہت مسرت ہوئی کیوں کہ "ادارۂ دیوبند" کی قبر اس سے زیادہ گہری کھودی جانی ممکن نہ تھی۔

سرائے میر (اعظم گڈھ)، میں تقریباً ربع صدی سے مدرسۃ الاصلاح کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہے جس کا مقصد زیادہ تر "علوم قرآنیہ" کی تعلیم اور انہی کی تحقیق و تفتیش ہے اس کے بانی مولانا حمید الدین اور روحِ رواں مولانا شبلیؒ تھے، چوں کہ اس کے کارکن نیک نیت ہیں اس لیے اس نے کافی ترقی حاصل کرلی، یہیں سرائے میر میں مولویوں کی ایک دوسری جماعت کو اس مدرسے سے "بوئے نان و استخواں" آئی اور انہوں

نے جواب میں دوسرا مدرسہ قائم کرکے یہ "روٹی کا ٹکڑا" چھین لینا چاہا، حالانکہ مدرسۃ الاصلاح کے کارکن اور مدرس جن حالات کے تحت اس درس گاہ کو چلا رہے ہیں وہ فاقہ کشی او دشت پیمائی سے کم نہیں ہے لیکن فریق ثانی کی "ریزہ چیں" فطرت اس حقیقت کو کیوں سمجھنے لگی تھی اس نے فوراً محاذِ جنگ قائم کر دیا اور آخر کار وہی ایک حربۂ تکفیر جس سے غریب مولوی ہمیشہ کام لیا کرتا ہے اس جنگ میں بھی استعمال کیا گیا۔

اسباب تکفیر یہ بتائے گئے کہ اس مدرسہ میں مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے خیالات کی اشاعت ہوتی ہے جو کافر تھے، مولانا شبلی اس لیے کہ وہ "کلام اور علم الکلام" کے مصنف تھے اور مولانا حمید الدین اس لئے کہ وہ قرآن پاک کی شرح و تفسیر میں اکابرِ سلف کی تقلید سے کہیں کہیں ہٹ جاتے ہیں۔

استفتاء شائع کیا جاتا ہے اور اس پر چالیس سے زیادہ علمائے کرام فتوے دیتے ہیں کہ شبلی و حمید الدین کافر تھے اور وہ لوگ بھی کافر ہیں جو ان کے خیالات کی اشاعت کرتے ہیں۔

ان فتویٰ دینے والوں میں مولوی اشرف علی صاحب ایسے جید عالم سے لے کر محمد علاء الدین ایسے معمولی مولوی تک شامل ہیں۔

ٹھیک اسی زمانہ میں جب سرائے میر کے اندر یہ ہنگامۂ دار و گیر برپا تھا مولوی حسین احمد صاحب دیوبند سے سرائے میر آئے اور وہ بھی اس فتوے کو دیکھ کر مدرسۃ الاصلاح کے کارکنوں کی طرف سے بد ظن ہوگئے لیکن جب ان کے سوالات کے جواب میں مدرسہ والوں نے سب کچھ وہی لکھ دیا جو مولوی حسین احمد صاحب سننا پسند کرتے تھے، تو انہوں نے پھر ان کے مسلمان ہونے پر مہرِ توثیق ثبت کر دی۔ لیکن مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کی طرف سے اب تک ان مولویوں کے دل صاف نہیں ہوئے اور ہونا بھی نہیں چاہئے کیوں کہ یہ دونوں بزرگ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنی قوت ایمان دکھانے کے لئے اس سے بہتر موقع انہیں اور کیا مل سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی پر جو الزاماتِ الحاد و زندقہ کے لگائے گئے ہیں وہ یکسر بے بنیاد ہیں کیوں کہ علم الکلام کی جن عبارتوں کو موردِ کفر قرار دیا جاتا ہے ان کا تعلق خود مولانا شبلی کے اعتقادات سے نہیں ہے بلکہ ان متکلمین کے عقائد سے ہے جن کا ذکر مولانا شبلی نے کیا ہے لیکن مخالف جماعت نے حد درجہ دسیسہ کاری و تلبیس سے کام لے کر ان کو مولانا شبلی سے منسوب کر دیا اسی طرح مولانا حمید الدین مرحوم کے جو نوٹ متعلق بہ

تفسیر رسالۂ اصلاح میں شائع ہوئے تھے وہ بھی نامکمل وناتمام ہیں اور ان کی بنیاد پر ان کے عقائد سے بحث کرنا کسی طرح مناسب نہیں تھا لیکن اگر اس روادارانہ نقطہ نظر کا خیال نہ رکھا جائے تو بھی مولانا حمید الدین کا صرف اتنا قصور ہے کہ تقسیمِ سُوَر، رکوعوں کے نام اور پاروں کی تفریق میں اسلاف کی رائے سے کچھ ہٹے ہوئے ہیں اور اگر کلام پاک کے سمجھنے میں کسی کو رائے کی اتنی آزادی بھی حاصل نہیں ہے تو پھر اسلام، خدا اور رسول کا تو نہ ہوا بلکہ صرف مؤلف شرح مقاصد کا ہوا، شارح فقہ اکبر کا ہوا، ابن حجر اور صاحب نبراس کا ہوا، ابن حزم اور سیوطی کا ہوا جن کے استدلات پر مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کو کافر قرار دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرائے میر میں جو کچھ ہوا اس کو مذہبیت اور للّٰہیت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا، بلکہ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ لوگ مدرسۃ الاصلاح کی طرف سے بد ظن ہو کر اس کی امداد ترک کردیں اور دوسرے مدرسہ کے مولویوں کی جھولیاں بھریں، یہ ہے ہمارے علمائے کرام کی ذہنیت اور یہ ہیں وہ ذلیل تدابیر جن سے وہ اپنا پیٹ پالنا چاہتے ہیں۔

ملاحدۂ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے (۱)

مذہب کی حقیقت

علم و مذہب کی جنگ کوئی نئی چیز نہیں، کیوں کہ مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے بغیر چون وچرا تسلیم کر لینا چاہئے اور اہلِ علم کی حجت یہ ہے کہ جب تک کوئی بات سمجھ میں نہ آجائے، اس پر یقین لانا ممکن نہیں۔ اہلِ مذاہب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عقلِ انسانی بہت ناقص ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کامل شے کا تصور کر سکے۔ فریقِ ثانی کہتا ہے کہ جس چیز کو تم "شے کامل" سے تعبیر کرتے ہو، اسی کا ثبوت تمہارے پاس کیا ہے کہ ہماری عقلِ ناقص کو اس کے سمجھنے سے باز رکھتے ہو؟ الغرض اہلِ علم و مذاہب کا یہ نزاع بہت قدیم چیز ہے اور باختلافِ نوعیت اب بھی اسی طرح بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے حکومت و مذہب دونوں ایک چیز تھے، اور اس لیے اہلِ مذاہب بزورِ شمشیر اپنے مخالفین کو خاموش کر سکتے تھے، اب ایسا نہیں کر سکتے اور معاندینِ مذہب کی جماعت بڑھتی جارہی ہے۔ یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں جہاں خدائے قادرِ مطلق کے بجائے Almighty Dollar کی پرستش کی جاتی ہے، الحاد نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اہلِ کلیسا حیران ہیں کہ "آسمانی بادشاہت" کے وجود کو کیوں کر قائم رکھ سکیں۔

ہندوستان میں بھی یہ رَو کافی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور یہاں کے حلقہ ہائے مسجد و خانقاہ میں بھی ان کی کفر سامانیوں کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے لیکن اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس طوفان سے بچنے کی صورت کیا ہے؟

اہلِ مذاہب کی طرف سے جو تدبیرِ دفاع اختیار کی جاتی ہے، وہ زیادہ تر اس لیے بے اثر رہتی ہے کہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ ملاحدہ کہتے کیا ہیں اور وہ کن دلائل کی بنا پر خدا اور مذہب سے انکار کرتے ہیں۔ امریکہ وغیرہ میں تو اہلِ مذہب ان کے لٹریچر کو شاید کبھی پڑھ لیتے ہوں لیکن ہندوستان میں تو اس کا دیکھنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے اور اس لیے یہاں

کے اہلِ مذہب قطعاً ناواقف ہیں کہ اس زمانہ کا الحاد کس قسم کا الحاد ہے اور اس کے مقابلے کے لئے کن نئی تیاریوں کی ضرورت ہے؟

مسلمانوں میں اس وقت صرف دو چار رسائل ایسے ہیں جنہوں نے اپنا مقصود الحاد کی مخالفت اور اسلام کی حمایت قرار دے رکھا ہے لیکن حقیقتاً ان میں کوئی ایک رسالہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس بیسویں صدی کے منکرینِ خدا کو خاموش کرسکے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جو راہ انہوں نے خدمتِ اسلام کی اختیار کی ہے، وہ نہ صرف یہ کہ بالکل غلط ہے بلکہ اور زیادہ دہریت پھیلانے والی ہے، کیوں کہ اگر ہم کسی کی بات نہ سنیں اور اپنی ہی کہے جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم کو بہرا ہی کہا جائے گا۔ پھر چوں کہ پیروانِ اسلام اپنے مذہب کو سب سے زیادہ مکمل اور عین فطرت کے مطابق کہتے ہیں، اس لیے ان کی طرف سے جب اس نوع کی جاہلانہ کوششیں دیکھتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔ علمائے اہلِ اسلام کی طرف سے ایک عام طریقہ جواب کا یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مذہب کے خلاف جو اعتراض کئے جارہے ہیں، وہ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پرانے ہیں اور ان کا جواب دیا جاچکا ہے۔ اول تو مجھے اس میں کلام ہے کہ ان پرانے اعتراضات کا کبھی ردّ کیا گیا ہے یا نہیں اور اگر اسے مان بھی لیں تو انہوں نے یہ کیوں کر جان لیا کہ موجودہ ذہنی انقلاب وہی ہے جو اس سے پہلے پایا جاتا تھا اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اگر اہلِ مذاہب واقعی الحاد کا سدِّباب کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض یہ ہے کہ پہلے ملحدین کے بیانات کو سنیں، بغیر کسی جذبۂ غیظ و انتقام کے ٹھنڈے دل سے سنیں اور پھر غور کریں کہ ان کے دلائل کا کوئی مسکت جواب ان سے ممکن ہے یا نہی؟ صرف گالیاں یا بددعائیں دینے سے کام نہیں چلتا۔ چناں چہ میں ایک لامذہب (ملحد) کے پانچ مقالے سلسلہ وار پیش کررہا ہوں تاکہ اہلِ مذہب کو معلوم ہوجائے کہ دنیا میں الحاد پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں اور پھر اگر ممکن ہو تو اس کا علاج سوچا جائے۔

مذہب کیا ہے؟

خدا ہی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مدبّر ہے، اس لیے مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی مطیع رہے، یعنی اگر اس کی طرف سے کوئی حکم نافذ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا ہر شخص پر لازم ہے۔

یہ ہے اصل مفہوم مذہب کا جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے اور تمام قوموں نے اسی

اعتقاد کے تحت یقین کر لیا کہ خدا ہم سے قربانیاں چاہتا ہے۔ چناں چہ اول اول لوگوں نے اپنی اولاد تک کو بھینٹ چڑھانے سے عذر نہ کیا، اور پھر صرف بیل، بھیڑ، بکری کے خون سے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش کی گئی، کیوں کہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو خدا ان کی فصلیں خراب کر دیتا، پانی برسانا بند کر دیتا، بیماریاں پھیلاتا، زلزلے لاتا اور قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا۔ اس اعتقادِ قربانی کی آخری جھلک عیسوی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے اور اسلام میں بھی۔ وہاں خدا اپنے بیٹے کی قربانی قبول کر کے ہمیشہ کے لیے چین سے بیٹھ گیا، اور یہاں ابراہیم خلیل اللہ کے تہیۂ قربانی سے خوش ہو کر آئندہ کے لیے صرف جانوروں کی قربانی پر راضی ہو گیا۔

اہلِ مذاہب کا یہ اعتقاد بھی بہت قدیم ہے کہ خدا ہماری التجائیں سنتا اور ان کو پورا کرتا ہے، اس لیے ان اعتقادات کے پیشِ نظر قدرتاً چند سوال پیدا ہوتے ہیں جو اصل بنیاد ہیں لا مذہبیت کی، اور چوں کہ اس وقت تک اہلِ مذہب کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں، اس لیے ملحدین خود ہی اس سے ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ شبہات ملاحظہ ہوں:

☆ کیا مذہب کی بنیاد کسی حقیقت معلومہ پر قائم ہے؟

☆ کیا واقعی کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جسے خدا کہتے ہیں؟

☆ کیا واقعی خدا سب کا خالق ہے؟

☆ کیا واقعی اس نے کبھی ہماری دعاؤں کو سنا ہے؟

☆ کیا واقعی قربانیوں سے خوش ہو کر اس نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص رعایت روا رکھی ہے؟

☆ اگر واقعی اسی نے انسان پیدا کیا ہے تو کیوں ایسے افراد اس نے پیدا کیے جو مسخ و قبیح ہیں، مفلوج و محتاج ہیں اور ذہنی حیثیت سے حد درجہ پست؟ مجرموں، دیوانوں اور بے عقل لوگوں کو پیدا کرنے میں اس کی کیا مصلحت تھی، کیا کوئی ایسی قوت کی طرف سے جسے فراستِ کل اور قوتِ مطلق کہتے ہیں، ان نقائصِ تخلیق کی کوئی معقول توجیہ پیش کی جا سکتی ہے؟

☆ اگر خدا تمام امورِ عالم کا مدبّر و منتظم ہے تو کیا وہ ان بادشاہوں کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے جنھوں نے دنیا میں سوا ظلم کے اور کچھ نہیں کیا؟ کیا وہ ان تمام لڑائیوں کا ذمہ دار نہیں ہے جن میں لاکھوں بے گناہوں کا خون بہایا جاتا ہے؟

☆ کیا وہ دورِ غلامی اس کی مرضی کے موافق نہ تھا جب صدیوں تک ہزاروں بے گناہ انسانوں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان بنی رہی اور بے شمار ماؤں کے مضطرب سینوں سے ان کے بلکتے ہوئے بچے جدا کر کے قتل وذبح کرا دیئے گئے؟

☆ کیا وہ ان مذہبی تعذیبات کا ذمہ دار نہیں جو بے گناہ انسان کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دینے اور شکنجے میں تان تان کر ایک ایک جوڑ علیحدہ کر دینے پر مشتمل تھے؟

☆ خدا نے کیوں ظالموں اور بد کرداروں کو مہلت دی کہ وہ بہادروں اور نیک کرداروں کو پامال کریں؟

☆ خدا نے کیوں کافروں کو اس کا موقع دیا کہ اس کے خاص بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ اگر ایک رحم و کرم والا خدا واقعی کائنات کا مدبر ہے تو یہ آئے دن کے طوفانوں، زلزلوں، وباؤں اور خشک سالیوں کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ سل و دق، سرطان و خناق اور اسی طرح کی سیکڑوں بیماریاں پیدا کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے جس سے نہ معصوم بچے جاں بر ہو سکتے ہیں، نہ زاہد و مرتاض انسان؟

☆ درندوں کا انسانوں کو پھاڑ کر کھاتے رہنا، زہریلے سانپوں کا لوگوں کو ڈستے رہنا اور خدا کا کچھ نہ کہنا عجیب معمہ ہے۔ کیا اس نے ناخن و چنگال اسی لیے پیدا کیے کہ وہ گوشت کے ریشے جدا کرتے رہیں، کیا اس نے پر و بال اسی لیے بنائے ہیں کہ معذور و بے کس آسانی سے گرفت میں آ سکیں، کیا اس نے جراثیم اسی لیے پیدا کیے ہیں کہ وہ انسانوں کو اندھا، کوڑھی، مسلول و مدقوق بنا کر اپنی بھوک مٹائیں؟

☆ کیا کائنات کی تنظیم اسی طرح ممکن تھی کہ ایک جان دار کی زندگی دوسرے جان دار کے گوشت و خون پر منحصر ہو اور کیا تدبیرِ عالم آہ اور کراہ کا ہنگامہ پیدا کئے بغیر محال تھی؟ پھر ان واقعات و حالات پر غور کرو اور سمجھو کہ مذہب کیا ہے؟

☆ دراصل وہ نام ہے صرف ایک بے بنیاد خوف کا، جو خود ہی ایک قربان گاہ بناتا ہے اور خود ہی اس پر قربانیاں چڑھاتا ہے، خود ہی ایک معبد تیار کرتا ہے اور خود ہی وہاں جھک جاتا ہے۔

☆ مذہب ہمیں وہی باتیں سکھاتا ہے جو صرف غلام ہی کے لیے موزوں ہیں، یعنی اطاعت، فرمانبرداری، نفس کشی، صبر و تحمل، عدمِ مقاومت اور اپنے آپ کو مٹا دینا۔ خود مختاری، سرفرازی، خود اعتمادی، جرأت و اقدام کا وہاں کوسوں پتہ

نہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا مالک ہے اور انسان اس کا غلام، لیکن مالک چاہے کتنا ہی بڑا ہو، غلام کو خوش گوار نہیں بنا سکتا۔

☆☆☆

اگر خدا کا وجود ہے تو ہم کیوں کر جان سکتے ہیں کہ وہ رحم و کرم والا بھی ہے، وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب و جفاکش، انسان ہل چلا رہے ہیں، کھیتیاں بو رہے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار صرف اسی محنت پر ہے لیکن وہ پانی نہیں برساتا، کھیتیاں مرجھا رہی ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ نہیں گراتا، کروڑوں انسان اپنی مایوس و منتظر آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن سوا جھلسا دینے والے آفتاب کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی انہیں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ خدا ان کے دل کے اضطراب کو دیکھتا ہے اور رحم نہیں کھاتا، ان کی اشک آلود آنکھوں کو دیکھتا ہے اور خاموش ہے۔ بچے ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لگے ہوئے بلک رہے ہیں اور دودھ نہیں پاتے، مائیں آنچل پھیلا پھیلا کر اپنے بھوکے بچوں کا واسطہ دے دے کر دعائیں مانگ رہی ہیں، لیکن کوئی سننے والا نہیں۔ پھر کیا خدا کا رحم و کرم ثابت کرنے کے لیے بادِ سموم کے ان جھونکوں کو پیش کیا جائے گا، جو بستیوں کی بستیاں تباہ کر جاتے ہیں اور میدانوں کو لاشوں سے بھر دیتے ہیں؟ کیا اس کی شفقت و محبت کے ثبوت میں زلزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جب زمین ہزاروں انسانوں کو نگل جاتی ہے؟ کیا آتش فشاں پہاڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کے شعلے بچے بوڑھے کی بھی تمیز نہیں کرتے؟

کیا اگر یہ تباہ کاریاں نہ پائی جائیں تو ہم کو یہ شک کرنے کا موقع ملے گا کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہے؟ کیا اگر زلزلہ و طوفان، قحط و وبا کی مصیبتیں نازل نہ ہوں تو ہم کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ خدا مہربان نہیں ہے؟

الٰہیات والے کہتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا۔ اس نے قد و قامت، رنگ و صورت، ذہن و فراست کے لحاظ سے قوموں کو ایک دوسرے سے متمایز کر دیا ہے، تو کیا بلند قوموں کو خدا کا شکر نہ ادا کرنا چاہئے کہ اس نے انہیں پست نہیں بنایا۔ یقیناً شکر کی بات ہے لیکن اس صورت میں کیا پست قومیں اس بات کا شکریہ ادا کریں گی کہ خدا نے انہیں جانور نہیں بنایا؟

جب خدا نے بلند و پست قوموں کو بنایا تھا تو کیا یہ بات اس کے علم میں نہ تھی کہ بلند قومیں پست قوموں کو اپنا غلام بنائیں گی، ان کو ایذا پہنچائیں گی اور تباہ و برباد کر دیں گی؟ کیا

وہ نہ جانتا تھا کہ یہ بلند و پست کا امتیاز دنیا میں کتنا خون بہائے گا؟ نوع انسانی کو کن کن مصائب میں مبتلا کرے گا، کتنے میدان لاشوں سے پاٹ دے گا، کتنے غلاموں کے جسم کا گوشت کوڑوں کی ضرب سے پارہ پارہ کرے گا، کتنی ماؤں کے دل ان کے بچوں کو جدا کر کر کے تڑپائے گا؟ پھر اگر یہ سب کچھ اس کے علم میں تھا تو کیا اس کا رحم و کرم اس سے زیادہ دل دوز مناظر کا منتظر تھا؟

وہ قید خانے، جن کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرا کر دنیا کے بہت سے بلند اخلاق والے انسانوں نے اپنی جانیں دے دیں، وہ سولیاں جو مقدس انسانوں کے خون سے رنگین بنائے جانے کے لیے نصب کی گئیں، وہ غلاموں کی جماعتیں جن کی پیٹھ کے زخموں کو خشک ہونے کا کبھی موقع نہیں دیا گیا، وہ مقدس ہستیاں جن کا ایک ایک جوڑ شکنجہ تان تان کر علیحدہ کیا گیا، جن کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر بھس بھر وایا گیا، وہ بے شمار انسان جو قحط و وبا کا شکار ہوئے، جن کو زمین نے نگل کر ڈکار تک نہ لی، جن کو سانپوں نے ڈسا، آتش فشاں پہاڑوں نے جھلسایا اور لاتعداد بدکار ظالم انسان جنھوں نے دنیا میں مظالم توڑے اور کامیاب زندگیاں بسر کیں، کیا یہ اور اسی طرح کے تمام سمجھ میں نہ آنے واقعات، رحم و کرم والے خدا کے علم سے باہر تھے؟ اور یہ سب کچھ بغیر اس کی مرضی کے ہوا؟

انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا دامن پکڑنا پسند کیا۔ اگر اس نے پتھر کو پوجنا چھوڑا تو ایک اور غیر معلوم قوت کے سامنے جھک گیا جس کو وہ صحیح راہ دکھانے والا باور کرتا ہے لیکن حقیقت کیا ہے؟

انسان فطرتاً اقدام پسند واقع ہوا ہے، وہ ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور تجربات اس کو بتاتے ہیں کہ اس نے جو قدم اٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط۔

ایک آدمی کسی جگہ کا ارادہ کر کے چل پڑتا ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں دو راستے پھٹتے ہیں، وہ بایاں راستہ اختیار کرلیتا ہے لیکن اسے کچھ دور چل کر معلوم ہوتا ہے یہ راستہ غلط تھا، وہ واپس آتا ہے اور داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار کر کے منزل تک پہنچ جاتا ہے، اس کے بعد وہ اس جگہ پہنچنے میں غلطی نہیں کرتا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ تو کیا یہ رہنمائی خود اس کی جستجو کا نتیجہ نہ تھی؟

ایک بچہ شعلہ کی چمک دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جل جاتا ہے، اس کے بعد پھر یہ جرأت وہ کبھی نہیں کرتا۔ تو کیا یہ سبق اس کو اس قوت نے دیا یا خود اس

کے تجربہ نے؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تجربات میں خود وہ قوت پنہاں ہے جو صحیح راستہ بتانے والی ہے، یہ قوت وادراک وارادہ سے بالکل معرّا ہے اور اس کا نام ہے تجربہ۔

بہت سے لوگ ضمیر اور احساسِ اخلاق کے وجود کو وجودِ خدا کی دلیل بتاتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرتاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور خانوادوں، قوموں اور قبیلوں کی صورت میں ہمیشہ زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے، پھر قبیلہ کے جن افراد نے خاندانی وعائلی مسرتوں میں اضافہ کیا، وہ اس کے اچھے اعضا شمار کئے گئے اور جنھوں نے تکلیفیں پہنچائیں، انہیں برا سمجھا گیا اور یہیں سے اخلاق کے اچھے برے ہونے کا معیار قائم ہوا۔

وحشی قوموں میں ہمیشہ فوری نتائج پر غور کیا جاتا ہے لیکن ترقی یافتہ قوموں میں نتائج بعیدہ کو سامنے رکھا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق کا معیار بلندتر اور فرض شناسی کا احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی مافوق الفطرت قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مذہب کیا ہے؟ انگرسول عیسوی مذہب کو سامنے رکھ کر پوچھتا ہے کہ عیسویت نے دنیا کو کیا فائدہ پہنچایا؟ جب اس کا اقتدار قائم کیا تھا تو کیا اس نے انسان کو زیادہ بہتر انسان بنا دیا؟ اس کا اثر اطالیہ، اسپین، پرتگال اور آئرلینڈ پر کیا ہوا؟ ہنگری اور آسٹریا کو کیا فائدہ اس سے حاصل ہوا؟ انگلستان، امریکہ، ہالینڈ اور اسکاٹ لینڈ نے کیا تمتع اس سے حاصل کیا؟ اگر عیسویت کے سوا وہ کسی اور مذہب کے پیرو ہوتے تو کیا وہ اس سے زیادہ خراب ہو جاتے؟

اگر ٹورکسٹمد، زردتشتی مذہب کا پابند ہوتا تو کیا اور زیادہ خراب انسان ہو جاتا؟ کیا کالون اور زیادہ خون خوار بن جاتا، اگر وہ یہودی ہوتا؟ کیا ڈچ اور زیادہ احمق ثابت ہوتے اگر وہ تثلیثِ مسیحیت کے قائل نہ ہوتے؟ کیا جان ناکس اور زیادہ برے اخلاق کا ہو جاتا، اگر بجائے مسیح کے وہ کنفوشس کا ماننے والا ہوتا؟

مذہب کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں بہت کافی تجربہ ہو چکا ہے اور اب اس ناکامی پر مزید حجت پیش کرنے کے لیے کسی اور جدید تجربہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مذہب کبھی انسان کے دل میں جذبۂ رافت والفت پیدا نہیں کر سکا اور اس کے ثبوت میں مذہبی تاریخ کے دو اوراق پیش کیے جاسکتے ہیں جن کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔

مذہب علم و تحقیق کا ہمیشہ دشمن رہا ہے اور اس نے کبھی ذہنی آزادی کا ساتھ نہیں دیا۔

مذہب کبھی انسان کو محنتی، جفاکش اور ایمان دار بنانے میں کامیاب نہیں ہوا، چناں

چہ وحشی اقوام کی برائیوں کا سبب صرف ان کی مذہبی واہمہ پرستی ہے۔

وہ لوگ جو فطرت کی یکسانیت کے قائل ہیں، ان کے لیے مذہب کا خیال کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

کیا انسان، فطرت اور صفاتِ مادہ کو اپنی دعاؤں سے متاثر کر سکتا ہے، کیا ہم طوفان کو پوجا پاٹ کے ذریعہ سے کم و بیش کر سکتے ہیں، کیا ہم قربانیاں پیش کر کے ہواؤں کا رخ بدل سکتے ہیں، کیا ہم آہ وزاری سے بیماری کا علاج کر سکتے ہیں، کیا عزت و سربلندی ہمیں بھیک مانگنے سے مل سکتی ہے؟

وہ چیز جسے نفس کہتے ہیں، کیا وہ قانونِ قدرت کا اسی طرح پابند نہیں جس طرح ہمارا جسم؟

مذہب کی بنیاد اس خیال پر قائم ہے کہ عالمِ فطرت کا کوئی ایک مالک ہے، خود دعاؤں کو سنتا ہے، اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے اور جزا و سزا دیتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ واقعات کی دنیا میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ہمیں ان اعتقادات کی تصدیق ہو سکے۔

جب ہم کوئی نظریہ قائم کرتے ہیں تو اس کے لیے کوئی نہ کوئی بنیادی حقیقت ضرور ہوا کرتی ہے، محض وہم و قیاس پر کوئی اصول مرتب نہیں ہو سکتا، اس لیے اگر ہم لامذہبیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو اس کیلئے چند بنیادی حقائق بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔

مثلاً یہ کہ مادہ و قوت فنا نہیں ہو سکتے، دوسرے یہ کہ مادہ و قوت ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے، تیسرے یہ کہ جو چیز غیر فانی ہے وہ غیر مخلوق ہے، قدیم ہے۔

دنیا میں ذہانت و ذکاوت کا وجود صرف قوت کی وجہ سے ہے اور قوت بغیر مادہ کے ممکن نہیں، اس لیے معلوم ہوا کہ ذکاوت صرف قوت و مادہ کی ممنون ہے اور اس باب میں کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے جسے مدبّرِ کائنات کہا جائے۔

اگر مادہ و قوت ازلی و ابدی ہیں تو جو کچھ ممکنات میں تھا، وہ واقع ہوا۔ جو ممکنات میں ہے، وہ ظاہر ہو رہا ہے اور آئندہ بھی رونما ہوتا رہے گا۔ کائنات میں اتفاق کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پایا جاتا ہے۔ جس چیز کو ہم حال کہتے ہیں، وہ ماضی کی پیداوار ہے اور جس کا نام مستقبل ہے وہ نتیجہ ہو گا حال کا۔ انسان سے لے کر رینگنے والے کیڑے کی حرکت تک سب اسی قانون کے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

ہزاروں سال سے دنیا کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے اور اسی غرض کے لیے

دیوتا، دیویاں، بہشت، دوزخ، الہامات و معجزات، کلیسا و خانقاہ، قید خانے اور شکنجے، سیکڑوں چیزیں پیدا کی گئیں۔ ایک بادشاہ کو تخت سے اتار کر دوسرے کو بٹھایا، ایک ملکہ کی گردن مار کر دوسری کو تخت نشین کیا، آدمیوں کو زندہ جلایا۔ فوج کشیاں کی گئیں، دعائیں مانگی گئیں، ڈرایا گیا، لالچ دی گئی۔ الغرض مذہب نے سبھی کچھ کیا لیکن مقصد آج تک پورا نہ ہوا۔ کیوں کہ مذہب غلامی ہے ذہن و دماغ کی، اور جب تک انسان کا ذہن آزاد و بیدار نہ ہو، نوعِ انسان کی فلاح مجموعی حیثیت سے ناممکن ہے۔

یہ ہیں وہ خیالات اس زمانے کے ملحد و لامذہب کے جو اخباروں، رسالوں اور لکچروں کے ذریعہ سے تمام دنیا میں اشاعت پا رہے ہیں اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم دہریت و الحاد کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دنیا کی اس ذہنی تشویش و تذبذب کو دور کریں۔ پھر اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ہم منطق و فلسفہ کی پیچیدہ باتوں میں الجھا کر فریقِ مخالف کو خاموش کرنے کی کوشش کریں، کیوں کہ اس طرح اس کی زبان تو بند ہو سکتی ہے لیکن دل مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرورت ہے اس مذہبی روح کی تلقین کی جو ظاہری شعائر و مراسم سے بے نیاز ہے اور جس میں سوا بلند تعلیمِ اخلاق کے کوئی اور چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو ہمیں الہام و معجزات، بہشت و دوزخ، حشر و نشر، قیامت و آخرت کے تسلیم کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ تنگ نظری تھی جس نے اہلِ مذاہب کو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رکھا اور یہی وہ چیز ہے جو مذہب کے اقتدار کو مٹا کر رہے گی۔ دنیا میں اب کوئی ایسا مذہب نہیں چل سکتا جو تمدنی ضروریات، بین الاقوامی تعلقات، اقتصادی مشکلات، اخلاقی اصولِ عامہ کو پس پشت ڈال کر صرف "امیدِ فردا" پر اپنی کارگاہِ تبلیغ قائم کرے۔ وہ وقت گزر گیا جب مذہب کسی ایک قوم کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا، اب کہ کرۂ زمین کی ۲۴ ہزار میل کی وسعت کو انسان چند دن میں طے کر لیتا ہے، تخصیصِ نسل و جغرافیہ کا سوال بالکل لایعنی چیز ہے، اور مذہب کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ کوئی ایسا لائحۂ عمل پیش کرے جو تمام آبادی کو کسی ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتا ہو اور یہ ممکن نہیں جب تک مذہب کے اعتقادی حصہ کو علیحدہ کر کے اسے ہیئتِ اجتماعی کے اصول پر صرف "سوشل آرگنائزیشن" کی حیثیت نہ دی جائے۔

○○○

ملاحدۂ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے (۲)

صراطِ مستقیم

ہمارے سامنے دو راستے ہیں، ایک وہ جو فطرت اور عالمِ اسباب کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے، اور دوسرا وہ جو مافوق الفطرت باتوں کی جانب مائل کرتا ہے۔ یعنی ایک وہ ہے جو ہمیں تحقیق و جستجو، اکتشافات و اختراع، سعی و کاوش اور رشتۂ علت و معلول کی طرف متوجہ کر کے راحت و آسائش، امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور دوسرا وہ جو ہمیں بتاتا ہے کہ اصل دنیا یہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے اور اسی غیر معلوم دنیا کے لیے بلا حیلہ و حجت ہم کو قربانیاں، دعائیں اور عبادتیں کرتے رہنا چاہیئے۔

ان دونوں راستوں میں اور کیا فرق ہے؟

ایک بتاتا ہے کہ زندگی نام ہے اپنے اور دیگر ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی رکھنے اور ان کے لیے اسبابِ راحت و سکون فراہم کرنے کا، دوسرا کہتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقصد خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش ہے جو دوسری دنیا میں ہمارے اس تمام عجز و انکسار کا ابدی معاوضہ دیں گے۔ ایک عقل و حقائق پر اعتماد کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور دوسرا صرف عقائد پر بھروسہ کرنے کی۔ ایک کہتا ہے کہ اپنے حواس و ادراک کی اس روشنی سے کام لو جو خود تمہارے اندر پائی جاتی ہے، دوسرا کہتا ہے کہ اس مقدس روشنی کو گل کر دو؏

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ کیا، وہ اس سے زائد کچھ نہ کر سکتے تھے۔ وہ ایک مافوق الفطرت قوت پر یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر وہ طاعت و عبادت، دعا و قربانی نہ کریں گے تو نہ بارش وقت پر ہو گی اور نہ ان کی کھیتیاں بار آور ہوں گی۔ وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ایک مستبد بادشاہ ہے جس کو ذرا ذرا سی بات ناگوار ہو جاتی ہے اور جو برہم ہو کر سزا دینے پر اتر آتا ہے۔ وہ خدائے خیر کے ساتھ خدائے شر کے بھی

قائل تھے اور انہی دو خداؤں کے درمیان بیم و رجا کی "رعشہ براندام" زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کی حیات کا کوئی لمحہ خوف سے خالی نہ گذرتا تھا اور ہر وقت وہ اسی ڈر سے کانپتے رہتے تھے کہ مبادا کوئی ان سے خفیف سی گستاخی سرزد ہو جائے اور خدا ناراض ہو کر انہیں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دے۔

طوفان آتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے انہی کی بد اعمالیوں کا، زلزلہ آتا تھا تو وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ان پر برہم ہو رہا ہے۔ وبائی بیماریاں پھیلتی تھیں تو وہ اسے بھی اپنے ہی گناہوں کی پاداش جانتے تھے، اور جب چاند سورج کو گرہن لگتا تھا تو اسے بھی اپنی خطاؤں کا نتیجہ باور کرتے تھے، تمام فضا انہی فرشتوں یا خبیث روحوں سے معمور نظر آتی تھی، اور شب و روز صرف اس لئے الحاح وزاری کیا کرتے تھے کہ خدا ان سے خفا ہو کر تباہ و برباد نہ کر دے، قدرت ان کے نزدیک گویا ایک سوتیلی ماں تھی جو پیشانی پر شکنیں ڈالے ہوئے ہر وقت انہیں خون چکاں آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

آخر کار ایک زمانہ آیا جب بعض افراد سوچنے والا دماغ لے کر پیدا ہوئے اور انہوں نے تمام حوادث وواقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ انہوں نے سمجھا کہ طوفانوں اور زلزلوں کے اسباب طبعی کچھ اور ہیں۔ سورج گرہن کے لیے ایک زمانہ معین ہے اور پہلے سے اس کے وقوع کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے، اسی طرح رفتہ رفتہ سیاروں کی گردش، کرۂ زمین کے جغرافی حالات، آب و آتش کے خواص، مظاہرِ فطرت کے اسباب، حیاتِ انسانی کی خصوصیات، اعضائے جسم کے وظائف معلوم کئے گئے اور واہمہ پرستی کی زنجیر کی کچھ کڑیاں ٹوٹیں۔ اس کے بعد کچھ زمانہ اور گذرا، یہاں تک کہ مدارس کی بنیادیں پڑیں۔ کتابیں تصنیف کی گئیں، مفکرین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ علمی اکتشافات نے انسان کے دماغ کو منور کرنا شروع کیا، فکر و خیال کی آزادی بڑھی اور مافوق الفطرت کی جگہ فطرت اور اصولِ فطرت نے لے لی۔ پھر روح کے اس احساسِ آزادی کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہ ظاہر ہو کر رہا، یعنی اختراع و ایجاد کے دروازے کھل گئے اور اربابِ مذہب اپنی اور اپنے اعتقادات کی کمزوریوں کو بری طرح محسوس کرنے لگے۔

ظاہر ہے کہ مفکرین کے مقابلہ میں "معتقدین" کوئی علمی و عقلی دلیل تو پیش کر نہ سکتے تھے، کیوں کہ یہی ایک چیز ان کے دسترس سے دور تھی۔ اس لیے وہ اہلِ علم کے خلاف ملک میں نہایت مکروہ پروپیگنڈا کی اشاعت پر اتر آئے اور واہمہ پرستی کے پاس

جہل و تعصب کے جتنے گندے حربے موجود ہیں، ان سب کا استعمال بیک وقت شروع کر دیا گیا، ان کو ذریاتِ شیطان بتایا گیا، خدا کا دشمن ظاہر کیا گیا۔ ان کو مٹا دینے کا نام مذہبی جہاد قرار پایا، اور استعمالِ آتش و زنجیر اور تعذیب و تذلیل کی جتنی مہیب صورتیں ہیں وہ سب بروئے کار لائی گئیں۔

پھر یہ سب کچھ چند دن کا ہنگامہ نہ تھا، بلکہ یہ خون آشامیاں صدیوں تک جاری رہیں اور اس سلسلہ میں کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کا ارتکاب مذہب کے نام پر جائز و مستحسن نہ قرار دیا گیا ہو۔ ایک فریق کہتا تھا کہ جذباتِ انسانی کو فنا کر دو اور ضروریاتِ زندگی کو کم، اپنے آپ کو معذور سمجھو اور آسمانی قوت پر اعتمادِ کامل رکھ کر تمام کام اسی پر چھوڑ دو، دوسری جماعت کہتی تھی کہ جذباتِ انسانی اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ مناسب حدود میں ان کو تسکین پہنچائی جائے اور ضروریاتِ زندگی کو بڑھانا بھی لازم ہے، کیوں کہ بغیر ان کے انسانوں کو اپنی قوتوں کا علم نہیں ہو سکتا اور دنیا میں کوئی ایجاد و اختراع معرضِ ظہور میں نہیں آسکتی۔

ایک فریق کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ مال و دولت کو ٹھکرا دیا جائے اور اسبابِ راحت سے نفرت کی جائے، یہ لوگ فنون لطیفہ کے دشمن تھے؛ اچھی غذا، اچھے لباس، اچھے مکانوں سے متنفر تھے، گویا یوں سمجھئے کہ یہ حکماء تھے غربت و افلاس کے، تشنگی و گرسنگی کے، جھونپڑوں کے، چیتھڑوں کے، برہنہ پائی کے اور ایک ایسے آہستہ ردِّ عمل خودکشی کے جو دفعتاً نہیں بلکہ تدریجاً قوم کی قوم ہلاک کر دینے والا ہے۔ ان کو اس دنیا میں سوا عذاب و مصیبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا اور دوسری دنیا ہر قسم کے اسبابِ نشاط و راحت سے معمور نظر آتی تھی، وہ امراء اصحابِ ثروت سے اور تمام ان لوگوں سے جو اپنی قوتِ بازو کی مدد سے راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں، نفرت کرتے تھے اور جنت میں سوا گداگروں اور بھکاریوں کے کسی اور کا درخور محال سمجھتے تھے۔ الغرض یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے دنیا کو ویران و غیر دل چسپ رکھنے کے لئے سیکڑوں سال تک جہاد کیا اور کچھ زمانہ تک انہیں کامیابی بھی حاصل رہی، لیکن ذہنی و عقلی آزادی بجائے خود ایسی زبردست لذت ہے کہ ایک بار چکھ لینے کے بعد اس کا چھوڑنا محال ہے، اس لیے اس کا ذوق رفتہ رفتہ عام ہوتا گیا اور ذہن و خیال کی دنیا ہی بالکل بدل گئی۔

چناں چہ اب انسان اس جسم متحرک کا نام نہیں ہے جو ایک وقتِ معین تک حرکت

کرتے رہنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے بلکہ انسان نام ہے قوائے عقل و دماغ کی ترقی کا، حرکت و عمل کا، تحقیق و جستجو کا، اعتمادِ ذاتی کا اور آسمان سے لے کر زمین تک تمام مناظرِ قدرت پر چھا جانے کا۔ اب وہ اس کا قائل نہیں کہ طاعت و عبادت بجائے خود کوئی تقدس و پاکیزگی ہے اور انعامِ خداوندی کی مستحق، اب وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جزا و سزا مافوق الفطرت سے متعلق ہے بلکہ وہ تقدس کا مفہوم صرف حرکت و عمل کو قرار دیتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ انسان کی دوزخ و جنت خود اسی کے اندر اور اسی دنیا میں موجود ہے اور اسے اختیار حاصل ہے، خواہ وہ مجہول و بے کار زندگی بسر کر کے جہنم میں چلا جائے، خواہ سعی و محنت سے کام لے کر فردوس حاصل کرے۔

یہ اعتقاد کہ بادشاہ کو خدا، بادشاہ بنا کر بھیجتا ہے اور رعایا کا کام صرف اس کی اطاعت ہے، اب ختم ہو گیا۔ یہ عقیدہ کے مذہب خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے اور اس کے بتائے ہوئے اصول و عقائد کو بغیر چون و چرا تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے، بہت کچھ مٹ گیا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے بادشاہ بھی رفتہ رفتہ فنا ہو رہے ہیں اور مذہبی حکومتیں بھی محو ہوتی جا رہی ہیں۔

انگلستان میں بجائے خدا کے اب پارلیمنٹ کی حکومت ہے اور امریکہ میں مذہبی اقتدار کی جگہ رائے عامہ نے لے لی ہے۔ فرانس اپنی آبادی کے سوا کسی اور مافوق الفطرت قوت کو حکومت میں دخل دینے کا مستحق قرار نہیں دیتا اور روس میں سب سے بڑا جرم خدا اور مذہب کا نام لینا ہے۔ یورپ میں صرف ایک قیصر ولیم (شاہ جرمنی) ایسا بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو فرستادۂ خدا سمجھتا تھا، سو گذشتہ جنگ میں وہ بھی ختم ہو گیا۔

انسان آزادیٔ کامل کی اس منزل تک سخت صعوبتیں اٹھانے کے بعد پہنچا ہے اور استعمالِ عقل کے استحقاق کو اب اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ جس وقت تک وہ اپنی فہم و فراست کو مشعل راہ بنانے سے باز رکھا گیا، بے شک وہ کہہ سکتا تھا کہ اصل نیکی صرف خوفِ جہنم سے کانپتے رہنا ہے اور حصولِ نجات کے لیے یہی کافی ہے لیکن جب اس نے دیکھا کہ تنہا یہ عقیدہ نہ اس کے لیے روزی فراہم کر سکتا ہے، نہ تن پوشی کے لئے لباس تو اس کی نگاہیں آسمان کی طرف سے زمین کی جانب مائل ہوئیں اور وہ یہ دیکھ کر متعجب ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتے ہیں، وہ بھی اسی کی طرح جرم و معصیت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ سقراط کو جس نے زہر کا پیالہ دیا، وہ بھی مذہبی انسان تھا اور عیسیٰ کو جنھوں نے سولی پر چڑھایا، وہ بھی خدا ہی کے ماننے والے تھے، اس

لیے اس کی روح میں بغاوت پیدا ہوئی اور اس طرح سب سے پہلا جذبۂ انتقاد جو مذہب کے خلاف رونما ہوا، وہ خود اہلِ مذہب ہی کا پیدا کیا ہوا تھا۔

آپ کسی مذہب والے سے دریافت کیجئے وہ اپنے سوا تمام دنیا کو گمراہ بتائے گا اور اسی خدا کو قابلِ پرستش قرار دے گا جو اس نے وضع کیا، دوسرے مذاہب و اقوام کے خداؤں کو وہ جھوٹا بتائے گا۔ وہ سوا اپنے معبد کے کسی اور کی عبادت گاہ کی عزت نہ کرے گا۔ سوا اپنے طریقِ عبادت کے وہ کسی اصولِ بندگی کا احترام نہ کرے گا وہ اپنی قربانیوں کے مقابلہ میں دوسرے مذہب کی قربانیوں کو لغو وبے کار بتائے گا۔ گویا اسی کا خدا خدا ہے، اور اس کا پیغمبر، پیغمبر، اسی کی کتاب الہامی صحیفہ ہے اور اسی کی دعائیں مقبول۔

اب خدا کے اس تصور کو دیکھئے جو الہامی مذاہب نے پیش کیا ہے، خدا کو قادرِ مطلق، بے نیاز اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو سکنے والا بتایا جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ کتبِ مقدسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غصہ بھی آتا ہے، وہ انتقام بھی لیتا ہے اور اپنے بندوں میں سے ایک کے ساتھ رعایت اور دوسرے کے ساتھ ظلم بھی کر سکتا ہے!

عدن میں آدم و حوا کو خود ہی پیدا کرتا ہے اور نافرمانی و سرکشی نہیں بلکہ معمولی سی غلطی پر خود ہی اس قدر برہم ہو جاتا ہے کہ عدن سے اُٹھا کر زمین پر پھینک دیتا ہے اور نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی تمام عمر غم و غصہ میں مبتلا رہنا مقسوم کر دیتا ہے۔ خدا اور اتنا غصہ، خالق اور اپنی مخلوق پر اتنی برہمی! اگر وہ جانتا تھا کہ ان سے یہ غلطی سر زد ہو گی تو پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ غلطی نہ کر سکنے والی مخلوق پیدا کرتا۔ خود ہی ان کو پیدا کیا۔ خود ہی برہم ہو کر انہیں مبتلائے آلام کر دیا، عجیب تماشہ ہے!

الہامی صحائف خدا کے غصے اور جنگ و قتال کے احکام سے بھرے پڑے ہیں قوموں کو اس نے برباد کیا۔ بستیوں کو اس نے ویران کیا۔ وبائیں اس نے مسلط کیں، آسمانی عذاب اس نے نازل کیے۔ حالاں کہ انسان کی سرکشی یا نافرمانی بھی اسی کی پیدا کی ہوئی چیز تھی اور خود اسی کی مرضی تھی کہ وہ ایسا کرے پھر سمجھ نہیں آتا کہ جب انسان کو (جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے) تباہ کرنا ہی مقصود تھا تو ان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ انہیں معصوم پیدا کرتا۔

ایک بار ساری دنیا کو سوائے آٹھ آدمیوں کے طوفان میں غرق کر دیتا ہے اور تمام

زمین کو لاشوں سے پاٹ کر دیتا ہے اس کے بعد وہ صرف یہودیوں کو لطف و کرم کا مستحق سمجھتا ہے اور باقی تمام مخلوق کو بغیر کسی سبب کے مردود قرار دیتا ہے، نہ وہ اہلِ مصر کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اہلِ ایران کی طرف، نہ اسیریوں کو قابل اعتناء خیال کرتا ہے نہ یونانیوں کو (حالاں کہ ان سب کا خالق بھی وہی تھا) اور صدیوں تک صرف ایک فرقہ کا خدا بنا رہتا ہے-------------- کیوں؟

خدا ایک قوم کو حکم دیتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے جنگ کر کے ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرے اور جو زندہ ہاتھ آ جائیں انہیں لونڈی غلام بنائے۔ اس کے علاوہ وہ ادارۂ غلامی قائم رکھنے کے لئے ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دیتا ہے۔ بادشاہوں کے جرائم کے عوض میں رعایا کو ہلاک کرنا مناسب سمجھتا ہے اور وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے بندوں میں سے کسی ایک جماعت سے خوش ہو جاتا ہے اور دوسری سے برہم------- اس کا سبب؟

حقائقِ عالم کے لحاظ سے صحفِ مقدسہ نے جو معلومات انسان کے سامنے پیش کی ہیں، ان کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ زمین کا چپٹا و مسطح بتانا، طبقات الارض کا انتہائی درس ہے اور تاروں کو آسمان سے جڑا ہوا ظاہر کرنا فلکیات کا بلند ترین نظریہ!

صحت و امراض کے متعلق دو نظریئے دنیا میں رائج ہیں۔ ایک مذہبی، دوسرا علمی۔ مذہبی نظریہ یہ ہے کہ بیماریاں ارواحِ خبیثہ سے پیدا ہوتی ہیں جو جسمِ انسانی میں حلول کر جاتی ہیں اور ان ارواحِ خبیثہ کو مذہب کے نفوسِ مقدسہ ہی دور کر سکتے ہیں۔ جب تک مسیح زندہ رہے ان کی عمر شیاطین اور ارواحِ خبیثہ کے دور کرنے میں بسر ہوئی اور بعد کو ان کے مقدس راہبوں نے صدیوں تک یہ خدمت انجام دی، چناں چہ ازمنۂ وسطیٰ میں لاکھوں کروڑوں شیاطین اسی طرح بھگائے جاتے رہے اور امراض کا علاج جھاڑ پھونک، دعا، تعویز اور گنڈوں سے ہوتا رہا۔ امراض کے طبیعی اسباب کا کوئی علم نہ تھا۔ مقدس اہلِ مذاہب دعاؤں کے بہانہ سے ہزاروں روپیہ کماتے تھے۔ (فقیروں کی روزی کا مدار اسی پر ہے)

آخر کار جب علم بڑھا تو آہستہ آہستہ امراض کے طبیعی اسباب کا بھی علم ہوا اور ان کے دور کرنے کی طبیعی تدابیر بھی رائج ہوئیں چناں چہ اِس وقت سوائے جاہل ممالک کے جن میں ہندوستان کا مرتبہ سب سے بلند ہے جنات یا شیاطین یا ارواحِ خبیثہ کا عقیدہ بالکل اٹھ گیا

ہے اور جب کوئی بیمار پڑتا ہے تو بجائے دعا تعویذ کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

مذاہبِ عالم اور کتبِ مقدسہ کے متعلق بھی دو خیال ہیں۔ ایک جماعت (اہلِ مذاہب) کی کہتی ہے کہ وہ بالکل الہامی ہیں اور انسانی فکر کو ان میں دخل نہیں اور دوسری جماعت کہتی ہے کہ صحفِ مقدسہ سب انسانوں کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور مذہب رونما ہوا ہے صرف اس جذبۂ خوف سے جو حوادثِ طبیعی و مظاہرِ قدرت کو دیکھ دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوتا تھا، چناں چہ دنیا میں کوئی قدیم قوم ایسی نہ تھی جس کا کوئی مذہب نہ رہا ہو اور اطاعت و عبادت کو اس نے اپنی حفاظت و نجات کا ذریعہ خیال نہ کیا ہو لیکن رفتہ رفتہ یہ واہمہ پرستی کم ہوتی گئی یہاں تک کہ اب ہر ذی فہم انسان جانتا ہے کہ دنیا میں ہر واقعہ کا ایک فطری سبب ہوا کرتا ہے اور قدرت بغیر اس خیال کے کہ انسان کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں، اپنے کام میں مصروف ہے۔

اب مفکرین اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب خود انسانوں نے وضع کئے تھے اور خدا اور الہامِ خداوندی سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ جن کتابوں کو وہ الہامی کہتے ہیں وہ بھی انسان ہی کے دماغ کا نتیجہ تھیں اور اسی لئے ہر قوم و زمانہ کے لحاظ سے ان میں مختلف خیالات و تعلیمات پائی جاتی ہیں، نہ خدا کو اطاعت و عبادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کی دعا سنتا ہے۔ اہلِ دنیا پر ہزاروں مرتبہ قحط و وبا طوفان و سیلاب کی مصیبتیں نازل ہوئیں اور کوئی دعا انہیں دور نہ کر سکی، زلزلے آتے رہے، جوالا مکھی آگ برساتے رہے۔ ہزاروں معصوم نفوس فنا ہوتے رہے اور انسان کی کسی گریہ و زاری نے خدا کو اس ہلاکت باری سے باز نہ رکھا، کھیتیاں سوکھتی رہیں اور انسانوں کی دعائیں ایک قطرہ پانی کا نہ حاصل کر سکیں وبائیں پھیلتی رہیں اور خدا کے نام پر لکھے ہوئے تعویذ کسی ایک متنفس کو بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے۔ غلاموں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان ہوتی رہی، عورتوں کی عصمت دری کو علی الاعلان جائز رکھا گیا۔ شیر خوار بچے ماؤں کی آغوش سے چھین چھین کر بازاروں میں فروخت کیے گئے، اور ان کی فریاد و زاری ایک لمحہ کے لئے خدا کو متوجہ نہ کر سکی کہ وہ ظالم بادشاہوں کی حکومت کے بجائے آسمانی بادشاہت قائم کرتا۔

اخلاقیات کے باب میں اہلِ مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے جس فعل سے باز رکھا ہے وہ ہی برا ہے اور جس کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اچھا ہے خود بندہ کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ خود کسی فعل کے مستحسن یا قبیح ہونے پر رائے زنی کرے گویا مذہبی

انسان کسی اچھے کام کو خود اچھا سمجھ کر انجام نہیں دیتا بلکہ فرمانِ خداوندی کی تعمیل سمجھ کر اس کو اختیار کرتا اور صرف اس خوف سے کہ مبادا خدا برہم ہو جائے اور اسے عذاب میں مبتلا کرے۔

تقریباً تمام اہلِ مذہب کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان اچھے اخلاق کا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ وجودِ خدا کا قائل نہ ہو اور اگر کسی میں یہ صفت پائی بھی جائے تو بغیر خدا کو مانے ہوئے وہ بالکل بے کار ہے۔

علماءِ اخلاقیات کا نظریہ یہ ہے کہ نیکی و بدی اشیاء کی فطرت میں موجود ہے بعض افعال ایسے ہیں جو انسانی مسرت کا باعث ہوتے ہیں اور بعض آزار و مصائب کا سبب بن جاتے ہیں، چناں چہ اول الذکر افعال کو ہم اخلاقِ حسنہ کہتے ہیں اور مؤخر الذکر کو افعالِ قبیحہ یا معصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اخلاقِ انسانی کا تعلق اسی دنیا سے ہے اور یہیں ان کے نتائج دیکھ کر ان کے برے یا اچھے ہونے کا اصول قائم کیا گیا ہے۔ نہ خدا ان سے متاثر ہوتا ہے اور نہ دوسری دنیا میں ان کا محاسبہ کر کے جزا و سزا دینے کی ضرورت، چوری کو برا سمجھنے کے لئے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی، انسان کے تجربہ نے اس کے نقصانات دیکھ کر خود اسے برا قرار دیا، تمام وہ جرائم جو انسان کو جسمانی اقتصادی و عمرانی نقصان پہنچاتے ہیں ان سے اپنے آپ کو محفوظ رہنے کا احساس ہر شخص میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اور یہی وہ احساس تھا جس نے اسے بتایا کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کس کو!

پھر جو چیز اس لحاظ سے بری ہے وہ یقیناً بری سمجھی جائے گی خواہ مذہب کے نزدیک اچھی ہو، واقعات و تاثرات کو کوئی قوت بدل نہیں سکتی جس طرح قدرت ایک مربع کو دائرہ ثابت کرنے سے عاجز ہے اسی طرح وہ کسی بری بات کو اچھی اور اچھی کو بری نہیں بنا سکتی۔

الغرض اہلِ مذہب نے جو نظریۂ اخلاق قائم کیا ہے اس پر ایک انسان کبھی فخر نہیں کر سکتا۔ ایک شخص نیک کام کرتا ہے صرف اس ڈر سے کہ خدا کا حکم ہے اور اس طمع سے کہ اس کا انعام دوسری دنیا میں ملے گا، دوسرا اچھے اخلاق اختیار کرتا ہے صرف اس بناء پر کہ یہ اس کا انسانی فرض ہے اور نیکی آپ اپنی جزا ہے اور دونوں کے فرق کو ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

الغرض اس وقت دو راستے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کی طرف ہم کو

لے جاتا ہے اور دوسرا وہ جو عقل کی طرف رہبری کرتا ہے۔ سواول الذکر کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور ہمیشہ اس کا نتیجہ ایک ہی نکلا ہے۔

فلسطین میں اس کا تجربہ کیا گیا لیکن اہلِ فلسطین کی مذہبیت ان کو تباہ و برباد ہونے سے نہ بچا سکی، وہ مفتوح و مغلوب ہو کر خارج البلد کئے گئے، صدیوں تک امدادِ خداوندی کا انتظار کرتے رہے اور اس توقع پر زندہ رہے کہ خدا انہیں پھر مجتمع کرے گا۔ ان کی بستیوں، ان کے معبدوں اور قربان گاہوں کو از سرِ نو تعمیر کرے گا۔ لیکن صدیوں پر صدیاں گزر گئیں اور ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

اس کا تجربہ سوئٹزرلینڈ میں کیا گیا وہاں بھی سوا غلامی کے اور کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں اور صرف انہی لوگوں کو آزادی کے ساتھ بولنے کا حق رہا جو صاحبِ جاہ و ثروت تھے، عوام سے ان کی معصوم مسرتیں چھین لی گئیں، ان کے لئے ہنسنا ممنوع قرار پایا اور سوائے رنج و غلامی کے کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے اوراد و وظائف، روزہ، صلوٰۃ، وعظ و پند کو بھی آزما کر دیکھ لیا لیکن کوئی چیز انہیں مسرت و راحت سے آشنا نہ کر سکی۔

اسکاٹ لینڈ میں بھی مذہب کا تجربہ ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی ماننے والی تمام آبادی کو خوش قسمت لیکن ظالم کرکوں کا غلام بن کر رہنا پڑا۔ پادری ہر خاندان میں گھس جاتے تھے، اور خوف وواہمہ پرستی پھیلا پھیلا کر لوگوں کی عقلیں سلب کر رہے تھے، اور اپنی ہدایات کو الہام ربانی کہتے تھے اور ان سے انحراف کرنے والے عذابِ خداوندی کا مستوجب قرار دیتے تھے، پھر اس مذہبی حکومت میں بھی وہی ہوا جو ہونا چاہئے۔ انسان غلام تھا اور غلامی کے ناقابلِ برداشت بار سے اس کی پیٹھ جھکی جا رہی تھی۔

انگلستان میں مذہبی حکومت نے جو گل کھلائے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اس زمانہ کے قانون، اس زمانہ کے اوہام و تعصبات اس قدر سخت تھے کہ خدا کی پناہ! پادری خدا کے بیٹے بنے ہوئے آسمان و زمین کی ملکیت کا دعویٰ کر رہے تھے۔ بہشت و دوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور جس کو جہاں جی چاہتا تھا دھکیل دیتے تھے۔ نہ ان کے دلوں میں رحم تھا، نہ آنکھوں میں مروّت، ادنٰی ادنٰی سی غلطیوں پر خارج البلد کر دینا، کوڑے لگوانا اور قید و بند میں ڈال دینا معمولی بات تھی۔

ازمنۂ مظلمہ میں مذہبی زندگی کا جو نتیجہ ہوا وہ اور زیادہ ہادمِ انسانیت تھا ہزاروں

سولیاں ہر وقت خون سے تر رہتی تھیں اور بے شمار تلواریں انسانی سینے میں پیوست۔ قید خانے کھچا کھچ بھرے رہتے تھے اور سینکڑوں انسان دہکتی ہوئی آگ کے اندر پڑے ہوئے تڑپا کرتے تھے۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو خدا کے نام پر روانہ رکھا گیا ہو اور کوئی معصیت ایسی نہ تھی جس کا ارتکاب مذہب کے پردہ میں نہ ہوتا ہو۔ الغرض یہ تھا مذہبی حکومتوں کا رنگ جو اہلِ مذہب نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اب اس کے مقابلے میں اس راستہ کو دیکھو جس کی رہنمائی عقل نے کی ہے کیسا صاف وہموار راستہ ہے کیسی کھلی ہوئی فضا ہے کیسی پر بہار زمین ہے۔ ہر شخص دوسرے کا بوجھ ہلکا کرنے کی فکر میں ہے۔ اور ہر دماغ اسی فکر میں ہے کہ بنی نوع انسان کی راحت و مسرت کا سامان بہم پہنچائے۔ نہ وہاں سولیاں ہیں نہ قید خانے، نہ جہنم کے اژدھے ہیں نہ فرشتوں کے کوڑے، قدرت کی وسیع فضا ہے جس سے ہر شخص یکساں فائدہ اٹھا رہا ہے، عقل و فراست کا ایک آفتاب ہے جو سب کو برابر مستفیض کرنا چاہتا ہے۔ انسانیت کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں غلامی کا داغ اشرف المخلوقات کی پیشانی سے ہٹ چکا ہے، ذہنی آزادی نے مختلف قسم کے چمن کھلا رکھے ہیں اور ہر فرد دوسرے سے ہم آغوش و بغل گیر نظر آتا ہے۔

جس وقت میں تاریک ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو میرا ریشہ ریشہ کانپ اٹھتا ہے، سب سے پہلے مجھے وہ تنگ و تاریک غار نظر آتے ہیں جہاں مقدس اژدھے کنڈلیاں مارے ہوئے قربانیوں کا انتظار کر رہے ہین۔ ان کے جبڑے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ آنکھیں چمک رہی ہیں اور زہریلے دانت خون آلود ہیں۔ جاہل ماں باپ اپنے معصوم بچوں کو اس افعیٰ دیوتا کے حضور پیش کرتے ہیں وہ اس چیختے تڑپتے ہوئے بچہ کو اپنے بل میں لپیٹ کر پیس ڈالتا ہے اور بے رحم والدین اس ہدیہ کے قبول ہونے پر خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں۔

اس کے بعد مجھے وہ عبادت گاہیں نظر آتی ہیں جن کو بڑے بڑے پتھروں سے تیار کیا گیا ہے لیکن یہاں ان کی قربان گاہیں بھی خون سے رنگین ہیں اور مقدس پجاریوں کے خنجر معصوم لڑکیوں کے سینوں میں یہاں بھی پیوست نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور معبد سامنے آتے ہیں جہاں مقدس آگ کی روشنی کو انسانی گوشت و خون سے قائم رکھا جاتا ہے، پھر چند عبادت گاہیں اور دکھائی دیتی ہیں جن کی قربان گاہیں بیلوں اور بھیڑوں

کے خون سے تر ہیں۔ اس کے بعد ہی مجھے کچھ اور معبد، کچھ اور پجاری، کچھ اور قربان گاہیں نظر آتی ہیں جہاں انسانی آزادی کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ خدا کے معبد تو نہایت عظیم الشان ہیں، لیکن کسانوں کے پاس جھونپڑا تک نہیں۔ پجاریوں اور بادشاہوں کے جسم زرکار عباؤں سے آراستہ ہیں لیکن رعایا کے پاس جسم ڈھانکنے کو بوسیدہ سا چیتھڑا بھی نہیں۔ اور کیا دیکھتا ہوں؟ یہ کہ قید خانے انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں، خارج البلد خانماں برباد بوڑھے، بچے، عورتیں، پہاڑوں اور صحراؤں میں سر ٹکرا رہی ہیں۔ آلات تعذیب حرکت میں آ رہے ہیں اور لاکھوں انسانوں کی چیخ سے خانقاہیں گونج رہی ہیں۔ اف! وہ تاریک قید خانے، وہ زنجیروں کی جھنکار، وہ آگ کے بلند شعلے، وہ جھلسے ہوئے سیاہ چہرے، وہ اینٹھتے ہوئے اعضاء، وہ شکنجوں میں کسے ہوئے ہزاروں معصوم انسان اور وہ ان رگوں کے ٹوٹنے کی آوازیں۔

اس کے بعد جو میری نگاہ اٹھتی ہے تو افق میں مجھے ایک نئی روشنی نظر آتی ہے انسانی جسموں کے راکھ کے ڈھیر سے ایک نیا آفتاب طلوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے یعنی عقل و مذہبِ آزادی، اب غلامی کی زنجیریں آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہیں، قربان گاہیں فنا ہوتی جاتی ہیں، عبادت گاہیں مسمار ہو رہی ہیں، زبان کی بندشیں اٹھتی جاتی ہیں اور ذہن و عقل کے قفل ٹوٹتے جا رہے ہیں۔

اب میں پھر دیکھتا ہوں لیکن ماضی کی طرف نہیں بلکہ مستقبل کی طرف اور فرطِ مسرت سے اچھل پڑتا ہوں۔ اس وقت مجھے کیا نظر آتا ہے، یہ کہ پجاری اور بادشاہ ختم ہو چکے ہیں۔ قربان گاہیں اور تخت و تاج خاک میں مل چکے ہیں۔ عمارتیں نیست و نابود ہو چکی ہیں اور تمام دیوتا مفقود ------ ان کی جگہ ایک نیا مذہب رونما ہوا ہے۔ جس کا نام آزادئ ضمیر ہے۔ اور ایک نئی سلطنت قائم ہوئی ہے۔ جس کی ملکہ حریتِ فکر و رائے اور جس کی رعایا اخوتِ عامہ ہے۔ ہر جگہ امن و سکون ہے اور ہر شخص مطمئن، نہ کوئی قید خانہ ہے نہ بیمارستان، نہ عدالت گاہیں ہیں نہ جرم و معاصی کی داستان، ایک ایسی دنیا ہے جہاں سوا صداقت کے کسی چیز کا گزر نہیں۔ سوا حسن و جمال کے کوئی شے پیش نظر نہیں۔ جدھر دیکھو نور کی بارش ہے اور انسانی دماغ کی کھیتیاں لہلہا رہی ہیں عقبیٰ کا خوف دنیا کی مسرتوں میں تبدیل ہو چکا ہے اور خدا کا ڈر انسانیت کی محبت میں۔

ملاحدۂ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے (۳)

مذہب کا مستقبل

اس وقت دنیا مذہب کی طرف سے کافی بدگمان ہو چکی ہے اور اس کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ مغرب کے اسی عہد کی برکت ہے درست نہیں۔ مذہب کی طرف سے انحراف کب اور کیوں کر شروع ہوا اس کا سراغ لگانے کے لئے ہم کو یورپ کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اس دور میں جس کو ہم دورِ "نشاۃ ثانیہ" Renaissance یا یورپ میں تہذیب و تمدن کی دوبارہ پیدائش کے نام سے یاد کرتے ہیں، زندگی کے مختلف مسائل پر بحث کرنا ایک عام تفریح ہو گئی تھی۔ اس زمانہ میں علمی تحقیق و تجسّس کا وہ جوش و ولولہ پایا جاتا تھا جو یورپ میں روم کی قیصریت کے فنا ہونے کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا گیا۔ لوگوں کو اس وقت یہ پتہ چلا کہ دنیا میں ایسے بھی مسائل پائے جاتے ہیں جن کا نہ انجیل میں تذکرہ ہے اور نہ جن کے متعلق پادریوں کی زبانیں کھلتی ہیں چناں چہ ایسے ہی مسائلِ زندگی پر لوگ اکثر آپس میں بحث کیا کرتے تھے۔ اس چیز کی ابتداء سب سے پہلے اٹلی میں ہوئی اور پھر یہ مباحث انگلستان اور فرانس تک پھیل گئے۔

اٹلی کا ایک مشہور اور سابق پادری گیارڈانو برونو Giordano Bruno جب تک قتل ہونے سے محفوظ رہا، برابر پادریوں اور ان کی مہمل تعلیمات پر اعتراضات کرتا رہا اور پھر اس نے لندن کو اپنا مستقل قیام گاہ بنا لیا۔ یہاں اس نے اور سر فلپ سڈنی نے (جسے انگلستان میں ایک "بے داغ ہستی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) مفکرین کا ایک ایسا حلقہ بنایا جو انسان اور کائنات پر بحث کیا کرتا تھا۔

چوں کہ اس دور کے اکثر افراد ملحدانہ خیالات کے بھی حامل تھے اس لئے وہ مذہب کے مستقبل پر بھی بحث کیا کرتے تھے ان میں سے مشہور ڈراما نویس کرسٹو فر مارلو اور ملکہ الزبتھ کا مشہور درباری سر والٹر ریلے ایک قسم کا کلب بنائے ہوئے تھے جہاں مذہب کے مستقبل پر انتقاد و تبصرہ ہوا کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ مذہب

عیسوی باطل ہے کیوں کہ عملی و تاریخی تحقیقات عیسویت کے افسانوں کو جھٹلا رہی تھیں۔ جہاز راں ایسے ممالک دریافت کر رہے تھے جو کبھی عیسیٰ کے خواب میں بھی نہ آئے تھے۔ منجمّ کائنات کے بارے میں ایسے انکشافات کر رہے تھے جو عقلِ انسانی کی محدود چہار دیواری کی بنیادوں کو متزلزل کیے دے رہے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ تحقیق و جستجو صرف ان لوگوں تک محدود تھی جن کے پاس فرصت تھی، دولت تھی اور جو تمام دنیاوی علائق سے بے نیاز ہو کر اپنا سارا وقت اسی قسم کی تحقیق و تجسّس میں صرف کرتے۔ ورنہ قوم کے زیادہ افراد جاہل تھے وہ مطلق نہیں جانتے تھے کہ تحقیقِ جدید کیا ہے اور جب کسی بے دین یا ملحد کو زندہ جلتے ہوئے دیکھتے تو خوش ہوتے تھے الغرض تعلیم یافتہ لوگ تو مذہب کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے اصول سے انہیں اختلاف تھا لیکن قومی مصالح کی خاطر انہیں اپنے مذہب پر قائم رہنا پڑتا تھا۔

مگر ان تمام مباحث کے دوران میں ایک چیز کا فقدان تھا اور وہ "ارتقاء" کا خیال تھا کسی کو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ نظامِ معاشرت کسی وقت بدل جائے گا حتیٰ کہ جب سر ٹامس مور نے اپنی مشہور کتاب یوٹوپیا Utopia لکھی تو بھی اسے "باغی" نہیں سمجھا گیا کیوں کہ اس کتاب کے تجویز کردہ نظامِ معاشرت کے قوانین بالکل بعید از قیاس سمجھے گئے حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے انگریزی میں وہی چیز لکھی تھی جو اٹھارہ صدی قبل یونانی زبان میں افلاطون لکھ گیا تھا۔ تہذیبِ جدید کے نئے قوانین لوحِ آسمان پر لکھے جا چکے تھے مگر انسان کی آنکھیں اتنی ضعیف تھیں کہ وہ انہیں نہیں دیکھ پاتی تھیں اور اوہام پرستی کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

لیکن اب ہماری نگاہوں میں زیادہ بصیرت پیدا ہو گئی ہے اور ہم ان مسائل کو ایسی صداقت کے معیار پر پرکھتے ہیں جس سے پہلے لاعلم تھے اب "قانونِ وقت" یا "حقیقت" کا لفظ "ترقی" Progress میں مضمر ہے۔

اگر واقعی نظامِ اشیاء کا کوئی قانونِ ابدی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ایک نظام کو دوسرے نظام میں تبدیل ہونا پڑے گا جیسے رات دن میں تبدیل ہوتی ہے۔ بہار خزاں سے بدلتی ہے اور بچپن جوانی سے بدل جاتا ہے ابھی تک ہم اپنے "بزرگوں کی عقل" کی مثالیں پیش کیا کرتے تھے مگر موجودہ زمانہ میں اس فقرہ کو جو استعمال کرے اسے بالکل

احمق سمجھنا چاہئے۔ ہمارے آبا و اجداد نہ ہوائی جہاز بنا سکتے تھے، نہ ریل چلا سکتے اور نہ موٹر؛ تو پھر ہم انہیں اپنے سے زیادہ عقل مند کیوں تسلیم کریں؟

بہر حال مذہب کو بھی بدلنا ہے اور نصف سے زیادہ دنیا اس کو تسلیم کر چکی ہے، وہ لوگ جن میں غور کرنے کی استعداد و صلاحیت موجود ہے اور ہمارے زمانے کے وہ تعلیم یافتہ مرد و خواتین جن کو پڑھنے اور تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کا موقع ملتا ہے، ان میں سے اکثریت کو اس امر کا یقین ہو چکا ہے کہ مذہب مٹ جائے گا۔ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ انسانی آراء کی دوسری منزل کیا ہو گی؟

وہ پیشین گوئیاں جو ادبیات کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں، قابل تسلیم نہیں۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں بالمیز (Balmes) نے کہا تھا کہ پروٹسٹنٹ تہذیب (جرمنی، ہالینڈ وغیرہ) ختم ہو رہی ہے، دنیا کے لیے پروٹسٹنٹ مصلحین کا پیغام بے اثر ثابت ہوا ہے اور کیتھولک سلطنتیں مثلاً فرانس، اسپین، پرتگال، آسٹریا وغیرہ دراصل دنیا کی حکم ران بن رہی ہیں مگر اس پیشین گوئی کے نصف صدی بعد یہ دیکھا گیا کہ کیتھولک ممالک تنزل پذیر ہیں، یا یہ کہ وہ اپنے سابقہ مذہب کو ترک کر چکے ہیں۔ عوام نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ پائس ثانی (Pius II) آخری پاپائے رومہ ہے، اس کے نصف صدی بعد لارڈ میکالے نے لکھا کہ پاپائے روم کا جھنڈا اڑتا ہی رہے گا۔ آج سے بیس برس قبل ایک پیشین گوئی یہ کی گئی کہ کیتھولک مذہب سب سے پہلے نیست و نابود ہو گا۔ اس کے بعد ایچ۔جی۔ ولس نے یہ کہا کہ آج سے ایک ہزار برس کے بعد جدید شہروں میں بھی پیادہ پا راہب چلتے ہوئے دکھائی پڑیں گے۔

لہٰذا اس قسم کی پیشین گوئیوں کو سچا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ گذشتہ عہد کی پیشین گوئیاں سیاسی یا فوجی نقل و حرکات اور تحریکات کی وجہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے اب جو پیشین گوئی کی جائے، وہ بھی غلط ثابت نہ ہو۔ مذہب کے بارے میں آج یہی نظریہ ٹوکیو میں بھی پایا جاتا ہے اور پیکنگ میں بھی، بمبئی میں بھی اور قاہرہ میں بھی، قسطنطنیہ میں بھی اور میکسیکو میں بھی۔

غرض کہ مقامی حالات کچھ ہوں، اقوامِ عالم ان مسائل پر اس وقت تک رائے زنی کرتی رہیں گی جب تک ان کا منطقی حل نہ معلوم ہو جائے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس منطقی حل کو معلوم کرنے کے شرائط ہر دس برس کے بعد بدل جاتے ہیں اور ان میں سب سے

بڑی شرط "علم" ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر عہد میں ایک الحاد پسند قلیل اقلیت یونان، روم، قرطبہ، فلورنس اور تقریباً ہر مقام پر پائی گئی اور آخر میں اقلیت کا خاتمہ ہو گیا لیکن یہ نتیجہ تھا اس امر کا کہ "کلچر" صرف اعلیٰ طبقوں تک محدود تھا اور اب یہ "کلچر" جمہوری ہے۔ آج ۵۰ کروڑ انسان پڑھ سکتے ہیں اور ۵۰ برس کے بعد ان کی تعداد دوچند ہو جائے گی۔

پھر یہ تو درست ہے کہ دنیا ہمیشہ مذہب کے بارے میں بحث کرتی رہے گی لیکن یہی کیوں فرض کر لیا جائے کہ ان مباحث کا منطقی نتیجہ الحاد و بے دینی کی صورت میں ظاہر ہو گا اور یہ کہ کیا یہ چیز ان پیشین گوئی کرنے والوں کا رسمی "فریب" (Fallacy) نہیں ہے۔

ہر پیشین گوئی کی سب سے بڑی کمزوری پیشین گو کی خودسری ہے، وہ اپنے آپ کو اتنا عقل مند تصور کر لیتا ہے کہ جو کچھ اس کے خیالات ہیں، آنے والی نسل ان کو بے چون وچرا قبول کرلے گی، خصوصاً سیاسی و اقتصادی نظریات کی دنیا میں کہ کتابوں اور واعظوں کے لکچروں کو جب کوئی شخص دیکھتا اور سنتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ کیتھولک کو یہ یقین رہتا ہے کہ ساری دنیا اسی کی ہم خیال بن جائے گی، موحد کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب وحدانیت تمام عالم کا ایمان بن جائے گا لیکن جب جارج برنارڈ شا آتا ہے تو وہ ان سب خیالات کو ٹھکرا کر ایک نئی بات کہتا ہے کہ مستقبل کا مذہب کیا ہو گا؟

الغرض ان معاملات میں صورت حال یکساں ہوتی ہے، پیشین گو کے دلائل بہت سادہ ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حقیقت و صداقت سے میں ہی آشنا ہوں اور چوں کہ تمام دنیا میری ہی طرح صداقت پرست ہونے والی ہے، لہٰذا میری بتائی ہوئی صداقت کو ضرور تسلیم کیا جائے گا۔

مگر میں اپنے نظریہ کو اس طرح نہیں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ مذہب اپنی ہر شکل میں ایک دھوکا ہے، ایک وہم ہے اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے پاس وہ ذرائع و اختیارات موجود ہیں جن کو مذاہبِ عالم نے ہم میں بڑھنے سے روکا ہے اور جب یہ تمام مظالم اور تمام دھوکے ختم ہو جائیں گے اور جب انسان کو اپنی صحیح طاقت کا اندازہ ہو جائے گا تو ایک ایسا نظام تیار ہو گا جو موجودہ نظام سے کہیں زیادہ خوشگوار اور دل کش ہو گا۔

میں یہ اس وجہ سے نہیں کہتا کہ میرا یہ عقیدہ مجھے اصل "صداقت" یا حقیقت معلوم ہوتا ہے بلکہ میں یہ اس واسطے کہتا ہوں کہ دنیا اسی سمت جارہی ہے، آگے چل کر

میں ”مذہب“ کی داستان مختصر الفاظ میں بیان کروں گا۔

تجربۂ سابق

مذہب کی داستان کئی ہزار برس کی پرانی داستان ہے اور مذہب کی ابتدا تلاش کرنے کے لیے ہم کو ”عہدِ حجری“ سے بھی قدیم تر زمانہ کی طرف نظر دوڑانی پڑتی ہے لیکن یہاں کسی مدت پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ اپنے ابتدائی دور ہی سے مذہبی خیالات میں تدریجی ارتقاء ہوتا رہا ہے۔ اس ارتقاء میں کوئی تحریکِ جذبات نہ شامل تھی بلکہ تفکر و واقعات کا ایک منطقی تسلسل تھا یا جیسا کہ اعتدال پسند مذہبی لوگ کہتے ہیں، یہ ارتقاء کسی بیرونی قوت کی طرف سے کوئی ”الہام“ نہیں ہے اور اقوامِ عالم کی معیارِ عقل کے مطابق خدا نے اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کیا ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب پہلے ایک مضرت رساں خیال تھا اور رفتہ رفتہ وہ بدتر ہوتا گیا۔

اگر تمام نسلِ انسانی برابر رفتار سے چلتی تو آج ہم مذہب کی ابتدا اور اس کے ارتقاء کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوتے، مگر انسان نے اپنے تجربات صرف پانچ چھ ہزار برس پیشتر سے محفوظ رکھنا شروع کئے، یہاں تک کہ فرضی داستانیں (Legends) بھی بہت پرانی نہیں ہیں لیکن انسانوں کی یہ داستان ہر واقعہ سے اتنا متاثر ہوئی ہے کہ نسل انسانی کے مختلف حصوں نے عام ارتقاء میں ہر منزل پر ترقی نہیں کی۔ بہر حال آج ہم دو انسانی سلسلے (Series) شمار کرا سکتے ہیں۔ ایک تو ان قبلِ تاریخ (Pre-Historic) قوموں کا سلسلہ جو لاکھوں برس پہلے گذر رہی ہیں۔ دوسرے وحشیوں کا زمانہ، یہ دونوں مدتیں تقریباً یکساں ہیں، کیوں کہ دونوں زمانہ قبلِ تاریخ (Pre-Historic) میں گذری ہیں، اور ان قوموں کے خیالات سے تفکرِ انسانی کے ارتقاء کے گذشتہ منازل ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں، اس کے بعد تہذیبِ قدیم کے مذہب کا پرانی عمارتوں سے پتہ چلتا ہے اور پھر ادبیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے بارے میں لوگوں کے کیا خیالات تھے۔ ادب سے گذشتہ تین ہزار برس قبل کے مذہبی ارتقاء کا حال معلوم ہوتا ہے جو مختلف مذہبی مرکزوں مثلاً چین، ہندوستان، ایران، یونان، روم اور مصر وغیرہ میں عیسائیت کے قبل پایا جاتا تھا اور جو سبق اس سے ہم کو ملتا ہے، وہ اس کے بالکل مطابق ہے جو اُس وقت سے اس وقت تک ہوتا رہا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہر قسم کی آب و ہوا اور ہر قسم کی اقتصادی حالت

میں مذہب کا ارتقاء اتنا یک رنگ و یکساں رہا ہے کہ خود ایک مذہبی آدمی اس کا مستقبل دیکھ سکتا ہے۔ جن واقعات نے انسانی ترقی کو (ایسے ممالک میں جہاں ترقی کے وسائل تھے) روک دیا، وہ لڑائیاں یا ایسی غلطیاں تھیں جو ہمیشہ تہذیب کو مٹاتی رہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الحاد اسی زمانہ میں پھیلا جب تہذیب اپنے انتہائی عروج پر ہوئی اور جب تخریبی قوتوں نے علم کو مٹادیا اور جہالت کا دور دورہ ہوا تو الحاد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب علم کی ترقی ہوتی ہے تو مذہب کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں اور جو تہذیب مٹنے لگتی ہے تو اس میں پھر قوت آجاتی ہے۔

مذهب اور فطرت انسانی

میری رائے میں مذہب کی ابتدا کا حال بالکل ایسا ہے جیسے پرانے زمانے کے حبشی کا تصور اپنے سایہ کے بارے میں، میں نے دیکھا ہے کہ اگر کسی کتے کی عمر میں پہلی بار ژالہ باری سے سابقہ پڑے تو وہ بے انتہا حیرت زدہ ہو جاتا ہے یا گر کوئی بلی پہلی مرتبہ کسی کچھوے کو رینگتے ہوئے دیکھتی ہے تو وہ بہت متعجب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زمانۂ قدیم کے انسان میں ممکن ہے ایسے ردِّ عمل (Reaction) ہوتے ہوں مگر ان کا مذہب سے اس وقت تک کوئی تعلق نہیں ہوا جب تک وہ یہ خیال کرنے لگا کہ جو چیز ان کا باعث ہے، وہ ایک غیبی طاقت ہے۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ انسان نے پہلے ایک مبہم طاقت کا تصور کیا اور پھر یہی چیز شخصی روحوں (Souls) میں تبدیل ہو گئی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ روح کا سب سے پرانا نام ”سایہ“ (Shadow) ہے اور جب ہم اپنے آپ کو ایک قدیم وحشی کی جگہ دیکھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً سایہ کے حیرت انگیز وجود پر غور و فکر پہلی چیز تھی جس نے قدیم انسان کے دماغ میں تصور کی جھلک پیدا کی۔ اب سے سو برس قبل جب مشنریوں اور سیاحوں نے وحشیوں کے خیالات کا ریکارڈ رکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کے خیالات اخلاق پر مبنی نہیں ہیں اور بعض کے تو مذہبی خیالات بھی نہیں، بعض ”ہم زاد“ یا ”سایہ“ پر یقین کرتے ہیں اور بعض انسان کے ”دوسرے حصے“ پر جو موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، کامل اعتقاد رکھتا ہے۔

دوسری منزل یا حیات بعد الموت کا خیال بھی تمام دنیا میں متوازی نظر آتا ہے، یعنی کہ مردوں کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور ان کی سرگرمیاں زیادہ بڑھ جاتی ہیں، نیز یہ کہ

ارواح بہت رنجیدہ اور خشک مزاج ہوتی ہیں، گویا زندگی ترک کرنے سے ان کو تکلیف پہنچی ہے، اس کا اظہار وہ خشونت سے کرتی ہیں یا یہ کہ چوں کہ اب وہ کسی کو نظر نہیں آتیں، اس لیے وہ ایسے کام کرنے لگتی ہیں جو پہلے گوشت پوست کی زندگی میں راز کھل جانے کے ڈر سے نہ کر سکتی تھیں۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب نے ایک وحشی کی زندگی کو کچھ عرصہ کے بعد تکلیف دِہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان ارواح کو تمام بیماریوں اور مصیبتوں کا ذمہ دار سمجھا جانے لگا اور چوں کہ ہر آدمی کے مرنے کے بعد ایک خبیث روح بڑھتی ہے، لہٰذا انسانی آبادیاں انہی ارواح سے معمور نظر آنے لگیں۔ بعد کو وہ زمانہ آیا جب ان ارواح کے لیے خاص جگہیں (مثلاً آسمان یا زمین) میں مقرر کر دی گئیں، ان میں سے بعض ایسی بھی سمجھی جانے لگیں جو آدمیوں کی مدد کرتی ہیں لیکن عام نظریہ یہی تھا کہ وہ عموماً شریر ہوتی ہیں۔

مذہبی "مقدسین" کا ظہور

مذہب کے اس ابتدائی دور میں زیادہ اظہارِ خیال کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہم نے انہیں مختصر الفاظ میں ہزاروں برس کے مذہبی ارتقاء کا حال لکھ دیا ہے اب مذہب کے ارتقاء کی دوسری منزل کو لیجئے جس میں "پادری" یا مذہبی عالم کا ظہور ہوا ہے، یہ دور ہر حصۂ دنیا میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ گو وہ ہر جگہ مختلف شکلوں میں آیا ہو، اور یہ جماعت گویا بری روحوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی اور اس کی پوزیشن بھی ابتداء ہی سے عجیب و غریب تھی ان ارواحِ خبیثہ کا مقابلہ کرنے میں مذہبی پیشواؤں کا طریق جنگ ایسا ہوتا تھا کہ بجز وحشیوں کے کوئی بھی اس پر ایمان نہیں لا سکتا تھا۔ وہ معمولی قسم کے "ہپناٹزم" کی مدد سے کسی کو اچھا بھی کر سکتے تھے یا دشمن کو مار بھی سکتے تھے، مگر ان کے تمام کام محض اتفاقی واقعات کے نتیجہ ہوتے تھے۔

بہر حال جس وقت مذہبی "بزرگوں" کا یہ گروہ بڑھ رہا تھا اسی وقت مذہبی خیال میں بھی وسعت ہونی شروع ہوئی، انسانی افراد قبائل میں منقسم ہونے لگے، ہر قبیلہ کا ایک سردار ہونے لگا، یہ سردار دوسری دنیا میں بھی سردار گنا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ انسان کی بڑھتی ہوئی قوتِ متخیلہ نے فطرت میں اور بھی کچھ طاقت ور ہستیاں دیکھنا شروع کیں، مثلاً سانپ، شیر وغیرہ اور آخر کار تمام نظامِ فطرت میں اسے ارواح ہی ارواح نظر آنے لگیں۔ رفتہ رفتہ ان میں سے بعض ارواح دیوتا بن گئیں، اسی کے ساتھ ساتھ مذہبی

بزرگوں کی طاقت میں بھی اضافہ ہونے لگا، یعنی جتنا بڑا دیوتا ہوتا تھا اتنا ہی عظیم المرتبت اس کا پجاری ہوتا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر کسی دیوتا کے پجاری زیادہ طاقت ور ہوئے تو انہوں نے اپنے دیوتا کو نا صرف دوسروں سے بڑھ کر ثابت کرنے کی کوشش کی بلکہ ان کو دوسرے دیوتاؤں کا یا تو سردار بنا دیا یا دوسروں کو شیطان ثابت کر دکھایا۔ مصر، بابل اور چین میں بھی ہر جگہ یہی ہوا۔

گناہ کا بھوت

لیکن وہ ترقی بھی بہت اہم تھی جو ان حالات کے ساتھ ساتھ مذہبی و اخلاقی خیالات میں الگ الگ نشو و نما پا رہی تھی۔ اخلاقیات کا دور اس وقت سے شروع ہوا جب لوگوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ان کے قبائلی مراسم ایک قانون ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان کے گذشتہ سردارانِ قوم جو بہت عقل مند تھے مرنے کے بعد بھی دیکھ رہے ہوں گے کہ ہمارے قبائلی قوانین پر ہمارے جانشین کہاں تک عمل کرتے ہیں گویا مذہب یہیں سے ”اخلاق“ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

اس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مذہب نے بہت جلد معلمِ اخلاقیات ہونے کی حیثیت حاصل کر لی لیکن تاریخِ مذاہب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اس وقت تک اخلاقی نہیں ہوا جب تک کہ اس کا معیار بہت اونچا نہیں ہو گیا، کہیں کہیں لوگ یہ خیال کر لیا کرتے تھے کہ ان کے دیوتا خرابیٔ اخلاق سے ناراض ہو جاتے ہیں، مگر زیادہ تر مذاہب میں اخلاقی عنصر نہیں پایا جاتا تھا۔ انصاف ایک تمدنی چیز تھا۔ یعنی اگر ایک آدمی دوسرے کے ساتھ ناانصافی کرتا تو دوسرا اپنا انتقام لے سکتا تھا لیکن دیوتا عموماً کاہل ہوتے تھے جن کو ہر بات میں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا اور ان کی بہترن خدمت یہی سمجھی جاتی تھی کہ وہ اوپر اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے اپنے بندوں کی قربانیوں کی خوشبو سونگھتے رہیں۔

شہوانی تعلقات سے بھی مذہب کو بہت عرصہ تک لگاؤ نہیں رہا، پرانی سوسائٹی میں ایک انسان کسی شہوانی غلطی کا مرتکب اسی وقت سمجھا جاتا تھا جب وہ کسی دوسرے کی بیوی یا لڑکی کی عصمت خراب کرے اور اس کا یہ فعل صرف یہ حیثیت رکھتا تھا گویا ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے مال کو چرا لیا اس کو نقصان پہنچایا مگر تعددِ ازدواج پھر بھی عام چیز تھی، عیسائی مبلغین کہتے ہیں کہ لوگوں کو گناہ کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا اور یہ سچ ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ ہم اپنی روزی چاہے جس طرح پیدا کریں لیکن خدا ناراض نہ ہو اور

نفسانی خواہشات کسی طرح پوری کریں تو وہ برہم ہو جائے۔ بہر حال نسلِ انسانی کا ایک حصہ سنِ عیسوی کی ابتداء تک اعضاءِ شہوانی کی پرستش کرتا رہا اور دوسرے حصہ کا مذہب اخلاقی رہا۔ 6 ہزار برس قبل جب مصر میں تہذیب کی ابتداء تھی تو اسیرس (Assyris) مردوں کا جج سمجھا جاتا تھا اور اس کے قانون میں ناجائز شہوانی تعلقات کی سزا بہت سخت تھی اسی طرح شہنشاہیتِ بابل کے زمانہ میں بھی زنا وغیرہ کی سخت سزائیں تھیں۔

غرض کہ گناہ کا خیال سنِ عیسوی کی ابتداء سے بہت قبل پیدا ہو گیا تھا ان کی داستان حسبِ ذیل پانچ حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے:

1. پتھر کے اوزار معلوم ہونے سے قبل لاکھوں برس پیش تر کا زمانہ
2. پتھر کے زمانہ سے قبل تقریباً پانچ لاکھ برس پیش تر کا زمانہ
3. پتھر کا زمانہ (اب سے 3 یا 4 ہزار برس پیش تر کا زمانہ)
4. نیا پتھر کا زمانہ (تقریباً ۲۰ ہزار برس قبلِ مسیح سے ۳۵۰۰ برس قبلِ مسیح تک)
5. تاریخی زمانہ مذہب کی ترقی خاص طور پر نئے پتھر کے زمانہ سے ہونا شروع ہوئی ہے اور اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ مصر و بابل میں اخلاقی اور مذہبی خیالات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔

یہ ترقی بالکل قدرتی تھی، ایک طرف تو دیوتا تھے جو قوم کے اخلاق و عادات کی نگرانی کیا کرتے تھے، دوسری طرف پادری یا مذہبی پیشوا تھے جو یہ ثابت کرتے تھے کہ خدا بدمعاشوں کو سزا دیتا ہے۔ بابلی یہ سمجھتے تھے کہ ہر مصیبت اور بیماری گناہوں کی پاداش ہے اور وہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مذہبی پیشواؤں کی وساطت سے دیوتا گناہ گار کو معاف نہ کر دے۔ اسی طرح مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک اسیرس معاف نہ کر دے مرنے کے بعد گناہوں کی سخت سزا ملتی رہے گی۔ ایران میں یہ خیال تھا کہ مزدہ ایک دن تمام دنیا کو تباہ و برباد کر دے گا عبرانیوں کا بھی اسی طرح کا عقیدہ تھا، یونانیوں کا مذہب جزوی طور سے اخلاقی ضرور تھا مگر Old Testament تحریر کئے جانے سے قبل ان کا بھی یہ خیال تھا کہ اگر روح گندی ہو جائے تو انسان کو حیاتِ ابدی اس وقت تک میسر نہیں ہوتی جب تک وہ توبہ اور بعض مراسم ادا کر کے پاک نہ ہو جائے۔

رہا یہ سوال کہ مذہبی و اخلاقی قوانین و خیالات کا اختلاط قوم کے لئے مفید تھا یا نہیں؟ سو اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زیادہ مناسب یہ تھا کہ اخلاقی

قانون پر مذہبی اثرات کے تحت عمل درآمد کرایا جائے اور ایک شخص کی اخلاقی حالت کے مطابق سزا و جزا دی جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنے عقائد کے ساتھ اپنے چال چلن کے باب میں جتنا زیادہ غیر منطقی رہا ہے اتنا اور کسی معاملہ میں نہیں رہا۔ کہا جاتا ہے کہ امنۂ وسطیٰ میں عیسائی قوموں کے درمیان اخلاقی قوانین (خصوصاً جنسی تعلقات کے بارے میں) بہت سخت تھے مگر پھر بھی ہمیں کوئی خطہ (بجز مشرقی بحر روم کے جہاں اعضائے شہوانی کی پرستش ہوئی تھی) ایسا نظر نہیں آتا جو زمانہ وسطیٰ کی ان قوموں سے زیادہ خراب چلن رکھتا ہو اس لئے یہ نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

گناہ کا خیال جنسی تعلقات کے علاوہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اخلاقی قانون کے مصنف دیوتا ہی ہیں مگر ایسے ثبوت کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ان کے خیالات سے قوم یا نسل کی اخلاقی حالت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، کنفیوشس، بودھ، زینو Zeno اور اپی کورس Epicuras سب نے ایسے اخلاق کا درس دیا جس میں خدا کا نام نہ تھا مگر پھر بھی اپنی قوم پر ان کا اتنا ہی اثر تھا جتنا کہ کسی اور مذہبی معلمِ اخلاق کا۔

ایک عیسائی جو اس مسئلہ پر بحث کرنا چاہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ گناہ کے مذہبی و اخلاقی خیال نے جنسی تعلقات کو زیادہ خوش گوار بنا دیا ہے حالاں کہ حقیقت یہ نہیں ہے کیوں کہ پانچویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی عیسوی تک جنسی اخلاقیات بہت آزاد رہا ہے، جنسی تعلقات کے بارے میں اخلاقی درس کی بنیاد کا پتہ زمانہ قبلِ تاریخ میں ملتا ہے یعنی ان اوہام میں جن سے ہم کو اب تنفر ہے۔

ایک اور خیال یہ تھا کہ دیوتا چاہتے ہیں کہ ان کے لئے قربانیاں کی جائیں اور جتنی زیادہ قیمتی قربانیاں کی جائیں گی اتنا ہی وہ خوش ہوں گے دراصل یہ نہایت طفلانہ نظریہ ہے کہ دیوتا بھی اتنے ہی خود سر اور جابر ہوں جتنا ایک مطلق العنان اور ظالم بادشاہ۔ مگر پھر بھی یہ اصل ہے اس دوشیزگی کی جس کی حضرت عیسیٰ نے تعریف کی ہے اور ان مقدس قسموں کی جو راہب یا راہبہ آج بھی کیتھولک فرقوں میں کھایا کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس حصہ میں بھی (یعنی شامی علاقہ میں) جو گناہوں کا مرکز تھا اور جہاں زناکاری ایک قسم کی عبادت شمار کی جاتی تھی، ایک ایسی قسم کے زہد و اتقاء کا دور دورہ ہوا جو راہبوں کی پرہیز گاری سے بڑھ کر تھا۔ چناں چہ سائبل (Sybele) کی پجارنیں اگر اپنے خوب صورت جسموں کو مندر میں پرستش کے لئے آنے والوں کے حوالے کر دیا کرتی تھیں تو دوسری طرف پجاریوں کو

بھی اپنے اشتیین کاٹ کر مندر پر چڑھانے پڑتے تھے۔ گویا ایک ہی آسمانی رحمت کے سایہ میں عیاشی اور انتہائی زہد و اتقاء دونوں پروان چڑھ رہے تھے۔

بے دینی یا الحاد کا عروج

آخری اخلاقی مذہبی ترقی حضرت عیسیٰ کے ایک ہزار برس قبل ہوئی یہ زمانہ تاریخ کے لئے بہت اہم شمار کیا جاتا ہے اور یہاں مذہب کی داستان نہایت اہم ہو جاتی ہے۔

ہر چند زمانۂ تاریخ کے آغاز میں جب لوگوں کو لکھنا آگیا تھا، مذہب میں کئی خداؤں کے ماننے کا رواج پیدا ہو گیا تھا۔ یعنی ہر قوم میں ارواح کے علاوہ دیوتا بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے اور ہر دیوتا کے الگ الگ پجاری اور مندر ہوا کرتے تھے اور ہر فرقہ کے مراسم بھی جداگانہ ہوتے تھے لیکن حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال قبل ہی روحانی خدا کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا۔ چناں چہ عبرانی پادری جنھوں نے پرانی انجیل Old Testament ایرانیوں اور بابلیوں کے اثرات کے تحت لکھی تھی اپنے مربّی بادشاہ سائرس (Syrus) کو موحد مانتے ہیں۔ قریطی (Cretons) بھی ہزاروں برس سے موحد تھے اور صرف زمین کو اپنا دیوتا تسلیم کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ چینی بھی آسمان کو اپنا خدا مانتے تھے اور حضرت عیسیٰ سے پانچویں یا چھٹی صدی قبل جب یونانی فلاسفر ایک خدا کا ذکر کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ وحدانیت عام ہو چکی تھی۔

مگر اس خدا کی نسبت بھی انکار اور الحاد کا دور اسی وقت شروع ہو گیا جب سے علم میں اضافہ ہونے لگا اور یونانی مفکرین نے بھی بے دینی پھیلانی شروع کی، چناں چہ تھیلس (Thales) انا کس مندر (Anax Mander) دیما قریطس (Dema Critus) وغیرہ کے نزدیک خدا صرف نام ہی نام ہے اسی طرح تیسری صدی قبلِ مسیح کے اسٹوئک (Stoic) اور اپی کورین (Epicurean) طبقے پورے مادہ پرست تھے۔

اب ذرا غور سے دیکھئے مصر میں حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار برس قبل زوال کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے اس کی علمی ترقی ختم ہو گئی اور وہاں بہت سے نئے مذہب پیدا ہونے لگے۔ بابل کو اسی زمانہ میں اسیریا (Assyria) نے تباہ کر دیا تھا، مگر ہندوستان اور چین نے اپنی اپنی ایک تہذیب قائم کر رکھی اور اپنے الحاد سے تمام تعلیم یافتہ طبقہ کو منسلک کر لیا۔ البتہ ہندوستان میں ایک جاہلانہ ردِّ عمل ہوا اور گوتم بدھ نے جو تعلیم دی تھی وہ کالعدم ہو گئی۔ چین کے اعلیٰ طبقہ میں مذہب نے کبھی اقتدار نہیں حاصل کیا اور

یہ اثر جاپان تک پھیلا جہان کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی بے دینوں میں شامل ہے۔

اب سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جہاں کہیں آزادیٔ خیال لوگوں کو نصیب تھی وہاں مذہب خواہ وہ وحدانیت ہی کا کیوں نہ قائل ہو، بے دینی میں بدلنے لگا تھا۔ یونانیوں کے تجرباتِ اولین سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، ان لوگوں میں تحصیلِ علم و اشاعت کا اس قدر شوق تھا کہ انہوں نے تین صدیوں میں سائنس اور فلسفہ کی اتنی اشاعت کی کہ مصر اور بابل تین ہزار برس میں بھی نہ کر سکے تھے اور یہ سب کے سب بے دین یا منکرِ دین تھے۔ ہمارے پاس ان کی کتابیں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے یونانیوں نے ان کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بالکل مادہ پرست تھے اور ان کی کائنات مادی کائنات تھی اور ساری طاقت جاہل عوام کے ہاتھوں میں تھی۔ اس وقت وہاں ایک خاص مذہبی عصبیت کی لہر دوڑ گئی اور مفکرین کو بہت اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، حتیٰ کہ سقراط کو بھی جو خدا پرست تھا جان دینا پڑی اور افلاطون کی بھی کسی نے نہیں سنی۔ مگر جب دوبارہ علم کی اشاعت ہوئی تو پھر بے دینی میں ترقی شروع ہوئی۔ اس کے بعد آخری زوال سے کچھ ہی زمانہ قبل ایتھنز میں تہذیب اپنے عروج پر تھی تو مذہب حتیٰ کہ افلاطون کی عقلی خدا پرستی کا کا بھی زوال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یونان کی تہذیب اسکندریہ کی طرف منتقل ہو گئی اور گو ہم اسکندریہ کے ماہرینِ سائنس و ماہرینِ ریاضی کے خیالات سے کم واقف ہیں مگر ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ وہ عموماً بے دین اور منکر تھے، اس کے بعد تہذہب روم میں پہنچی اور وہاں اگرچہ عوام مذہب کے پیرو تھے مگر تعلیم یافتہ طبقہ میں وہی بے دینی پائی جاتی تھی جو اپی کورئین کے الحاد اور اسٹوئک کے اخلاقیات سے مل کر پیدا ہوئی تھی۔

الغرض ایک ہزار سال کی مدت جو ۶۰۰ برس قبل مسیح سے شروع ہو کر ۴۰۰ برس بعد مسیح تک جاری رہی ہے اور جس پر "پرانی دنیا" کا اختتام سمجھا جاتا ہے تاریخی اہمیت سے بھری ہے۔ ابھی تک علم صرف پادریوں اور پجاریوں تک محدود تھا اور "مندر" اور عبادت گاہوں کے لئے حاصل کیا جاتا تھا۔ البتہ بابلی نجوم میں ترقی کر رہے تھے مگر اس کے بعد دنیا کے ہر حصہ مثلاً چین، ہندوستان، ایران، یونان، مصر اور روم میں مفکر اور معلم پیدا ہونے لگے اور الحاد کا پھر عروج ہو گیا، فیثاغورث اور افلاطون وغیرہ چند مفکرین نے مذہب کو بے دینی کی اس زد سے بچانا چاہا مگر ان کا اثر زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ سن عیسوی کی ابتداء کے وقت

تعلیم یافتہ لوگ عموماً بے دین تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر مغربی تہذیب مٹ نہ گئی ہوتی تو تعلیم یافتہ طبقہ چین اور جاپان والوں کی طرح مستقل طور پر بے دین ہو جاتا۔

خود دورِ آخر کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ طبقۂ اوسط کی تہذیب کی وسعت گویا بے دینی کی وسعت تھی۔ رومیوں نے عوام میں تعلیم پھیلانی شروع کر دی تھی۔ ابتدائی تعلیم اور مدرسہ ہر شخص کے لئے عام تھا۔ اکثر کو ثانوی تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی تھی اور چند کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں بھی مدد دینے کا انتظام کیا گیا تھا اور اگر یہی سلسلہ جاری رہتا تو مذہب بے دینی پر جا کر ختم ہو جاتا مگر بد قسمتی سے اس کے بعد ۱۵ سو برس تک ایک ایسا زمانہ گزرا جب کلچر دفن کر دیا گیا۔ غور و فکر کی آزادی سلب کر لی گئی اور انسانی دماغ کو معمولی کام کرنے سے بھی روک دیا گیا۔

عیسائیت کی سچی داستان

یہ پندرہ سو برس کی مدت وہی ہے جسے عہدِ عیسویت کہا جاتا ہے یعنی چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر سے (جب یورپ میں عیسائیت بہ جبر پھیلائی گئی) انیسویں صدی کی نصف آخر تک (جب آزادئ عقائد مل گئی تھی) سائنس کی اشاعت ہونے لگی تھی، عوام کو تعلیم دی جانے لگی تھی اور عیسائیت اکثریت کے مذہب کی حیثیت سے ختم ہو چکی تھی یہ وہ عہد تھا جب یورپ و امریکہ میں عظیم الشان اکثریت کا مذہب عیسائیت تھا۔

اس کے بعد وہ باہم دِگر بہت مختلف ہو گئے اور یہ اختلاف علمی و جذباتی دونوں طرح کا تھا کیوں کہ ایک شخص کسی معاملہ کا بہت بڑا ماہر ہو سکتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ مذہبی مسائل میں اس کی معلومات بہت ہی ناقص ہو سکتی ہیں۔ ایک آدمی خاص علم کے باب میں ایک زبردست نقاد بن سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ مذہب کے متعلق بھی انتقادی اہلیت رکھتا ہو۔

غرض دو ہزار برس پیش تر بھی مختلف اسکول پائے جاتے تھے ایک اپی کورئین جو روحانیت یا مذہب کے خیالات کو پسِ پشت ڈال کر انسانی مسائل کو انسانی نگاہ سے دیکھتا تھا اور دوسرا متصوفانہ (جس میں فیثا غورث، افلاطون، مارکس، وغیرہ شامل تھے) دوسرے قسم کے مفکرین نئے مذاہب چاہتے تھے چناں چہ کئی مذاہب قائم بھی ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ نے سب سے پہلے یہ "روحانی" تعلیم دی کہ عیش و عشرت سے نفرت کی جائے اور گناہ سے خوف کیا جائے۔ یہ نظریہ عیسیٰ کی پیدائش سے بہت قبل تمام دنیا میں

پھیل چکا تھا سقراط، فیثا غورث، افلاطون مصر و ایران وغیرہ کے متعدد مفکرین کی بھی تقریباً یہی تعلیم تھی۔ حتیٰ کہ سائبل (محبت کی ایک دیوی) کا شہوت پرست مذہب بھی اپنے پادریوں (مذہبی پیشواؤں) کو خصی ہو جانے پر مجبور کر تا تھا۔

پہلی صدی قبلِ مسیح کی یونانی، مصری اور رومی دنیا اس قسم کی روحانیت سے بھری تھی۔ اس کے بعد عیسیٰ کے ماننے والوں کو تاریخ کے صفحات پر اس وقت آنے کا کوئی امکان نہ تھا جب تک پال (Paul) نے عیسیٰ کو خدا نہیں بنا دیا اور ان کی موت کے افسانے تیار نہیں کروائے، اس کے بعد یونانی عیسائیوں نے عیسیٰ کی ایسی سوانح عمریاں لکھنی شروع کیں جن میں مختلف مذاہب کے توہمات اور فرضی افسانے حضرت عیسیٰ سے منسوب کر دیئے گئے اور اس صورت سے جو نیا مذہب تیار ہوا وہ یونان کے خیالات کا ایک مجموعہ تھا اس نئے تیار شدہ مذہب میں ایک بھی اخلاقی خیال ایسا نہ تھا جو ان کا اپنا ہو۔ کیوں کہ اس طرح کے افسانے اس وقت تک تمام مذاہب میں عام طور سے پائے جاتے تھے اور اس لحاظ سے حضرت عیسیٰ کی تصویر تموز (Tammuz) اسیرس (Acris) ایڈونس (Adonis) وغیرہ کی روایات سے لی گئی تھی۔ مگر پھر بھی یہ نیا مذہب تین سو برس تک یونانی اور رومی دنیا میں کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکا۔ البتہ اس میں ایک خاص بات یہ ضرور پیدا ہو گئی کہ حضرت عیسیٰ کے مفروضہ احکام اور مشن کے خلاف پادریوں نے مخصوص مذاہب (Dogmas) پیدا کر لئے، تاہم ۵۰۰ء تک وہ اپنے حلقہ میں ۱۰ لاکھ سے زیادہ حلقہ بگوش پیدا نہ کر سکے اور اب گزشتہ نصف صدی میں وہ ۱۰ کروڑ عقیدت مندوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخِ عیسوی کی یہ داستان کہ عیسائیوں کا متعدد مرتبہ قتل عام ہوا یہ بھی اب غلط سمجھی جاتی ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ ان قصوں کو نہیں مانتے صرف چند آدمیوں کے قتل کا حال بے شک تاریخ سے ثابت ہو تا ہے ورنہ باقی افسانہ ہی افسانہ ہے۔

سب سے بڑا اور خاص "قتلِ عام" تیسری صدی عیسوی میں ہوا تھا، جب عیسائیوں نے شہنشاہِ روم سے گستاخی کی تھی۔ اس گستاخی کی سزا میں جب قتلِ عام شروع ہوا تو اس وقت عیسائیوں میں صرف دو قسم کے طبقے تھے اور تمام روم میں ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے علاوہ کچھ مغربی یورپ میں بھی پائے جاتے تھے، چناں چہ اس سزائے عام میں کچھ لوگ تو اٹلی کے مارے گئے اور کچھ دوسرے حصوں کے۔ لیکن روم کے چند ہزار عیسائیوں کی اکثریت نے اپنا مذہب بدل دینا منظور کر لیا اور جب چو تھی

صدی کا آغاز ہوا تو عیسائیت کی حالت نہایت ذلیل و خوار تھی۔ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مسلمان تو دو سو برس میں تین تہذیبوں کے مالک ہو گئے اور عیسائیت تین سو برس بعد بھی دیوالیہ ہی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی لٹریچر میں تاریخ کا حصہ انتہائی کذب بیانی پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد شہنشاہِ فلسطین نے جو ایک رومن افسر اور شراب خانہ کی ایک فاحشہ عورت کا لڑکا تھا جنگ کر کے تختِ سلطنت حاصل کیا اور اس نئے مذہب کی سرپرستی کرنے لگا۔ یہ سوال کہ خود اس نے مذہب کو کہاں تک قبول کیا متنازع فیہ ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ اس نے اس مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ مراعات کیں، اس مذہب کے قبول کرنے والوں کی ہمت افزائی کی اور اپنے لڑکوں اور جانشینوں کو عیسویت کی تعلیم دی۔ لیکن پچاس برس کے شاہی اثرات اور مشرق میں جور و ظلم کے باوجود عیسائیت صرف اقلیت تک محدود رہی اور روم کے تقریباً تمام اُمرا ''کافر'' ہی رہے آخر کار قیصرانِ روم کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ تمام روم کو بہ جبر عیسائی بنائیں چناں چہ اس طرح اور صرف اسی طرح صلیب نے اپنے حریفوں کے معبدوں پر فتح حاصل کی اور یہ ایسے تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔

دوسری تاریخی غلطی کی تصحیح یہ ہے کہ عیسائیت کے پھیلنے کے بعد اخلاقیات میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ سو برس کے اندر اندر یورپ میں زمانۂ جاہلیت کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ یہ امر حقیقت کے بالکل منافی ہے کہ عیسائیت نے اسکول قائم کرائے، غلاموں کو آزاد کرایا، عورتوں کے رُتبہ میں اضافہ کیا یا خیرات و رحم و کرم کو رواج دیا، دراصل عیسائیت نے اس کے بالکل برعکس کیا۔ اس نے اسکولوں کا خاتمہ کر دیا، عورتوں کو ذلیل و خوار کر دیا ''کافر'' رومیوں کی فیاضیوں کو ملیامیٹ کر دیا اور نفس پرستی اور ظلم و جفا کی سرپرستی کی۔

عیسائیت کے طرف دار کہتے ہیں کہ تہذیب کی بربادی گوتھ اور ونڈال اقوام نے کی، نہ کہ عیسائیت نے لیکن جو مورخ ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ بلکل غلط ہے کیوں کہ شہادتیں اس کے برعکس پائی جاتی ہیں۔ یونان کی عیسائی مملکت پر کبھی ان وحشی قبائل نے حملہ نہیں کیا مگر پھر بھی اس نے کوئی ترقی نہ کی اور بداخلاقیوں ہی میں پڑی رہی خود سلطنتِ رومہ کے مغربی حصہ میں یہ ''وحشی'' اتنے درندہ اور بدتہذیب نہ تھے جتنا کہ ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ تھیوڈرک (Theodoric) اور شارلمین (Charlemagne) نے تہذیب میں اضافہ کرنا چاہا تھا مگر پادریوں نے صرف یہی نہیں کہ اس کی امداد نہ کی بلکہ اس کی

ساری اسکیم کو ناکامیاب کر دیا۔ دوسری طرف عربوں نے جو قوم ٹیوٹن (Tauton) ہی کی طرح شدت پسند اور جاہل تھے یونانی اور ایرانی کلچر کو حاصل بھی کیا اور اپنی شاندار تہذیب کو بھی رواج دیا لیکن اسے کے بالکل بر خلاف عیسائیت چھ صدی تک جہالت درندگی اور وحشت کا ایک مجموعہ رہی اور بہ حیثیت مجموعی یورپ کی بد اعمالیوں، بدعنوانیوں اور جہالت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس ختم ہو چکی تھی اور سو میں ایک شخص بھی تعلیم یافتہ نہ تھا فنونِ لطیفہ (بجز ایک قلیل مدت کے جب جرمنی میں فنِ تعمیر میں کچھ ترقی ہوئی تھی) بارہویں صدی تک گوشہ گمنامی میں پڑے رہے۔ بارہویں صدی تک مشکل سے کوئی اسکول یا لائبریری دکھائی دیتی تھی۔ شہروں کی آبادی 40 ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اور بڑے سے بڑے قصبہ میں صفائی کا مطلق انتظام نہ تھا۔ انصاف کے ساتھ مذاق کیا جاتا تھا اور سزائیں انتہائی وحشیانہ ہوتی تھیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ گوتھ اور ونڈال کی تاراج کردہ زمین کو عیسائیت نے اس قابل بھی نہ بنایا کہ اس میں ایک پھول بھی نکل سکتا ہے۔ تاریخ، عیسائیت کے اس دعویٰ بے دلیل پر ہنستی ہے کہ اس کے مذہب میں تہذیب کا عنصر موجود تھا عیسائیت کو تہذیب کی اشاعت کے لئے دوسرے مذہب سے زیادہ مواقع تھے مگر اس علم بردارانہ تہذیب نے دُنیا کو غیر مہذب ہی رکھا۔

تھذیب کی تجدید

اس کے بعد بارہویں صدی سے یورپ میں تہذیب از سر نو قائم ہونے لگی۔ بارہویں صدی اس لئے کہا گیا ہے کہ یہیں سے تہذیبِ یورپ میں کئی چیزوں کی ابتداء ہوتی ہے۔ مثلاً گوتھک آرٹ کی ابتدء یونیورسٹیوں کا قیام، تجارت کی ترقی، بڑے بڑے شہروں کا وجود، غلاموں کی آزادی وغیرہ، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ فراموش کر دینا چاہئے کہ ہر چند عہدِ وسطیٰ دراصل انیسویں صدی تک قائم رہا لیکن تہذیبِ یورپ کی حالت دراصل بارہویں صدی سے سنبھلنا شروع ہو گئی تھی اور جو کچھ اصلاحات ہوئیں وہ یا تو عیسائیت سے قطعاً بے نیاز ہو کر ہوئیں یا اس کے علی الرغم۔ مگر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ تہذیبِ یورپ کی تمام تاریخ محض "چرچ" یا پادریوں کو خوش کرنے کے لئے بدل دی گئی حالاں کہ عہدِ وسطیٰ میں فنونِ لطیفہ کی ترقی جس پر "چرچ" فخر کرتا ہے اس وجہ سے ہوئی کہ صاحبانِ آرٹ نے پرانے معیار کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ غلاموں کی آزادی اقتصادی و معاشرتی وجوہ کی بناء پر ہوئی اور پادریوں کا طبقہ ہی وہ طبقہ تھا جس نے اس پالیسی پر سب سے آخر میں عمل

کیا۔ عملی زندگی کا احیاء اور دوسرے فنون کی ترقی اسپین میں مسلمانوں کی شاندار تہذیب کی بدولت ہوئی اور اس بنیاد پر جس پر یورپ کے اثرات نے یورپ کے کسی ملک میں کوئی عمارت قائم نہیں کی تھی۔ اسپین میں عربوں نے ایک صدی کے اندر تہذیب کا ایک لاجواب معیار قائم کر دیا تھا۔ غرض یہ کہ یورپ میں سائنس کی اشاعت مسلمانوں کی بدولت شروع ہوئی مگر عیسائی پادریوں نے ان حیرت انگیز ترقیوں کو آئندہ تین صدیوں تک ملتوی رکھا۔ یورپ میں تہذیب کی از سرِ نو پیدائش میں یونانی لٹریچر کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ بھی بڑی حد تک مبالغہ آمیز ہے۔ اس تہذیب کا سب سے بڑا باعث سپین کے "مور" (مسلمان اور سسلی کے عرب) ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یونانی اور لاطینی کتابوں نے اٹلی اور فرانس اور انگلستان مین تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات سدھارنے میں بہت مدد کی۔

عیسائیت کے طرف دار اکثر اپنے مذہب کی حمایت میں کسی خانقاہ یا کسی پادری یا کسی لائبریری (جو کہیں کہیں ایک آدھ صدی میں دکھائی پڑتی ہیں) نام لیتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے دیکھو یہ سب مذہب کی برکت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک دو صدی میں کسی ایک پادری کا کوئی فعل یا کسی لائبریری کا قیام مذہب کی حقانیت کو نہیں ظاہر کرتا بلکہ "عیسائی چرچ" کی پالیسی اس کے پادریوں اسقفوں اور پاپاؤں کی اکثریت کے افعال سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ پالیسی انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے انتہائی مہلک رہی ہے۔ پاپاؤں اور پادریوں کی کثیر تعداد ہمیشہ خود غرض اور اخلاقی اعتبار سے نہایت نفس پرست رہی۔ غرض کہ یورپ میں جن چیزوں نے تہذیب کے پھیلانے میں امداد دی ان میں مذہب کا ہاتھ بالکل نہیں اور جس قسم کی بھی یورپ میں ترقی ہوئی اس میں عیسائیت ذرا ممدّو معاون نہیں ہوئی "اصلاحِ مذہب" کی تحریک جس نے پاپائے روم کی طاقت کو صدمہ پہنچایا، البتہ ایک مذہبی خدمت تھی مگر اس اصلاح نے بھی ایک ایسی خانہ جنگی کی بنیاد ڈالی جس کا اثر عرصہ تک قائم رہا اور انقلابِ فرانس تک نہ زائل ہو سکا البتہ اس کے بعد یورپ میں جب ذہنی اصلاح شروع ہوئی تو وہ صرف اس نظریہ کی بدولت کہ علم مذہب کے لئے مہلک ہے اور ترقیٔ تہذیب سے مراد ہے لامذہبیت کی ترقی اور اس تمام مدت میں جہالت اور شائستگی یا نور و نار میں برابر جنگ ہوتی رہی۔ مشرقی یورپ میں "انکارِ عقائد" نویں صدی سے شروع ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ تھیوڈورا نے اسی صدی میں پال کے ایک لاکھ معتقدین کو ہلاک کرا دیا اور دسویں صدی میں ایک اور بادشاہ نے ان کے ۶ لاکھ آدمیوں کو بلگاریا کے ویرانوں میں جلاوطن کر دیا یہ لوگ اگرچہ

"انجیلِ نو" کو مانتے تھے مگر ان کی تحریک دراصل عیسائیت کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ اطالوی شہروں میں بھی مسلمان عربوں کے اثر کی وجہ سے ایک قسم کی تہذیبِ بے دینی عام ہو چلی تھی۔ پاپائیت نے ان منکرین کی خون کی ندیاں بہادیں مگر پھر بھی یہ تحریک لوتھر کے زمانہ تک چلتی رہی۔ اس کے بعد اسی سلسلے میں لوسی فر کا فرقہ پیدا ہوا اور کئی زبردست بلوے بھی ہوئے جن میں لاکھوں آدمیوں کی جانیں کام آئیں، قصہ مختصر یہ کہ نشاۃ الثانیہ کی پوری مدت پاپائیت نے تقریباً دس لاکھ سے زیادہ آدمیوں کی جانیں لیں اور لاکھوں کو مختلف صعوبتوں میں مبتلا رکھا اور اگر مذہبی جنگوں کے مقتولین بھی شامل کر لئے جائیں تو ان "شہداء" کی تعداد نہ معلوم کتنی لاکھ ہو جائے۔

یورپ کی تاریخ ان واقعات کی تصدیق کرتی ہے اور یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتا ہے کہ جیسے جیسے علم میں ترقی ہوئی ایسے ہی انکارِ مذہب میں ترقی ہوئی، حتیٰ کہ موجودہ زمانہ کی ترقیٔ تعلیم نے اس بے دینی کا یا انکارِ مذہب میں اور زیادہ اضافہ کر دیا اور جس قانون کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک صحیح ثابت ہوتا چلا آیا ہے۔

مستقبل کی لامذہبیت

اس مضمون سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ مذہب کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیشن گوئی کسی مخصوص آدمی کی رائے پر منحصر نہیں بلکہ ہم کو وہ قانون معلوم ہو گیا ہے جو ہر زمانہ میں سچا ثابت ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ سوال البتہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر علم کا نتیجہ الحاد ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اتنے تعلیم یافتہ لوگ مذہب کو اب بھی مانتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عوام کے مذہب کا ارتقاء وحدانیت اور پھر بے دینی ہے دُنیا جسمانی حیثیت سے ایک منزل سے دوسری منزل تک نہیں جاتی اور تعلیم یافتہ آدمیوں میں بھی مزاج کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ عیسائی ہے یعنی حضرت عیسیٰ کا مداح ہے، دوسرا حضرت عیسیٰ کی مدح کرنے کے باوجود اپنے آپ کو عیسائی کہنے سے اس حالت میں گریز کرے گا، جب کہ وہ عیسائی مذہب کو نہیں پسند کرتا۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور دوسرا کہہ سکتا ہے کہ اس کا خدا پر کوئی اعتقاد نہیں مگر پھر بھی ایک عالم گیر قوت کا دونوں کو احساس ہو سکتا ہے۔ ایک آدمی مختلف علوم کا ماہر ہو سکتا ہے مگر اس کا بھی امکان ہے کہ اس نے مذہب پر کبھی غور نہ کیا ہو۔

بہر حال یہ طے شدہ امر ہے کہ مذہب بحیثیت ایک مجموعۂ عقائد کے تعلیم یافتہ طبقہ

سے اپنا اثر زائل کرتا جارہا ہے اور چوں کہ آج کل تعلیم عام ہو چلی ہے، اس لیے یہ بھی صحیح ہے کہ گویا عوام پر سے اس کا اثر زائل ہورہا ہے، یہ مسئلہ مذہب میں اصلاح کرنے کا نہیں ہے، کیوں کہ اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو پیغمبروں پر حرف آتا ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصولِ مذہب سے انکار کرکے صرف اخلاقیات کو مانا جائے، کیوں کہ اس نظریہ کو ایک قلیل اقلیت کے علاوہ اور کوئی نہ تسلیم کرے گا۔ اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب کا زوال یقینی ہے۔

اسی کے ساتھ واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا پرستی کا زوال بھی لازمی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ گذشتہ پچاس برس سے وحدانیت کس طرح اپنی جگہ پر قائم ہے اور الحاد کتنا پھیل رہا ہے، لہٰذا اب جب کہ علم عام ہورہا ہے، مستقبل کا حال ظاہر ہے۔ خدا کے خیال کو، خواہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ بنایا جائے، مگر اب وہ باقی نہیں رہ سکتا۔

گذشتہ نصف صدی میں کئی مذاہب پیدا ہوئے اور ان کے معتقدین کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی گئی مگر پھر بھی ان کے پیروؤں کی تعداد میں بیس لاکھ سے زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ حالاں کہ ۲۰ کروڑ آدمی ایسے ہوگئے ہیں جو مذہب سے بالکل بے پرواہیں، درآنحالِ کہ ہمارے نصاب تعلیم میں مذہب پر خاص زور دیا جاتا ہے، بہر حال مذہب کا خاتمہ اب کچھ مدت کی بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذرا صورتِ حال پر نظر ڈالئے کہ (صرف عیسائی) ممالک میں مبلغینِ مذہب کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ ہے اور ان کے مقابلے میں بے دینی پھیلانے والے ۵۰۰ کے تناسب سے زیادہ نہیں، اس پر طرّہ یہ کہ مذہب کی طرف سے کروڑوں روپیہ بھی ہر سال خرچ ہوتا ہے، کیا اس حالت پر غور کرنے کے بعد بھی مذہب کے مستقبل کے متعلق کوئی شک باقی رہ جاتا ہے؟ تعلیم یافتہ ممالک میں تو مذہب تقریباً ختم ہو گیا ہے، البتہ جاہل ملکوں میں اکثریت مذہب کی پابند ہے مگر وہ بھی اس وقت تک اسے مانتی رہے گی جب تک وہاں تعلیم عام نہیں ہوتی، بہر حال کچھ بھی ہو اس صدی کے آخر میں اگر کہیں مذہب قائم بھی رہا تو وہ انتہائی نفرت خیز چیز ہو گی۔

یاد رکھئے کہ مذہب کا خاتمہ وہ مبارک گھڑی ہو گی جب ہم مردہ انسانوں سے مدد مانگنے کے بجائے اپنی عقل سے امداد کے طالب ہوں گے اور ہم میں ایک ایسی زندگی پیدا ہو جائے گی جو تمام زندگیوں سے لطیف تر، خوش گوارتر اور مرغوب تر ہو گی۔

ملاحدۂ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے (۴)

روایت و معجزہ کی حقیقت

زندگی کا صحیح مقصد حصولِ مسرت ہے اور ذہنِ انسانی مجبور ہے کہ وہ مسرت کے واقعی اسباب و شرائط معلوم کرے۔ واضح رہے کہ مسرت سے مراد میری صرف کھانا پینا نہیں، محض جسمانی راحت و آسائش نہیں بلکہ بلند قسم کی وہ مسرت ہے جو ادائے فرائض کے بعد حاصل ہوتی ہے، جو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے جو فطرت کے مطالعہ اور حسنِ مجرّد کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور جو آزادئ ذہن و ضمیر کی پیداوار ہے۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مسرت کی خواہش کو ٹھکراتا ہے جو حریتِ فکر و رائے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جس نے عقلِ انسانی کو شلّ کردینا ہی اپنی مقصودِ زندگی قرار دے رکھا ہے، یہ گروہ اپنے آپ کو اہلِ مذہب اور روحانیت پرست کہتا ہے۔ یہ گروہ وہ ہے جو احساساتِ مسرت کو وسوسۂ شیطانی کہتا ہے، یہ اس دنیا کی زندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کی تمام خواہشات کا تعلق کسی دوسری دنیا سے ہے، جس کا اصطلاحی نام اس نے "حیات بعد الموت" رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنی "تسبیح و تہلیل" کے لیے منتخب کرلیا ہے، پیامِ ربانی کے لیے اس کی زبان مخصوص ہے اور صداقت و حقیقت نام ہے صرف اس چیز کا جو اس کے دل و دماغ سے پیدا ہو۔

اس جماعت نے ہمیشہ عقل و علم سے دشمنی کی، "ذہنِ انسانی" کو اس نے ہمیشہ کند رکھنا چاہا اور اس نے علم و یقین کا ماخذ ہمیشہ غیر فطری کرامات و معجزات کو قرار دیا ہے، اس لیے دنیا میں صرف نفرت، تعصب اور خوف کی اشاعت کی۔ اس نے مفکرین کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا، اس نے محنت و عمل سے ہمیشہ جی چرایا اور اسی کو برگزیدۂ قوم سمجھا جس کے لئے غیب سے من و سلویٰ نازل ہوسکتا ہے۔

یہ جماعت اپنا ایک لٹریچر بھی رکھتی ہے جسے مختلف ناموں سے مختلف قوموں کے

سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس لٹریچر میں وہ سب کچھ ہے جسے عقلِ انسانی کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ اس میں تخلیقِ کائنات کا بھی ذکر ہے اور آفرینشِ انسان کا بھی۔ اس میں تاریخِ قدیم کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں اور اخلاق کے درس بھی لیکن بایں ہمہ یہ محض روایت و داستان ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں یا پھر ان ہدایات کا مجموعہ ہے جو محض تعصب و تنگ نظری کی پیداوار ہیں۔

انہوں نے ہمیشہ خدا کا ڈر دکھا کر اپنا اثر قائم کیا۔ انہوں نے ہمیشہ دنیا کو یہی یقین دلایا کہ اگر ان کی دعائیں شاملِ حال نہ ہوں تو بارش بند ہو جائے۔ کھیتیاں برباد ہو جائیں، دنیا قحط و وبا سے فنا ہو جائے اور جب کبھی کوئی مصیبت نوعِ انسانی پر نازل ہوئی تو انہوں نے اس کو اپنی ہی بد دعاؤں کا نتیجہ بتایا۔ پھر انہوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ جب کبھی انہیں اقتدار حاصل ہوا علم کو روندا گیا۔ عقل پامال کی گئی، آزادی کو مٹایا گیا۔ مفکرینِ عالم کو قید میں ڈالا گیا۔ اربابِ فضل و کمال کو ذبح کیا گیا اور خدا کے نام پر وہ سب کچھ کیا گیا جسے شیطان بھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔

لیکن مذاہب کا ظہور، مذہبی کتابوں کی پیداوار، خانقاہوں کی تعمیر اور اہلِ خانقاہ کا وجود، کوئی غیر فطری بات نہ تھی، بلکہ عہدِ وحشت کے غاروں سے لے کر موجودہ دورِ تہذیب تک انسان نے جو تدریجی ترقی کی ہے، اسی کے یہ لازمی مظاہر تھے۔ دنیا کی تاریخ میں اتفاق کوئی چیز نہیں ہے، نہ اس میں معجزہ و خرقِ عادات کو کوئی دخل ہے اور نہ غیبی مداخلت کو ہر شے اور ہر حالتِ واقعات سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے اگر ہمارے اسلاف کے دلوں میں مذہب و روحانیت کا خیال پیدا ہوا تو وہ بالکل فطری خیال تھا، کیوں کہ ان کی عقل زیادہ سے زیادہ یہیں تک پہنچ سکتی تھی اور وہ اس کو سچ سمجھ کر پیش کرتے تھے۔

تمام زمانوں میں انسان نے اپنے اور اپنے ماحول کے سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ دیکھتا تھا اور تعجب کرتا تھا کہ پانی کیوں برستا ہے، درختوں کا نشو و نما کیوں ہوتا ہے، بادل کیوں کر معلق فضا میں اڑتے ہیں، ستاروں کی چمک کہاں سے آتی ہے، چاند سورج کو کون اِدھر سے اُدھر لے جاتا ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ زندگی کے بعد موت کا سکون کیا۔ بیداری کے بعد نیند کیسی، روشنی کے ساتھ تاریکی کیا معنی۔ بجلی اور کڑک کو دیکھ کر وہ سہم جاتا تھا۔ زلزلوں اور پہاڑوں کی آتش فشانیاں دیکھ کر وہ لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا اور چوں کہ وہ ان کے طبعی حدوث کے اسباب سے ناواقف تھا، اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ ان تمام حوادث کے پیچھے کوئی

عظیم الشان، ذی حیات ہستی ضرور ایسی موجود ہے جو ان تمام مناظر و مظاہر کی پیدا کرنے والی ہے اور انہی کو وہ دیوتا یا دیوی سمجھ کر ان سے ڈرنے لگا اور ان کی پوجا کرنے لگا۔

طلوعِ صباح کو وہ سمجھنے لگا کہ یہ کوئی نہایت ہی حسین و جمیل دیوی ہے، آفتاب کو اس نے ایک جنگجو عاشق مزاج دیوتا فرض کر لیا۔ رات کو اس نے سانپ یا ناگ سمجھ لیا اور ہوا کو مغنی، جاڑے کو اس نے ایک ایذا رساں درندے سے تعبیر کیا اور خزاں کو ایسی دیوی سے جو دنیا کے سب پھول چن کر لے جاتی ہے، الغرض اس طرح کی سیکڑوں تعبیریں، ہزاروں تفسیریں، اس نے مناظرِ فطرت اور حوادثِ طبعی کی اپنی ذہانت سے پیدا کیں اور ان کو حقیقت جان کر پھیلانا شروع کیا۔ اقوامِ عالم کی روایات مذہبی یا "اساطیر الاولین" پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کی بنیاد یکسر انہی شاعرانہ تعبیروں اور اسی قسم کے قیاساتِ ضعیفہ پر قائم ہے، چناں چہ باغِ عدن کی روایت کو دیکھیے کہ وہ دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی ہے، کیوں کہ جب وہ مصائب سے گھبرا اٹھی تو اپنی تسکین کے لیے اس نے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیدا کیا جہاں راحت ہی راحت ہے۔

اسی طرح طوفانوں کی روایت، ایشیا و یورپ کے تمام قدیم قوموں میں پائی جاتی ہے، انہوں نے گھونگھے، سیپیاں اور لہروں کے نشانات، پہاڑوں، وادیوں اور میدانوں میں دیکھ کر خیال کیا کہ کسی وقت ضرور ساری دنیا پر طوفان آیا تھا جس سے سوا چند مقبول بندوں کے کوئی جان بر نہ ہو سکا۔ توریت، انجیل اور کلام مجید کے علاوہ ہندوں میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ منو نے ایک بار گنگا میں کوئی ظرف ڈبو کر پانی لیا، اس میں ایک مچھلی بھی آ گئی۔ مچھلی نے التجا کی کہ مجھے پھر پانی میں چھوڑ دیجیے۔ منو نے رحم کھا کر اسے چھوڑ دیا لیکن مچھلی نے اس احسان کے عوض میں ان کو بتایا کہ ایک بڑا زبردست طوفان آنے والا ہے۔ آپ ایک کشتی بنا کر اس میں اپنے ساتھیوں کو مع مویشیوں کے بٹھا لیجیے۔ میں بروقت پہنچ کر آپ کی مدد کروں گی، چناں چہ منو نے اس کی تعمیل کی اور جب طوفان آیا تو مچھلی حاضر ہوئی لیکن اب وہ بڑی مچھلی ہو گئی تھی جس کے سر پر ایک سینگ بھی نکلا ہوا تھا۔ منو نے ایک رسی اس کے سینگ سے باندھ کر کشتی میں اٹکا دی اور وہ طوفان سے کشتی کو بچا کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گئی اور طوفان کے ختم ہونے تک منو جی یہیں ٹھہرے رہے۔ ان تمام روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی اور موت کے اسرار کو کس کس طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں اس کے کتنے اندیشے، کتنی امیدیں، کتنی مسکراہٹیں اور کتنے

آنسو شامل تھے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا اولین مذہب "آفتاب پرستی" تھا اور یہ بالکل فطری بات تھی، کیوں کہ روشنی ہی زندگی ہے اور اسی سے زندگی میں حرارت قائم رہتی ہے۔ اپالو بھی سورج تھا جو رات کے ناگ کو شکست دے کر بھگا دیتا تھا۔ اگنی بھی سورج تھا جو انسان کے ہر ہر جھونپڑے کی حفاظت کرتا تھا۔ کرشن بھی سورج ہی تھے کہ ان کی ولادت کے وقت تمام درخت ہرے بھرے ہو گئے، ہرقلس بھی سورج دیوتا تھا، جونا (یونس) بھی وہی تھا اور یہ سب کے سب ۲۵ دسمبر ہی کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ سب نے چالیس دن کا روزہ رکھا۔ سب غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ اب مسیح کے حالات کا ان روایات سے موازنہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ وہاں بھی سب کچھ یہی ہے، ۲۵ دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوئے، ہیروڈ نے بہت سے بچوں کو ان کے دھوکے میں ہلاک کیا۔ چالیس دن[14] کا روزہ رکھا۔ غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ عیسیٰ بھی سورج دیوتا تھے، اور یقیناً تمام مذاہب کی ابتدا آفتاب پرستی ہی سے ہوئی، چناں چہ اس وقت بھی عبادت کے وقت لوگوں کا آنکھیں بند کر لینا اسی زمانہ کی یادگار ہے، کیوں کہ وہ سورج کو نہ دیکھ سکتے تھے اور آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ جب ہم اممِ سابقہ کی دیگر مذہبی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مذاہب میں کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی۔ ان کے تمام مراسم و عبادات کا رشتہ عہدِ قدیم کے مذاہب ہی سے جا کر مل جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ عیسائیوں میں بپتسمہ یا اصطباغ کی رسم پائی جاتی ہے، لیکن یہ عیسویت سے بہت پہلے کی چیز ہے۔ ہندوؤں، مصریوں، یونانیوں اور رومیوں میں بھی مقدس پانی کا وجود پایا جاتا تھا۔ صلیب کا خیال بھی نہایت قدیم خیال ہے۔ یہ علامت تھی غیر فانی ہونے کی، زندگی کی، اگنی کی۔ قبرِ انسانی کی۔ اٹلی کی قدیم آبادی (رومیوں سے بہت پہلے کی) قبروں پر صلیب ہی کا نشان قائم کرتی تھی۔ وسطی امریکہ کے قدیم معبدوں میں صلیبی نشان کثرت سے دریافت ہوئے ہیں۔ بابل کی سرزمین سے جو اسطوانے یا نلکے دریافت ہوئے ہیں، ان پر بھی صلیب کا نشان موجود ہے۔ اسی طرح تثلیث کا خیال بھی بہت پرانا ہے اور قدیم مصر میں پایا جاتا تھا۔

ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ اساطیر و معجزات میں بہت فرق ہے۔ اساطیر نام ہے کسی بات

14- چالیس کا عدد مذاہبِ عالم کی تاریخ میں بہت نظر آتا ہے۔ طوفان سے پہلے چالیس دن بارش ہوتی رہی، موسیٰ چالیس دن کوہ سینا پر رہے۔ چالیس سال تک بنی اسرائیل صحراؤں میں پھرتے رہے۔

کی خیالی تصویر پیش کرنے کا اور معجزہ کہتے ہیں کوئی بات گھڑ کر بیان کرنے کو۔ اگر تم کسی سے کہو کہ دو ہزار سال قبل مردے زندہ ہو گئے تھے، وہ غالباً کہے گا ہاں ہوا ہو گا۔ اگر تم اس سے کہو کہ ایک لاکھ سال بعد تمام مردے زندہ ہو جائیں گے تو وہ کہے گا، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ لیکن اگر تم یہ کہو گے کہ کیا تم نے خود قبر کے اندر سے کسی مردے کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ تمہیں دیوانہ سمجھ کر کوئی جواب نہ دے گا۔

مذہبی کتابیں اسی قسم کے بیانات سے معمور ہیں۔ خدا نے یہودیوں کے لیے جتنے معجزات سے کام لیا، وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان کو غلامی سے آزاد کرانا بھی معجزوں ہی کے ذریعے سے ہوا۔ جب وہ مصر سے باہر نکلے ہیں تو دن کو بادل اور رات کو روشنی کا ایک ستون آگے آگے رہنمائی کے لیے ہوتا تھا۔ دریائے نیل ان کے لیے شق کیا گیا، من و سلویٰ ان کے لیے آسمان سے نازل کیا گیا لیکن یہودیوں نے ان میں سے کسی معجزہ کی پروا نہیں کی اور جب تک بچھڑا بنا کر پوج نہیں لیا، انہیں چین نہ آیا۔

اسی طرح مسیح نے بہت سے معجزے پیش کیے لیکن بالکل بے نتیجہ۔ وہی مردے جن کو انہوں نے زندہ کیا، وہی اندھے جن کو انکھیارا بنایا اور وہی کوڑھی جنہیں اچھا کیا، ان پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب تھا۔ صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر نہیں ہوئے بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں۔

پانی کو شراب بنا دینا، سیکڑوں آدمیوں کو صرف ایک روٹی سے سیر کر دینا، اندھے کو مٹی لگا کر بینا بنا دینا، طوفان کو خاموش کر دینا، پانی پر چلنا؛ یہ سب باتیں ہیں جنہیں انسان سوچتا تھا، جن کے پورا ہونے کی تمنائیں رکھتا تھا اور انہیں کی تکمیل کو سب سے بڑی نعمت سمجھ کر اظہارِ عظمت و تقدس کے لیے اس نے پیغمبروں سے منسوب کر دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جہل و خوف سے معمور تھی اور اپنی ہر مشکل میں مافوق الفطرت ہستی سے امداد کی توقع رکھتی تھی، چناں چہ انہوں نے ان مفروضہ غیر انسانی ہستیوں کو خوش کرنے کے لیے مندر بنائے، قربان گاہیں تیار کیں، ان کے سامنے ناک رگڑی، قربانیاں چڑھائیں اور وہ سب کچھ کیا جس سے وہ خود خوش ہو سکتے تھے لیکن ان آسمانی قوتوں نے ایک نہ سنی۔ ان میں سے کوئی انسان کی فریاد کو نہ پہنچا۔ طوفان بھی آئے، کھیتیاں بھی برباد ہوئیں، وبائیں بھی پھیلیں، جن کو برے حال جینا تھا، وہ برے حال ہی جیے اور جنہیں مرنا تھا وہ مر ہی گئے۔

انسان یہ سمجھتا تھا اور اب بھی مذہبی انسان یہی سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اسی کے لیے ہے۔ اسی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کائنات وجود میں آئی، چناں چہ وہ ہر چیز پر قابض ہونا چاہتا تھا اور جب ناکام رہتا تھا تو سمجھتا تھا کہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا، حالاں کہ اگر دنیا میں ایک انسان نہ ہوتا تو بھی سورج کا یہی طلوع و غروب ہوتا۔ یہی بہار و خزاں ہوتی، گلاب اسی طرح کھلتا۔ انگور کی بیلیں اسی طرح پھل لاتیں۔ وہی سمندر کا مدّ و جزر ہوتا اور وہی رات دن، وہی طوفانی ہوائیں ہوتیں اور وہی رعد و برق۔ جب ایک زمانہ، ایک غیر محدود زمانہ انسان پر اسی جہل و بے بصری کی حالت میں گزر گیا تو کچھ لوگ سوچنے والے پیدا ہوئے اور انھوں نے ان روایات و معجزات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ انھوں نے غور کیا کہ کسوف و خسوف کیوں مقررہ وقفہ کے بعد ہوتا ہے اور آخر کار انھوں نے اس کی وجہ معلوم کر کے سمجھ لیا کہ اجرامِ فلکی کی گردش اولادِ آدم سے بالکل بے نیاز ہے اور انسان خود بھی مظاہرِ طبیعی کا ایک معمولی مظہر ہے۔

گیلیلیو، کوپر نکس اور کیپلر نے مذہب کی بتائی ہوئی ہیئت کو درہم برہم کر دیا، زمین چپٹی ہونے کے بجائے گول اور ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہو گئی۔ آسمان بجائے ٹھوس ہونے کے خلا محض بن گیا اور سارا بنا بنایا کھیل مذہب والوں کا بگڑ گیا۔

ظاہر ہے کہ مذہب اپنی روایات کی اس تکذیب و توہین کو برداشت نہ کر سکتا تھا، وہ تاریکی جو زمانۂ معلوم سے دماغوں پر مسلط تھی، یوں آسانی سے دور نہ ہو سکتی تھی۔ آخر کار جہل نے علم کے خلاف ایک محاذ جنگ قائم کیا، اور مذہب کے درندہ نے جس کے پنجے ہمیشہ خون سے رنگین رہے ہیں، برونو کے خلاف اپنا چنگل بڑھایا اور محض اس خطا پر کہ وہ اس کرّہ کے علاوہ اور کرّوں کا بھی قائل تھا۔ اسے کافر و ملحد قرار دے کر سات سال کے لیے قید کر لیا گیا کہ اگر وہ اپنے الحاد سے باز آجائے تو رہا کیا جا سکتا ہے لیکن اس نے کہا کہ ایک حق بات سے انکار کیوں کر ممکن ہے اور آخر کار پا بہ زنجیر اسے قصاص گاہ میں لے گئے اور بہت سی لکڑیاں جمع کر کے چتا میں آگ لگا دی گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ الغرض مذہب نے عقل و علم کو شکست دینے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن جہل کے پاؤں جب ایک بار اکھڑ جاتے ہیں تو پھر مشکل سے جمتے ہیں۔ عقل کی روشنی پھیلتی رہی اور مذہب کی تاریکی سمٹتی رہی۔

جان بازانِ علم اٹھے اور انھوں نے سمندروں، پہاڑوں اور وادیوں میں جانیں دے

دے کر وہ وہ باتیں دریافت کیں جو مذہب کی دسترس سے باہر تھیں۔ انہوں نے بخار و برق کی قوت دریافت کر کے انسان کو دیوتا بنا دیا، لیکن اہلِ مذہب بدستور دیوتاؤں کے غلام ہی بنے رہے۔ مذہب والے مفروضہ معجزہ ہی بیان کرتے رہے اور انہوں نے انہیں پورا کر کے دکھا دیا، یعنی انسان کی جن تمناؤں کو دیوتا پورا نہ کر سکے تھے، اسے علم و عقل نے پورا کر دیا۔

سائنس بتاتی ہے کہ نہ تخلیق کوئی چیز ہے، نہ فنا کوئی چیز، ایک لامحدود ہستی کا وجود، ایک لامحدود استحالۂ عقلی ہے، کائنات کے تمام مظاہر و مآثر اسباب و نتیجہ سے وابستہ ہیں اور اشیاء کے اسی فطری رابطہ کو ایک نے نہ سمجھا اور مذہب بن گیا، دوسرے نے سمجھ لیا اور علم کہلایا۔

مذہب کا تجربہ انسان نے ہزاروں سال کیا لیکن کوئی آسمانی مدد اسے نہ پہنچی، خدا کا رحم حاصل کرنے کے لیے ماؤں نے اپنے بچوں کی قربانیاں پیش کیں لیکن اسے ان پر رحم نہ آیا۔ برہنہ و وحشی انسان کو لاکھوں کی تعداد میں درندوں نے کھایا، سانپوں نے ڈسا، طوفانوں نے ڈبویا، زلزلوں نے تباہ کیا لیکن خدا نے اپنا اصولِ کار نہ بدلا۔ انسان نے لاکھوں مندر بنائے، رات دن اس کی پوجا کی لیکن ظالموں کا ظلم بدستور قائم رہا اور غلاموں کی پیٹھ پر جو کوڑے پڑا کرتے تھے، بدستور پڑتے رہے؛ یہاں تک کہ انسان نے لاکھوں سال کے تلخ تجربات کے بعد سمجھا کہ خدا انسانی معاملات میں دخل نہیں دیتا اور اس کے نزدیک گھاس کی پتی اور انسان سب برابر ہیں، اس لیے اس کی ترقی کا انحصار صرف اس کی محنت و کاوش اور رہبریٔ عقل پر ہے۔ آخر کار رفتہ رفتہ معجزات کا زمانہ گزر گیا، روایاتِ مذہبی کا دور ختم ہو گیا اور اب انسان اس کے لیے تیار نہیں کہ وہ مذہب کے بتائے ہوئے اصولِ نجات پر یقین رکھ کر اپنی دنیا کو تباہ کر دے اور بے وقوف کہلائے۔

قیامت قائم ہے، حشر و نشر کا ہنگامہ برپا ہے۔ مسیح اپنے تخت پر جلوہ افروز ہیں کہ ایک روح سامنے آتی ہے۔

مسیح: تیرا نام کیا ہے؟

روح: ٹارکومیڈا[15]

مسیح: کیا تو عیسائی تھا؟

15- اسپین کا وہ ظالم انسان جس نے سب سے پہلے غیر مسیحی لوگوں کے لئے جسمانی سزائیں دینے کا محکمہ قائم کیا۔ سن ۱۴۲۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۴۹۸ء میں مرا۔

ٹار: تھا

مسیح: کیاتونے اوروں کو مسیحی بنانے کی کوشش نہیں کی؟

ٹار: کی اور پوری طرح کی

مسیح: کیوں کر؟

ٹار: میں نے منکرین کو قید کیا، ان کے پاؤں میں خاردار زنجیریں ڈالیں، ان کی زبانیں کھنچوالیں، ان کی آنکھیں نکلوائیں، شکنجے میں کسوا کر ان کی رگ رگ توڑ دی اور اگر وہ پھر بھی زندہ رہتے تو کھال کھنچوا کر زندہ آگ میں ڈلوادیا۔

مسیح: خوب کیا! اے میرے وفادار خادم! خوب کیا، اچھا جاؤ اور قربِ خداوندی میں رہ کر نجاتِ ابدی کی راحتیں حاصل کرو۔

(دوسری روح حاضر ہوتی ہے)

مسیح: تیرا کیانام ہے؟

روح: برونو

مسیح: کیاتو مسیحی تھا؟

برونو: کچھ عرصہ تک مسیحی رہا، لیکن اس کے بعد میں نے خود اپنی عقل سے سچائی کی تلاش شروع کی۔

مسیح: کیاتونے لوگوں کو تبلیغ کی؟

برونو: کی، لیکن مسیحیت کی نہیں، آزادئ فکر و ضمیر کی، اچھا کام کرنے کی، بغیر "طمعِ ثواب" اور برے کام سے بچنے کی بلا "خوفِ عذاب"۔ میں نے لوگوں کو بتایا کہ انسانیت نام ہے صرف بھلائی کا، ہمدردی کا اور دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کا۔

مسیح: یہ تو گویا تونے انجیل کو جھٹلایا اور معجزات سے انکار کیا، اچھا! تو جا! اسفلِ سافلین میں تیرا ٹھکانہ ہے اور وہیں تجھے، ابدالآباد تک دوزخ میں جلنا ہے۔

کیا خدا اور مسیح کے اس فیصلے کو دنیا اب بھی قرینِ انصاف سمجھ سکتی ہے؟ اور کیا مذہب کا دورِ معجزہ و کرامات اب پھر واپس آسکتا ہے؟

ملاحدۂ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے (۵)

مذاہبِ عالم کی تاریکیاں

ترقی کرنا انسان کا فطری حق ہے لیکن ترقی کا حقیقی مفہوم کیا ہے، اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس باب میں دو متضاد رائیں پائی جاتی ہیں، کیوں کہ وہی ایک حالت ہے، جسے ایک جماعت ترقیٔ تہذیب سے تعبیر کرتی ہے اور دوسری وحشت و جہل سے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ہر وہ چیز جو قدیم ہے، پرانی ہے، قابلِ احترام ہے گویا جب تک کسی چیز کے جھاڑنے سے صدیوں کی جمی ہوئی خاک نہ اڑے قابلِ اعتناء نہیں۔ ان کے نزدیک حکومتیں وہی تھیں جو ختم ہو گئیں، فرماں روا وہی تھے جو گزر گئے۔ سچے مصلح وہی تھے جو مر گئے۔ نہ ویسے شاعر اب پیدا ہوتے ہیں، نہ ویسے ادیب، نہ ویسے سیاست داں اب نظر آتے ہیں، نہ ویسے حکماء و فلاسفہ۔

دوسرا گروہ قدیم و قدامت کا دشمن ہے اور موجودہ زمانہ کا مداح۔ ان کے نزدیک زمانۂ قدیم میں کوئی بات معقول تھی ہی نہیں اور قدرت نے اپنے تمام برکات زمانۂ حال ہی کے لیے وقف کر دیئے ہیں۔ میری رائے میں دونوں غلطی پر ہیں۔ نہ قدیم زمانہ کی ہر چیز بری تھی، نہ زمانۂ حال کی ہر بات اچھی، صداقت ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اور اسے ہم قدیم و جدید نہیں کہہ سکتے۔ وہ ہر زمانہ میں یکساں رہی اور ہمیشہ اس کی جستجو کرنا چاہیئے۔

اگر ہم اصولاً اس بات کو تسلیم کر لیں کہ "فکر و عمل" ہی ملک کی ترقی و مسرت کی بنیاد ہے اور یہ عمومی مسرت ہی فی الحقیقت فطری صداقت ہے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا کے "فکر و عمل" کو بالکل آزاد ہونا چاہیئے۔ آپ اس عہدِ قدیم کو نہ دیکھئے جب اشیاء ترتیبِ تاریخ سے پہلے بھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا بلکہ عہدِ وسطیٰ کو لیجئے اور غور کیجئے کہ اس وقت یورپ کی (جو اس وقت سب سے بڑا مدعیٔ تہذیب و آزادی ہے) کیا حالت تھی، طبقۂ عمّال کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا۔ جہل کی تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی اور فکرِ انسانی نام تھا صرف اوہام پرستی کا۔ فضا میں ہر طرف

ملائکہ و عفاریت چھائے ہوئے تھے اور ہر سمجھ میں نہ آنے والی بات معجزۂ خداوندی قرار دی جاتی تھی۔ اعتقادات نے عقلِ انسانی کو بے کار کر رکھا تھا اور مذاہب نے غور و فکر کو انسان کے لیے وجہِ امتیاز صرف یہ تھا کہ یا تو وہ سپاہی ہو یا پادری، یعنی سوائے لڑنے اور جھوٹ بولنے کے لیے اور کوئی صورت، انسانیت کی موجود نہ تھی۔ صنعت و حرفت کو ذلیل سمجھا جاتا تھا اور اس ذریعہ سے ایک شخص بھی اپنا پیٹ آسانی سے نہ بھر سکتا تھا۔ قومیں خرید و فروخت کے ذریعہ سے ضروریاتِ زندگی حاصل نہ کرتی تھیں بلکہ لوٹ مار سے اور ہر مسیحی ملک غیر مسیحی قوم کے مال کو لوٹ لینا ثواب جانتا تھا۔ لکھنا پڑھنا نہایت خطرناک بات سمجھی جاتی تھی اور اگر کوئی شخص بد قسمتی سے سیکھ لیتا تھا تو اسے ساحر یا کافر سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت تقریباً بالکل ناممکن ہے کہ ہم اس زمانہ کی جہالت، واہمہ پرستی اور کور دماغی کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اس وقت انسان کے جسم و دماغ دونوں مقیّد تھے، ایک کے لئے لوہے کی زنجیریں تھیں اور دوسرے کے لئے وہم پرستی کی اور اس غلامی سے آزاد ہونے کی صورت سوا موت کے اور کوئی نہ تھی۔

پندرہویں صدی میں انگلستان کا قانون یہ تھا کہ اگر کوئی شخص انجیلِ مقدس کا مطالعہ اپنی مادری زبان میں کرے گا تو اس کی جائیداد اور اس کے مویشی ہمیشہ کے لیے ضبط ہو جائیں گے اور وہ حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا۔ چناں چہ اس قانون کے نفاذ کے بعد ایک دن ۳۹ آدمی پھانسی پر لٹکائے گئے اور ان کی لاشیں سرِ بازار جلائی گئیں، پھر یہ جہل صرف انگلستان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ یورپ کے ہر حصہ میں پایا جاتا تھا۔ چناں چہ سولہویں صدی میں فرانس کی حکومت نے ایک شخص کو اس خطا پر آگ میں تڑپا تڑپا کر ہلاک کر ڈالا کہ وہ راہبوں کے ایک جلوس کے سامنے دو زانو نہ ہوا تھا۔ اب آیئے اس اجمال کی ذرا تفصیل سن لیجیے:

عہدِ وسطیٰ کے تمام انسان جاہل و عالم، آقا و غلام، پادری و غیر پادری سب کے سب جادو ٹونا اور ٹوٹکے کے قائل تھے، انہیں یقین تھا کہ شیطان نہ صرف انسان بلکہ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے اندر بھی حلول کر جاتا ہے اور چوں کہ شیطان کا مقابلہ ایک مقدس فریضہ تھا۔ اس لیے کسی ایسے شخص کو جس کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ وہ شیطان کا ہم راز و ندیم ہے، مار ڈالنا یا زندہ جلا دینا بہت معمولی بات تھی۔ جس حد تک حقیقت یا واقعیّت کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ مہمل عقیدہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ کسی

انسان کے اندر شیطان حلول کر جائے اور وہ اسے نجس وناپاک افعال پر مجبور کرے لیکن اس عقیدہ کی مذہبی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ لوگ جو اس جرم میں گرفتار کیے جاتے تھے جن کے خلاف عدالت گاہوں میں مقدمے چلائے جاتے تھے اور جن سے دنیا نفرت کرتی تھی، خود بھی یقین رکھتے تھے کہ واقعی ان پر شیطان سوار ہے اور وہ اس کا اعتراف کر لیتے تھے۔

جیمس اول کے زمانہ میں ایک شخص اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا اس جرم میں جلایا گیا کہ وہ شاہی خاندان کو ڈبو دینے کے لیے سمندر میں طوفان پیدا کر رہا تھا۔

ایک بار سر میتھو ہیل کے سامنے جو انگلستان کا مشہور قانون داں جج تھا، ایک عورت پیش کی گئی کہ یہ بچوں سے سوئیوں کی قے کراتی ہے اور شیطان سے ساز باز رکھتی ہے۔ چناں چہ جج صاحب نے اس کو مجرم قرار دے کر زندہ جلوادیا اور فیصلہ میں لکھا کہ یہ جادوگرنی تھی اور جادو کا ازروئے مذہب حق ہونا ثابت ہے۔ عام عقیدہ ایک یہ بھی تھا کہ بعض آسیب زدہ انسان بھیڑیئے کی شکل اختیار کرسکتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی شخص پر بھیڑیے نے حملہ کر دیا، اس نے مقابلہ کرکے اس کا ایک پنجہ کاٹ لیا اور جیب میں رکھ کر گھر پہنچا، دیکھا کہ اس کی بیوی کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے اور اس کے خون نکل رہا ہے۔ اس سے یہ یقین کیا گیا کہ اس کی بیوی بھیڑیا بن کر گئی تھی، چنانچہ اس نے اقرار کیا اور جلادی گئی۔

اس طرح لوگوں پر یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ وہ گرمیوں میں پالا گراتے ہیں، اولے برسا کر فصلیں تباہ کرتے ہیں، شرابیں ترش کر دیتے ہیں اور گائیوں کو بانجھ کر دیتے ہیں، اس زمانہ میں کسی کی زندگی محفوظ نہ تھی۔ کسی کا اپنے دشمن کے متعلق یہ کہہ دینا کہ ساحر ہے کافی تھا اور اس الزام کی تحقیق کوئی نہ کرتا تھا۔ پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ الزام صرف انسانوں ہی پر عائد نہ کیا جاتا تھا بلکہ جانور بھی اس سے محفوظ نہ تھے۔ ۱۴۷۴ء میں ایک مرغ پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ اس نے انڈا دیا ہے اور چوں کہ مرغ عام طور پر انڈا نہیں دیتا، اس لیے یقیناً اس میں شیطان حلول کر گیا ہے۔ چناں چہ یہ مرغ مع انڈے کے عدالت گاہ میں پیش کیا گیا اور اس کو سرِ راہ جلا دیئے جانے کا حکم صادر ہوا۔ اسی طرح ایک سؤر پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ اس نے آدمی کو مار کر کھالیا ہے اور اسے بھی جلا دیا گیا۔ ۱۷۴۰ء ایک گائے پر بھی آسیب زدہ ہونے کا الزام قائم کرکے اسے سزا دی گئی۔ جانوروں کو بطور شاہد کے طلب کرنا بھی اس وقت کا دستور تھا۔

ایک وقت میں یورپ کا قانون تھا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی شخص رات کو داخل ہوا اور وہ اسے قزاق سمجھ کر مار ڈالے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس سلسلہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے کوئی شخص کسی بہانہ سے کسی کو بلا کر مار ڈالے اور اس طرح سزا سے بچ جائے۔ اس بنا پر قانون میں ترمیم کی گئی کہ مالک مکان اس وقت تک بے گناہ نہیں سمجھا جائے گا جب تک وہ گھر کے کتے، بلی یا دوسرے جانور کو پیش نہ کرے جس کے سامنے اس نے مارا ہے۔ پھر یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا تھا تو گھر والے کو کوئی پلا ہوا جانور پیش کر کے اس کے سامنے اپنی بے گناہی کی قسم کھانا پڑتی تھی، عقیدہ تھا کہ اگر وہ جھوٹ بولے گا تو ضرور کسی نہ کسی طرح جانور اس کا اظہار کر دے گا۔

یہ بھی انگلستان کا قانون تھا کہ اگر کوئی شخص جرم کرے تو وہ اس متبرک پارچۂ نان و پنیر سے اپیل کرے جو اس مقصد کے لیے الگ کر دیا جاتا تھا یعنی مجرم اس روٹی کے ٹکڑے کو لے کر کہتا تھا کہ اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے میرے حلق میں پھنس جائے۔

پانی اور آگ کے ذریعہ سے بھی گناہ و بے گناہی کی جانچ ہوتی تھی یعنی مجرم آگ میں تپایا ہوا سرخ لوہا ہاتھ میں لیتا تھا اور عقیدہ یہ تھا کہ اگر وہ گناہ گار نہیں ہے تو اس کو کوئی ضرر نہ پہنچے گا (ہندوستان کے بھی بعض سیّد خاندان مدعی ہیں کہ آگ ان پر اثر نہیں کر سکتی کیوں کہ وہ معصوم ہیں، یہ جاہلانہ عقیدہ بھی اسی نوع کی مذہبی تاریکی کا نتیجہ ہے) اسی طرح مجرم کو ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی میں ڈال دیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اگر وہ بے گناہ ہے تو ڈوبے گا نہیں۔

ان مثالوں کے دینے سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان قوموں میں جو مذہب کی جاہلانہ گرفت میں مبتلا تھیں یا ہیں، کیا کیا بد تمیزیاں پائی جاتی ہیں اور عقل انسانی کا خون کرنے میں معتقدات مذہبی نے کتنا حصہ لیا۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب کی اس لعنت میں صرف جاہل انسان ہی مبتلا نہ تھا بلکہ پڑھے لکھے، ذی فہم و ذی ہوش افراد بھی مبتلا نظر آتے تھے۔

کپلر دنیا کے مشہور بڑے آدمیوں میں سے تھا اور ہیئت دانی میں تو اس کا نظیر نہ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس احمقانہ عقیدہ میں بھی مبتلا تھا کہ ستاروں کو دیکھ کر ایک شخص کے مستقبل کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ عقیدہ اس کے دل میں مذہبی بنیاد رکھتا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ ایسے ہی ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی۔ تیخو براہی بڑا زبردست ہیئت

داں تھا، یہ بہت سے مہمل الفاظ ایک جگہ لکھ کر پیشین گوئیاں کیا کرتا تھا اور ان کے پورا ہونے کا منتظر رہتا تھا۔

لوتھر کو یقین تھا کہ اس کی ملاقات شیطان سے ہوئی تھی اور بعض مذہبی مسائل پر اس سے مباحثہ بھی ہوا تھا۔ چارلس پنجم شہنشاہ جرمنی کے زمانہ میں اسٹوفلر بڑا مشہور ہیئت داں گزرا ہے، اس نے ایک بار ستاروں کو دیکھ کر حکم لگایا کہ ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے اور اس کا اتنا یقین ہو گیا کہ ہزاروں آدمیوں نے جو نشیبی حصۂ زمین میں رہتے تھے، ترکِ وطن کر دیا اور خانماں برباد ہو گئے۔ فرانس میں تو لوگوں نے دوسری کشتی نوح تیار کر لی اور ذخائر سے اسے بھر دیا تا کہ طوفان میں کام آ سکے لیکن طوفان نہ آنا تھا، نہ آیا۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہنِ انسانی کس درجہ غلامی میں مبتلا تھا اور مذہب کا مفہوم سوائے شیطان کی پرستش کے اور کچھ نہ تھا۔ ان کی تاریخ کے صفحات اسی قسم کے مزخرفات سے معمور تھے اور ان کی مذہبی روایات اس طرح کی لغو باتوں سے بھری ہوئی تھیں، اس کا سبب یہ تھا کہ انسانی معلومات کا ذریعہ صرف مذہبی ادارے تھے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ ادارے تھے وہ قصداً جھوٹ بولتے تھے اور ارادتاً خلافِ عقل باتیں گھڑ لیتے تھے تا کہ لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں اور وہ اس کے جواب میں معجزات و کرامات وغیرہ بیان کر کے عوام کو مرعوب کر لیں اور اپنا اقتدار جمائیں۔

پھر جہل و ظلمت کا یہ اثر کسی ایک شعبہ تک محدود نہ تھا بلکہ تمام انسانی معلومات پر چھایا ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ زبان ہی کے مسئلہ کو لیجئے تو عجیب و غریب حقائق کا انکشاف ہو گا۔ اول اول عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ عبرانی ہی اصل زبان ہے اور تمام زبانیں اسی سے نکلی ہیں (عربی کو بھی امّ الالسنہ اسی لیے کہتے ہیں) بعد کو یہی دعویٰ اور زبانوں نے بھی کیا، اینڈرے کمپ نے ۱۵۶۱ء میں ایک کتاب شائع کی جس کا مقصود یہ بتانا تھا کہ بہشت کی زبان کیا ہے، چناں چہ اس نے لکھا ہے کہ خدا نے آدم سے سویڈن کی زبان میں باتیں کیں۔ آدم نے ڈنمارک کی زبان میں جواب دیا اور سانپ نے حوا سے فرانسیسی میں باتیں کیں۔

ایرو نے اپنی کتاب میں جو میڈرڈ میں شائع ہوئی تھی، ظاہر کیا ہے کہ جنت عدن میں بسکانی زبان (شمالی ہسپانیہ کی) بولی جاتی ہے۔ ۱۵۸۰ء میں گروپیں نے ایک کتاب لکھی کہ یہ سب غلط ہے، بہشت میں توڈچ زبان بولی جاتی ہے۔

اب جغرافیہ کو لیجئے کہ اس میں کیا کیا گل کھلائے گئے، چھٹی صدی میں ایک راہب نے جس کا نام کاساس تھا، ایک کتاب ہیئت و جغرافیہ کی ملی جلی لکھی اور ظاہر کیا کہ بائبل میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہی بالکل صحیح ہے یعنی دنیا مشتمل تھی ایک مسطح قطعۂ زمین اور اس کے بعد دائرہ دار ٹکڑوں پر، یہ قطعۂ زمین چاروں طرف پانی سے بھرا ہوا تھا جسے سمندر کہتے ہیں اور پانی کے اس حصہ سے آگے ایک اور حلقہ خشکی کا تھا اور طوفان سے قبل یہیں انسانی آبادی پائی جاتی تھی۔ یہیں ایک بلند پہاڑ تھا جس کے گرد سورج چاند طواف کرتے تھے اور جب سورج اس پہاڑ کے پیچھے چلا جاتا تھا تو رات ہو جاتی تھی اور سامنے آجاتا تو دن ہو جاتا تھا۔ اس راہب نے یہ بھی بتایا کہ بیرونی دائرہ خشکی کے کنارہ سے آسمان بندھا ہوا تھا اور وہ کسی ٹھوس چیز کا بنا ہوا تھا، اور زمین کو ایک کڑھائی کی طرح ڈھکے ہوئے تھا۔

ان بیانات کے ساتھ ہی اس کا بھی اہتمام تھا کہ بائبل میں کائنات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے کہ اس کے خلاف کوئی شخص کچھ نہ کہے نہ سمجھے ورنہ وہ کافر و بے دین قرار دیا جائے گا۔

علم کے خلاف مذہب کی اس جنگ کا یہ حال تھا کہ لکھنا پڑھنا ممنوع تھا اور جو کوئی ایسا کرتا تھا، اسے طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اگر کسی کے منہ سے نکل گیا کہ زمین ایک کرّہ ہے تو اسے پکڑ کر جلا دیا گیا۔ اگر کسی نے دعویٰ کیا کہ آفتاب نظامِ شمسی کا مرکز ہے تو اسے جلا وطن کر دیا گیا۔ ایک عورت کو صرف اس لیے سولی پر چڑھا دیا کہ وہ بخار کی تکلیف کو گا گا کر کم کر رہی تھی۔

مگر چوں کہ یہ عقیدہ عام تھا کہ انسان اپنی روح کا مالک نہیں ہے، اس لیے ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی مرتسم ہو گیا کہ وہ اپنے جسم کا بھی مالک نہیں ہے اور اس طرح غلامی کی بنیاد قائم ہوئی۔ پھر جنہوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، ان سے مخفی نہیں کہ یونان و رومہ، فرانس و جرمنی وغیرہ میں غلامی کے کتنے وسیع و مہیب ادارے قائم تھے اور انسانوں کو جانور بنانے میں انہوں نے کتنا بڑا حصہ لیا۔

الغرض مذہب کے تاریک دور میں انسان کا جسم و ذہن دونوں انتہائی ذلیل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور انسانیت کا مستقبل سخت تاریکی میں مبتلا تھا، لیکن چوں کہ حقیقت و صداقت کو عرصہ تک دبایا نہیں جا سکتا اور فراستِ انسانی وہ چنگاری نہیں جو کسی نہ کسی وقت بھڑک نہ اٹھے اس لیے رفتہ رفتہ ایک زمانہ آیا کہ علم کی روشنی

پھیلی۔ مذہب نے اس کے لیے جگہ چھوڑی اور اس طرح انسانیت جو ہزاروں سال سے وحشت و درندگی کے بوجھ کے نیچے پڑی کراہ رہی تھی، آزاد ہوئی۔ پرانے جغرافئے بدلے، تاریخ بدلی، معتقدات بدلے اور آخر کار انسان مذہب کی گرفت سے چھوٹ کر آزاد ہو گیا۔ علم و فن کسی کی ملکیت نہ رہا۔ سوچنے سمجھنے کا ہر شخص مجاز ہو گیا۔ غور و تدبر ہر شخص کا فطری حق قرار پایا۔ اختراعات و ایجادات کا دروازہ کھل گیا۔ آزادیٔ فکر و رائے کے لیے کوئی مانع حائل نہ رہا اور انسان کو اس طرح سب سے پہلے ترک مذہب ہی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔

ترقی کا مفہوم کیا ہے، اس سوال کا مطالعہ آپ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی کیجیے اور مذہب سے علیحدہ ہو کر بھی آپ کو بالکل دو مختلف جواب ملیں گے۔ مذہب کے نزدیک ترقی کا مفہوم اس دنیا سے تعلق رکھتا ہے جہاں دنیاوی افعال و اعمال کے نتائج سے واسطہ پڑے گا اور عمل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔ پھر کیا یہ امر حیرت ناک نہیں کہ جس عالم کے کردار سے مذہب نے جزا و سزا کو متعلق بتایا ہے، اسی کو اندھوں کی طرح بسر کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

اب ذرا مذہب کی پابندیوں سے ہٹ کر انسانیت کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں کتنی وسعت ہے، جدوجہد کا کتنا پھیلاؤ ہے اور اس کے مقاصد کتنے بلند ہیں، سب سے بڑی چیز جس پر انسان فخر کر سکتا ہے، وسعتِ نظر ہے اور اس کا پتہ عالمِ اخلاق میں چل سکتا ہے۔ پھر دیکھئے کہ اخلاقی حیثیت کس کی زیادہ بلند ہے۔ ایک مذہب کا پابند، خواہ وہ کتنا ہی بلند نظریہ اخلاق کا رکھتا ہو، دوسرے مذاہب والے کو تحقیر و استخفاف کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ یہ خیال کہ صرف میں راہ راست پر ہوں اور دوسرا گمراہ ہے، قدرتاً ایک شخص کے دل میں جذبۂ تفوق کو پیدا کر کے دوسرے کو حقیر و ذلیل ٹھہرائے گا اور یہی وہ ایک جذبہ تھا جو ہمیشہ دنیا میں فساد و خوں ریزی کا باعث ہوا۔

یوں تو مذہب نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں امن و سکون پھیلانے آیا ہے لیکن عمل سے وہ اس دعویٰ کو کبھی صحیح ثابت نہ کر سکا اور اس لئے اگر واقعی ترقی کی راہوں پر غور کرنا ہے تو مذہب سے علیحدہ ہو کر غور کرنا چاہیئے اور انسانیت کے کلی مفہوم کو سامنے رکھ کر شاہراہِ عمل متعین کرنا چاہیئے۔

مذاہب کی واہمہ پرستیاں!

کل ایک بزرگ تشریف لائے اور عجیب و غریب بحث چھیڑ دی۔ ان کا ذہن جن خیالات سے متاثر تھا ان کا خلاصہ یہ تھا کہ کہنے والے کہتے ہیں خدا مستجاب الدعوات ہے، لوگوں کی دعائیں سنتا ہے، غریبوں کی فریاد کو پہنچتا ہے۔ اس نے آدم کی گریہ وزاری کو سنا اور کھوئی ہوئی جنّت کے عوض اس سے بہتر فردوس کا وعدہ کر کے ان کے آنسو پونچھے یعقوب کی سرشک آلود آنکھوں کو دیکھا اور اُن کے یوسفِ گم گشتہ کو پھر ان کی آغوش تک پہنچا دیا۔ وہی تھا جس نے نوح کو طوفان سے زندہ سلامت نکالا۔ آتشِ نمرود کو ابراہیم کے لئے اِک گلزار بنا دیا۔ یونس کو بطنِ ماہی کے اندر فنا ہونے نہ دیا۔ موسیٰ کی حمایت میں فرعون کو غرق کیا۔ مسیح کو دوبارہ زندہ کر کے اپنے پہلو میں جگہ دی اور محمد کو اُن کی دعائے نیم شبی کے عوض کونین اٹھا کر دے دیئے لیکن جس وقت ہم خود اپنے ذاتی احساس و تجربہ کی دنیا میں اس عقیدے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ "روایتی خدا" واقعی ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی حقیقت و نوعیت کیا ہے؟

آج انسانیت جس دورِ اضطراب سے گزر رہی ہے اس نے نوح کے طوفان کو بھلا دیا۔ آتشِ نمرود اس کے سامنے ایک چنگاری کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ بنی اِسرائیل پر جو مظالم روا رکھے گئے ان سے زیادہ ظلم اب اس دنیا پر ہو رہا ہے۔ محمد کے زمانہ میں جس بت پرستی نے اخلاقِ انسانی کا خون کر رکھا تھا اس سے زیادہ صداقت سوز صورتیں اس وقت پیدا ہیں۔ غریبوں کی فریاد مظلوموں کی کراہ اگر پہلے ہزاروں تک محدود تھی تو اب کروڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ پہلے آگ جسم سے شروع ہوتی تھی اور وہیں ختم ہو جاتی تھی اب شعلے دل سے اٹھتے ہیں اور جسم و جان دونوں کو پھونکے ڈالتے ہیں لیکن نہ خدائی قہر و غضب میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ اس کا دریائے رحمت جوش میں آتا ہے۔

یہ سن کر میں نے جو جواب دیا وہ زیادہ تر فکاہی حیثیت رکھتا تھا لیکن ان کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کیا یہ ذہنی گمراہی ہماری مذہبی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے اور کیا دلوں میں ایسے شکوک پیدا ہونے کی ذمّہ داری مذہب پر نہیں ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ

وہ خود ہی ایک مفروضہ اپنے ذہن سے پیدا کرتا ہے اور جب تجربہ سے اس کے نتائج خلافِ امید ظاہر ہوتے ہیں تو وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں پر الزام رکھتا ہے۔ اس نے آپ خدا کا ایک مفہوم مقرر کیا اور جب خدا ویسا نہ نکلا جیسا اس نے سمجھا تھا تو اپنی غلطی تسلیم کرنے کے جگہ خدا کی طرف سے بدگمانیاں پیدا کرنے لگا یعنی خدا کو وہ ویسا ہی سمجھے جائے گا جیسا وہ سمجھ چکا ہے خواہ خدا کی خدائی رہے یا نہ رہے۔

خدا کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا؟ اس مسئلہ پر انسان اپنی مجبورانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر غور کرتا ہے اور اس لئے وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی کا سہارا ڈھونڈ کر اپنی جدوجہد کی مصیبتوں کو کم کر دے اور یہیں سے وہ خدا وجود میں آجاتا ہے جس سے ہم اپنی ناکامیوں پر باز پُرس کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنی قوّتِ عمل کو اصل چیز قرار دے کر خدا کا مفہوم متعین کرے تو شاید خدا خود اس کو اپنے اندر نظر آئے اور وہ اپنی ہی عملی زندگی کی اصلاح و درستی کی طرف مائل ہو۔

سوچتے سوچتے جب میرے سامنے مذاہبِ عالم کی تاریخ آئی اور ان معتقدات کی تفصیل جن کو مذہب نے دنیا سے تسلیم کرایا ہے تو میرے ذہن نے زیادہ عمیق فلسفیانہ رخ اختیار کیا۔ ایک بے لاگ انتقادانہ کیفیت میرے اندر پیدا ہوئی اور میں یہی دیکھ کر حیران رہ گیا کی اگر مذاہب کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی بنیاد سوا واہمہ پرستی کے اور کچھ نظر نہیں آتی۔

سب سے بڑی واہمہ پرستی جو سرچشمہ ہے بہت سے اوہام کا، معجزہ کا اعتقاد ہے معجزہ نام ہے ایسے فعل کا جو قوانینِ فطرت کے خلاف ہو، یعنی اگر کوئی شخص ایسا دائرہ بنا سکے جس کا قطر اس کے محیط کا نصف ہو تو یہ اقلیدس کا معجزہ کہلائے گا۔ اگر ہم دو اور دو کے مجموعہ کو پانچ ثابت کر دکھائیں تو یہ دنیائے ریاضی کا معجزہ کہلائے گا۔ اگر کوئی شخص بلندی سے پتھر گرائے اور پہلے سیکنڈ میں اس کی رفتار دس فٹ ہو اور دوسرے سیکنڈ میں ۲۵ اور تیسرے سیکنڈ میں ۵ تو یہ طبعیات کا معجزہ کہلائے گا۔ اگر ایک آدمی ہائیڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن کو ملا کر سونا تیار کرے تو یہ علم الکیمیا کا معجزہ ہوگا اور اگر کوئی حکومت چاندی کے سکّے کو سونے کا سکّہ بنا سکے تو فنانس کا معجزہ ہوگا۔ اسی طرح ایک چوکور کو مثلث بنانا، آئینہ کی پشت پر کھڑے ہونے والے کا عکس آئینہ میں دکھا دینا۔ آوازِ بازگزشت سے علاوہ اپنی آواز کے اور کوئی آواز پیدا کرنا، الغرض قدرت کے مقررہ قوانین کے خلاف کوئی بات کر دکھانا معجزہ کہلائے گا لیکن اس وقت جب فطرت کے قوانین اٹل سمجھے

جاتے ہیں اور تمام ذہنی ترقیوں کا انحصار اس پر ہے۔ کیا آپ میں اس کی ہمّت ہو سکتی ہے کہ ایسا دعویٰ کریں، اور کیا کوئی اس کا یقین کر سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو انسان ہی نے پیدا کیا اور بڑی حد تک اپنی ہی طرح انسان سمجھا۔ عہدِ وحشت کے انسان نے جو تصور خدا کا پیش کیا اس سے بھی وہی وحشت و درندگی پائی جاتی تھی اس کے بعد جب انسان نے کچھ ترقی کی تو خدا بھی ایک حد تک تراقی یافتہ ہو گیا۔ اس کی وحشت کم کر کے تھوڑا سا رحم بھی اس کے دل میں ڈال دیا گیا، جب انسانی ذہن و خیال میں زیادہ وسعت پیدا ہوئی تو خدا بھی منصف، زیادہ رحم کرنے والا اور زیادہ مقدّس ہو گیا۔ یہاں تک کہ مسیح تشریف لائے اور انہوں نے خدا کو سراپا رحم و محبت ظاہر کیا۔ لیکن زلزلے برابر آتے رہے، وبائیں بدستور پھیلتی رہیں، قحط برابر پڑتے رہے اور لاکھوں آدمی تڑپ کر جان دیتے رہے جس کی تاویل مذہب والوں نے یہ کی کہ یہ تباہیاں، یہ مصائب سب انسان ہی کی فلاح کے لئے ہیں۔ کیوں کہ لذتِ تنعم، عیش و راحت اخلاق خراب کر دیتے ہیں لیکن کیا یہ باتیں اس زمانے میں بھی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ ہم کو معلوم ہے کہ نہ نیکی کبھی بدی ہو سکتی ہے نہ بدی نیکی۔ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ تاریکی کسے کہتے ہیں اور روشنی کیا ہے؟ لیکن یہ کبھی نہیں مان سکتے کہ نیکی و بدی کی تعیین و تحدید خدا کی طرف سے ہوئی ہے۔ بلکہ ہم کو ہماری ضروریاتِ زندگی نے بتایا ہے کہ ہماری معاشرت کے تجربات نے سکھایا ہے اور آئندہ بھی اصولِ اخلاق میں جو تغیرات پیدا ہوں گے وہ ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہوں گے اور ہماری ضروریاتِ تمدن سے متعلق ہوں گے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ معتقداتِ مذہبی سے ہم کو کیا نقصان پہنچتا ہے اگر ہم دوزخ و جنّت، حور و قصور، جنّ و مَلک، معجزہ و خرقِ عادات وغیرہ پر عقیدہ رکھتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے، جب کہ ان عقائد کا مقصود بھی اصلاحِ اخلاق ہے بظاہر یہ بات قرینِ عقل معلوم ہوتی ہے، لیکن فی الحقیقت ان عقائد کے نقصانات حد درجہ مہلک ہیں!

یہ معتقدات چوں کہ یکسر روایات پر مبنی ہیں اور عقل و درایت کا ان سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے ان کو صحیح سمجھ لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن حقائق کی جستجو سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اسباب و نتائج کے رابطہ کو سمجھنے کی اہلیت ہم میں باقی نہیں رہتی۔ انسان کے تمام قواءِ ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں اور ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔

پھر اگر خدا کا تصور ہمیشہ زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے تو اب بھی اس کو بدلنا پڑے گا اور اگر مذہب انسان کے لئے ضروری ہے تو اس کے اصول بھی وہی مقرر کرنے ہوں گے جو ہمارے لئے مفید ہوں یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم قدرت کا مفہوم اس کے قوانین سے قطعِ نظر کر کے متعین کریں۔ اگر خدا ہے تو یقیناً وہ ان اصولوں کا پابند ہے جو اس نے وضع کئے ہیں اور اگر وہ ان اصولوں سے منحرف ہو سکتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم بھی اس سے منحرف ہو سکتے ہیں اور رشتۂ عبد و معبود کبھی استوار نہیں ہو سکتا۔

خدا کا وجود فی نفسہ نہ خلافِ عقل ہے نہ مضرت رَساں لیکن ہمارا نفع و ضرر اس کے تصوّر کی نوعیت سے ضرور متعلق ہو جاتا ہے اگر ہم خدا کو ایسی ایک قوت مان لیں جو کائنات کے نظامِ تخلیق وارتقاء میں کار فرما ہے تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم اس کا تصّور ایک دنیاوی بادشاہ کی طرح کریں کہ وہ کسی سے خوش ہو کر نہال کر دیتا ہے اور کسی پر غضب ناک ہو کر تباہ، تو بے شک یہ تصّور غلط، مضرت رساں اور مانعِ ترقی ہو گا!

ہر چند خدا کے اس جدید تصّور سے انبیاء و رسل، صحفِ مقدسہ، حیات بعد الموت، دوزخ و جنت، ملائکہ و شیاطین، حشر و نشر، عذاب و ثواب ختم ہو جائیں گے یا ان کی کوئی عقلی توجیہ و تاویل کرنا ہو گی۔ لیکن اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہم کو ان مروجہ عقائد اور خدا دونوں میں سے ایک کو لینا ہے اور غالباً یہ زیادہ آسان ہو گا کہ خدا کے مقابلہ میں ان معتقدات کو پس پشت ڈال دیا جائے اور بقائے مذہب کی ہلکی سی ہلکی جو صورت ہو سکتی ہے اس پر قناعت کی جائے۔

میں اس سے قبل بھی بارہا لکھ چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جب تک مذہب کا وجود باقی ہے دنیا کا امن و سکون خطرے میں ہے، یہ ہو نہیں سکتا کہ تمام کرۂ ارض پر ایک ہی مذہب کے ماننے والے پائے جائیں اور مذاہب کا اختلاف حقیقتاً دلوں کا اختلاف ہے جس سے جذبۂ منافرت پیدا ہونا ضروری ہے، یہ بالکل درست ہے کہ مذہب کے فنا ہونے کے بعد بھی جنگ و جدال یقیناً قائم رہے گی لیکن یہ اختلاف ہمارے قواءِ ذہن کو مضمحل کرنے والا ثابت نہ ہو گا بلکہ مدافعت و حفاظت کا جذبہ ہمیں زیادہ حرکت و عمل پر آمادہ کرے گا، اور ہو سکتا ہے کہ آخر کار تمام نوعِ انسان کسی ایک مرکز پر جمع ہو کر ان مادی اختلافات کو دور کر سکیں، لیکن مذہب کے ہوتے ہوئے اس کا کوئی امکان نہیں۔

بت پرستی و بت شکنی

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے بت پرستی کی شدید مخالفت کی اور جس کے علم برداروں نے اپنے آپ کو "بت شکن" کہلانے کے لئے نہ ہمالیہ کی بلندیوں کی پرواکی اور نہ بحرِ ہند کی گہرائیوں کی۔ وہ مورو ملخ کی تعداد میں فوجیں فراہم کرکے اٹھے، صرصر و سیل کی طرح نہ رکنے والا عزم لے کر آگے بڑھے اور برق و زلزلہ کی مانند ہر اس بت کدہ کو تباہ کرگئے، جو ان کے سامنے آیا۔ ان کا ہر قدم جو اس غرض سے اٹھتا تھا "جنت وعدن" سے قریب تر کردینے والا ہوتا تھا۔ اور تیشہ کی ہر وہ ضرب جو کسی بت پر پڑتی تو گویا قصرِ فردوس کی تعمیر کی مترادف تھی۔ وہ مذہب جس کی بنیاد ہی لات و ہبل کی مسماری پر قائم ہوئی ہو اس کے متبعین میں یہی جوش و خروش ہونا چاہیے تھا اور ہر سومناتھ کے لئے ان کے اندر ایک محمود کا پیدا ہو جانا ضروری تھا لیکن صبحِ صادق کی نورانی صباحت میں جب مندر کے کسی گھنٹہ کی آواز مرے کانوں میں پڑتی ہے تو میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ ایک "بت" کا تعلق انسان کے کن جذبات سے وابستہ ہے اور کیوں یہ اختلاف ہے کہ ایک طرف گرزِ گراں اٹھا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف "جنبد کلیدِ بت کدہ دردستِ برہمن۔"

یوں تو دنیا کا ہر پتھر جس کو ہم ٹھوکر لگا کر گزر جاتے ہیں، بت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے اندر ایک "ناتراشیدہ معبود" چھپائے ہوئے ہے لیکن نہ بت پرست اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور نہ "بت شکن" اس پر اپنا تیشہ صرف کرتا ہے۔ کیوں؟ آیئے آج کی صحبت میں اسی پر غور کریں۔ شاید تسبیح و زنّار کی گتھیوں کو اس طرح سلجھا سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق "مادہ" سے ہوئی ہے اور مادہ قدیم ہے ہمیں اس دعویٰ کے صدق و کذب پر اس وقت بحث کرنا مقصود نہیں۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ محض مادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اصل چیز جو اس کو باوقعت بناتی ہے وہ انسان کی

ذہانت ہے جو اس پر صرف ہوتی ہے۔ مٹی یوں کوئی قیمت نہیں رکھتی لیکن جس وقت اس سے کوئی برتن بنالیا جاتا ہے تو اس کی قیمت متعین ہو جاتی ہے۔ لوہا اپنی معدن کے اندر بے کار ہے لیکن جب انسان اسے باہر نکال کر دوسری شکلوں میں تبدیل کر لیتا ہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے سونا یوں کسی کام کی چیز نہیں لیکن چوں کہ ذہنِ انسانی نے اس کو معیاری قدر و قیمت کی چیز سمجھ لیا ہے اس لئے وہ گراں ہے۔ الغرض مادہ بذات خود کوئی چیز نہیں اور اگر انسان کی ذہانت خواہ وہ خالص عملی پہلو رکھتی ہو یا جذباتی، اس سے متعلق نہ ہو تو وہ بالکل بے کار شے ہے!

اب اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ایک "بت" کی حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہے؟ "بت" فی الاصل ایک پتھر کا ٹکڑا تھا۔ جب تک اس کو انسانی ذہانت نے ایک مخصوص شکل میں تبدیل نہ کیا تھا وہ ایک حقیر پارۂ سنگ تھا جس وقت تک انسان نے اپنے جذبات کو اس میں مشکّل نہ کیا تھا، لیکن ایک "بت تراش" کی چھینی اور ایک "برہمن" کے جذبۂ عقیدت سے مَس ہوتے ہی وہ اس قدر مقدّس ہو گیا کہ پیشانیاں اس کے سامنے جھکنے لگیں اس لئے اگر "بت شکنی" کا ہدف صرف وہ "پیکرِ سنگیں" قرار پائے جو مندروں میں رکھا ہوا نظر آتا ہے تو اس سے زیادہ کوتاہ نظری اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ پتھر کو بت بنا دینے والی حقیر و ذلیل پارۂ سنگ کو "معبود" کی حیثیت دینے والی ذہنیت اس سے بدل نہیں سکتی، اور وہ ہزار بت شکینوں کے بعد بھی بدستور قائم رہ سکتی ہے۔ ہاں اگر کسی مخصوص و متعین "بت" کو توڑنے کے بعد کوئی دوسرا بت اس کی جگہ نہ لے سکے تو بے شک "بت شکنی" مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن چوں کہ بت پرستی کا تعلق صرف انسان کی ذہنیت سے ہے اس لئے جب تک اس بت کدہ کو توڑ نہ اجائے جو انسان کے قلب و دماغ میں چھپا ہوا ہے، یہ مادی بربادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام دنیا کا تنہا وہ مذہب ہے جس نے بت شکنی میں خاص شہرت حاصل کی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود "لات و ہبل" کی صرف مورتیوں کو مسمار کر کے خاموش ہو جانا نہیں تھا بلکہ اس ذہنیت کو منہدم کرنا تھا جو انسان کے اندر غلامانہ تذلیل پیدا کرتی ہے اور اس لئے جب کسی بت کو توڑا تو اس کا فلسفہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ پرستش کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ اس مادی عالم سے جدا ایک اور چیز ہے جو خود انسان کے اندر ہی موجود ہے اور اس کا اصطلاحی نام "خدا" ہے۔

انسان جسمِ ظاہری کے لحاظ سے یقیناً فانی ہے لیکن اپنی معنویت کے لحاظ سے وہ قطعاً غیر فانی ہے۔ انفرادی حیثیت سے وہ چاہے کتنا ہی بے بود ہو لیکن کلی و اجتماعی حیثیت سے وہ لازوال مقصودِ آفرینش ہے اور یہی وہ حقیقت تھی جو بعض زبانوں سے "انا الحق" کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

بہر حال "بت پرستی" اگر انسان سے اس جذبۂ بلند کو محو کر دینے والی ہے تو یقیناً نہایت مضرت رساں چیز ہے اور اس کو یقیناً مٹ جانا چاہیئے لیکن سوال یہی ہے کہ کیا اس وقت بھی نزاعِ کفر و دین کو جاری رہنا چاہیئے اور ایک کے جذبۂ بت شکنی کو دوسرے کے جذبۂ بت پرستی سے متصادم ہونا چاہیئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب تمام دنیا سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑھ گئی اور عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہ عقولِ انسانی کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مذہب کا وہ ارتقائی مفہوم ہمارے سامنے آیا ہے جس پر تمام نوعِ انسانی متفق ہو سکتی ہے، اور یہی وہ دورِ عقل و فراست ہے جس نے حقیقی مذہب کے چہرے کو بے نقاب کر کے اس کے دل کش خط و خال نمایاں کر دیئے ہیں۔ مذہب ضرورتِ انسانی کی پیداوار تھی، اور ہماری ضرورتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی چلنا چاہیئے۔ اول اول جب انسان کی "اجتماعی حیثیت" محدود طبقوں اور مخصوص قوموں کے لحاظ سے بہت تنگ تھی تو مذہب کا نقطۂ نظر بھی بہت تنگ تھا اور ہونا چاہیئے تھا لیکن اب کے نظامِ تمدّن نے وسیع ہو کر شرق و غرب کے امتیاز کو مٹا دیا ہے اور انسان صحیح معنی میں "خلیفۃ اللہ فی ارض" بن کر سارے کرۂ ارض پر چھا گیا ہے۔ مذہب کو بھی وسیع ہونا چاہیئے اس کے مقصود کو بھی بدلنا چاہیئے اور اس کے اصول میں بھی وسعت پیدا ہونا چاہیئے تاکہ امتیازِ نسل و رنگ اور اختلافِ مسجد و کلیسا سے بلند ہو کر تمام نوعِ انسانی کو ایک ہی مرکز پر لایا جا سکے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مذہب کو صرف مابعد الطبیعات تک محدود رکھا جائے۔ جزا و سزا کا معیار، بہشت و دوزخ یا حور و قصور کی سطح سے بہت بلند ہو گیا ہے اور اب خدا نام کسی ایسی قہار و جبّار ہستی کا نہیں رہا جو کسی خود مختار فرماں روا کی طرح دنیا میں صرف غلامی کو رواج دینا چاہتا ہے۔ مذہب کا دورِ استبداد (Autocracy) ختم ہو گیا اور اگر وہ اپنے آپ کو قائم رکھنا چاہتا ہے تو اس کو بھی زمانہ کا ساتھ دینا پڑے گا جو اس وقت صرف عالم گیر سکون و آزادی چاہتا ہے۔

وہ دور جب انسان نے خدا کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے گزر گیا ہے آج جو خدا عیسائیوں کا ہے وہی ہندوؤں کا ہے۔ جو ہندوؤں کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے جس طرح وہ مسجد کی اذانوں میں چھپا ہوا ہے اسی طرح وہ ناقوس میں پوشیدہ ہے۔ اس کا سورج سب پر یکساں چمکتا ہے۔ اس کے الطاف سب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اس کی محبت ہر ہر فرد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے حسن نے کائنات کی ہر ہر چیز کو محصور کر رکھا ہے اس کے نغموں نے ہر ہر شے کو مبہوت کر رکھا ہے وہ ذرہ ذرہ کے اندر سمایا ہوا ہے وہ کائنات کی نبض میں گرم خون کی طرح دوڑ رہا ہے عالم کون کے سینہ میں قلب بنا ہوا دھڑک رہا ہے وہ گویا ایک ”مرکز المرکز“ ہے جہاں پہنچ کر ماضی حال و مستقبل سب ایک ہو جاتے ہیں۔

آج کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کا مفہوم کوئی علٰیحدہ قرار دے اس کا کوئی جداگانہ تصور پیدا کر کے اپنے لئے مخصوص کر لے۔ مذاہبِ قدیمہ نے عرصہ تک خدا کو اپنا غلام بنا رکھا تھا لیکن اب وہ اس شکنجہ سے آزاد ہو گیا ہے اور اپنا معبد اس نے عقلِ انسانی کی اس غیر محدود فضا میں تعمیر کیا ہے جہاں وحوش و طیور، انس و جن، سیاہ و سفید، جاہل و عالم، شاہ و گدا، سب ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور نوعِ انسانی اپنی تفریق کو محو کر چکی ہے۔

آج کوئی قوم ایسی نہیں جو برگزیدگی کو صرف اپنے لئے مخصوص کر سکے۔ کوئی جماعت اس کی مستحق نہیں کہ وہ سوا اپنے باقی سب کو گمراہ قرار دے۔ اگر انسان کی قسمت میں نجات لکھی ہے تو وہ اسی دنیا میں حاصل ہو گی اور نوعِ انسانی کا ہر ہر فرد اس میں برابر کا شریک ہو گا، یہ ممکن نہیں کہ ایک انعامِ خداوندی کا مستحق قرار دیا جائے اور دوسرا آلام و مصائب کا شکار بنا رہے۔ اگر معصیت کی بناء پر انسان کو دوزخ میں جانا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کے میں جاؤں اور آپ بچ جائیں۔ اب تو یہاں دوزخ ہی رہے گی یا فردوس، اور بلا تفریق سب کو اسی ایک سے واسطہ پڑنا ہے۔ یہ دور ہے اشتراکیت کا، اجتماعیت کا جب ہر چیز ایک کلی اور عمومی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے اور خدا کی (Univesality) حیاتِ انسانی کے ہر ہر پہلو کو کائناتی بنا دینا چاہتی ہے۔ ہمارا خدا، ہمارا معبد، ہمارا مذہب، ہماری عبادت، ہماری روحانیت سب کو ”کائناتی“ رنگ اختیار کرنا ہے اور یہی وہ حقیقی مقصودِ آفرینش تھا جس کی تکمیل کا زمانہ اب آ رہا ہے۔

خدا اب مسجدوں، مندروں، اور کلیساؤں کے اندر مقید نہیں رہنا چاہتا اس کا مطالبہ

اب یہ ہے کہ فطرت کی وسعت میں اس کو تلاش کیا جائے اور دل کے اندر اس کا استھان بنایا جائے۔ وہ اب انسان کے بنائے ہوئے معبودوں میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس معبد میں جو خود اسی کا بنایا ہوا ہے جہاں بلا تفریق و امتیاز سب کے سر جھک جاتے ہیں اور وہ معبد انسان کا قلب و دماغ ہے۔

مسجد و کلیسا کی تفریق کا وقت گزر گیا۔ زنار و تسبیح کے امتیاز کا زمانہ ختم ہو گیا جن کو ہم بت سمجھ کر پوجتے تھے وہ از خود سرنگوں ہوتے جا رہے ہیں جن کی پرستش ہم خدا سمجھ کر کرتے تھے وہ خود ہم سے بے زار ہیں اس لئے ہم کو بت پرستوں کی جستجو اجودھیا اور کاشی سے باہر کسی اور جگہ کرنا چاہئے اور پرستاران خدا کی تلاش حطیمِ کعبہ سے باہر کہیں اور۔

دنیا میں بت پرستی اب بھی قائم ہے لیکن مورتیوں کی صورت میں نہیں۔ بت شکنی اب بھی ضروری ہے لیکن تیشۂ آہنی سے نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بت کہاں اور کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بت ہر جگہ موجود ہیں اور مختلف شکلوں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ بت تم کو خانقاہوں میں زرکار مسندوں پر بیٹھے نظر آئیں گے۔ تعلیمی اداروں میں قرآن و حدیث کا درس دیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سیاسی جلسوں میں صدارتی تقریریں کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ان کی صورتیں نورانی ہوں گی لیکن دل سیاہ، ان کی زبانوں پر خدا اور رسول کا نام ہو گا لیکن صرف نمود و نمائش کے لئے ان کی تقریروں سے ملک و قوم کی محبت ٹپکتی ہو گی لیکن ان کا مقصود صرف اپنی ذات ہو گی۔ ان کی پیشانیوں پر سجدہ کا نشان، ان کی وامن دار طویل قبائیں، ان کی عریض و طویل داڑھیاں، ان کی ہر وقت گردش کرنے والی خاکِ شفا کی سمرنیں۔ ان کی وہ خصوصیات ہیں جن سے تم ان بتوں کو ہمیشہ آسانی سے پہچان سکتے ہو۔ یہ خود کبھی سلام میں تقدیم نہیں کریں گے۔ کوئی دوسرا سلام کرے گا تو جواب میں کبھی سر نہ جھکائیں گے جب یہ کسی طرف سے گزریں گے تو ان کی ذُریات کا ایک ہجوم ان کے ساتھ ہو گا اور جب خانقاہوں کے اندر شہ نشینوں پر ان کو بیٹھا دیکھو گے تو یہ معلوم ہو گا کہ "خداوند لقا" اپنے بندوں کو دیدار سے مشرف کر رہا ہے۔

جس وقت یہ قرآن کا درس دے رہے ہوں گے تو سوائے نحوی و صرفی نکات کے کوئی اور موضوع ان کے سامنے نہ ہو گا۔ جب حدیث پڑھا رہے ہوں گے تو اسماءِ رجال کی تحقیق ان کا انتہائی کارنامہ ہو گا۔ جب یہ منبر پر وعظ فرما رہے ہوں گے تو سوا خدا کے قہر و غضب اور

جہنم کے ہول ناک مناظر کے وہ کچھ نہ بیان کریں گے۔ سیرتِ اکابر پر اظہارِ خیال فرمائیں گے تو سوا ان باتوں کے جو حماقتوں سے پُر ہیں کوئی لفظ ان کے منہ سے نہ نکلے گا۔ فرشتوں کی باتیں، جنّات کے فسانے، معجزہ و کرامت کے واقعات اور اسی طرح کے دیگر مزخرفات ان کے مواعظ کی جان ہیں۔ اخلاق کا درس بھولے سے کبھی دیں گے بھی تو وہ بہشت کی طمع، جہنم کے خوف سے خالی نہ ہو گا اور ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئے گی کہ نیکی کرنا ہر انسان کا فطری فرض ہے اور اسے خیال مزد و تعزیر سے بہت بلند ہونا چاہئے۔

یہ اگر رواداری و ہم دردی کا درس دے رہے ہوں گے تو یقین رکھو کہ ضرور کسی نہ کسی کا حق غضب کر کے آئے ہیں۔ یہ اگر اہل و عیال کے ساتھ محبت و رأفت کا وعظ فرما رہے ہوں گے تو باور کرو کہ ابھی ابھی اپنی بیوی کو ٹھوکروں سے مار کر باہر نکلے ہیں لوگوں کو سچ بولنے کی ہدایت کرتے ہیں تا کہ جھوٹ بولنے کا حق ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو۔ عجز و انکسار کی خوبیاں بیان کرتے ہیں تا کہ لوگ آ کر ان کے قدموں کو بوسہ دیں۔

الغرض یہ ہیں وہ بت جن کو اس وقت توڑنے کی ضرورت ہے اور یہ ہیں آج کل کے وہ "لات و ہبل" جن کو مسمار کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

قرآن کے کلامِ خدا ہونے کا صحیح مفہوم

میں آج کی صحبت میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کو اس مفہوم میں خدا کا کلام کہنا جو عام طور پر قرار دیا جاتا ہے نہ صرف یہ کے خود قرآن کے منشاء کے خلاف ہے بلکہ اس صحیح تصوّرِ وحدانیت کے بھی منافی ہے جس کی تعلیم رسول اللہ نے پیش کی ہے میں اس بحث میں نہ احادیث و تفاسیر سے استناد کروں گا نہ اقوالِ سلف سے کیوں کہ یہ سب جھگڑے کی چیزیں ہیں بلکہ خود کلام پاک کی آیات سے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کیا قرآن واقعی خدا کا کلام ہے اور اگر ہے تو کس مفہوم میں؟

ا۔چوں کہ قرآن کے متعلق اہل مذہب کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ سے پہنچایا گیا تھا اس لئے نامناسب نہ ہو گا اگر سب سے پہلے وحی کی حقیقت معلوم کر لی جائے۔

وحی کے لغوی معنی ''اشارۂ سریع'' یا''الہام بالسرعۃ'' کے ہیں، اردو میں اس کا صحیح مفہوم''برمحل سوجھ بوجھ'' کے فقرے سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فطری ودیعت ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی خدا کی عنایت ہے اور نتیجہ ہے اس ذہنی قوت کا جو فطرتاً انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور چوں کہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی ہے اور ان کا ہر قول و فعل صرف نوعِ انسان کی خدمت کے لئے ہوتا تھا اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ اسی اشارۂ خداوندی کے تحت ہوتا تھا۔وحی کا مفہوم جو میں نے معین کیا ہے وہ میری ذاتی رائے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود قرآن پاک سے ظاہر ہوتا ہے۔

سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی گئی ہے یہ ہے کہ وحی کو انبیاء ورسل کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا، حالاں کہ حقیقت یہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء ورسل کے پاس وحی بھیجے جانے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے لیکن غیرِ انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے۔سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:

وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ أُمِّ مُوسَىٰٓ أَنْ أَرْضِعِيهِ

"ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلایئں"

ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیہ نہ تھیں اور اس لئے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اسی طرح وحی کے معنی وہ نہ رہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کے علاوہ حیوانات پر بھی وحی بھیجی ہے۔ سورۂ نحل کی آیت ہے:

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى ٱلنَّحْلِ أَنِ ٱتَّخِذِى مِنَ ٱلْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ ٱلشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ﴿٦٨﴾

"ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں اور درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتا بنائے"

اس جگہ وحی کے معنی اس فطرتِ ذکاوت کے ہوئے جس سے کام لے کر شہد کی مکھی اپنا خوبصورت چھتا تیار کرتی ہے۔ جمادات پر وحی نازل ہونے کا ثبوت سورۂ زلزال کی اس آیت سے ملتا ہے:

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ﴿٤﴾ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ﴿٥﴾

"اس دن زمین اپنی خبریں اس طرح بیان کرنے لگے گی جیسے خدا نے اس پر وحی نازل کی ہو"

ظاہر ہے زمین زبان نہیں رکھتی اس لئے اس کا یہ بیان بہ زبانِ حال ہوگا اور اس جگہ وحی کا مفہوم "ماحول و اقتضاءِ ماحول" قرار پایا۔

کلام مجید میں ایک جگہ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے سورۂ حمٓ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَقَضَىٰهُنَّ سَبْعَ سَمَـٰوَاتٍ فِى يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِى كُلِّ سَمَآءٍ أَمْرَهَا

"پس ہم نے دو دن میں سات آسمانوں کی تخلیق کا حکم دے دیا اور ہر آسمان میں اس کے نظم و اصول کو وحی کر دیا"

اس جگہ وحی کے معنی ودیعت کرنے کے ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلّق بڑی حد تک اس فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے جو خدا نے ایک انسان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے لیکن آپ سن کر تعجب کریں گے کہ الہام و وحی کا استعمال بری باتوں کے لئے بھی کیا گیا ہے۔ سورۂ شمس میں نفسِ ایمانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَىٰهَا ﴿٨﴾

یعنی اس میں برائی بھلائی الہام کی ---- یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت و عدم صلاحیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

لفظ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بری باتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ انعام کی یہ آیت:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَٰطِينَ ٱلْإِنسِ وَٱلْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ ٱلْقَوْلِ غُرُورًا

"اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن اس کے ساتھ لگا دیئے۔ یہ وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں۔"

اس جگہ وحی کے معنی "بری بات سمجھانے" کے ہوئے۔ یہاں تک تو لفظ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی جو مختلف جگہ پر مختلف مفہوم میں مستعمل ہوا ہے اب خود قرآن پاک سے جو تعلّق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے: سورۂ نجم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ﴿٣﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴿٤﴾ عَلَّمَهُۥ شَدِيدُ ٱلْقُوَىٰ ﴿٥﴾

رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا، بلکہ وہ سب کچھ وحی ہے اور ایک بڑی قوت والے نے اسے سکھایا ہے

سورۂ انعام میں رسول اللہ کی زبان سے یہ الفاظ کہے جاتے ہیں:

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانُ لِأُنذِرَكُم بِهِۦ

مجھ پر قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تمہیں بری باتوں کی طرف سے ڈراؤں

سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن کو حکمت کی کتاب بتایا جاتا ہے:

ذَٰلِكَ مِمَّآ أَوْحَىٰٓ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ ٱلْحِكْمَةِ

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

قُل لَّآ أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَآئِنُ ٱللَّهِ وَلَآ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ وَلَآ أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ

(اے رسول کہہ دو کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کا حال جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ فرشتہ ہوں، میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے وحی کیا جاتا ہے)

ان آیات سے قرآن کو وحی بتایا گیا ہے لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں۔

خدا کسی سے ہم کلام نہیں ہو سکتا نہ کوئی انسان اس سے ہم کلام ہو سکتا ہے اور عبد و معبود کی اس باہمی گفتگو کی صورت کوئی اگر ہو سکتی ہے تو صرف وحی کے ذریعہ سے چناں چہ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ ٱللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَآئِ حِجَابٍ

اس آیت سے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ موسیٰ خدا سے باتیں کرتے تھے۔ مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیوں پیدا ہوا کہ قرآن کے تمام الفاظ خدا کے الفاظ اور فرشتہ ان الفاظ کو رسول اللہ کے پاس لایا کرتا تھا اس کے متعلق ہم آئندہ بیان کریں گے لیکن ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی طرف سے جو آیتیں کلام پاک کی پیش کی جاتی ہیں پہلے انہیں سن لیجئے، سورۂ زخرف کی آیت ہے:

إِنَّا جَعَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٣﴾ وَإِنَّهُۥ فِىٓ أُمِّ ٱلْكِتَٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِىٌّ حَكِيمٌ ﴿٤﴾

اس آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اس امّ الکتاب کا ایک حصّہ ہے جو ہمارے پاس موجود ہے یہ امّ الکتاب ہے کیا؟ اس کی صراحت میں وہ کلام مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

بَلْ هُوَ قُرْءَانٌ مَّجِيدٌ ﴿٢١﴾ فِى لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ﴿٢٢﴾

یعنی قرآن ایک تختی میں محفوظ ہے۔

ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن امّ الکتاب کا ایک حصّہ ہے جس کا دوسرا نام لوح بھی ہے لیکن جس وقت ہم سورۂ رعد کی حسب ذیل آیت پڑھتے ہیں تو ہم کو "لوح و امّ الکتاب" دونوں کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

وَ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ عَلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ مِنْهُ ءَايَٰتٌ مُّحْكَمَٰتٌ هُنَّ أُمُّ ٱلْكِتَٰبِ وَأُخَرُ مُتَشَٰبِهَٰتٌ

اس آیت میں "امّ الکتاب" کو آیاتِ محکمات سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی مضبوط و مستحکم نشانیاں یا بالفاظِ دیگر وہ قوانینِ فطرت جو اٹل ہیں اور جن میں تبدیلی ممکن نہیں اور یہی مفہوم لوح یا تختی کا بھی قرار پایا۔

۲۔ اب عام روایات کی بناء پر اس عقیدہ کو بھی ملاحظہ فرمایئے جو قرآن کے امّ الکتاب اور لوحِ محفوظ میں مرسوم ہونے کے متعلق عام مسلمانوں میں رواج پایا گیا ہے۔

قصص الانبیاء کی روایت ملاحظہ ہو:

"عرش عظیم سے نیچے اس نے ایک دانہ مرواریدپیدا کیا اور اس موتی سے اس نے لوح محفوظ بنائی۔ اس لوح کا طول ۷۰۰ سال کی راہ اور عرض ۳۰۰ برس کی راہ[16] تھا۔ اس کے حاشیہ پر خدا نے اپنی قدرت سے لعل و یاقوت کی گل کاری کی تھی بعد ازاں قلم کو حکم ہوا کہ لکھ اے قلم! میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تا قیامت ہوگا اس کے متعلق میرے علم کا حال۔

قلم نے لوحِ محفوظ پر "بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ" لکھا اور پھر تمام مخلوقات کی نسبت قیامت تک کا حال لکھا، یہاں تک کہ درخت کا پتہ ملنے، گرنے یا اوپر اڑنے تک کا حال درج کیا۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوحِ محفوظ ایک مادی تختی تھی جو موتی سے بنائی گئی تھی اور جس پر خوش نویسوں کی رسم کے مطابق چاروں طرف حاشیہ میں گل کاری بھی کی گئی تھی۔ اس لغویت کے ساتھ ہی اس بیان سے یہ عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم کی تخلیق سے قبل ہی قرآن لوحِ محفوظ میں درج ہو گیا تھا لیکن اس خیالِ کی تکذیب خود قرآن پاک کے بیانات سے بھی ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں زبور، توریت وانجیل وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے پہلے ہی لوحِ محفوظ میں درج ہو گئی ہوں گی، ورنہ ایسی چیز کا ذکر جو وجود میں نہ آئی ہو کوئی معنٰی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ لوح کے عقیدہ کا خیال بہت قدیم ہے۔ اہلِ بابل کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کی قسمت کا حال ایک لوح پر لکھا ہوا محفوظ ہے۔یہی خیال توریت میں منتقل ہوا جیسا کہ کتابِ استثناء، باب ۱۰، آیت ۱، لغایتہ ۵ سے ظاہر ہوتا ہے اس میں لکھا ہے کہ جب موسیٰ نے خدا کے حکم سے ویسی دو تختیاں پتھر تراش کر بنائیں جیسی اس نے توڑ دی تھیں تو خدا نے ان پر احکامِ عشرہ تحریر فرمائے اور موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ وہ ان تختیوں کو ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے۔ ----- اور پھر یہی خیال یہود سے مسلمانوں میں منتقل ہوا۔ چناں چہ عبرانی زبان میں جو لفظ تختی کے لئے استعمال ہوا ہے وہی عربی میں پایا جاتا ہے۔

چوں کہ رسول اللہ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے توریت و انجیل لوحِ محفوظ میں منقوش خدا کے پاس موجود ہیں اور اس عقیدہ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے اس لئے مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر قرآن، توریت و انجیل کی طرح خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے تو اسے بھی لوحِ محفوظ میں درج ہونا چاہئے اور اس باب میں متعدد حدیثیں گھڑ لی گئیں۔

16 - معلوم نہیں راہ کس کی مراد ہے؟ انسان کی، طیور کی یا حشرات کی۔ اور اگر موٹر یا ہوائی جہاز کی رفتار کو سامنے رکھا جائے تو یہ راہ کتنے دن کی قرار پائے گی؟

۳۔ یہاں تک میں نے روایتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر واضح کر دیا ہے کہ قرآن کا وحی ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور اس کو لوحِ محفوظ میں درج سمجھنا ایک مستعار عقیدہ ہے جو قدیم بابلیوں اور یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے اب روایتی حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے حد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے، جس سے ایک طرف خدا کے تصوّرِ وحدانیت کو صدمہ پہنچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔

اگر ہم الفاظِ قرآن کو بھی الہامی اور منطوقِ خداوندی کہیں گے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا کی صفتِ نطق مادّی اسباب کی محتاج ہو گی اور یہ اسلام کے تصوّر وحدانیت کے منافی ہے۔ گفتگو، نطق، الفاظ ان سب کے تخیل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ ان تمام آلاتِ نطق یا عضلات و اعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صورت کے لئے ضروری ہیں اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ خدا ایسے الفاظ بغیر کسی مادی اسباب یا ذرائع کے پیدا کر سکتا ہے تو ایسا فرض کرنے کی نہ کوئی دلیل موجود ہے نہ اس کی ضرورت۔

خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا پھرتا، بولتا چالتا فرض کیا جائے اور رسول کی برتریٔ اخلاق کے ثبوت کے لئے بھی ضروری نہیں کہ خدا اس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کر کے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے اس کے پاس بھیج دے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ ہو۔

رسول کو محض ایک ایسے پیغمبر کی حیثیت دینا جو خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو ایک ڈاکیہ کی حیثیت دے دینا ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو عام انسانی سطح سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔

ہم رسول کو مصلحِ قوم کہتے ہیں لیکن کیا وہ شخص صحیح معنی میں مصلح ہو سکتا ہے جو وقت و زمانہ کے لحاظ سے خود کوئی حکم لگانے یا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو، جو خود قوانینِ اصلاح وضع نہ کر سکتا ہو اور جسے اپنی ذاتی عقل و رائے سے کام لینے کا مجاز نہ ہو، فوج کے ایک جرنل کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف مرکز کے احکام کی تعمیل کرے اور خود اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر فوج کو نہ لڑائے ان کا اولین فرض یہ ہے کہ وقت و موقع کے لحاظ سے خود مناسب احکام صادر کرے کیوں کہ وہ جنگ کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے۔

اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بتایا ہوا ہے تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے؟

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور اگر خدا کوئی کلام کر سکتا ہے تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہیے لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوتِ اختراع کیا ثابت ہوتی ہے؟

الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوحِ محفوظ میں اس کا مرتسم ہونا یقین کرنا صحیح اسلامی خیال نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے۔ قرآن میں جہاں جہاں کلام اللہ اور کلمات اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد خدا کے احکام ہیں۔ رسول نے صرف الفاظ پیش کر کے ان کی پوجا نہیں کرائی بلکہ احکام پیش کر کے ان کی تعمیل چاہی ہے۔

یہ ہے میرا عقیدہ قرآنِ پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضاء یہی ہے کہ قرآن کو انہی کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے جو اس سے قبل کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔

اگر قرآن کو خدا کا کلام سمجھا جائے جو عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے تو اس سے بہت سے شبہات وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے، دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیوں کہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا۔ حالاں کہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو "شئے مخلوق" ماننا پڑے گا لیکن "شئے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ" اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے، اور اس لئے خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔

(۲) اگر قرآن شریف نام ہے ان الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلامِ خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا۔

(۳) اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو اس کو خدا کی عینِ ذات تصور کیا جائے، یا صفاتِ خداوندی میں شامل کیا جائے۔ قرآن کو خدا کی عینِ ذات نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن خدا ہے اور خدا

قرآن ہے۔ اس لئے لامحالہ اسے "صفتِ ربّانی" ماننا پڑے گا لیکن چوں کہ خدا کی ہر صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے اس لئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطقِ خداوندی" ہے جو جبرئیل کے ذریعہ سے آں حضرت تک پہنچایا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا جس طرح خدا نے کیا تھا، بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا ہے اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

(۵) قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے اس لئے وہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے اس قرآن سے بہ لحاظِ ترتیب مختلف ہے جو لوحِ محفوظ میں پایا جاتا ہے اس کے معنٰی یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پزیر چیز حادث ہے حالاں کہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہیئے۔

(٦) کہا جاتا ہے کہ قرآن نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں رسالت مآبؐ پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں "شانِ نزول" کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا، وہ آیت بھی موجود نہ تھی اس لئے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے ہی تمام آیات لوحِ محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔

(۷) اگر قرآن مجید پہلے سے لوحِ محفوظ میں موجود تھا تو پھر ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظ قُل سے شروع ہوتی ہیں، یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" در آں حالِ کہ اس وقت رسول اللہ کی ذات دنیا میں موجود نہ تھی اسی طرح ان دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے۔ کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کر لی گئیں تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی؟

(۸) اگر قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو پھر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے یہ معنٰی ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنٰی سی بات ہے۔ سورۂ فاتحہ میں الحمدللہ سے لے کر مالك یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعتاً ایّاك نعبد سے اندازِ تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جارہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔ اگر سورۂ فاتحہ پہلے سے لوحِ محفوظ میں منقوش ہوتی تو اس کا اندازِ تخاطب یہ نہ ہوتا۔

(۹) قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلّق بالکل عہدِ نبوی سے ہے۔ مثلاً ابو لہب یا کفّارِ مکہ اور ان کے اصنام وغیرہ، پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلقِ عالم کے وقت لوحِ محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بصورت مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشن گوئی کی گئی ہے۔ در آں حالِ کہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

(۱۰) خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں لیکن اس کی سماعت و بصارت کان اور آنکھ کی محتاج نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کی صفتِ نطق کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو جو الفاظ کا محتاج ہے جس طرح اس کو سننے اور دیکھنے کے لئے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں، اسی طرح کلام کے لئے زبان یا الفاظ سے اسے بے نیاز ہونا چاہئے اور اس صورت میں الفاظِ قرآنی کو "خدا کا کلام" کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے۔

یہ ہیں چند من جملہ اور شبہات کے جن کی بناء پر میں قرآن پاک کو "منطوق خداوندی" سمجھنے سے مجبور ہوں، لیکن اگر ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ کلامِ خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ و حروف نہیں ہیں بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ خدا نے علی وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہ پر نازل کئے جنہیں آپ نے اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔

روح وبقاءِ روح

علمی و اسلامی نقطۂ نظر سے

مذہبی و علمی دنیا کے درمیان یوں تو بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن ان تمام اختلافات کی بنیاد مذہب کے صرف مابعد الطبیعی عقائد ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیئے کہ اگر اہلِ مذہب بقائے روح و حیاتِ بعد الموت سے انکار کر دیں یا اہلِ علم اس کے قائل ہو جائیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

مذہب والے کہتے ہیں کہ موت زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ ابتدا ہے۔ دوسری زندگی کی، یعنی جس طرح اس عالم آب و گل میں ایک انسان اپنی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی اس کا تشخص باقی رہے گا کیوں کہ روح غیر فانی ہے اور اسی کے ماننے یا نہ ماننے کا نام مذہب و لا مذہبیت ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ بقاءِ روح یا حیات بعد الموت کا عقیدہ دنیا کے مذہبی دور کی پیداوار ہے یا اس سے پہلے کی اور اس کا جواب تاریخ انسانی کے مطالعہ کے بعد ہم کو یہ ملتا ہے کہ مذاہب الہامی کے ظہور سے بہت پہلے جب انسان جہل و تاریکی کے دور سے گزر رہا تھا یہ عقیدہ پایا جاتا تھا اور مذاہب عالم نے اس میں کوئی تبدیلی ایسی نہیں کی جو الہامِ خداوندی کے بغیر ناممکن ہوتی یا جس کے ثبوت میں کسی ربانی دلیل کی ضرورت لاحق ہو، اس لئے اگر لامذہب جماعت اس عقیدہ کی مخالف ہے تو دراصل یہ مخالفت مذہب کی نہیں بلکہ انسان کے تاریک دور کے ایک خیال کی مخالفت ہے اور اگر اہلِ مذاہب یہ کہنے کے لئے تیار نہیں کہ عہدِ قدیم کے انسان کا یہ عقیدہ بھی الہامی تھا تو پھر عہدِ تاریک کے اس عقیدہ کو بدستور قائم رکھنے کی ذمّہ داری اہلِ مذاہب ہی پر عائد ہوتی ہے اور وہی اس کے جوابدہ ہیں۔

ابتداءِ آفرینش میں انسان کا علم و تجربہ دونوں بہت محدود تھے، وہ کائنات کے ہر طبعی حادثہ کو دیکھ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا اور اپنی کوتاہ عقل کے مطابق اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ دنیا کے حوادث میں سب سے پہلا اور اہم حادثہ جس سے اس کو دوچار ہونا پڑا غالباً اس کی اولاد یا دوسرے عزیزوں کی موت کا رہا ہوگا۔ اول اول اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہوگا

کہ جیتا جاگتا چلتا پھرتا انسان کیوں اور کہاں چلا گیا۔ لیکن جب اس کے واہمہ نے خواب میں پھر اس کو زندہ دکھایا ہوگا تو اس نے خیال کیا ہوگا کہ آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی وہ زندہ ہے اور یہیں سے نہ صرف بقاءِ روح بلکہ حیات بعد الموت کے عقیدہ کی ابتدا ہوئی ہے جو اس وقت بھی مذاہبِ عالم میں اصل بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عقیدہ کا دوسرے الفاظ میں یہ مفہوم قرار پاتا ہے کہ روح زندگی سے مختلف چیز ہے اور وہ زندگی ختم ہونے کے بعد بھی پائی جاتی ہے، حالاں کہ علمی تحقیق سے زندگی کی جو حقیقت دریافت ہوئی ہے وہ اس خیال کی تردید کرتی ہے۔

تمام اونچے درجے کی حیوانی زندگی صرف ایک خلیہ (Cell) سے شروع ہوتی ہے یہ خلیہ دوسرے خلیہ سے ملتا ہے اور پھر ان سے اور بہت سے خلایا پیدا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک خاص صورت کا حیوان شکل پذیر ہو جاتا ہے اور اس کی تمام حیوانی زندگی کے دوران کروڑوں بلکہ اربوں خلایا اس کے جسم میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں یہاں تک کہ بیماری یا کہولت یا کسی حادثے کی وجہ سے یہ خلایا بے کار ہو جاتے ہیں اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خلایا میں روح ہوتی ہے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کیوں کہ جس وقت استقرارِ حمل ہوتا ہے تو ماں کی طرف سے کم از کم دس ہزار خلایا اور باپ کی طرف سے اربوں خلایا کام کرنے کے لئے حرکت میں آجاتے ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک یا دو خلایا انسانی زندگی کا باعث ہوتے ہیں اور باقی سب ضایع ہو جاتے ہیں اس لئے اگر خلایا اور جراثیم میں بھی روح کا وجود تسلیم کیا جائے گا تو کائنات میں روحوں کی تعداد غیر محدود تسلیم کرنا پڑے گی، علاوہ اس کے اگر روح کو حیات سے علٰحدہ کوئی چیز دوسری مانیں گے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ انسان میں وہ روح کب، کیوں کر اور کہاں سے داخل ہوئی اور جسم سے جدا ہونے کے بعد وہ کہاں چلی جاتی ہے۔

اس سے پہلے جب علمِ طب نے زیادہ ترقی نہ کی تھی تو ایک مردہ بچہ پیدا ہونے پر اسے دفن کر دیا جاتا تھا اور اس طرح ڈوبنے کے بعد جب انسان بے جان ہو جاتا تو اسے بھی سپرد خاک کر دیتے تھے لیکن اب بعض صورتوں میں بجلی یا دوسرے ذرائع سے آن کے ساکن قلب میں حرکت پیدا کر دی جاتی ہے اور زندگی عود کر آتی ہے اگر ہم روح کے وجود کو زندگی سے علٰحدہ تسلیم کرلیں گے تو ان صورتوں میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ مردہ روح کیا کہیں قریب ہی منڈلا رہی تھی جو ان کے جسموں میں داخل ہوگئی اور اگر ایسا ممکن تھا تو پھر وہ بغیر طبی ذرائع اختیار کیے ہوئے از خود کیوں نہ آگئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم جس چیز کو زندگی سے

تعبیر کرتے ہیں وہ ہی دراصل روح ہے تو پھر حشرات و نبات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ زندگی سے وہ بھی خالی نہیں ہیں۔ حالاں کہ اہلِ مذاہب سوا انسان کے کسی اور جاندار میں روح کا وجود تسلیم نہیں کرتے۔

بہر حال اہلِ مذاہب کا یہ عقیدہ کہ روح زندگی یا حیات سے علیٰحدہ کوئی ایسی چیز ہے جو فنا نہیں ہوتی، اہلِ علم کے نزدیک قابلِ تسلیم نہیں اور اس اعتراف و انکار کے سلسلہ میں مذہب کی طرف سے کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جاتی ہے اور اہلِ علم انکار کے بہت سے دلائل اپنے پاس رکھتے ہیں مثلاً:

(۱) اگر روح غیر فانی ہے تو اس کی معنی یہ ہیں کہ قدیم ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی کیوں کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک چیز کی انتہا نہ ہو لیکن ابتدا ہو۔ وجود کا ایک سرا اگر لا محدود ہے تو دوسرا بھی یقیناً لا محدود ہو گا اس لئے روح کو غیر فانی کہنا گویا اسے واجب الوجود تسلیم کرنا ہے حالاں کہ یہ صفت صرف خدا کو حاصل ہے جس میں کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں۔

(۲) اگر روح حیات سے علیٰحدہ کوئی چیز ہے تو پھر یہ امر غور طلب ہے کہ وہ کس وقت جسمِ انسانی میں داخل ہوتی ہے، آیا اسی وقت جب نطفہ رحمِ مادر میں قرار پاتا ہے یا اس کے بعد کسی اور زمانہ میں۔ اگر استقرارِ حمل کے وقت ہی کو آمدِ روح کا اولین لمحہ قرار دیا جائے تو چوں کہ روح کو صاحبِ شعور و ادراک کہا جاتا ہے اس لئے جنین کو رحم مادر کے اندر بھی صاحبِ شعور و ادراک ہونا چاہیئے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اگر آمدِ روح کا کوئی اور وقت مقرر کیا جائے گا تو پھر اس تعین کے کیا اصول ہوں گے جب کہ شعور و ادراک کے مسائل میں تمام انسان یکساں نہیں ہیں کسی میں شعور و ادراک بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے کسی میں بہت دیر کے بعد، کسی کا حافظہ ابتداء ہی سے قوی ہوتا ہے اور کسی کا آخر عمر تک ضعیف رہتا ہے اور جو دیوانے پیدا ہوتے ہیں ان میں آخر عمر تک شعور و ادراک پیدا نہیں ہوتا حالاں کہ روح ان کے اندر بھی پائی جاتی ہے اس صورت میں مجبوراً یہ ماننا پڑے گا کہ شعور و ادراک کا تعلق روح سے نہیں ہے جو عقیدۂ مذہبی کے خلاف ہے۔

(۳) اگر یہ کہا جائے کہ روح بھی دماغی نشو و نماء کے ساتھ ترقی کرتی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ دماغی خرابی یا موت کے ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہے حالاں کہ یہ بقاءِ روح کے عقیدے کے منافی ہے۔

(۴) اگر یہ کہا جائے کہ روح اور حیات ایک ہی چیز ہے تو پھر حیات کے ساتھ اس کی ابتداء اور موت کے ساتھ اس کا اختتام بھی تسلیم کرنا چاہئے اور اس صورت میں روح کو غیر فانی نہیں کہہ سکتے۔

(۵) اگر روح غیر فانی ہے تو اس کے بقاء دوام کی نوعیت متعین کرنا پڑے گی اور اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ کیوں کہ روح کے وجود کے لئے زمان و مکان کی تعیین ضروری ہے اور جب زمان و مکان کی قید لگ جاتی ہے تو پھر اسے محدود ماننا پڑے گا اور ہر محدود چیز فانی ہے اس لئے روح کو بھی فانی ماننا پڑے گا۔

(۶) اگر ہر انسان کی روح انفرادی طور پر علیٰحدہ علیٰحدہ وجود رکھتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وجودِ انسانی سے قبل بھی انفرادیت رکھتی تھی۔ لیکن وہ انفرادیت کیا تھی؟ اگر عقیدۂ تناسخ کی رو سے اس کا تشخص کسی اور ہستی کے تشخص کے ساتھ وابستہ تھا تو پھر ان تمام ہستیوں کا شعور و ادراک جن جن میں وہ روح داخل ہوئی تھی یکساں ہونا چاہئے حالاں کہ ایسا نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ جس شعور و ادراک کی روح جسم میں داخل ہو گی وہ ہی شعور و ادراک انسان میں پیدا ہو گا تو پھر اس کا جواب دِہ کون ہے کہ احمد میں کیوں احمقانہ روح داخل کی گئی، اور محمود کو کیوں عقل مند روح سے سرفراز کیا گیا؟

(۷) اگر یہ کہا جائے کہ روح میں پہلے سے کوئی شعور نہیں پایا جاتا بلکہ جسم انسانی میں داخل ہونے کے بعد شعور پیدا ہوتا ہے تو پھر یہ بتانا پڑے گا کہ اس شعور و ادراک کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوتا ہے اور کیا اس کا تعلق کسی اور روح سے ہے؟

(۸) اگر حیات اور روح کو ایک ہی چیز تسلیم کیا جائے تو جنین کی اوّلین جنبش و حرکت ساتھ اس کے آغاز کو ماننا پڑے گا اور انسان کی موت کے ساتھ اس کے اختتام کو۔ اور اس صورت میں روح کو فانی ماننا پڑے گا یا حیات کو غیر فانی اور یہ دونوں مسلّماتِ مذہب کے خلاف ہیں۔ علاوہ اس کے ہم کو ان تمام مخلوقات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا جو ذی حیات کہلاتے ہیں اور روح کے حامل نہیں۔

(۹) اگر یہ کہا جائے کہ روحِ انسانی، روحِ حیوانی، روحِ نباتی اور روحِ حشراتی سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اس صورت میں ان سب روحوں کو غیر فانی ماننا پڑے گا یا پھر اس کی وجہ بتانا پڑے گی کہ روحِ انسانی کیوں غیر فانی ہے، اور دوسری قسم کی روحیں کیوں فانی ہیں اور اگر روحِ نباتی و روحِ حشراتی کے غیر فانی ہونے کو عقل قبول

نہیں کرتی تو روحِ انسانی کے غیر فانی ہونے کو کیوں قبول کرے۔

(۱۰) اہلِ مذاہب اس کا ایک الزامی جواب یہ دیتے ہیں کہ جب مادئین مادہ کو غیر فانی مانتے ہیں تو روح کو غیر فانی ماننے میں کیا حرج ہے۔ یعنی اگر جسم کے اجزاء فنا نہیں ہوتے بلکہ صرف ہیئت بدلتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ روح بھی انہی مختلف تشخصات کے ساتھ نہ پائی جائے۔ اہلِ مذاہب کا یہ اعتراض، خود ان کے عقائد کے خلاف ہے کیوں کہ اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی روح اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہی اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کتنے کیڑوں یا پودوں کی روحوں میں منقسم ہو گئی اور اس طرح یومِ آخرت میں انسانی روح کے جواب دِہ ہونے کا عقیدہ باطل ہو جاتا ہے۔

(۱۱) مذاہب بقاءِ روح اور عذاب و ثواب کے ثابت کرنے میں ایک اخلاقی منطق سے بھی کام لیتے ہیں اور وہ یہ کہ مرنے کے بعد احیاءِ موتیٰ، بقاءِ روح، حشر و نشر، عذاب و ثواب کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ ایک شخص اس دنیا میں باوجود عصیاں کاری کے لطف و مسرت کی زندگی بسر کرے، اور دوسرا شخص باوجود تقدس و نیکوکاری کے خراب و خستہ رہے اس عدمِ توازن کے دور کرنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مرنے کے بعد ایک عدالت گاہ قائم کی جائے اور وہاں عذاب و ثواب کے دونوں پلّے برابر کر دئے جائیں اس صورت میں خدا کے عادل ہونے کی صورت برقرار رہتی ہے۔

قطع نظر اس سے کہ یہ عقیدہ علمی حقائق و مُسلمات اور فطری قوانین اور مقادیر کے خلاف ہے، سب سے بڑا نقص اس میں یہ ہے کہ خدا کی مسئولیت اس عقیدہ کے بعد بھی دور نہیں ہوتی کیوں کہ ایک انسان کو انسان، ایک حیوان کو حیوان، ایک پودے کو پودا پیدا کرنے کی ذمہ داری بہر حال خدا پر ہی عائد ہوتی ہے اور اس لئے سبزہ فریاد کر سکتا کہ اسے کیوں سبزہ پیدا کر کے ہمیشہ پامال رکھا۔ ایک کیڑا شکایت کر سکتا ہے کہ اسے کیڑا پیدا کر کے کیوں چڑیوں اور جانوروں کا لقمہ بنایا۔ ایک جانور کہہ سکتا ہے اسے جانور بنا کر کیوں انسان کے بس میں دے دیا اور اگر ان کا جواب یہ دیا جائے کہ یہ خدا کی مصلحت ہے "جسے چاہا جیسا بنا دیا" تو پھر انسانی دنیا کے اس عدمِ توازن کا بھی یہی جواب ہو سکتا ہے کہ خدا مختار ہے دنیا میں جس طرح جس کو چاہا رکھا اگر اچھے کام کرنے والے کو تکلیف پہنچی تو کیا اور بُرے کام کرنے والے آرام سے رہے تو کیا خدا بے نیاز ہے اور اس سے کوئی اخلاقی بازپرس نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام مذہبی عقائد صرف اس کے اِس پندار کا نتیجہ ہیں کہ وہ

کوئی بہت بڑی چیز ہے اور اگر کسی کام کا نتیجہ اس کی خواہش کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ اپنی تسکین اس طرح کرنا چاہتا ہے کہ یہاں نہیں تو کہیں اور، اس وقت نہیں تو کسی وقت اور اس کی تلافی ہو گی۔ اس نے اپنی دنیاوی زندگی کے لحاظ سے اچھائی اور برائی کی تعیین کی، اور اسی لحاظ سے اس نے اُخروی عذاب و ثواب کی طرح ڈالی، ہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں عیش کی ہے کبھی یہ نہیں چاہ سکتا کہ اس سے اس عیش کوشیوں کی باز پُرس ہو اور ہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں ناکام زندگی بسر کی ہے، اپنی تسلّی صرف اس طرح کر سکتا ہے کہ ایک دوسری دنیا فرض کر کے اس میں اپنے آپ کو عیش کرتا ہو دیکھے ۔ الغرض بقاءِ روح اور عذاب و ثواب کا عقیدہ خدا کی بے نیازی اور علم و عقل کو دیکھتے ہوئے ضرورت و مصلحت اور قانونِ قدرت دونوں کے خلاف ہے اور اس کو تسلیم کرانے کے لئے نہ کوئی ربانی دلیل پیش کی جاسکتی ہے نہ اخلاقی و علمی۔

یہاں تک تو علمی بحث اس عقیدہ کے مطابق ہوئی۔ اب آیئے دیکھیں کہ اسلام نے اِس گتھی کو کس طرح سلجھایا ہے اور چوں کہ اسلامی لٹریچر میں صرف قرآن ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اس لئے ہم اپنی جستجو کو صرف آیاتِ قرآنی ہی تک محدود رکھیں گے۔

قرآن مجید میں روح کا لفظ متعدد جگہ آیا ہے اور ضرورت ہے کہ اس کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لئے ہم ان آیات کو اپنے سامنے رکھیں جن میں لفظِ روح استعمال کیا گیا ہے:

قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں جن میں روح کا لفظ حضرت عیسیٰ سے تعلق رکھتا ہے مثلاً سورۂ بقر میں ارشاد ہوتا ہے "وأيّدناه بروح القدس" (یعنی ہم نے روح القدس سے ان کی مدد کی) سورۂ مائدہ میں خطاب ہوتا ہے کہ " أيّدتكَ بروح القدس" (ہم نے روح القدس سے تمہاری مدد کی) سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے "عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ ٱللَّـهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ أَلْقَىٰهَآ إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ" اس آیت میں گویا عیسیٰ کے "روح اللہ" ہونے کی صراحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ اور کلمۃ اللہ کا بھی وہی مفہوم ہے جو روح اللہ کا۔

ہر چند ان آیات سے اس روح پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جو زیر بحث ہے لیکن ان سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ روح کا لفظ اپنی لغوی و اصلی معنیٰ سے ہٹ کر مجازاً کسی دوسرے مفہوم میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

سورۂ سجدۂ میں ایک جگہ انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "ونفخ فيه من روحه" سورۂ شوریٰ میں خود قرآن کو روح سے تعبیر کیا گیا ہے "كذالك أوحينا

إليك روحا من امرنا" سورۂ مومن میں ارشاد ہوتا ہے: "يلقى الروح من امره علىٰ من يشاء من عباده" یعنی اپنے بندوں میں سے جس پر وہ چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں روح کو بہ معنی الہام، وحی یا فراست استعمال کیا گیا ہے، اور اس روح سے اس کا کوئی واسطہ نہیں جو حیاتِ انسانی سے تعلق رکھتی ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ روح کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے "يسئلونك عن الروح قل الروح من أمر ربّي" (تجھ سے روح کے متعلق لوگ سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو روح حکمِ خداوندی کا نام ہے)

اول تو اس آیت کے بعد کی آیتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی روح سے قرآن یا وحی والہام مراد ہے کیوں کہ بعد کی آیتوں میں صراحتاً وحی و قرآن کا ذکر موجود ہے لیکن اگر ہم سیاق کی دوسری آیتوں سے علیٰحدہ سمجھ کر یہاں روح کے معنیٰ واقعی روح کے لیں تو اس سے روح کی حقیقت صرف اس قدر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خدا کا حکم ہے اور شاید اس سے بہتر الفاظ میں روح کی حقیقت کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ آپ امر ربانی یا حکم خداوندی پر غور کریں گے تو قانونِ قدرت یا مقادیرِ الٰہیہ کے علاوہ کچھ نظر نہ آئے گا اور اس طرح روح کے معنی صرف اس حیات یا زندگی کے رہ جائیں گے جو قانونِ قدرت کے مطابق پیدا ہوتی اور فنا ہو جاتی ہے۔

مجھے تلاش سے کلام مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ روح زندگی سے علیٰحدہ کوئی دوسری چیز ہے اور موت کے بعد وہ باقی رہتی ہے۔

سورۂ نبا میں بے شک ایک جگہ "يوم يقوم الروح والملائكة صفا" کہا گیا ہے لیکن -- غالباً یومِ قیامت کا ایک منظر اس میں ظاہر کیا گیا ہے ---- یہ پوری صورت مکّہ میں نازل ہوئی تھی جب عہدِ رسالت کی ابتداء تھی اور کفارِ عرب نے رسول اللہ کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اس لئے یہ صورت دراصل رسول اللہ کی کامیابیوں اور کفار کی ناکامیوں کی پیشن گوئی ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب اچھّی اور بُری طاقتوں کا مقابلہ ہو گا اور کامیابی رسول اللہ کو ہو گی۔

خدا کا تصّور

آپ مذاہبِ عالم کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ مادیات سے ہٹ کر خدا کا تصّور آج تک کوئی مذہب قائم نہ کر سکا، یہاں تک کہ جمادات، نباتات و حیوانات میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو کبھی نہ کبھی خدا بننے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو، خیر آفتاب و ماہتاب کو چھوڑیئے کہ ان میں تو ایک قسم کا علوّ پایا جاتا ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ مذہب نے پتھروں، درختوں اور جانوروں کے سامنے بھی ہمیں سر جھکانے پر مجبور کیا۔ گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مذہب نے انسان کو ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا اور ایسی صورت میں اخلاقِ انسانی پر جو خراب اثر پڑنا چاہیئے تھا، پڑا، اور آج تک مذہب زدہ قومیں اس کا خمیازہ بھگت رہی ہیں۔

جن بانیانِ مذہب نے خدا کا تصّور قائم کرنے میں ان پریشان خیالوں سے کام لیا، ان کو میں بُرا نہیں کہتا کیوں کہ انہوں نے جو کچھ کیا خلوص نیت سے کیا۔ جہل کی مجبوری سے کیا اور اس سے زیادہ کوئی اور توقع ان سے ہو بھی نہ سکتی تھی، لیکن میں موجودہ زمانہ کے انسان پر ضرور حیرت کرتا ہوں کہ وہ اب بھی تقویمِ پارینہ کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو اپنی زندگی کا جواب دِہ سمجھتا ہے۔

انسان کو جتنے حواس، فطرت نے عطا کئے ہیں ان سب کا تعلق مادیات سے ہے یعنی وہ کسی ایسی بات کا تصّور کر ہی نہیں سکتا جو اس کے حواس کے حدود سے باہر ہو اسلئے جب اول اول انسان کو ان ناکامیوں سے واسطہ پڑا جن کا سبب وہ متعین نہ کر سکتا تھا تو اس کا خیال کسی ایسی قوّت کی طرف منتقل ہوا جسے وہ اپنے سے زیادہ زبردست سمجھتا تھا لیکن اس کا تصور اس نے قائم کیا انہی چیزوں کو دیکھ کر جن سے وہ دنیا میں روز دوچار ہوتا تھا۔ یہ تو تھا خوف کا عنصر جس نے انسان کو خدا کا خوف ناک تصّور قائم کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن بعض تجربات اس کے دل خوش کن بھی تھے۔ اس لئے ان کا تعلق اس نے مہربان خداؤں سے رکھا اور ان کا تصور اس نے ایسی چیزوں کی مدد سے قائم کیا جو اس دنیا میں اس کے لئے سازگار ثابت ہوئیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کا بتایا ہوا خدا غیر مادی ہے لیکن جو تصور اس نے پیش کیا ہے وہ مادیت کی جھلک سے بالکل پاک نہیں ہے اسلام کے تصورِ الٰہی کا تذبذب اسی سے ظاہر

ہوتا ہے کہ اس نے ننانوے (۹۹) ناموں سے اسے سمجھانا چاہا حالاں کہ ان میں سے بعض نام مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کے متضاد بھی ہیں مثلاً رحمٰن وجبّار، رحیم وقہّار اور مفہوم کے لحاظ سے سوا ایک آدھ کے کوئی ایسا نہیں جو جذبات سے علیٰحدہ ہو۔ ان ناموں میں صرف ایک نام کل ایسا ہے جو فلسفیانہ گہرائی لئے ہوئے ہے لیکن یہ ایسا زیادہ مشہور نہیں اور میں نے آج تک نہیں سنا کہ کسی درویش یا مولوی نے یہ نام ورد کیا ہو۔ وہ یا غفور، یا رحمٰن، یا رحیم ورد تو بکثرت کرتا ہے کیوں کہ دوزخ سے ڈرتا ہے لیکن "ھوالکل" اس کی سمجھ میں نہیں آتا اس لئے وہ اس نام سے سرسری گزر جاتا ہے۔

ان ناموں کے مفہوم میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس کی تاویل میں ہم کو "کلّ یومٍ ھو فی شأنٍ" سنایا جاتا ہے یعنی وہ رحم و کرم کے موقع پر رحیم و کریم ہے قہر و جبار کے موقع پر قہار و جبار، لیکن اس قسم کی تاویل کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ وہ یہ کہہ کر خدا کو انسان کی صف میں لاکر کھڑا کر دیتے ہیں کیوں کہ رحم و کرم، قہر و غضب، خوشی و برہمی، لطف و بے زاری، عطا و انتقام، ان سب کا تعلق جذبات سے ہے اور اگر خدا جذبات رکھ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان بھی خدا نہ کہلائے، ان ناموں میں بعض نام مثلاً صبور، شکور، مومن وغیرہ تو ایسے ہیں جو انسان کے انفعالی جذبات سے متعلق ہیں اور کسی طرح خدا کی صفات میں شامل نہیں ہوسکتے اور ادنیٰ تامل سے یہ بات ہر شخص پر واضح ہو سکتی کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر خدا کا صحیح ترین نام سوائے "جامعِ اضداد" کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انسان کے لئے کسی ایسی چیز کا تصور بہت دشوار ہے جس نے اس کو نہ دیکھا ہو، وہ کسی غائب چیز کے سمجھنے میں صرف قیاس سے کام لے سکتا ہے اور قیاس کا تعلق صرف انہی اشیاء سے ہوتا ہے جن کو انسان دیکھ چکا ہے اس لئے خدا کا تصّور قائم کرنے میں بھی اس کو یہی دشواری پیش آئی اور چوں کہ انتہائی عظمت و قوت کے تصور میں وہ ایک مستبد و جابر بادشاہ سے زیادہ اور کوئی چیز موزوں نہ پا سکتا تھا اس لئے اس نے خدا کو اسی صورت میں سمجھنا چاہا۔

ہمارے پاس اس کی کوئی شناخت موجود نہیں ہے کہ خدا کے اس تصور میں کوئی خاص تبدیلی امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئی لیکن یہ ضرور ہے کہ اسلام نے جو تصّور پیش کیا اس میں کہیں کہیں اس بلندی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے جو اس مادّی تصور سے خدا کو تھوڑی دیر کے لئے علیٰحدہ کر دیتی ہے اور شاید یہ سب سے پہلا قدم تھا جس نے بعد کو علمِ کلام کی بنیاد ڈالی اور صوفیہ نے اس الجھن کو "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" کہہ کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

میں خود ایک زمانہ تک اس کے سمجھنے میں سرگرداں رہا اور آخر کار مجھے پناہ ملی تو انہیں صوفیہ کے یہاں، جن کا تصور واقعی ایک کائناتی اور ہمہ گیر تصور ہے اور جس کو سامنے رکھ کر ہم دنیا کے ہر انسان کو اس کے سمجھنے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

ہر چند "صوفیہ" نے بھی بعد کو اس میں بہت سی الجھنیں پیدا کر دیں لیکن احساس و اصول کے لحاظ سے ان سب کا اتفاق اسی تصور پر ہے جسے ہم دوسرے الفاظ میں "ھو الکل" یا "ھوالاول" اور "ھو الآخر" سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

اسلام نے ایک اور تصور بھی پیش کیا جو خالص فلسفیانہ ہے اور وہ تصور خدا کے "واجب الوجود" اور "قدیم" ہونے کا ہے لیکن اس قسم کے فلسفیانہ تخیل سے اخلاقِ انسانی پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔ البتہ ذہنِ انسانی کی ورزش ضرور ہو جاتی ہے، چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ محض واجب الوجود اور قدیم کا مفہوم متعین کرنے میں دفتر کے دفتر لوگوں نے سیاہ کر دیئے اور بجائے اس کے کہ اس سے کوئی فائدہ ہوتا، فرقہ بندی کی صورت پیدا ہو گئی۔

میری رائے میں خدا کا بہترین تصور وہی ہو سکتا ہے جو ہمارے اندر خدا کے ساتھ محبت کی کیفیت پیدا کرے، خوف و خشیت کا جذبہ نہ خدا سے محبت کرنا سکھا سکتا ہے اور نہ اپنی جنس کے ساتھ رواداری کی تعلیم دے سکتا ہے۔ عیسوی مذہب میں خدا کا تصور یک گونہ اس معیار پر پورا اترتا ہے لیکن ان کے یہاں تثلیث کے عقیدہ نے اس کو بالکل مہمل بنا دیا۔ اب سائنس کے دور میں اگر خدا کا کوئی تصّور قائم ہو سکتا ہے تو اس کو ہم صرف قوت (Energy) سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن یہ بھی ہمارے اندر محبت و شفقت کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتا اور دنیا کے امن و سکون کے لئے ہمیں ضروری کوئی نہ کوئی تصور خدا کا ایسا قائم کرنا پڑے گا جو ہمیں محبت کرنا سکھائے۔

خدا کو آگ برساتے ہوئے، خون اور پیپ پلاتے ہوئے، آتشیں کوڑوں سے سزا دیتے ہوئے بہت زمانہ ہو چکا ہے، اب ضرورت ہے کہ وہ صرف زخموں پر مرہم رکھے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو ڈھارس پہنچائے اور بجائے کسی خاص قوم پر لطف کرنے کے وہ تمام بنی نوعِ انسانی کو اپنا ہی بندہ سمجھے اور نجات کا دروازہ بغیر کسی شرط کے سب کے لئے کھول دے، لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک مذاہب کا عقائدی اختلاف دور نہ ہو، خدا کا کوئی ایسا کائناتی تصّور قائم ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر کوئی شخص اس اختلافِ عقائد کو مہمل قرار دیتا ہے تو اسے ملحد و کافر کہا جاتا ہے اس لئے میری رائے میں اب خدا کی خدائی اگر صحیح معنی میں قائم ہو سکتی ہے تو اس کی توقع ہم کو صرف کافروں اور ملحدوں ہی سے کرنا چاہئے۔

ماخذ القرآن پر ایک اُصولی گفتگو

علماء کرام کا سکوت

ڈاکٹر ٹسڈل کے "ماخذ القرآن" کی اشاعت کو عرصہ گزر چکا اور اس وقت تک مجمل یا مفصل ایک جواب بھی ایسا موصول نہیں ہوا جسے واقعی جواب کہا جا سکے میں سمجھتا تھا کہ "علماء کرام" کے بعض افراد جو واقعی سنجیدگی سے گفتگو کرنے کے اہل ہیں اس موضوع پر ضرور قلم اٹھائیں گے اور غیر ضروری مباحث سے قطعِ نظر اصل اعتراضات کے متعلّق کچھ ایسی باتیں کہہ سکیں گے جو خالص علم و عقل کی نقطۂ نظر سے بھی لوگوں کے لئے باعثِ تسکین ہوں گی لیکن افسوس ہے کہ میرا یہ خیال غلط نکلا اور ہمارے "اکابرِ مذہب" نے کوئی توجہ نہ کی۔

انہوں نے اس وقت تک زیادہ سے زیادہ صرف اتنا کہا کہ یہ بحث نئ نہیں ہے اس پر اس سے قبل کافی کہا جا چکا ہے اور اس کے ثبوت میں وہ احمدی جماعت، امر تسری اور اسی طرح کی بعض دوسری تبلیغی جماعتوں کے ان رسائل کو پیش کرتے ہیں جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں اور اگر کسی نے کچھ اس کے علاوہ لکھنے کی کوشش بھی کی تو بالکل دوراز کار باتوں کو چھیڑ دیا۔

اول تو بعض کے لئے یہی سمجھنا مشکل ہو گیا کہ "ینابیع الاسلام" اور "ماخذ القرآن" دو بالکل علٰیحدہ علٰیحدہ کتابیں ہیں اور اگر بعض نے اسے سمجھا بھی تو جواب میں اسی "پارینہ" لٹریچر کو کافی سمجھا جو ایک ربع صدی بلکہ اس سے بھی قبل بعض مشنریوں کی طرف سے شائع ہو چکا تھا اور جن کا اب حوالہ دینا "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" سے زیادہ نہیں۔

میں ایک سے زائد بار اس حقیقت کو واضح کر چکا ہوں کہ اس وقت سوال نہ ٹسڈل کا ہے نہ کسی اور عیسائی مشنری کا، بلکہ ان مسلم یا غیر مسلم افراد کا ہے جو "ماخذ القرآن" کے مطالعہ کے بعد اوہام و شکوک میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور جن کو اُن استدلالات سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا، جو ٹسڈل یا دوسرے اربابِ کلیسا کو خاموش کر سکتے ہیں۔ ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب والے کو نہایت آسانی کے ساتھ الزامی جواب سے مطمئن یا ساکت کر سکتا ہے، کیوں کہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی بات خلافِ عقل نہ پائی

جائے اور اس صورت میں ایک مذہب والا نہایت اطمینان کے ساتھ فریق ثانی سے کہہ سکتا ہے کہ " تمہارے مذہبی عقائد میں اس سے زیادہ اہمال پایا جاتا ہے" لیکن مشکل تو اس وقت آن پڑتی ہے جب ہم مدعی کو اس قسم کا الزامی جواب نہ دے سکیں اور یہیں پہنچ کر اہلِ مذاہب کو یا تو تاویلات سے کام لینا پڑتا ہے یا اگر ان میں سے کوئی صاحبِ حال ہے تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ:

خود گرفتم کہ نظر بر رخِ خوباں جرم ست
من ازیں باز نیایم کہ مرا ایں دیں ست

لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نہ کسی "صاحبِ قال" نے توجہ کی اور نہ کسی "صاحبِ حال" نے۔

مجھ سے تقاضائے جواب

اس دوران میں "علماء کرام" کے سکوت کو دیکھ کر "قارئین نگار" نے مجھ پر تقاضہ شروع کیا کہ میں خود اس بحث میں براہ راست حصہ لوں اور ان تقاضے کرنے والوں میں سے چوں کہ اکثر ایسے ہیں جن کو میرے مسلمان ہونے کی طرف سے شک ہے اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیوں کر انہیں مطمئن کر سکتا ہوں، کیوں کہ اسلام کا واقعی جو مفہوم میرے ذہن میں ہے اس کا تعلّق زیادہ تر محمدؐ سے ہے نہ کہ خدا سے، قرآن کی روح سے ہے نہ کہ الفاظ سے، کردار سے ہے نہ کہ گفتار سے، یعنی دنیا محمدؐ کو سمجھنا چاہتی ہے، قرآن واحادیث سے اور میں قرآن و حدیث کو پرکھنا چاہتا ہوں، محمدؐ کی زندگی سے۔ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ وہ ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے، میں کہتا ہوں قرآن وہ ہے جسے محمدؐ نے اپنے عمل سے ظاہر کیا، دنیا کے نزدیک اسلام سمجھنے کی منزلیں یہ ہیں: "خدا، قرآن اور محمدؐ" اور میرے یہاں اس کے بالکل برعکس ان منازل کی ترتیب ہے: "محمدؐ، قرآن اور خدا" لوگ خدا سے ڈر کر قرآن و محمدؐ کا مطالعہ کرتے ہیں اور میں محمدؐ سے محبت کر کے قرآن و خدا کو سمجھنا چاہتا ہوں ع

تو گل از باغ می خواہی، من از گل باغ می جویم
من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

ان حالات میں میرے لئے یہی مشکل ہے کہ میں اسلام کے مروجہ عقائد و مسلمات کو سامنے رکھ کر مذہبِ اسلام کا مفہوم متعین کروں۔ چہ جائے کہ ان عقائد و روایات کو

علم و عقل کی روسے صحیح ثابت کرنا کہ یہ تو اس سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

اسلام میرے نزدیک

پچھلے پندرہ سال کے اندر مجھے اتنی بار کافر، مرتد، ملحد و دہریہ کہا گیا کہ کبھی کبھی مجھے بھی سوچنا پڑا کہ کیا حقیقتاً میں اسلام سے خارج ہو چکا ہوں، کیا واقعی میرے لئے اب اس مذہب میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی، لیکن باور کیجئے کبھی مجھ کو اس کا یقین نہیں آیا اور میں نے جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لیا۔ میں اپنے خیال پر زیادہ مستحکم ہو گیا اور بار بار رسول اللہ کا وہی ارشاد سامنے آیا جو آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے کہا تھا کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لا کر رکھ دیں تو بھی میں اپنے خیال سے باز نہ آؤں گا۔"

اس موقعہ پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو میرا اسلام کس قسم کا ہے اس کے کیا اصول ہیں اور یہ اصول قرآن و حدیث پر کیوں کر منطبق ہو سکتے ہیں۔

اگر میری سابقہ تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے لیکن چوں کہ وہ سب کے سامنے نہیں ہیں اس لئے مجملاً اس کی وضاحت یہاں کر دینا چاہیئے۔

اسلام کی اساسی شرط یہ بتائی جاتی ہے کہ "خدا کے سوا کسی اور کو معبود نہ سمجھا جائے اور محمدؐ کو اس کا رسول تسلیم کیا جائے" اور اس حد تک مجھ میں اور عام مسلمانوں میں شاید کوئی فرق نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تسلیم کرنے کے بعد بھی ایک شخص مسلمان نہیں ہو سکتا اور غالباً یہی وہ خیال تھا جس کی بناء پر حضرت عمرؓ نے "من قال لا إله الّا الله فقد دخل الجنة" کی روایت کو بہ جبر ردّ کر دیا۔ کیوں کہ محض خدا کو زبان سے ایک کہہ دینا کوئی ایسی بات نہیں جس کا انعام جنت قرار پائے۔ رسول اللہ کی بعثت سے قبل بھی بہت سے لوگ توحید کے قائل تھے اور اس کے بعد بھی کافی تعداد ایسے لوگوں کی پائی جاتی تھی، لیکن اپنے اخلاق کے لحاظ سے وہ اتنے گرے ہوئے تھے کہ ان کو کوئی توقع جنّت یا کسی دوسرے انعام کی نہ ہونا چاہیئے تھی۔

ہر جماعت میں داخل ہونے کے لئے بعض مخصوص شرائط ہوا کرتے ہیں جن کا تعلق ظاہر و باطن دونوں سے ہوا کرتا ہے اور اس قسم کے بعض شرائط جماعتِ اسلامی میں داخل ہونے کے لئے مقرّر تھے، ظاہری شرائط یہ تھے:

(۱) توحید و رسالت کا اقرار (۲) متعینہ طریقوں سے مراسمِ عبادت ادا کرنا (۳) بعض مخصوص مابعد الطبیعاتی عقائد کا ماننا۔ لیکن معنوی شرط صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ اسوۂ رسول کی پابندی کی جائے۔ پھر چوں کہ اجتماعی مفاد صحیح طور پر معنوی شرائط ہی سے وابستہ ہوتا ہے اور ظاہری شرائط محض علامات و آلۂ کار کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے میرے نزدیک مسلمان ہونے کی پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ وہ رسول کی سیرت کو سامنے رکھ کر اس کی پابندی کرے اور اسی لئے میں نے بارہا اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ میں اگر مسلمان ہوں تو صرف "محمد رسول اللہ" کی حد تک "لا الہ الا اللہ" کی بحث میں پڑنا نہ صرف یہ کہ بے کار بل کہ ایک حد تک نقصان رساں بھی ہے کیوں کہ یہ مسئلہ اتنا مشکل یا دلچسپ ہے کہ پھر انسان کو "ترکِ ماسوا" کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہتا اور مذہب وذہب سب رخصت ہو جاتے ہیں حالاں کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا لائحۂ عمل ہمارے سامنے ہونا بالکل ضروری ہے جو یہاں کی مادی کش مکش میں ہماری بقاء و حیات کا ضامن ہو اور یہی وہ لائحۂ عمل ہے جس کو میں "سیرتِ نبوی" سے تعبیر کرتا ہوں اور اسی کی پابندی کو اصل اسلام قرار دیتا ہوں۔

میری نامسلمانی کی ابتدا

میری نامسلمانی کی تاریخ بہت دلچسپ ہے اور ممکن ہے کسی وقت اپنے سوانحِ حیات کے ساتھ ساتھ بالتفصیل اسے پیش کر سکوں تاہم نہایت اختصار کے ساتھ اس وقت بھی سُن لیجئے:

مجھے بالکل علم نہیں کہ میرے والد سے قبل میرے خاندانی افراد جاہل تھے یا عالم، مذہبی تھے یا غیر مذہبی، لیکن خود اپنے والد کے متعلق مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ سخت مذہبی انسان تھے گو اصطلاحی حیثیت سے وہ فرنگی محل یا دیوبند کے سند یافتہ عالم نہ تھے لیکن ان کا علم بڑے بڑے عالموں سے زیادہ وسیع تھا فارسی کے وہ بڑے زبردست شاعر وانشاء پرداز تھے۔ صہبائی سے عنفوانِ شباب میں مشورہ لیتے تھے غالب کے پرستار تھے اور کتب بینی کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ رہی مذہبیت سو اس کی سختی کا اندازہ آپ اس بات سے کرسکتے ہیں کہ میری عمر ۶، ۷ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ اس وقت بھی مجھے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے پر مجبور کرتے تھے۔

اب یہاں اس تفصیل کا موقعہ نہیں کہ میری تعلیم و تربیت کے متعلق ان کا کیا

نظریہ تھا اور انہوں نے اس کے لئے کیا کیا اہتمامات کئے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میری ابتدائی تعلیم نہایت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی اور ایک نہایت متعصب مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا نشو ونما ہونے لگا۔ میں نمازیں بھی پڑھتا تھا، روزے بھی رکھتا تھا، ظاہری وضع و لباس میں سر سے لے کر پاؤں تک نہایت خشک و بھیانک قسم کا مسلمان تھا اور چوں کہ صحبت عالموں اور مولویوں ہی کی تھی اس لئے شب و روز میرے دل و دماغ پر مذہب ہی مسلط رہتا تھا اور میں دنیا کی ہر بات کو مذہب ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بات ضرور دل میں کھٹکتی رہتی تھی کہ مذہبی لوگوں اور مولویوں کے اخلاق پست کیوں ہیں؟ خصوصیت کے ساتھ ان کی رعونت اور ان کا پندارِ تفوّق مجھے بہت برا معلوم ہوتا تھا۔ ان کی یہ خواہش کہ ہر شخص دور ہی سے دیکھ کر ان کے سامنے جھک جائے، مجھے اچھی نہ معلوم ہوتی تھی اور آخرکار یہ سمجھنے پر مجبور ہوا کہ ان کی عبادتیں بے روح ہیں اور بے روح عبادت بالکل بے کار چیز ہے۔

میری فطرت شروع سے ہی یہ ہے کہ ہر بات کے سبب و نتیجہ پر غور کرتا ہوں اور جب تک کوئی معقول وجہ نہ ہو میں مشکل ہی سے کسی بات کو مان سکتا ہوں چناں چہ حضراتِ علماءِ کرام کے ان اطوار و انداز کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں صرف نماز کی غرض سے اور مذہب کا مفہوم ان کے یہاں سوا اس کے کچھ نہیں کہ مراسمِ عبودیت کو مخصوص اوقات پر مخصوص طریقہ سے ادا کر دیا جائے اور بس، انہیں اس سے بحث نہیں کہ ان کے قلب و روح میں بھی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے یا نہیں اور اس کا نتیجہ قدرتاً یہی ہونا چاہئے کہ ان کے دلوں میں شقاوت پیدا ہو اور اس پندار کی بناء پر کہ وہ خدا کے بڑے عبادت گذار مقبول بندے ہیں عام لوگوں سے وہ اپنے آپ کو بلند سمجھنے لگیں۔

یہ تھی ابتداء میرے تنفر کی جو مولویوں کی طرف سے مجھ میں پیدا ہوا اور مطالعہ و تجربہ کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا رہا یہاں تک کہ احادیث کا نصاب میرے سامنے آیا اور مشکوٰۃ کا درس شروع ہوا چوں کہ اب مجھ میں غور و فکر کی اہلیت زیادہ پیدا ہو گئی تھی اس لئے خود میری عقل نے فیصلہ کیا کہ تمام احادیث یقیناً رسول اللہ کا ارشاد نہیں ہو سکتیں کیوں کہ ان میں سے اکثر بالکل طفلانہ خیالات کا مجموعہ ہیں اور جب میں نے اپنے شبہات اساتذہ کے سامنے پیش کئے تو انھوں نے زجرہ توبیخ کے علاوہ کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا اور

ہمیشہ یہی کہہ کر خاموش کرنا چاہا کہ مذہب میں عقل آرائی کافروں اور ملحدوں کا کام ہے۔
یہ تھا سب سے پہلا فتوائے کفر و الحاد جس نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ اگر مولویوں کی جماعت واقعی مسلمان ہے تو میں یقیناً کافر ہوں اور اگر میں مسلمان ہوں تو یہ سب نامسلمان ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف کورانہ تقلید کا، اور تقلید بھی رسول و احکامِ رسول کی نہیں ب لکہ بخاری اور مسلم و مالک وغیرہ کی اور میں سمجھتا تھا کہ حقیقی کیفیت یقین کی اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک ہر شخص اپنی جگہ غور کر کے کسی نتیجہ پر نہ پہونچے۔

محمد کی عظمت کا تصور

قصہ مختصر یہ کہ اولین بیزاری اسلامی لٹریچر کی طرف سے مجھ میں احادیث نے پیدا کی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مطالعۂ اسلام کے لئے مجھے اقوالِ رسول نہیں بلکہ "افعالِ رسول" پر غور کرنا چاہئے چناں چہ میں نے سیرتِ نبوی کے متعلق چھان بین شروع کی اور ہر چند سیرت کی کتابوں میں بھی مجھے بڑا حصہ مزخرفات ہی کا نظر آیا (کیوں کہ یہاں بھی وہی احادیث و استنادِ احادیث کا جھگڑا موجود تھا) تاہم میں نے یہ ضرور سمجھ لیا کہ محمدؐ کی ہستی واقعی نہایت عجیب و غریب ہستی تھی اور ایسی پاکیزہ اطوار و خصائل کا انسان بن نہیں سکتا بلکہ پیدا ہوتا ہے اور یہی مفہوم ان کے اور تمام انبیاء کے معبوث ہونے کا ہے۔
اس کے بعد قدرتاً مجھے قرآن کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تھا کیوں کہ اس باب میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ قرآن میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہ یقیناً رسول کی زبان سے ادا ہوا ہے اور اگر اسے عام مروجہ مفہوم میں خدا کا کلام نہ مانا جائے تو رسول کا کلام ہونے میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا اور اس لئے اسلام کے قیمتی مقاصد سمجھنے کے لئے تنہا یہی ذریعہ اختیار کرنا چاہئے۔

خدا کا تصور

اس وقت تک خدا کا تصور میرے لئے بالکل مبہم چیز تھا لیکن مطالعۂ قرآن کے سلسلہ میں میرے لئے ناگزیر ہو گیا کہ سب سے پہلے خدا کو سمجھوں، لیکن میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ خدا کے سمجھنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جاتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ ناقابل فہم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ برسوں اسی حیرانی کے عالم میں گذر گئے اور آخرکار جب میں نے فلکیات کا مطالعہ کیا تو مجھ پر خدا کی حقیقت ظاہر ہوئی لیکن یہ انکشافِ حقیقت اس سے زیادہ نہ تھا ع

بحرِ بے تاب کہ آں گوہر نایاب کجاست — چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہاں تاب کجاست
دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم — کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست
اے سمندر بہ ہوس داغ فروش آتش کو — ماہیاں تشنہ بمیرید دمِ آب کجاست

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے تصورات، دوزخ و جنت، حشر و نشر وغیرہ کے عقائد، ان سب کا مفہوم میرے لئے کچھ سے کچھ ہو گیا کیوں کہ اب مجھے نہ صرف یہ عقائد بل کہ خود مذاہب کا وجود بچوں کا کھیل نظر آنے لگا اور میں نے اس کو خدا کی توہین سمجھا کہ اس کے اور اس کے کاروبار کے متعلق انسانی نفسیات اور دنیا کے اصولِ زندگی کو سامنے رکھ کر کسی انسانی زبان کے ذریعہ سے اظہارِ خیال کیا جائے۔

یہ تھا میرا دوسرا لیکن مضبوط قدم لامذہبیت یا لا ادرئیت کی طرف لیکن باوجود ان تمام پریشان خیالیوں اور ذہنی تشویشوں کے رسول کی عظمت ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل سے محو نہیں ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ جب خدا کی ہستی اتنا زبردست معمّہ ہے جسے رسول و غیرِ رسول کوئی بھی حل نہیں کر سکتا اور جس کی حقیقی عظمت کا تصور مذاہب کے وجود سے بھی بے نیاز ہے تو پھر قرآن میں جو تمام بیاناتِ خدا اور جزا و سزا وغیرہ کے متعلق پائے جاتے ہیں، ان کی کیا حقیقت ہے اور ان کے اظہار کا مقصود کیا ہو سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑا مشکل سوال تھا کیوں کہ ایک طرف محمدؐ کی شخصیت تھی جس کے متعلّق میرا ایمان ہے کہ ان سے زیادہ سچّا، مخلص اور مکمل انسان ہونا مشکل ہے اور دوسری طرف قرآن کے وہ بیانات جن کا اگر واقعی وہی مفہوم قرار دیا جائے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو پھر خدا، خدا نہیں رہتا بلکہ مشرکوں کا وہ دیوتا ہو جاتا ہے، جو انسانوں پر غصہ بھی کر سکتاہ، ان سے خوش بھی ہو سکتا ہے، جس میں جذبۂ انتقام بھی ہے اور ولولۂ لطف و انعام بھی۔

قرآن اور وحی و الهام

اس سلسلہ میں میرے لئے ضروری ہوا کہ پہلے میں اس حقیقت پر غور کروں کہ قرآن کو خدا کا کلام کہنا کیا معنیٰ رکھتا ہے، وحی و الہام کا کیا مفہوم ہے اور "گفتہ او گفتہ اللہ بود" کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے؟ یہی وہ خیال تھا جس کی بناء پر پچھلے سال میں نے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور جس کے جواب میں ہندوستان کے اکابر علماء کی متفقہ قوت نے "براہینِ وحی" لکھ کر شائع کی۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو اعتقاداً بغیر کسی بحث و دلیل

کے قرآن کو واقعی خدا کا کلام سمجھتے ہیں یہ کتاب مزید ایقان کا باعث ہوئی ہو لیکن میں نے اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہ پایا جو مجھے مطمئن کر سکتا، البتہ اکابرِ اعظم گڈھ اور دریاباد کی گالیوں نے اسے دلچسپ ضرور بنا دیا۔

بہر حال اس بحث کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے قرآن کے کلامِ خداوندی ہونے کی حیثیت کو متعین کر لیا جائے۔ اس کے بعد یہ غور کیا جائے کہ رسول اللہ کی تعلیمات کا اصل مقصود کیا تھا، اور پھر قرآن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر "معقولات" کے نقطۂ نظر سے غور کرنے کی ضرورت بھی پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔

امرِ اول کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ کسی انسانی زبان کی کتاب کو اسی مفہوم میں خدا کا کلام قرار دینا جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا کیوں کہ خدا کی ذات ہر نوع کے مادی لگاؤ سے بلند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ یہاں کلام سے صرف اس کا مفہوم مراد ہو گا، بلکہ (زیادہ صحیح الفاظ میں) وہ طبعی و نفسیاتی کیفیت جس کے زیر اثر ایک شخص بے اختیارانہ کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے اسی کیفیت کا نام مذہبی زبان میں وحی و الہام، جبرئیل اور روح القدس وغیرہ ہے اس سے انکار ممکن نہیں کہ قرآن کے الفاظ عربی زبان کے الفاظ ہیں اس لئے اگر قرآن کے الفاظ کو کلامِ الٰہی کہا جائے گا تو ساری عربی زبان کلامِ خداوندی قرار پائے گی حالاں کہ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ کسی ملک کی مخصوص زبان کو خدا کی زبان کہا جائے کیوں کہ اگر خدا کسی زبان میں گفتگو کر سکتا ہے تو پھر کسی خاص زبان کی قید کیسی، اسے دنیا کی ہر زبان جاننا چاہئے اور وہ ہر زبان میں قرآن نازل کر سکتا ہے۔

عام مسلمانوں اور مولویوں کا یہ عقیدہ کہ قرآن، اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے لحاظ سے پہلے ہی لوحِ محفوظ میں منقوش تھا اور فرشتہ (جبرئیل) یہی محفوظ و منقوش کلام رسول اللہ کو آکر سناتا تھا اور رسول اللہ انہی آسمانی الفاظ کو دہرا دیتے تھے، حد درجہ مضحکہ خیز ہے، اگر قرآن کی زبان عربی نہ ہوتی بلکہ کوئی نئی زبان ہوتی تو بھی خیر کچھ کہا جا سکتا تھا، لیکن جب کہ وہ اس زبان میں نازل ہوا تھا جو عام طور پر عرب میں رائج تھی تو اس کے الفاظ کو کیوں کر خدائی الفاظ کہا جا سکتا ہے؟ بہر حال قرآن کو خدا کا کلام اس حیثیت سے تسلیم کرنا کہ اس کا ایک ایک نکتہ ایک ایک لفظ خدا کا بتایا ہوا ہے اور خود رسول اللہ کے عقل و دماغ کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا تو خدا کو اس کے منصب سے گرا کر انسان کی حد

تک کھینچ لانا ہے اور رسول کو سطحِ انسانیت سے نیچے گرا دینا ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ خدا کو سمیع و بصیر ماننے کے بعد تو اس کی سماعت و بصارت کی کیفیت کو انسانی سماعت و بصارت سے بالکل علیٰحدہ سمجھتے ہیں لیکن صفتِ کلام کی بحث میں انسان ہی کی طرح الفاظ کا محتاج قرار دیتے ہیں۔ اگر خدا کی سماعت و بصارت کا مفہوم اس کی عام توجّہ و نگرانی قرار دیا جائے تو اس کے نطق یا کلام کا مفہوم کیوں نہ وہ اثر قرار پائے جس سے متاثر ہونے کے بعد انسان والہانہ و بے اختیارانہ کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

منصبِ رسالت

اگر ہم رسول اللہ کی قائم کی ہوئی شریعت اور ان کے بتائے ہوئے اصولِ اخلاق و معاشرت کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ وہ بالکل خدائی چیز تھی اور خود رسول اللہ کے فہم و فراست اور عزم و ارادہ کو اس میں کوئی دخل نہ تھا تو رسول کی ذاتی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور ان کی حیثیت محض ایک ایسے پیام رساں یا قاصد کی سی رہ جاتی ہے جو خود کوئی انفرادیت نہیں رکھتا اور جس سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا۔

اگر رسالت کا منصب کوئی ایسی چیز ہے جو بالکل خدا کے انتخاب پر منحصر ہے (اور خدا کے انتخاب کی کوئی نہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کوئی اس باب میں کوئی سوال ہو سکتا ہے) جس میں خود انسانی سعی و عمل یا غور و فکر کو مطلق دخل نہیں ہے تو پھر یہ بالکل قسمت کی چیز ہوئی اور ممکن تھا کہ محمدؐ کے علاوہ کسی اور کا انتخاب ہو جاتا۔

رسول کی جو عظمت میرے دل میں ہے (اور میں چاہتا ہوں کہ یہی عظمت ہر مسلمان کے دل میں پیدا ہو جائے) اس کا تعلق خدا اور رسول دونوں کی ذات سے ہے جس کی وضاحت یہاں ضروری ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہر شخص اپنی فطرت اپنے ساتھ لاتا ہے اور یہ اس کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ جو چاہے بن سکے۔ ہر چند دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ محض اپنی کوشش سے انسان نے ایسی راہ اختیار کی جس کے لئے وہ وضع نہ ہوا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اس میں زیادہ کامیاب ہوا ہو اور ایسا ہمیشہ ہوا ہے کہ جس نے اپنی فطری اہمیت کو سامنے رکھ کر اپنا دائرۂ عمل قائم کیا سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا اور اسی چیز کو میں خدا کا عطیہ کہتا ہوں کیوں کہ "فطری اہلیت" قدرت یا خدا ہی کا عطیہ ہے اور اسی اہلیت کو مذہبی زبان میں بعثت و منصبِ رسالت کہتے ہیں۔ قرآن میں صاف طور پر کہا گیا

ہے کہ "رسول اللہ" مامور من اللہ تھے، یعنی اللہ کی طرف سے انہیں حکم دیا گیا تھا یا متعین کئے گئے تھے ہدایت و اصلاح کے لئے اور میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ صحیح تعبیر رسالت و بعثت کی اور کوئی نہیں ہو سکتی کیوں کہ کسی شخص کا فطرت کی طرف سے کوئی خاص اہلیت یا ملکہ لے کر پیدا ہونا گویا خدا کی طرف سے ماموری ہے کہ وہ اپنے اس فطری ودیعت سے کام لے اور چوں کہ رسول اللہ نے اس ماموری یا اہلیت سے فائدہ اٹھایا اس لئے وہ بہت کام یاب رسول ثابت ہوئے۔

میرے اس بیان سے غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ منصبِ رسالت میں خدا یا قدرت کا کتنا دخل تھا اور خود رسول کی سعی و عمل کا کس قدر۔ اور ان دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق تھا۔ اب آیئے رسول اور قرآن کے تعلق پر غور کریں۔

رسول اور قرآن کا باہمی تعلق

جنہوں نے تاریخِ اسلامی اور سیرتِ نبوی کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہو گی کہ رسول اللہ کی پیدائش کے وقت اہلِ عرب کی اخلاقی حالت کتنی گری ہوئی تھی اور دنیا کی کوئی غیر انسانی و غیر شریفانہ حرکت ایسی نہ تھی جس کے وہ مرتکب نہ ہوتے ہوں۔ آپ نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی قوم کی اس گری ہوئی حالت کا بہت اثر لیا اور یہ اثر لینا صرف اس بناء پر تھا کہ قدرت نے آپ کے دل و دماغ میں غیر معمولی صلاحیت سوچنے سمجھنے کی ودیعت کر دی تھی جسے ہم مذہبی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو خدا نے منصبِ نبوت کے لئے چن لیا تھا۔

آپ نے سوچا کہ قوم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے آپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان برائیوں کی اصلاح کریں اور قوم کے تمام افراد کو اس پستی سے نکالیں۔ چناں چہ آپ نے اس مسئلہ پر رات دن کی تنہائیوں میں غور کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ آپ کے تاثرات اس قدر شدید ہو گئے کہ انہوں نے ایک آہنی عزم کی صورت اختیار کر لی اور آپ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو وہ اپنی قوم کے اصلاح کی کوشش ضرور کریں گے۔

اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ایسے خراب ماحول میں پیدا ہونے کے بعد آپ میں ایسا پاکیزہ جذبہ کیوں کر پیدا ہوا۔ لیکن اس کا جواب میں وہی دوں گا جو ابھی ظاہر کر چکا ہوں اور وہ یہ کہ قدرت نے آپ کے دماغ ہی میں پاکیزہ بات سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ علاوہ اس کے تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ماحول سے جنگ کرنے والی

ہستیاں قدرت نے ہمیشہ پیدا کی ہیں کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو انسان کے قواءِ ذہنی کبھی نشو و نما نہ پاتے، اسی کے ساتھ اگر ہم توارثِ نسلی کے اصول کو سامنے رکھیں تو علمی حیثیت سے بھی یہ بات بالکل قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کیوں کہ رسول اللہ نہایت ہی شریف و معزز خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور آپ کے آباء و اجداد میں بعض ایسے نفوس بھی گزر چکے تھے جنہیں اس قسم کا مرتبۂ رشد و ہدایت مل چکا تھا۔

بہر حال اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی ذہنی صلاحیت لے کر آئے تھے اور سالہا سال کی غور و فکر کے بعد آپ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی قوم کی اصلاح کر کے رہیں گے اور دنیا کی کوئی مخالفت انہیں اس ارادے سے باز نہ رکھ سکے گی۔ آپ کے اس عزم کا ثبوت آپ کے واقعاتِ زندگی سے بخوبی مل سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی جسمانی و ذہنی تکلیف ایسی نہ تھی جو آپ کو نہ پہنچائی گئی ہو۔ بڑی سے بڑی رشوت ایسی نہ تھی جو آپ کے سامنے پیش نہ کی گئی ہو لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی آپ کا قدم متزلزل نہیں ہوا۔ وہی کر کے رہے جو سوچ چکے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ انسانی جد و جہد کی ایسی غیر معمولی مثالیں ہم کو تاریخ کے صفحات میں اور بھی ملتی ہیں لیکن ان میں اکثر کا تعلق مادی خواہشات سے تھا اور اس لئے جب یہ خواہشیں پوری ہو گئیں تو آخر کار دنیا کے لئے عذاب ہو کر رہ گئیں۔

چنگیز خان، ہلاکو، ہنی بال، سکندر، نپولین ان میں سے ہر ایک بڑے پختہ ارادے کا انسان تھا اور ان کی کامیابیاں اس میں شک نہیں تنہا انہی کے ذاتی جد و جہد اور عزمِ صمیم کا نتیجہ تھیں لیکن ان کوششوں کا مقصود صرف مال و جاہ کا حاصل کرنا تھا اور ان کا یہی پست مقصدِ زندگی ان کے زوال کا باعث ہوا۔

انسان کے ذہن کا بلندی کے اس درجہ پر پہنچ جانا کہ ذاتی یا خاندانی مفاد کا خیال تک کبھی اس کے دل میں نہ آئے انتہائی کامیابی کے وقت بھی جذبۂ انتقام اس میں پیدا نہ ہوا۔ دشمنوں پر قابو پا جانے کے بعد بھی لطف و محبت و عفو و درگزر سے کام لے اور پھر باوجود ان تمام روحانی بلندیوں کے دنیا میں اسبابِ زندگی بسر کرنے کی بھی ایسی راہیں بتا جائے جو واقعی دنیا کی نجات کی ضامن ہوں۔ یقیناً بہت بڑی چیز ہیں اور اگر ان تمام خصوصیات کا کسی ایک ہستی میں اجتماع، قدرت کا معجزہ ہو سکتا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس معجزہ کا ظہور محمدؐ کی ذات پر ختم ہو گیا اور اگر دنیا نے کبھی انسانیتِ کبریٰ کا مجسمہ تیار کیا تو وہ محمدؐ ہی

کا ہو گا کسی انسان کا نہیں، کسی انسانِ اعلیٰ (Superman) کا نہیں، بلکہ ایک ایسے انسان ماوراء انسان کا جس کے حدودِ انسانیت، حدودِ الوہیت سے ٹکّر کھاتے ہیں اور ازل سے ابد تک فضائے فطرت کو معمور کئے ہوئے ہیں ؏

جوہر اعتبارِ غیب و شہود اصلِ کیفیت خفاو نمود
ازل افسانۂ ہدایت او ابد اندیشۂ نہایت او

ظاہر ہے جو شخص اتنے بلند مقصود کو لے کر اٹھا ہو گا اور جس نے اپنے جسم و جان کو اس کی تکمیل کے لئے تج دیا ہو گا اس کے انہماک کا کیا عالم رہا ہو گا اس کے دل و دماغ کیسی والہانہ کیفیت سے معمور رہے ہوں گے۔ رسول اللہ کی سیرت کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جب آپ غارِ حراء کے سکون و تنہائی میں اپنے ابناءِ وطن کی دردناک حالت پر غور کرکے باہر تشریف لاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ پر کوئی نہایت گہری کیفیت طاری ہے اور آپ کا سینہ جذبات کی شدت سے پھٹا جارہا ہے لیکن آپ ضبط سے کام لیتے اور پھر غور و فکر میں مصروف ہو جاتے یہاں تک کہ زندگی کا بڑا حصہ اسی عالم میں گزر گیا اور آخر کار وہ وقت آیا کہ یہ سیلاب اُبل پڑا، یہ چشمے پھوٹ نکلے اور جذبات و تاثرات کے طوفان نے الفاظ کی صورت اختیار کرلی اور انہی الفاظ کا مجموعہ "قرآن" ہے، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ الفاظ معمولی انسان کے الفاظ تھے۔ یہ الفاظ دراصل کیفیاتِ روحانی کی مسموع صورت تھے، ولولۂ رشد وہدایت کی روح القدس کا مظہر تھے، جذبۂ اصلاح و تزکیۂ اخلاق کے جبرئیل کی زبان تھے۔ یعنی یہ وہ نطقِ ہمایونی تھا جو بغیر مرتبۂ نبوت ملے ہوئے محمدؐ کو عطاہی نہ ہو سکتا تھا اور اس لئے یقیناً وہ خدا کا الہام تھا، اس کی وحی تھی، اس کا کلام تھا جسے محمدؐ نے سنایا اور جس کو سن کر دنیا محوِ حیرت ہو گئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی نئی زبان تھی، نئے الفاظ تھے بلکہ اس لئے کہ ان کے اندر نئی روح تھی، نیا اثر تھا۔ ایک قوت تھی سر تسلیم خم کرا دینے والی، ایک اعجاز تھا۔ حیران و مبہوت بنا دینے والا۔

قرآن کے اسالیبِ بیان

اگر آپ قرآن کا بغور مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ رسول اللہ کے تاثرات کے لحاظ سے اس کا اندازِ بیان بھی بدل گیا ہے۔ کہیں تو بالکل soliloquy ہے یعنی رسول اللہ نے خود اپنے نفس سے خطاب کیا ہے، کہیں انہوں نے خدا کو مخاطب کرکے اپنے جذباتِ فدویت و تشکر کا اظہار کیا ہے، کسی جگہ اپنے ابناءِ قوم و اپنے اعزّہ و احباب اور اپنے دشمنوں

کو مخاطب کیا ہے اور کہیں ایسا انداز اختیار کی ہے گویا خدا خود کچھ فرما رہا ہے اور ان مختلف اسالیبِ بیان سے صرف یہی نہیں کہ ہم رسول اللہ کے ذہنی تاثرات کی صحیح تاریخ مرتب کر سکتے ہیں بلکہ اس نتیجہ پر بھی پہنچتے ہیں کہ رسول اللہ کا تنہا مقصود کسی نہ کسی طرح لوگوں کی درستیٔ اخلاق کی طرف متوجہ کرنا تھا اور اسی مقصود کو مختلف طریقوں اور مختلف اسالیب سے پورا کیا گیا ہے۔

جس زمانہ میں رسول اللہ مبعوث ہوئے ہیں اس سے پہلے ہی عرب میں فنِ خطابت و شاعری پورے عروج پر پہنچ چکا تھا اور کاہنوں کی فصیح و بلیغ تقریریں صرف ادب و انشاء بلکہ اپنے اثرات کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتی تھیں، اہلِ عرب جاہل ضرور تھے لیکن ملک کی جغرافی خصوصیات وہاں کے ریگ زاروں کوہستانوں اور ان کی صحرائی طرز معاشرت نے انہیں دنیا کی تلخ ترین حقیقتوں کو بھی برداشت کرنے اور ان پر غور کرنے کا اہل بنا دیا تھا اور ان کے ذہن و فکر کی تمام راہیں ایک پتھریلی قسم کی ٹھوس کیفیت اپنے اندر رکھتی تھیں اور چوں کہ تہذیب و تمدن کے غیر حقیقی تکلفات سے وہ آشنا نہ تھے اس لئے زندگی کی سچی سادگی ان کے شعر و ادب میں بھی منتقل ہو گئی تھی اور اسی سے وہ متاثر ہوتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں ایسی قوم کی اصلاح کے لئے کوئی ایسا لٹریچر پیش نہیں کیا جا سکتا تھا جو ان کی ذہنی رفتار کے مطابق نہ ہوتا اور حقائقِ علمی و تاریخی سے تعلق رکھتا، خطابت سے ہی متاثر ہو سکتے تھے اور ان کی اصلاح کے لئے یہی طریقۂ کار اختیار کرنا ضروری تھا۔ پھر چوں کہ رسول اللہ ایسے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت اور پاکیزگیٔ زبان کے لحاظ سے بہت شہرت رکھتا تھا اس لئے آپ کے تمام اقوال و ارشادات کو عربوں کے ذوق کے لحاظ سے یوں بھی بلند ہونا چاہئے تھا، لیکن قرآن کی زبان میں چوں کہ علاوہ آپ کے خاندانی فصاحت و بلاغت کے آپ کے وہ بلند تاثرات بھی شامل تھے جو خدا کے منزّہ تصور میں ڈوب جانے کے بعد ہی پیدا ہو سکتے ہیں، اس لئے قرآن کا اندازِ خطابت اس وقت کی عام مروجہ خطابت سے کہیں زیادہ بلند چیز تھا اور اسی لئے اس وقت کے بڑے بڑے کاہنوں، خطیبوں اور شاعروں نے اس کو ادبی معجزہ سمجھا۔

جیسا کہ ابھی میں نے ظاہر کیا، قرآن کا اندازِ بیان ہر جگہ ایک سا نہیں ہے بلکہ وہ رسول اللہ کے تاثرات کے لحاظ سے ہر جگہ بدلتا گیا ہے لیکن کسی جگہ ان لوگوں کے ذہن و عقل سے متجاوز نہیں ہوا جن سے خطاب کیا گیا ہے اور قرآن کی سب سے بڑی بلاغت یہی ہے۔

نزولِ قرآن کا حقیقی مقصود

اس سے شائد کسی کو اختلاف نہ ہو گا کہ رسول اللہ کا مقصود انسان کے اخلاق درست کرنا بھی تھا اور ذہنی ترقیوں کی طرف مائل کرنا بھی، لیکن زیادہ اہم اخلاق کی درستی ہی تھی (کیوں کہ بغیر اس کے ذہنی ترقیاں بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے یقیناً اسلام ہی دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے روح و مادہ دونوں کی ترقی کی تعلیم ایک ساتھ پیش کی اور ان دونوں کے صحیح امتزاج کی دو صورتیں بتائیں جو اس سے قبل کسی مذہب میں نہ پائی جاتی تھیں) اور اس لئے ان کی تعلیمات کا بڑا حصہ اسی کے لئے وقف ہے پھر ان حالات میں قرآن کا مطالعہ کسی اور نقطۂ نظر سے کرنا یقیناً اصولی غلطی ہو گی۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں بہت جگہ انسان کو تعقل و تدبر، غور و فکر، تعلیم و تعلّم اور کسبِ فضل و کمال کی ہدایت کی گئی ہے لیکن خود کوئی مخصوص علمی، تاریخی یا فنی نظریہ اس نے پیش نہیں کیا اور اس کا سبب یہ تھا کہ علمی تحقیقات اور جستجوئے حقائق کے ساتھ ساتھ علمی و فنی نظریئے بدلتے رہتے ہیں اور ان کے متعلق کسی زمانہ میں کوئی لٹریچر اس دعوے کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا کہ وہ "حرفِ آخر" کی حیثیت رکھتا ہو اور قرآن کو "حرفِ آخر" ہی کی حیثیت سے پیش گیا گیا تھا اور یقیناً یہی حیثیت رکھتا ہے بشرطِ کہ ہم ضرورت سے زیادہ خوش اعتقادی سے کام لے کر اس کے صحیح مقاصد و اصول سے ہٹ کر اس کا مطالعہ نہ کریں۔

بعض حضرات اس اعتقاد کے زیر اثر کہ قرآن "جامع الکل" کتاب ہے موجودہ علمی مسائل کا حل بھی اس میں تلاش کرتے ہیں، عہدِ حاضر کے فنی نکات بھی اس میں ڈھونڈتے ہیں، یہاں تک کہ فلکیات کی پیچیدہ ریاضی بھی انہیں قرآن میں مل جاتی ہے لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ اگر کل یہ نظریئے بدل گئے جو ایک حد تک یقینی امر ہے تو وہ پھر کیا تاویل کریں گے اور قرآن کب تک اسی دماغی و ذہنی ورزش کا شکار رہے گا۔

اس لئے میری رائے میں قرآن کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ دنیا کے تمام مسائل اور ان کے جزئیات سے بھی بحث کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ قرآن اور رسول دونوں کی توہین بھی ہے۔

"رطب و یابس" دونوں کا "کتابِ مبین" میں ہونا بالکل درست ہے لیکن اس مفہوم میں نہیں جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ روحانی و مادی

دونوں قسم کی صحیح ترقی کے جو اصول ہو سکتے ہیں وہ سب اس میں پائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا، اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جس نے دین و دنیا دونوں کو یکساں اہمیت دی ہے اور کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ انسان کاروبارِ عالم سے منہ موڑ کر عضوِ معطل ہو کر رہ جائے اس لئے انسان کو سراپا سعی و عمل بننے کا درس دیا۔ اس نے ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لئے غور و فکر تعقل و تدبّر کی تاکید کی، یہاں تک کہ اس نے اسلام کا معیار ہی یہ قرار دے دیا ہے کہ اس کا ماننے والا کبھی پست حالت میں نہیں رہ سکتا (وَأَنتُمُ ٱلْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ) لیکن اسی کے ساتھ چوں کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ محض دنیاوی ترقی کو مقصدِ حقیقی قرار دینا کبھی نوعِ انسانی کے لئے مفید نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے اخلاق بھی بلند نہ ہوں اس لئے اس نے دنیاوی ترقی کی ضروری شرط یہ قرار دی کہ انسان پہلے یہ سمجھ لے کہ وہ دنیا میں فساد برپا کرنے نہیں آیا ہے بلکہ اس کا فرض تمام انسانی برادری میں رشتۂ اخوّت و مساوات قائم کرکے امن و سکون کی اشاعت کرنا ہے اور اس کی صداقت روز بہ روز زیادہ واضح ہوتی جارہی ہے۔

آج دنیا ترقی کی جن راہوں سے گزر رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اب آدمی انسان ہونے سے زیادہ کچھ کچھ خدا بھی ہو چلا ہے لیکن یہ خدا یزداں نہیں ہے بلکہ اہرمن ہے اور اس کی ذہنی ترقیاں بجائے اس کے کہ عالم میں امن و سکون پھیلائیں اس کو فتنہ و فساد کی آگ سے تباہ کرتی جارہی ہیں، برخلاف اس کے اسلام نے جس ترقی کا درس دیا وہ کرۂ ارض کو "جناتِ عدن" بنا دینے والا تھا اور اسی لئے رسول اللہ کو اس تعلیم کا صحیح مظہر قرار دے کر "رحمۃ للعالمین" کے لقب سے سرفراز کیا گیا اور آپ نے دین و دنیا کی فلاح و ترقی میں جو توازن پیدا کرنا چاہا اس کے سمجھنے کیلئے آپ کا صرف ایک ارشاد کافی ہے اور وہ یہ کہ "دنیا کے کاموں کو اس طرح انجام دو گویا تمہیں کبھی مرنا ہی نہیں اور دین کے (یعنی روح و اخلاق) کے کام اس طرح کرو گویا تمہیں ابھی مر جانا ہے۔

الغرض قرآنی تعلیمات کا اوّلین مقصد اخلاق کی درستی تھی اور جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسی مدعا کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے لیکن چوں کہ کسی قوم کی اصلاح آسان کام نہیں، خصوصیت کے ساتھ عرب جیسی جاہل و متشدد قوم کہ ان کو سمجھانا گویا پتھر میں جونک لگانا تھا اس لئے اس مقصد کی تکمیل میں آپ نے وہ طبعی اصول اختیار کئے جن کی ناکامی کا امکان ہی نہ تھا۔

قرآنی تعلیم نفسیاتی نقطۂ نظر سے

نفسیات کا مسلمہ نظریہ یہ ہے کہ تعلیم و تربیت میں رجحانات کی رعایت بہت ضروری ہے کیوں کہ رجحانات تاریخی و جغرافی ماحول کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں اور ماحول کے نتائج میں ردِّ عمل پیدا کر کے کسی متضاد کیفیت کو عرصہ تک قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ اگر ذہنی رواداری سے کام نہ لیا جائے اور آہستہ آہستہ اس کا عادی نہ بنایا جائے، اب آپ تعلیماتِ قرآنی کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اس میں بالکل اسی اصول سے کام لیا گیا ہے۔

عربوں میں بت پرستی کی شدت نے ایسا ذہنی جمود و تعطل پیدا کر دیا تھا کہ ان کی انسانی "انفرادیت" اور "اجتماعی ہیئت" دونوں محو ہو چکی تھیں اور ان کی حالت بالکل بہائم کی سی تھی جو بتوں کے وہمی و فرضی چابک سے ہانکے جا رہے تھے، ان کی پست حالت کو دور کرنے کے لئے رسول اللہ نے انہیں توحید کی طرف لانا چاہا جسے وہ بالکل بھول چکے تھے لیکن اس کی ترکیب یہ نہ تھی کہ ان کے سامنے توحید کا فلسفہ پیش کیا جاتا بلکہ اس کے لئے ایک سخت ضرب کی ضرورت تھی تاکہ ان کی ذہنی رفتار کا رخ دفعتاً بدل جائے اور اسی لئے رسول اللہ نے نہایت صاف الفاظ میں بتوں کی برائی شروع کر دی اور آخر کار ان کو توڑے بغیر باز نہ رہے لیکن چوں کہ نفسیاتی حیثیت سے یہ بات ان لوگوں کے لئے سخت ردِّ عمل پیدا کرنے والی تھی اور اس کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے کفار و مشرکین کے رجحانات کی کوئی نہ کوئی رعایت ضروری تھی، اس لئے ان کے عظیم بت کدہ کی عزت و اہمیت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا اور پرستش گاہ ہونے کی حیثیت سے کعبہ، کعبہ ہی بنا رہا۔ ورنہ خدا اور توحید کا جو پاکیزہ و بلند تصور اسلام نے پیش کیا ہے وہ کعبہ و حطیم سب سے بے نیاز ہے۔ جب رسول اللہ اپنے اس بنیادی مقصد کو حاصل کر چکے تو اپنے ابناءِ وطن کی معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کے لئے انہوں نے ہمیشہ نفسیاتی اصول اختیار کیا اور کبھی کوئی ایسا طریقہ کام میں نہیں لائے جو لوگوں کے عقول و اذہان اور ان کی اہلیتِ تاثر کے لحاظ سے غیر مفید ثابت ہوتا۔ شادی کے باب میں عربوں کے اصول اس قدر ناپسندیدہ تھے کہ انہوں نے عورتوں کو بازار کی جنس سے بھی زیادہ کم تر حیثیت بنا دیا تھا اور اس طرح گویا انسانیت کا نصف حصہ بالکل تباہ و برباد ہوا جا رہا تھا، چناں چہ آپ نے اس میں ان کی غیر محدود آزادی کو چار تک محدود کر کے اس اخلاقی ناسور کو بہت کچھ بھر دیا، ممکن

ہے کہ آپ بیک وقت صرف ایک ہی بیوی رکھنے کی اجازت دیتے، لیکن قطعِ نظر اس سے کہ اس وقت مصالح کے لحاظ سے یہ مناسب ہوتا یا نہیں اتنی شدت شائد لوگوں کو گوارا نہ ہوتی اور پھر مطلق اصلاح نہ ہو سکتی۔ لونڈی، غلاموں کے باب میں رسول اللہ کی بلند تعلیم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آزاد اور غلام کے درمیان بہ حیثیت انسان ہونے کے آپ نے کوئی فرق باقی نہیں رکھا اور گو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے آپ کلیۃً اس کا استیصال نہ کر سکے لیکن اپنے قول و عمل سے یہ ضرور بتا گئے کہ دنیا میں کوئی انسان غلام بننے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے اور اس رسم کو دنیا سے بالکل اٹھ جانا چاہیئے۔

شراب کا استعمال عرب میں نہایت بد تمیزی سے جاری تھا لیکن اس کا استیصال بھی آہستہ آہستہ تدریج کے ساتھ کیا۔ پہلے صرف شراب کی برائیاں ظاہر کیں اور کچھ لوگوں نے اس سے متاثر ہو کر اسے ترک کر دیا، پھر اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ نشہ کی حالت میں نماز ادا نہ کرو، یہ سن کر کچھ اور لوگوں نے اسے چھوڑ دیا، یہاں تک کہ جب حالات اور زیادہ موافق ہو گئے تو ترکِ مے خواری کا حکم نافذ کر دیا۔ الغرض رسول اللہ نے اصلاحِ اعمال و تزکیۂ اخلاق کے لئے جو کچھ اور جس طرح کیا وہ اس وقت کے ماحول، اہلِ عرب کی فطرت اور اپنے ذرائع و مصالح کو سامنے رکھ کر کیا اور اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔

قرآن کی تقسیم مطالب کے لحاظ سے

قرآن اپنے مطالب کے لحاظ سے کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک حصہ عبادات یا تعلیمِ اخلاق سے متعلق ہے، دوسرا معاملات سے، تیسرے میں قصص و حکایات درج ہیں اور چوتھے میں اعتقادات کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز پہلے دو حصے ہیں اور باقی دو حصے محض تدبیر و ذرائع اور اصولِ کار کی حیثیت رکھتے ہیں، کیوں کہ اگر ایک شخص قصصِ قرآنی اور معتقدات کو صحیح ماننے کے بعد عبادات و معاملات میں ہدایاتِ قرآنی کا پابند نہ ہو تو وہ کبھی سوسائٹی کے لئے مفید نہیں ہو سکتا لیکن اگر قصص و معتقدات کو نہ مانتے ہوئے وہ عبادات و معاملات میں احکامِ الٰہی کا پابند ہے تو ہیئتِ اجتماعی اور نظامِ تمدن میں یقیناً وہ ایک عضوِ مفید کی حیثیت رکھنے والا سمجھا جائے گا۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے وہ تمام اجزاء جو اسرائیلیات اور حیات بعد الموت سے تعلق رکھتے ہیں، اصل مدعا کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کا مقصود صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اخلاق کی درستی کی طرف مائل کیا جائے اور اس اصلاح پر انہیں

مضبوطی سے قائم رکھا جائے۔

انسان فطرتاً طمّاع وخود غرض واقع ہوا ہے اور اسی کے ساتھ وہ معاملات وواقعات سے بھی بہت متاثر ہوتا ہے جو اس کی ذاتی اغراض کے منافی یا معاون ہوتے ہیں۔

بعثتِ نبوی کے وقت عرب میں یہود و نصاریٰ کی بہت سی روایات رائج تھیں اور مابعد الطبیعیاتی عقائد بھی قریب قریب وہی پائے جاتے تھے جو قرآن میں مذکور ہیں لیکن ان روایات و معتقدات سے جو اعتبار و بصیرت یا ولولۂ عمل پیدا ہونا چاہیئے وہ بالکل مفقود تھا۔لوگ سنتے تھے اور انہیں اساطیر الاولین کہہ کر ٹال دیتے تھے تاہم یہ ضرور تھا کہ ان کی یہ بے پروائی جحود و انکار نہیں، بلکہ محض غفلت و سہل انگاری کا نتیجہ تھی۔انہیں اپنی بدمستیوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ان روایات و معتقدات کی روح پر غور کرتے اور ان کے اخلاق کی پستی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنی موجودہ حالت وزندگی میں کسی بلند تغیر کا امکان ہی نہ پاتے تھے۔

پھر ان حالات میں یہی مناسب تھا کہ بھولی ہوئی باتیں یاد دلا کر ان کو اصلاح کی طرف مائل کیا جائے اور کوئی ایسی نئی چیز ان کے سامنے نہ لائی جائے جس کو ان کے دماغ کسی طرح قبول ہی نہ کر سکتے تھے اگر ان روایات و معتقدات کی جگہ ان کو قوموں کے عروج وزوال کا فلسفہ اور نوامیسِ فطرت کا اصول سمجھایا جاتا یا اخلاق کے ان بلند نظریوں کو پیش کیا جاتا جو انفرادی فائدہ اور اجر وثواب کے خیال سے ہٹ کر محض اجتماعیت اور خالص احساسِ فرض شناسی سے تعلق رکھتے ہیں تو یقیناً ان پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ ہرگز تعلیماتِ اسلامی کی طرف مائل نہ ہوتے۔

عرب قوم اپنے جذبات کے لحاظ سے بڑی متشدد قوم تھی،وہ اگر کسی کے دشمن ہو جاتے تھے تو بے رحمی کا کوئی طریقہ ایسا نہیں جو انتقام لینے کے لئے صرف نہ کر دیتے ہوں اور ذراسی بات پر سالہاسال تک لڑتے جھگڑتے نہ رہتے ہوں، الغرض افادی حیثیت سے ان کے مشاغلِ زندگی کچھ نہ تھے اور سوا اس کے کہ وہ اپنی قوتیں صرف جسمانی و شہوانی لذتوں کے حصول میں صرف کر دیں، کچھ نہ جانتے تھے۔

ان کے عیش و مسرت کا انتہائی تخیل دودھ، شہد، شراب اور عورت سے آگے نہ بڑھتا تھا اور ان کی ایذاء پسندی کا ابتدائی تخیل بھی اس سے کم نہ تھا کہ دشمن کو ویسی ہی تکلیف پہنچائی جائے جیسے آگ میں ڈالنے سے کسی کو پہنچ سکتی ہے اس لئے اگر انہیں اچھی

باتوں کی طرف یہ کہہ کر مائل کیا جاتا کہ اس کے عوض میں انہیں ایک روحانی ابدی راحت حاصل ہوگی اور بری باتوں سے انہیں یہ کہہ کر ہٹایا جاتا کہ اس کی سزا انہیں روحانی کرب و تکلیف کی صورت میں ملے گی تو وہ اس بیان سے قطعاً متاثر نہ ہوتے کیوں کہ ان کے ذہن و عقل نے اتنی ترقی نہ کی تھی کہ وہ لذت و اَلم کے اس بلند فلسفہ کو سمجھ سکتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلام اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہوتا۔

عذابِ قبر، نکیرین، حشر و نشر، میزان و صراط، ہاویہ و جہنم، طوبیٰ و فردوس، کوثر و سلسبیل، حور و قصور کا بیان جس انداز سے قرآن میں کیا گیا ہے وہ سب عربوں کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور اسلام سے پہلے جن مذاہب نے اس نوع کا اندازِ بیان اختیار کیا تھا، انہوں نے بھی انسان کی اسی عام ذہنیت کو سامنے رکھ کر حساب و کتاب اور سزا و جزا کی یہی مادی صورتیں پیش کی تھیں۔

اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ انبیاء نے جو مابعد الطبیعیاتی عقائد پیش کئے تھے وہ ان کو واقعی ویسا ہی سمجھتے تھے جیسا کہ انہوں نے ظاہر کیا یا صرف اصلاح کی غرض سے مصلحتاً یہ اندازِ بیان اختیار کیا تھا۔اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں، اگر ضرورت سے زیادہ خوش اعتقادی سے کام نہ لیا جائے۔

اس سے تو شائد کسی کو انکار نہ ہو گا کہ انسان کی ذہنی و عقلی ترقیاں تدریج کے ساتھ ہوئی ہیں اور انبیاء و مصلحین قوم بھی اس کلّیہ سے مستثنٰی نہیں ہیں جو علمی حقائق آج دریافت ہوئے ہیں وہ آج ہی دریافت ہو سکتے تھے، اس سے قبل ان کا علم نا ممکن تھا اس لئے رسول اللہ سے قبل انبیاء نے جن عقائد کی تعلیم دی تھی، وہ یقیناً ان کو حقیقت سمجھتے تھے اور کوئی مصلحت، ان کے سامنے نہ تھی لیکن قرآن و احادیث میں البتہ بعض بیانات ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ کے ذہن میں دوزخ و جنت کا مفہوم ادیانِ سابقہ کے سمجھے ہوئے مفہوم سے مختلف تھا۔ یہ موضوع ایک بسیط گفتگو چاہتا ہے تاہم اجمالاً بعض تصریحات کا ذکر یہاں بھی ضروری ہے۔

جنت

اس میں شک نہیں کہ فردوس کے بیان میں قرآن بھی بہت سی باتیں ایسی پیش کرتا ہے جن کا تعلق مادی دنیا اور جسمانی لذتوں اور راحتوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ اندازِ بیان یقیناً تمثیلی ہے اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث دونوں سے ملتا ہے:

سورۂ سجدہ میں برے اور اچھے اعمال کی سزا و جزا کا ذکر کرتے ہوئے نعائمِ جنت کی حقیقت ان الفاظ میں ظاہر کی گئی ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾

یعنی کوئی اس حقیقت کو نہیں جان سکتا کہ اچھے کام کرنے والوں کی جزا کس کس طرح ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائے گی۔

ظاہر ہے کہ آنکھوں کی ٹھنڈک سے یہاں ظاہری آنکھ کی ٹھنڈک مراد نہیں بل کہ اس سے مقصود دل و دماغ اور قلب و روح کے سکون کو ظاہر کرنا ہے۔

سورۂ محمدؐ میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ جنت کے متعلق جو بیانات پیش کئے جاتے ہیں وہ تمثیلی ہیں:

مَّثَلُ ٱلْجَنَّةِ ٱلَّتِي وُعِدَ ٱلْمُتَّقُونَ فِيهَآ أَنْهَـٰرٌ مِّن مَّآءٍ غَيْرِ ءَاسِنٍ وَأَنْهَـٰرٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُۥ وَأَنْهَـٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّـٰرِبِينَ وَأَنْهَـٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ ٱلثَّمَرَٰتِ

یعنی پرہیز گاروں کے لئے جو وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کے لئے جنت میں دودھ، شراب اور شہد کی نہریں ہوں گی لیکن یہ سب تشبیہات ہیں۔

رسول اللہ کی ایک حدیث جسے بخاری نے نقل کیا ہے اس مسئلہ کو اور زیادہ صاف کر دیتی ہے، آپ سے دریافت کیا گیا کہ نعائمِ جنت کی حقیقت کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ وہ لذتیں ایسی ہیں کہ:

مالا عین رأت و مالا اذن سمعت و ما خطر علی قلب بشر

نہ کسی آنکھ نے آج تک ان کو دیکھا ہے نہ کسی کان نے ان کا ذکر سنا ہے اور نہ انسان ان کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکتا ہے۔

تلاش سے متعدد ایسی آیات و احادیث پیش کی جا سکتی ہیں جن سے جنت کا صحیح مفہوم متعین ہو سکتا ہے۔

دوزخ

جنت کی طرح دوزخ کا مفہوم بھی قرآن میں مادیات سے تعلق نہیں رکھتا اور اس کے ثبوت میں غالبًا قرآن میں صرف ایک آیت کو پیش کرنا کافی ہو گا جس میں آتشِ دوزخ کی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

نَارُ ٱللَّهِ ٱلۡمُوقَدَةُ ۝٦ ٱلَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى ٱلۡأَفۡـِٔدَةِ ۝٧

یعنی دوزخ کی آگ وہ خدائی آگ ہے جو انسان کے دلوں پر مستولّی ہوتی ہے۔

اگر دوزخ کی آگ سے یہی دنیا کی آگ مراد ہوتی تو اس کو خدا سے منسوب کر کے نار اللہ نہ کہا جاتا اور نہ یہ کہ وہ دلوں سے تعلق رکھتی ہے، ظاہر ہے دل کی آگ وہی ہو سکتی ہے جو انسان کو روحانی کرب میں مبتلا کر دے اور ظاہری آگ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔

دیگر معتقدات

دوزخ و جنت کی طرح اور تمام عقائد جو میزان، صراط، حشر و نشر اور ملائکہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی سب مادیات سے علیحدہ اپنا مفہوم جداگانہ رکھتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات خود قرآن سے ثابت ہو سکتی ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اسلام میں حیات بعد الموت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ ادیانِ سابقہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور اس سلسلہ میں تقریباً تمام انہی عقائد کو پیش کیا گیا ہے جو اسلام سے قبل رائج تھے لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں قرآن میں ان کو حقائق کی صورت سے نہیں بلکہ تمثیل و تعبیر کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

چوں کہ عام ذہنِ انسانی مادیات سے ہٹ کر کوئی روحانی تصورِ جزا و سزا کا قائم نہیں کر سکتا اس لئے اس کو سمجھانے کے لئے ضروری تھا کہ مثال میں دنیا کی وہی چیزیں پیش کی جاتیں جن کو انسان روز دیکھتا رہتا ہے اور وہ جانتا تھا کہ جب کوئی شخص جرم کرتا ہے تو حکومت اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے اسے گرفتار کراتی ہے۔ اس کے اعمال کا احتساب کرتی ہے اور جب جرم ثابت ہو جاتا ہے تو نوعیتِ جرم کے لحاظ سے سزا دی جاتی ہے اور اگر آپ مذاہب کے مابعد الطبیعیاتی عقائد کا تجزیہ کریں گے تو وہ سب اسی دنیاوی طریقِ احتساب و سزا کی مختلف صورتیں نظر آئیں گی۔

پھر اگر "رسول اللہ" لوگوں کی اس عام ذہنیت کا خیال نہ کر کے عذاب، ثواب یا لذت و الم کا وہ فلسفہ پیش کرتے جس کا تعلق روحانی زندگی سے ہے تو یقیناً کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوتا۔

یہی حال قصص و روایات کا ہے کہ قرآن قطعاً اس سے بحث نہیں کرتا کہ وہ صحیح ہیں یا غلط، بل کہ انہیں محض اعتبار و بصیرت کے لئے پیش کرتا ہے تا کہ لوگ انہیں سنیں اور عبرت حاصل کریں۔

احادیث

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ نے اپنے دورانِ رسالت میں لوگوں سے خدا جانے کتنی باتیں کہی ہوں گی لیکن چوں کہ قرآن کی طرح آپ کے اقوال کو محفوظ رکھنے کا طریقہ رائج نہ تھا اس لئے آج ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے کس سے کب، کیا فرمایا اور اگر کوئی آپ کے کسی قول کی کوئی نقل بھی کرے تو یہ اعتبار کیوں کر آسکتا ہے جو بات بیسیوں آدمیوں کی وساطت سے نقل در نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہے وہ واقع وہی ہے جو رسول اللہ نے فرمائی تھی۔

احادیث کے نقل و جمع کرنے کا رواج بہت بعد میں ہوا ہے اور ہر چند جامعینِ احادیث نے اس باب میں بڑی چھان بین کی ہے اور ''اسماء الرجال'' کا انتقادی فن ہی اس سلسلہ میں علیحدہ قائم ہو گیا، پھر بھی کتبِ احادیث میں ''خرافیات'' کا بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔

رسول اللہ کی رحلت کے بعد جب حکومتِ اسلام کے سامنے نئے نئے مسائل آئے، تو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق رسول اللہ کے اقوال و ہدایات معلوم کئے جائیں اور ایسے لوگوں کی جستجو ہوئی جن کو آپ کے ارشادات کا علم ہو، پھر چوں کہ اسلام کی حیثیت اب خالص مذہبی نہ رہی تھی بل کہ اس میں سیاسی مصالح اور ذاتی و جماعتی اغراض بھی شامل ہو گئے تھے اس لئے خلفاء چاہتے تھے کہ انھی کی خواہشوں کے مطابق احادیث میسر آئیں اور اس طرح بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں وضعِ احادیث کی ٹکسالیں قائم ہو گئیں اور لوگوں نے طمع و خوف کے زیر اثر لاکھوں حدیثیں اپنی طرف سے گھڑ کر رسول اللہ سے منسوب کر دیں، اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ خلفاءِ وقت کے اغراض پورے ہو گئے لیکن اسلام کے صحیح خط و خال بالکل چھپ گئے اور لوگ اسلام کا مطالعہ بجائے قرآن کے احادیث سے کرنے لگے اور پھر انھی احادیث کی بنیاد پر مذہبی کتابیں تصنیف ہونے لگیں، یہاں تک کہ لغویات و مزخرفات کا ایک انبار لگ گیا اور اسی انبار کو سامنے رکھ کر اسلام پر اعتراضات ہونے لگے۔

ٹسڈل کے اعتراضات

جن حضرات نے میرے نوٹ اور استدراکات کو ملاحظہ فرمایا ہے ان سے یہ امر پوشیدہ نہ ہو گا کہ عبادات، معاملات و اخلاقیات کے متعلق ٹسڈل نے جو اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب میں اسی وقت دے چکا ہوں اور اب ان سے اعتناء کرنے کی ضرورت نہیں البتہ

اسرائیلیات و معتقدات کے متعلق جو کچھ اس نے کہا ہے اس پر ٹسڈل کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ علمی و عقلی حیثیت سے غور کرنا ضروری ہے تا کہ اسلام کی منقح صورت سامنے آئے۔

ٹسڈل کو خاموش کرنا تو بہت آسان بات ہے کیوں کہ انجیل و تورات کے محرّف ہونے سے تو خود عیسائیوں کو بھی انکار نہیں اور ان کو تو صرف یہ کہہ کر خاموش کیا جا سکتا ہے کہ تحریف شدہ کتابوں کو سامنے رکھ کر قرآن کے بیانات پر نکتہ چینی کرنا، جن کے غیر محرف ہونے کا ساری دنیا کو اعتراف ہے کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن اس سلسلہ میں قطعِ نظر اس سے کہ ٹسڈل یا کوئی اور کیا کہتا ہے، خود قرآن کے بیانات خواہ وہ کہیں سے ماخوذ ہوں یا نہ ہوں، عقلی نقطۂ نظر سے ضرور زیرِ بحث آجاتے ہیں اور انہی پر ہم کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں، قرآن کے قصص و روایات یقیناً قدیم اسرائیلیات سے لئے گئے ہیں لیکن تاریخی حیثیت سے نہیں بل کہ صرف لوگوں میں کیفیتِ اعتبار و بصیرت پیدا کرنے کے لئے اور اس لئے ان کے ماخوذ ہونے یا نقل کئے جانے یا خلافِ عقل ہونے کا سوال ہی سامنے نہیں آتا۔

یہی حال معتقدات کا ہے کہ وہ بھی دراصل سب تمثیلی حیثیت سے بیان کئے گئے ہیں اور اس باب میں اسلام کا امتیاز یہی ہے کہ اسی نے سب سے پہلے ادیانِ سابقہ کے ان معتقدات کی حقیقت کو ظاہر کیا۔

لیکن اگر علماءِ اسلام کے نزدیک قرآن کے قصص و حکایات واقعی تاریخی حقیقت رکھتے ہیں اور معتقدات کا تعلق مادیات سے ہے تو اس کے ثبوت کی ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے۔

روحانی اثرات

اس سلسلہ میں مجھے ایک بات اور عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ بسلسلۂ معتقدات میں عذاب، ثواب وغیرہ کو روحانی یا احساسی چیز سمجھتا ہوں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ میں بقاءِ روح اور حیات بعد الموت کا اسی معنیٰ میں قائل ہوں جس معنیٰ میں عام طور پر لوگ اسے سمجھتے ہیں۔

روح اور روحانیات کا تعلق بھی میرے نزدیک اسی دنیا سے ہے جو انسان کے اعمال کے لحاظ سے دوزخ بھی بن جاتی ہے اور جنت بھی، جہاں ہمارے اعمال آئندہ نسلوں کے لئے اچھا یا برا نقش چھوڑ کر ہم کو مرنے کے بعد بھی نہیں مرنے دیتے۔

سامی مذاہب کی روایات

علمی و تاریخی نقطۂ نظر سے

تخلیقِ انسان

کتابِ پیدائش کے باب ۱ آیت ۲۷ میں لکھا ہے کہ "خدا نے چھٹے روز انسان کے نر و مادہ دونوں کو اپنی صورت پر پیدا کیا" اس کے بعد آیت ۲۲ میں الہام درج ہے کہ "خداوند اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا" اور پھر اس کتاب کے باب ۲ آیت ۷ میں تحریر ہے کہ "خدا نے زمین کی مٹی سے آدم کو پیدا کیا" آدم کا مٹی سے پیدا ہونے کا خیال تمام سامی مذاہب (موسوی، عیسوی اور اسلام) میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مٹی کی چیزیں بنانے کا فن عہدِ قدیم میں بہت ترقی کر گیا تھا۔ اول اول وہ لوگ صرف ایسی چیزیں مٹی سے بناتے تھے جن کی ضرورت ہوتی تھی پھر انسانوں اور بعد ازاں دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیں مٹی سے بنانے لگے۔

پروفیسر کلیفورڈ ایچ فار لکھتے ہیں کہ "جب ان قدیم زمانہ کے کاری گروں کا خیال زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا تو ان کی قوتِ شعور نے ان میں یہ عقیدہ پیدا کیا کہ خود انسان کو بھی کسی اعلیٰ ہستی نے ازل میں مٹی سے ہی بنایا تھا"۔ چناں چہ اہلِ بابل اپنے صنمِ کبیر کو "بَعل" یا "بِعل" کہا کرتے تھے جس کا معنٰی ہیں "کمہار" اور اہلِ مصر بھی اپنے بڑے دیوتا کو خنومنؤ کہا کرتے تھے اس مصری لفظ کے معنٰی بھی کمہار کے ہیں۔ عبرانیوں میں انسان کو "آدم" کہتے ہیں "ۃ" ان کے یہاں لاحقۂ تانیث ہے۔ آدمۃ کے معنٰی ان کے ہاں مٹی کے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود عبرانی زبان ہی اس عقیدہ کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا۔

پروفیسر فار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عبرانی زبان میں جو قصۂ آفرینش آدم کا پایا جاتا ہے، خود عبرانیوں کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہے، حالاں کہ حقیقت یہ نہیں ہے بل کہ

یہ خیال بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔

آفرینش و ہبوطِ آدم

توریت میں آفرینشِ عالم کے متعلق جو بیان دیا گیا ہے اس میں اس قدر تناقض و اختلاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر گز کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

آفرینشِ آدم سے لے کر واقعۂ ہبوطِ آدم تک کی تمام وہ تفصیلات لیجئے جو توریت میں پائی جاتی ہیں اور جن سے تقریباً ہر شخص واقف ہے یہ ہیں: "خدا کا چھ دن میں کائنات کی مختلف مخلوقات کو پیدا کرنا، ساتویں دن آرام کرنا، آدم و حوا کی پیدائش، باغ عدن میں ان کا قیام، شجرِ ممنوع کے پاس نہ جانے کا حکم، سانپ کا اغواء اور پھر آدم کا اس درخت کے پاس جا کر پھل کھانا وغیرہ وغیرہ"

توریت کو الہامی کتاب ماننے والے کہتے ہیں کہ یہ تمام واقعات ذریعۂ وحی، خدا کی طرف سے بتائے گئے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ سے قبل کسی کو ان حقیقتوں کا علم نہ تھا۔ حالاں کہ جس وقت ہم آثارِ قدیمہ اور باقیاتِ عہدِ عتیق کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب کے سب یا اکثر اعتقادات وہ ہیں جو حضرت موسیٰ سے بہت قبل دنیا میں پائے جاتے تھے۔ کیوں کہ جب آشوریوں نے فلسطین کو فتح کیا اور غیر ملکی لوگ وہاں آباد ہوئے تو اپنے ساتھ وہ تمام افسانے بھی لائے جو ان کے یہاں رائج تھے۔ چناں چہ فسانۂ عدن ہی کو لیجئے جو مصر، جنوبی ہندوستان، چین، ایران، فینقیہ اور قدیم میکسیکو تک میں پایا جاتا ہے۔

فرنیکلسن نے اپنی کتاب "بدھ مت والے اور جینی" میں لکھا ہے کہ "ہمارے اوّلین والدین (آدم و حوّا) کے ہبوط کے واقعہ کی ایک نہایت دل چسپ تصویر پتھر پر کھدی ہوئی ملکِ نوبہ میں مقامِ اپسامبول کے ایک شاندار مندر میں سیاح ولسن نے دیکھی تھی۔ سیاح موصوف بیان کرتے ہیں کہ "اس غار میں آدم و حوا کی تصویر ٹھیک اسی زندگی کی ہے جو باغِ عدن میں بتائی جاتی ہے۔ اس میں سانپ کو درخت کے گرد لپٹا ہوا نہایت خصوصیت کے ساتھ دکھایا ہے" ایسی ہی ایک تصویر کرنیل کومبس بھی لائے تھے۔ یہ تصویر جنوبی ہندوستان کے ایک مندر میں ایک سنگین ستون پر کندہ تھی۔ اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ آدم و حوا بہشتی درخت کے نیچے کھڑے ہیں اور درخت کی گنجان شاخوں

میں لپٹا ہوا ایک سانپ چھپا ہے جو اپنے منہ میں اس درخت کا پھل لئے ہوئے ہے اور آدم وحوا کو کھانے کی ترغیب دے رہا ہے۔

مجوسیوں میں جو باغِ عدن کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں لکھا ہے کہ "ایرانیوں کے خدائے خیر ہورامزدا نے زمین اور انسان کو پیدا کیا اور کے لئے آرام وراحت کے جملہ سامان بہم پہنچائے یعنی جس طرح بائبل کی کتابِ پیدائش کے مطابق ایلوہیم نے تکوینِ عالم کے کام کو چھ دن میں ختم کیا تھا اسی طرح ہورامزدہ نے تکوین کے کام کو چھ اوقات میں درجۂ تکمیل تک پہنچایا اور مرد وعورت کو اس نے بھی چھٹے روز پیدا کیا۔ مرد کا نام اس نے "آدمہ" اور عورت کا نام "ایوہ" (Evah) رکھا تھا۔ ساتویں دن ہورامزدہ نے آرام کیا۔ یہ دن سنیچر یعنی زحل کا تھا۔ قدیم ملک اتروریہ (اطالیہ) کی روایتِ آفرینش بھی قریب قریب مجوسیوں کی روایت سے ملتی جلتی ہے۔ ڈاکٹر طامس انمان لکھتے ہیں کہ "ایرانیوں کے ساتھ میل جول ہونے سے پیشتر عبرانیوں کے ہاں ہفتہ کا دن یوم السبت نہیں مانا جاتا تھا۔ دوسری قومیں اس دن کو اپنا مقدس دن خیال کرتی تھیں۔ چناں چہ انہیں دیگر اقوام وملل کے لوگوں سے لے کر عبرانیوں نے بھی یہ رسم اختیار کی"۔

مجوسیوں کی روایت ہے کہ اہرمن نے ہورامزدا کے خلاف بغاوت کی اور وہ دنیا کی تمام برائیوں کا بانی "خدائے شر" بن گیا (بائبل میں اسی کا نام "شیطان" رکھا ہے) ایک خاص قسم کا پھل کھا کر اہرمن نے اپنی ہیئت سانپ کی سی بنالی اور زمین پر لوگوں کو بہکانے لگا۔ وہ لوگوں کو عیش پرستی، انتقام، ظلم و ستم اور دروغ گوئی اور افتراء پردازی وغیرہ کی ترغیب دیتا تھا۔ سب سے پہلے مرد عورت کو ایک عجیب وغریب درخت "ہسوم" (یہی سنسکرت میں "سوم" ہے) کا پھل کھلا کر اس نے ان کے دلوں میں برے خیالات پیدا کر دیئے جس کے باعث وہ گرا دیئے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے جانوروں کو مارا اور ان کی کھالوں سے تن پوشی کی۔ ہورامزدا اور اہرمن کی اس جنگ کی وجہ سے اب دنیا کے ہر حصہ میں خیر وشر پائے جاتے ہیں، مگر مجوسیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ پرستارانِ ہورامزدا کو فتح حاصل ہوگی۔ اہرمن مغلوب ہوگا اس وقت امن و صلح، اخوت و مسرت دنیا میں قائم ہو جائے گی۔ اہلِ میدیا (Medes) اور ایرانیوں میں تقریباً ۷۰۰ ق م ایک نبی بنام زردشت (زرتشتر) مبعوث ہوا جس نے ایرانیوں کے قدیم مذہب کی اصلاح کی۔ اس کے زمانہ کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ عہدِ سائرس (Cyrus) سے

لے کر جو ۵۵۰ برس قبلِ مسیح گزرا ہے، اسکندرِ اعظم کے ہاتھوں ایران فتح ہونے تک تمام مغربی ایشیا میں دینِ زردشت ہی کا غلبہ تھا۔ تکوینِ عالم کے متعلق مجوسیوں کے یہاں جو کچھ روایات ہیں ان کا علم ہم کو خاص طور پر پارسیوں کی کتاب "ژند واوستا" سے حاصل ہوتا ہے۔ڈاکٹر فان بولیین لکھتے ہیں کہ "بائبل کی کتابِ پیدائش کے قصوں اور ژند کے بیان میں نہایت ہی گہرا تعلق اور مطابقت پائی جاتی ہے"

مسٹر جارج اسمتھ نے (جن کا تعلق برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقیہ سے ہے) ایسی آشوری الواحِ گلی کھود نکالی ہیں جو ۱۵۰۰ سے لے کر دو ہزار سال قبل مسیح تک کی ہیں، (یعنی حضرت موسیٰ کی پیدائش سے بھی صدیوں قبل کی) ان الواحِ گِل پر آفرینشِ عالم، ہبوطِ آدم، برجِ بابل، انتشارِ اقوام و ملل اور طوفانِ نوح کا حال بالکل ایسا ہی لکھا ہے جیسا کہ بائبل کی کتابِ پیدائش میں بیان کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ خطِ میخی کے یہ کتبے مکمل نہیں ہیں۔یعنی ان قصص کا کچھ اہم حصہ ضائع ہو گیا اور جس حصہ میں درخت، سانپ اور طوفانِ نوح کے حالات درج ہیں اس کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہے مگر سرزمینِ بابل سے بعض ایسے جواہرات دستیاب ہوئے ہیں جن پر باغِ عدن کے واقعات کی تصویریں کندہ ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام باتیں ان کی روایات میں شامل تھیں۔

بائبل کی کتابِ پیدائش میں جس "شجرۃ الحیوٰۃ" کا ذکر کیا ہے وہ بالکل ویسا ہے جیسا کہ خداوند انوؔ (Anu) کا مقدس باغیچہ تھا جس کی نگہبانی تلوار کے ذریعہ سے ہوتی تھی، جو چاروں طرف گھومتی تھی، اس مقدس درخت کی تصویر مع "محافظ فرشتوں" کے مسٹر اسمتھ نے ایک آشوری اسطوانہ سے نقل کر کے اپنی کتاب کے صفحہ ۸۱ پر دی ہے اور اسی صفحہ پر ایک دوسری تصویر بھی ہے جس میں دو آدمی درخت کے اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے ہیں اور پھل توڑنے کے لئے ہاتھ پھیلا رہے ہیں، ان آدمیوں میں جو عورت ہے اس کی پشت پر سانپ کی تصویر کھنچی ہوئی ہے۔اصل تصویر برٹش میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے، مسٹر اسمتھ لکھتے ہیں کہ: "ہم خوب جانتے ہیں کہ ان قدیم کتبوں میں اس قسم کی تصویریں خیالی یا اتفاقی نہیں ہو سکتیں بلکہ وہ واقعاتِ گذشتہ یا مفروضہ واقعات کے مناظر ہیں اور یہ واقعات ان کی قدیم روایات سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہبوطِ آدم کا جو قصہ بائبل کی کتابِ پیدائش میں دیا گیا ہے وہی قصہ قدیم زمانے کے اہلِ

بابل میں بھی رائج تھا"۔

جو اشوری کتبے مسٹر اسمتھ نے بر آمد کئے ہیں اگرچہ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو آشورین پال (۶۸۸لغایتہ ۶۲۲ق م) کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ الواحِ گلی جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اصلی نہیں ہیں بلکہ قدیم الواح کی نقلیں ہیں جو اور بھی زیادہ پرانی ہوں گی۔ اہل آشوریہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لٹریچر ان کے یہاں بابلی ذرائع سے آیا تھا اور خطِ میخی کی ان تختیوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۵۰۰ اور ۱۵۰۰ ق م کے درمیانی زمانہ میں اہلِ بابل بھی انہی عقائد کے ماننے والے تھے جو بائبل کی کتابِ پیدائش میں بیان کئے گئے ہیں۔

مسٹر پیرپانٹ مارگین کے پاس قدیم کتبے یا نقوش کے ٹکڑے ایسے موجود ہیں جن میں طوفانِ نوح کا حال درج ہے اور یہ انیس سو برس قبلِ مسیح کے ہیں، مگر ان کے ٹکڑوں کی نسبت بھی یہ خیال ہے کہ وہ اصلی نہیں ہیں بلکہ اور زیادہ قدیم کتبوں کی نقلیں ہیں۔

۱۵۴۳ء کا واقعہ ہے کہ ایک فرانسیسی ماہرِ آثارِ قدیمہ موسیو ایمیلی باتے نے نینوا کے قریب ایک ترکی گاؤں خورس آباد میں کھدائی شروع کی۔ یہاں مزدور کھودتے کھودتے ایک آشوری محل کے کھنڈر تک پہنچ گئے جو کسی زمانے میں شاہ سارگون دوم (۷۲۲لغایتہ ۷۵ق م) کا قصرِ شاہی تھا۔ اس واقعہ کے بعد ایک جوشیلے نوجوان انگریز سمی آسٹن اینچ لیارڈ نے نمرود کے بڑے ٹیلے کے نیچے قدیم شہر قلاہ کھود نکالا، اس کے بعد اس نے قصرِ شاہی بر آمد کیا جو نینوا میں سناحریب (۷۰۵لغایتہ ۶۸۱ق م) نے تعمیر کیا تھا اور ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سنگِ موسیٰ کی چند لوحیں بر آمد ہوئی تھیں جو اس وقت ییل یونیورسٹی کے میوزیم میں موجود ہیں ان کی سطح پر ایک پیغام ایسے رسم الخط میں تحریر ہے جو مسیح سے غالباً ۶ ہزار سال پیشتر رائج تھا۔

۱۹۲۴ء میں خرابہ شہر کش، عراق کے ایک قدیم سلطنت کے پایۂ تخت میں کچھ اینٹیں دستیاب ہوئی تھیں اور ایک بہت بلند برج کے کھنڈر دریافت ہوئے تھے جس کی تعمیر جیسا کہ اینٹوں سے ظاہر ہوتا ہے زائد از چہار ہزار سال قبل ہوئی تھی توقع کی جاتی ہے کہ جب اس تعمیر کے تمام حصوں کو صاف کر لیا جائے گا تو سات ہزار برس قبلِ مسیح کے زمانے کی لکھی ہوئی تاریخ بر آمد ہو گی۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ برج غالباً وہی ہے جو قدیم روایات میں برج بابل کے نام سے پکارا گیا ہے اور اس کا تعلق طوفانِ نوح سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ شمس ایلو کے زمانہ کی بھی کچھ اینٹیں بر آمد ہوئی ہیں جو بابل کے اول شاہی خاندان کا

ساتواں بادشاہ تھا(اس کازمانہ ۲۰۸۰ لغایتہ ۲۰۴۳ق م ہے) اینٹوں کی تحریر کاترجمہ بھی کر لیا گیاہے ۔ اس کے علاوہ اسی خاندانِ شاہی کے دوسرے بادشاہ شمس الایلو (۲۲۱۱ لغایتہ ۲۱۷۶ق م) کی سلطنت کے زمانہ کی بھی منقوش اینٹیں بر آمد ہوئی ہیں اور ایک قدیم مندر بھی بر آمد ہوا ہے جو شمس الایلو نے جنگ کے دیوتا، ایل بابا کے نام پر بنایا تھا۔ماہرینِ فن کا خیال ہے کہ اب کھودتے کھودتے مزدور مٹی کی اس تہہ تک پہنچ گئے ہیں جہاں سے قدیم ترین بابلی تمدن کی باقیات بر آمد ہوں گی اور توقع کی جاتی ہے کہ بہت جلد ایسے آثار دستیاب ہوں گے جس سے عراق کی قدیم ترین تاریخ پر روشنی پڑے گی۔

بہت عرصہ ہوا پروفیسر اگناز گولڈ زہیر نے اس امر کے نہایت قوی ثبوت پیش کئے تھے کہ عبرانیوں نے آفرینشِ عالم کے حالات قدیم اہلِ بابل سے لئے تھے، پروفیسر موصوف نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "بورے" (Bore) اور یوسر (Yoser) یعنی "خالق" کی صفات کا خیال سب سے پہلے ان عبرانیوں نے ظاہر کیا تھا جو اسیر ہو کر بابل گئے تھے یا جو وہاں بحالتِ اسیری پیدا ہوئے تھے اسی طرح باغِ عدن کا قصہ جو تاریخِ آفرینش کا ضمیمہ ہے خاص بابل میں لکھا گیا تھا۔ یہی باعث ہے کہ توریت کی کسی دوسری کتاب یا عہد نامۂ عتیق کے کسی دوسرے صحیفہ میں کتابِ پیدائش کے قصہ کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ مسٹر لنکان لکھتے ہیں کہ عبرانیوں کی قدیم کتبِ مقدسہ میں ہبوطِ آدم کے قصہ کا مطلقاً کہیں ذکر نہیں آیا۔ آدم، حوا، سانپ، عورت کا اپنے شوہر کو ورغلانا وغیرہ یہ سب وہ باتیں ہیں جن کا اسرائیلی کتب میں کہیں بھی ذکر نہیں۔ پروفیسر جان فسکے تحریر کرتے ہیں کہ "باغِ عدن میں سانپ کا قصہ مع تمام اپنی تفصیلات کے آریہ قوم سے لیا گیا ہے، شیطان کے "خالقِ شر" ہونے کا خیال صرف بعد کی لکھی ہوئی کتابوں میں آتا ہے اور یہ کتابیں اس وقت تصنیف ہوئیں تھیں جب کہ یہودیوں میں ایرانی خیالات بکثرت رائج ہو گئے تھے۔

باغ عدن اور آدم

اس باب میں اسفار موسیٰ کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ خدا نے آدم و حوا کا جوڑ پیدا کر کے کہا کہ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاؤ، نسل بڑھاؤ زمین کو رونق دو اور اس پر حکومت کرو۔ دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف آدم کو پیدا کیا اور باغِ عدن میں اسے متمکن کر کے حکم دیا کہ اس کی حفاظت اور آراستگی کر۔

اوّل بیان کے مطابق اس کو وہ تمام پودے دے دیئے گئے جو زمین پر پائے جاتے ہیں

اور ان کے پھل کھانے کی اجازت دے دی گئی دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان درختوں میں سے ایک درخت مستثنٰی کر دیا گیا جو علم کا درخت تھا کیوں کہ یہ بہت زہریلا تھا۔
اگر کہا جائے کہ درختِ علم صرف کنایہ ہے کسی اور حقیقت کی طرف تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ خصوصیت کیا ہے اور اس اشارہ کنایہ کے استعمال کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اگر اس درخت کو واقعی درخت سمجھا جائے تو قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اس درخت کو پیدا ہی کیوں کیا اگر اسے پیدا کرنا تھا تو عدن سے باہر خدا کی خدائی پڑی ہوئی تھی کہیں اور پیدا کیا جاتا اور اگر پیدا کر کے اسے ممنوع قرار دینا تھا تو آدم کو اس سے علیحدہ رکھا ہوتا ان تمام سوالات کا جواب اسفارِ موسیٰ میں صرف اس قدر ملتا ہے کہ:

"خدا نے کہا دیکھو، انسان اس درخت کا پھل کھا کر نیک و بد سے واقف ہو گیا اور ہم جیسا بن گیا پس ہو سکتا ہے کہ اب وہ شجرِ حیات کا پھل کھا کر غیر فانی بھی ہو جائے اس لیے اس کو عدن سے نکال دینا چاہیئے چناں چہ وہ وہاں سے علیحدہ کر کے زمین پر پھینک دیا گیا تا کہ جَوتے اور بوئے"۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا یہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان شجرِ علم کا پھل کھا کر نیک و بد سے واقف ہو جائے گویا وہ انسان کو ہمیشہ جاہل کندہ ناتراش اور بے وقوف رکھنا چاہتا تھا۔
اسفارِ خمسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو شجر حیات کی حفاظت کا بہت زیادہ خیال تھا چناں چہ آدم کے نکالے جانے کے بعد بھی اس قدر احتیاط سے کام لیا گیا کہ اس کے چاروں طرف فرشتے مامور کر دیے گئے جو شعلہ فشاں تلواریں لیے ہوئے اس کی نگرانی کرتے تھے۔
مفسرین میں باغِ عدن کی جائے وقوع کے متعلق بہت اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ تیسرے آسمان میں تھا بعض چوتھا آسمان بتاتے ہیں کوئی چاند میں اس کا واقعہ ہونا ظاہر کرتا ہے اور کوئی خلا میں (کشش زمین کی حدود سے بلند) بعض اس کا موقعہ زمین ہی بتاتے ہیں اور بعض زیر زمین کوئی قطبِ شمالی میں اس کا سراغ پاتا ہے کوئی قطبِ جنوبی میں اسی طرح یہ اختلافِ روایات چین تا تار، لنکا، آرمینیا، افریقہ، عراق، شام، ایران، عرب، بابل، اسیریا، فلسطین، اور یورپ وغیرہ میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔
انسان کے عدن سے نکالے جانے کے سلسلہ میں سانپ کا ذکر بھی اسفارِ خمسہ میں پایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سانپ نے حوا کو ترغیب دلائی تھی کہ وہ شجرِ ممنوع کا پھل

کھائیں اور حوا نے اپنے شوہر کو بھی آمادہ کیا اس پر خدا نے سانپ کو تو یہ سزا دی کہ اسے رینگنے والا جانور بنا دیا اور آدم و حوا کو زمین پر اٹھا کر پھینک دیا۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو اس وقت سانپ کہا جاتا ہے وہ عدن کے اندر کسی اور صورت و ہیئت کا تھا چناں چہ ڈاکٹر آدم کلارک کہتے ہیں کہ سانپ پہلے آدمیوں ہی کی طرح چلتا تھا۔ باتیں کرتا تھا عقل و فہم رکھتا تھا گویا جس جانور کی مدد سے شیطان نے آدم و حوا کو بہکایا وہ سانپ نہ تھا جسے ہم اس وقت دیکھتے ہیں بلکہ بندر کی قسم کا کوئی حیوان تھا۔

ڈاکٹر ہنری کہتے ہیں کہ سانپ سے مراد شیطان ہے جو کسی وقت نہایت معزز فرشتہ تھا اور اپنی نافرمانی کی وجہ سے مردود قرار دے دیا گیا تھا اسی نے حوا کو دھوکہ دے کر وہ پھل کھلایا اور ان کے نکالے جانے کا باعث ہوا۔ سانپ کی شکل اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ جانور اپنی صورت و ہیئت کے لحاظ سے عورتوں کے لیے بہت زیادہ جاذب توجہ ہے پھر ہو سکتا ہے کہ اس نے اڑنے والے سانپ کی صورت اختیار کی ہو۔ ذرا اوپر فضا سے اس کی آواز سن کر حوا نے اسے اشارۂ خداوندی سمجھا ہو۔

اب یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ سانپ کہاں سے آیا۔ ایامِ تخلیق کے چھ دنوں میں کس دن اور کس نے اس کو پیدا کیا۔ اگر خدا نے پیدا کیا تو کیا اس کے علم میں یہ بات نہ تھی کہ وہ آدم و حوا کی بہکائے گا اور نوعِ انسانی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گی۔

وہ انسان نہیں تھا، چوپایہ نہیں تھا، طائر نہیں تھا، مچھلی نہیں تھا اور نہ رینگنے والا جانور۔ کیوں کہ پیٹ کے بل چلنے کا عذاب تو اس پر بعد کو مسلط کیا گیا ہے۔ پھر وہ کیا تھا اس کی کیا غذا تھی اس کے پیدا کئے جانے کا کیا سبب تھا۔ آدم کو دھوکہ دینے کی تحریک اس میں کیوں پیدا ہوئی۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے سوالات اس ضمن میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کا جواب نہ اسفارِ خمسہ میں کہیں ملتا ہے اور نہ دوسری مذہبی کتابوں میں۔

اگر کہا جائے کہ شیطان ہی کو سانپ سے تعبیر کیا گیا ہے تو بھی اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ باوجود اس علم کے کہ وہ انسان کا دشمن ہے کیوں اسے عدن کے اندر داخل ہونے اور حوا کو بہکانے کی اجازت دی گئی۔ اگر خدا کا منشا یہی تھا کہ وہ انسان کو جنت میں پیدا کرے اور پھر مصیبت بھری دنیا میں اٹھا کر پھینک دے تو تخلیق ہی کی کیا ضرورت تھی اگر مدعا یہی تھا تو کیا اس کی بہتر صورت یہی ہو سکتی تھی کہ اسے پہلے شجرِ علم سے دور رہنے کا حکم دیا جائے اور پھر جب وہ اس تک پہنچ جائے تو صرف اس بنا پر کہ کیوں اس نے

علم و شعور حاصل کرنے کی کوشش کی کہ نکال باہر کیا جائے۔

اسی سلسلہ میں اسفارِ خمسہ کا ایک اور بیان قابل ملاحظہ ہے لکھا ہے کہ "جب آدم و حوا جنت سے نکالے جانے لگے تو خدا نے ایک چرمی قمیض ان کو مرحمت فرمائی" یہ سن کر قدرتاً یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ چمڑا کہاں سے آیا کیا خدا نے کسی جانور کو ہلاک کر کے اس کی کھال کھینچی تھی؟ چمڑے کی دباغت کس نے کی اور قمیض کیوں کر تیار ہوئی؟

پھر ایک بات اور یہ ہے کہ ان کو لباس کی ضرورت ہی کیا تھی کیا وہ اپنی عریاں حالت پر جنت میں مطمئن نہ تھے اور اگر یہ لباس اس خیال سے دیا گیا تھا کہ زمین کی موسمی حالت سے متاثر نہ ہوں تو بھی بے کار تھا کیوں کہ زمین کا موسم بدلتا رہتا ہے۔

طوفانِ نوح

اسفارِ خمسہ میں طوفان نوح کی نوعیت اور اس کے اسباب پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے اس میں لکھا ہے کہ جب آدم و حوا جنت سے نکالے جانے کے بعد زمین پر آکر بسے تو ان کی نسل بڑھی لیکن یہ نسل نہایت بد اعمال تھی اس لیے خدا پچھتایا کہ میں نے کیوں انسان کو پیدا کیا اور آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ انسانوں اور جانوروں سب کو تباہ کر دے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عدن سے آدم و حوا کا اخراج نوعِ انسانی کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ مضرت رساں نکلا کیوں کہ اس کی اخلاقی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی لیکن سوال یہ ہے کہ اس خرابی کا ذمہ دار انسان کیوں کر ہو سکتا تھا جب کہ اس وقت تک اصلاح نوعِ انسانی کے لیے نہ خدا نے کسی نبی کو بھیجا نہ کوئی صحیفۂ الہامی نازل کیا اور نہ کوئی دوسری صورت اس کے اخلاق درست کرنے کی اختیار کی گئی۔

یقیناً خدا جانتا تھا کہ انسان روز بروز گنہ گار ہوتا جائے گا اور سوائے نوح و خاندانِ نوح کے وہ سب کو غرقِ آب کر دے گا۔ پر کیا یہ مناسب نہ تھا کہ وہ بجائے آدم و حوا کے جنھوں نے نافرمانی کی تھی پہلے نوح ہی کو پیدا کرتا جو اولادِ آدم میں سب سے پہلے مطیع و فرمان بردار بندے خدا کے تھے۔

دوسری عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ہے کہ خدا نے انسانوں کے ساتھ جانوروں کو بھی تباہ کرنے کا ارادہ کیوں کیا، غلطی تو انسان کی تھی نہ کہ جانوروں کی۔ پھر انہیں کس قصور میں مبتلائے عذاب کیا گیا؟ شجرِ ممنوع کا پھل کھائیں آدم و حوا، گناہ میں مبتلا ہوا ان کی

نسل اور غصہ اتارا جائے جانوروں پر یہ کیسا انصاف تھا؟

طوفان لانے سے قبل خدا نے نوح کو حکم دیا کہ وہ ایک کشتی تیار کریں ۳۰۰ ہاتھ (۵۵۰ فٹ) لمبی، ۵۰ ہاتھ (۹۱ فٹ ۸ انچ) چوڑی اور ۳۰ ہاتھ (۵۵ فٹ) اونچی۔ اس کشتی کے تین درجے تھے اور چوٹی پر ایک کھڑکی ۲۲ مربع انچ تیار کی گئی تھی ایک دروازہ بھی اس میں تھا جو باہر سے بند ہوتا تھا جب کشتی تیار ہو گئی اور سامانِ خورد و نوش اس میں رکھ دیا گیا تو خدا نے سات دن کی مہلت دی کہ وہ جانوروں کو اس کے اندر جمع کر لیں۔

بعض تاویل کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ طوفان زمین کے ایک حصے کے لیے مخصوص تھا اس لیے بہت زیادہ جانور اس میں جمع نہیں کئے گئے لیکن اسفار کی عبارت اس تاویل کی اجازت نہیں دیتی کیوں کہ خدا نے ہر متنفس کو تباہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا آسمان و زمین کے درمیان جتنی مخلوق تھی سب کو غرقِ آب کرنا چاہا تھا علاوہ اس کے اسفار کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ ہم نے نوح کو حکم دیا کہ ہر جان دار کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لیں دوسری جگہ یہ تحریر ہے کہ تمام پاک جانوروں میں سے سات سات جانور نر و مادہ اور ناپاک جانوروں میں سے دو دو نر و مادہ طیور میں سے بھی سات سات نر و مادہ لے لیے جائیں۔

اب غور کرنا چاہئے کہ نوح نے کتنے وحوش و طیور جمع کئے؟ اس وقت تک پرندوں کی قسمیں کم از کم ۱۲۵۰۰ دریافت ہوئی ہیں اور چین و جنوبی امریکہ اور افریقہ کے تمام طیور کی ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی۔ اس لیے حسبِ بیانِ توریت کم از کم ۱۷۵۰۰ پرندے حضرت نوح نے فراہم کئے ہوں گے اسی طرح کم از کم ۶۵۸ قسمیں چوپایوں کی دریافت ہوئی ہیں اور ۶۵۰ رینگتے ایسے جانوروں کی، کیڑے مکوڑوں کی قسمیں تقریباً دس لاکھ ہیں اس لیے کم از کم ۲۰ لاکھ جانور نوح نے اپنی کشتی میں جمع کئے ہوں گے اس لئے اب بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوا ہو گا؟ ظاہر ہے کہ جب طوفان نے تمام پہاڑوں کو ڈبو دیا ہو گا اور سارا کرۂ ارض کرۂ آب ہو کر رہ گیا ہو گا تو تمام سمندروں اور دریاؤں کا پانی ایک ہو گیا ہو گا اور یہ پانی اتنا شور و نمکین ہو گا کہ اس سے پیاس کا بجھانا ممکن نہ رہا ہو گا۔ پس ظاہر ہے کہ حضرت نوح نے ان سب کے لئے شیریں پانی بھی اپنی کشتی میں رکھا ہو گا ہر ایک قسم کے جانوروں کو مخصوص غذا فراہم کی ہو گی اس سے اندازہ کیجئے کہ ۳۰ ایام کے لیے جو طوفانِ نوح کے قیام کا زمانہ بتایا جاتا ہے ۲۰ لاکھ جانوروں کے لیے پانی اور چارہ کتنا درکار ہوا ہو گا؟

بتایا جاتا ہے کہ کشتی میں صرف آٹھ آدمی تھے، تو کیا ۱۰۵۰۰۰ چڑیوں، ۳۶۱۶ چوپایوں، ۱۳۰۰ رینگنے والے جانوروں اور ۲۰ لاکھ کیڑے مکوڑوں کی دیکھ بھال صرف آٹھ آدمیوں کے سپرد تھی؟

سال بھر میں ایک جانور جتنی غذا کھاتا ہے وہ اس کے وزن کی دوچند ہو جاتی ہے یعنی ایک جوڑے ہاتھی کے لئے ۱۵۰ ٹن چارہ ضروری ہے، میمتھ کے لئے اس سے دوچند ہونا چاہئے، اسی طرح اور بہت سے جانور نوح کی کشتی میں ایسے رہے ہوں گے جو سال بھر کے اندر جنگل کے جنگل صاف کر جاتے، پھر کیا ممکن ہے کہ ۵۵۰ فٹ لانبی اور ۹۱ فٹ چوڑی کشتی میں اتنے طیور ووحوش سماگئے ہوں گے اور عقل اسے باور کر سکتی ہے کہ ان سب کی غذا بھی پورے ایک سال کے لئے کشتی کے اندر ذخیرہ کرلی گئی ہو؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف آٹھ آدمیوں نے کیوں کر اتنے حیوانات کا انتظام کیا ہو گا اور جو غلاظت پھیلی ہو گی اس کی صفائی کی کیا صورت اختیار کی گئی ہو گی؟

کشتی میں تمام دنیا کے جانور تھے اور چوں کہ کرۂ ارض کے مختلف حصوں کا درجۂ حرارت مختلف ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہر حصۂ زمین کے جانور کے لئے اسی درجۂ حرارت کی ضرورت رہی ہو گی جس میں وہ زندہ رہ سکتا ہے۔ قطب شمالی کے جانوروں کے لئے انتہائی سردی کی ضرورت ہے اور صحرائے افریقہ کے جانوروں کے لئے انتہائی گرمی کی۔ بعض جانور معتدل موسم چاہتے ہیں، اس لئے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کشتی کے اندر ایک ہی وقت میں مختلف موسم اور مختلف درجہ ہائے حرارت پیدا کرنا کیوں کر ممکن ہے؟

وہ جانور جو نباتات پر زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے تو خیر چارہ کا ذخیرہ ممکن ہے لیکن جن جانوروں کی غذا گوشت یا کیڑے مکوڑے ہیں ان کے لئے کیا انتظام ہوا ہو گا؟ کیا علاوہ ان جانوروں کے جو نوح کے مہمان تھے بہت سے اور جانور ایسے بھی کشتی میں سوار تھے جو غذا کا کام دے سکیں؟ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مہمان جانوروں سے زیادہ غذا کے جانور فراہم کئے ہوں گے جن کی ایک تعداد ایک سال کی مدت کے لحاظ سے اتنی بڑی ہوتی کہ ہزاروں میل کی وسعت بھی ان کے لئے کافی نہیں چہ جائے کہ معمولی کشتی۔

کہا جاتا ہے کہ متواتر ۴۰ دن تک بارش ہوتی رہی اور بلند سے بلند پہاڑ کی چوٹی ڈوب گئی گویا بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ پانی ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گیا تھا اس حد تک پہنچنے

کے بعد پانی کا دباو فی مربع فٹ ۸۰۰ ٹن ہونی چاہئے اور یہ دباؤ اتنا زبردست ہے کہ پانی کے اندر کوئی جاندار کوئی درخت اور پودا باقی نہیں رہ سکتا اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب طوفان ختم ہونے کے بعد تمام جانور کشتی سے باہر نکلے ہوں گے ان کو غذا کیوں کر ملی ہوگی؟ جب کہ وہاں نہ کوئی درخت باقی رہا تھا نا گھاس، نہ کوئی جان دار موجود تھا، نہ کیڑا مکوڑہ، نباتات کے نشو و نما کے لئے کم از کم ٦ ماہ کی مدت درکار ہے، تو کیا اتنی مدت تک جانور بھوکے رہے ہوں گے؟

جب طوفان ختم ہو کر خشک زمین نمودار ہوئی ہوگی اور تمام جانور کشتی سے باہر نکلے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کی طرف روانہ ہوئے ہوں گے، بعض جانور قطبِ شمالی کی طرف گئے ہوں گے بعض قطبِ جنوبی کی طرف، بعض افریقہ کی جانب، بعض ایشیا کی جانب، اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصلی مستقر پر پہنچنے کی مدت تک زندہ کیوں کر رہے ہوں گے، جب کہ ان میں سے ہر ایک ناموافق موسم کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کشتی کوہِ ارارات پر جا کر ٹھہری تھی۔ پس سوا اس حصۂ زمین کے دوسرے جانوروں کے لئے یہاں کا موسم ناموافق رہا ہوگا جسے وہ کسی طرح برداشت نہ کر سکے ہوں گے۔

علاوہ اس کے بعض جانور ایسے ہیں جو نہایت سست رفتار ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے مستقر تک کیوں کر پہنچے ہوں گے؟ فرض کیجئے کہ ایک گھونگھا جو دن بھر میں ایک فٹ چلتا ہے اپنے مستقر تک روانہ ہوا جو بارہ ہزار میل دور ہے تو اس کے یہ معنٰی ہوئے کہ وہ ایک ہزار سال میں وہاں پہنچا ہوگا۔

اسفارِ موسیٰ کے آٹھویں باب میں لکھا ہے کہ ساتویں مہینے کے سترہویں دن نوح کی کشتی کوہِ ارارات پر جا کر ٹھہری۔ پہاڑ کی چوٹیاں دسویں مہینے تک نظر نہیں آئیں۔ اس کے بعد بھی نوح نے ۴۰ دن کا انتظار اور پھر ایک کوّے کو روانہ کیا کہ خشکی کا پتہ چلائے لیکن وہ واپس نہ آیا۔ اس کے بعد فاختہ کو روانہ کیا جو واپس آگئی، اس کے بعد پھر سات دن انتظار کیا اور فاختہ کو مکرر روانہ کر دیا۔ اس مرتبہ وہ واپس نہ آئی اور اس سے حضرت نوح نے سمجھا کہ خشکی کا حصہ نمودار ہو گیا ہے اس کے بعد وہ خشکی پر اترے، قربان گاہ تیار کی، قربانی چڑھائی اور خدا اتنا خوش ہوا کہ نوح اور ان کی اولاد کو اجازت دے دی کہ دنیا میں جو چاہیں کھائیں پیئیں اور وعدہ کیا کہ آئندہ پھر کبھی طوفان لا کر نوعِ انسانی کو ہلاک نہ

کرے گا۔ چناں چہ قوسِ قزح اسی وعدۂ خداوندی کی یادگار ہے۔

من جملہ دیگر داستانوں کے جو حسبِ روایاتِ توریت موسیٰ پر بذریعہ وحی نازل ہوئیں، ایک یہ بھی تھی کہ:

جب روئے زمین پر آدمی بہت ہو گئے اور ان سے بیٹیاں پیدا ہوئیں تو خدا کے بیٹوں نے "آدمیوں کی بیٹیوں" کو دیکھا کہ وہ خوب صورت ہیں اور ان میں سے جو پسند آئیں ان کو اپنی بیوی بنالیا۔ اس مواصلت سے جبابرہ پیدا ہوئے، جنھوں نے بہت فساد پھیلایا۔ تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دل گیر ہوا"۔ (کتاب پیدائش، باب ۶، آیت ۶/۱)

اور اس نے یہ ارادہ کر کے کہ وہ انسان کو مار ڈالے گا، کہا کہ:

"میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا ہے، روئے زمین سے مٹادوں گا نہ صرف انسان، بلکہ حیوانوں کو بھی، پرندوں کو بھی، حشرات الارض کو بھی، کیوں کہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں"۔ (پیدائش، باب ۶، آیت ۷)

بہر حال جب کتابِ پیدائش کے بیان کے مطابق انسان نے دنیا کو ظلم سے بھر دیا (پیدائش، باب ۶، آیت ۱۳) تو خدا نے انسانوں کو غرق کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور نوح کو حکم دیا گیا کہ:

"تو اور تیرے بیٹے اور تیری اور تیرے بیٹوں کی بیویاں تیرے ساتھ کشتی میں جائیں گے اور سب جانوروں میں سے ہر جنس کے دو دو جوڑے اپنے ساتھ کشتی میں لے لے تا کہ وہ بچے رہیں۔ اسی طرح پرندوں اور حشرات میں سے بھی ہر ایک دو دو جوڑے لے لے اور تو اپنے پاس کھانے کی چیزیں جمع کر تا کہ وہ تیری اور ان کی خوراک ہوں۔ (پیدائش، باب ۲، آیات ۱۲-۱۵)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوح کو تمام مخلوقات میں سے دو دو جوڑے لینے کا حکم دیا گیا تھا اور ساری دنیا کو تباہ کرنا مقصود نہ تھا لیکن پیدائش باب ہفتم کی آیات میں یہی واقعہ ان الفاظ میں درج ہے کہ:

"اور خدا نے نوح سے کہا کہ تو اپنے خاندان سمیت کشتی میں آ، کیوں کہ میں نے تجھی کو اپنے حضور میں اس زمانہ کے درمیان صادق دیکھا۔ سب پاک جانوروں میں سے سات سات نر اور مادہ اور ان میں جو پاک نہیں ہیں دو دو جوڑے اپنے پاس لے لے اور آسمان کے پرندوں میں سے جو پاک ہیں سات سات جوڑے لے لے تا کہ زمین پر ان کی نسل باقی رہے کیوں کہ سات کے بعد زمین پر چالیس دن اور چالیس رات پانی برساؤں گا۔ تمام موجودات کو جنھیں میں نے بنایا زمین پر سے مٹادوں گا"۔

یہاں ہر چیز کا جوڑا جوڑا لینے کا حکم نہیں بلکہ سات سات کا حکم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تمام موجودات کو تباہ کیا جائے گا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:

"دوسرے مہینے کی سترہویں تاریخ کو اسی دن بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور چالیس دن اور چالیس رات تک زمین پر پانی کی جھڑی لگی رہی۔ اسی دن نوح اور سام اور یافث نوح کے بیٹے اور نوح کی بیوی اور اس کے بیٹوں کی تینوں بیویاں کشتی میں داخل ہوئیں اور تمام جانور جوڑے جوڑے کشتی میں داخل ہوئے اور خدا نے اس (نوح) کو باہر سے بند کر دیا۔ (کتاب پیدائش، باب ۷، آیات ۱۱-۱۶)

یہاں پھر "جوڑے جوڑے" نوح کے پاس آتے ہیں۔ اس اختلافِ بیان کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کتابِ پیدائش کے یہ قصے لکھے ہیں اس کے سامنے دو قسم کی قدیم داستانیں تھیں لیکن ان میں وہ ربط پیدا نہ کر سکا۔

کشتی بند کر دینے اور "دوسرے مہینے کی سترہویں تاریخ" کے بارہ میں ڈاکٹر بونویک کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال قدیم مصر کی روایات سے عبرانیوں میں آیا ہوگا کیوں کہ ہر سال ماہ اثیر کی سترہویں تاریخ کو مصرِ قدیم کے پوجاری اپنے بڑے دیوتا اوسیزر کے بت کو ایک مقدس کشتی میں بند کر دیا کرتے تھے اور جس زمانہ میں نوح کا کشتی میں بند ہونا بتایا جاتا ہے وہ اثیر ہی کا مہینہ ہوتا ہے اور وہی تاریخ پڑتی ہے" لیکن ہمیں اس سے اختلاف ہے کیوں کہ طوفانِ نوح اور برجِ بابل کا قصہ عبرانیوں نے بابلیوں کا یا کلدانیوں سے لیا تھا نہ کہ مصریوں سے، چناں چہ مسٹر بارنگ گولڈ پادری کا بھی خیال یہی ہے کہ "جب یہودیوں کو اسیر کر کے بابل لے جایا گیا وہاں انہوں نے بہت سی ایرانی اور کلدانی روایتیں سنیں اور اپنے مذہبی لٹریچر میں داخل کر لیں"

مسٹر جارج اسمتھ نے نینوا کے کھنڈر سے جو کتبے ۷۴-۱۸۷۳ء میں بر آمد کئے تھے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طوفان کا قصہ اہلِ بابل کو اڑھائی ہزار برس مسیح سے پیش تر معلوم تھا۔

کلدانی مؤرخ بیروسوس نے طوفان کا جو حال لکھا ہے وہ بھی کتابِ پیدائش کے بیان کے مطابق ہے اور اس کتبہ کے بھی مطابق ہے جو مسٹر اسمتھ[17] نے بر آمد کیا ہے۔

دونوں قصوں میں ایک متقی و پاک باز آدمی کو خداوند کی طرف سے مطلع کیا جاتا ہے کہ ایک ایسا طوفان آنے والا ہے جو تمام بنی نوعِ انسان کو غرق کر دے گا اور دونوں

17- اگرچہ بعض جگہ دونوں بیانات کچھ مختلف ہیں لیکن یہ اختلافات اہم نہیں ہیں اور یوں بھی ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کی کسی روایت کو بیان کرے گی تو اس میں کچھ نہ کچھ زیبِ داستاں کے لئے ضرور اضافہ کر دے گی۔

قصوں میں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ایک کشتی یا جہاز بنائیں اور اس میں جانور اور پرندے وغیرہ بھی مع سامان خورد و نوش کے رکھ لیں۔ دونوں قصوں میں لکھا ہے کہ کشتی سے ایک پرندہ تین مرتبہ باہر بھیجا جاتا ہے اور تیسری مرتبہ واپس نہیں آتا۔ دونوں قصوں میں کشتی ایک پہاڑ پر ٹھہرتی ہے اور کشتی سے باہر نکلنے کے بعد دیوتاؤں کی قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ بیروسوس کے قصے کا ہیرو زسوطرس (Xisuthrus) ہے جو ملک کا دسواں بادشاہ تھا اور کتابِ پیدائش کے ہیرو نوح ہیں جو دسویں سردارِ قبیلہ تھے، پھر جس طرح زسوطرس کے تین بیٹے ہیں (۱) زیروفانوس (۲) طیطن (۳) یافتو سیتھس بتائے جاتے ہیں اسی طرح نوح کے بھی تین بیٹے تھے (۱) حام (۲) سام (۳) یافث[18] (ان میں سے یافتو سیتھس اور یافث دونوں کی شخصیت غالباً ایک ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابِ پیدائش کی اس روایت کا ماخذ قدیم کلدانی یا بابلی روایات ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ یہ روایات قدم مصریوں سے لی گئی ہوں لیکن یہ خیال درست نہیں کیوں کہ قدیم مصریوں میں طوفانِ نوح کے متعلق کوئی روایت نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی کیوں ٹھیک اسی وقت جب کہ بقولِ بائبل طوفانِ نوح سے تمام روئے زمین کو غرق کر دیا تھا، بادشاہ فرعون خوفو اپنا ہرمِ اعظم تعمیر کرا رہا تھا۔ علاوہ اس کے قدیم مصریوں کی کتاب مقدس "کتاب الموتیٰ" میں طوفان کا حال درج نہیں ہے۔

مسٹر جارج اسمتھ نے جو مٹی کی تختیاں زمین سے برآمد کی ہیں ان میں سے ایک لوح پر حسبِ ذیل روایت دربارۂ طوفان کندہ ہے:

> سطح زمین زیرِ آب ہو گئی۔ اس نے روئے زمین کی تمام جان دار چیزوں کو ہلاک کر دیا۔ شدید طوفان جو لوگوں پر نازل ہوا وہ آسمان تک پہنچا۔ بھائی نے بھائی کو نہ دیکھا اور آدمیوں نے ایک دوسرے کو نہ پہچانا۔ آسمان میں دیوتا طوفان سے خوف کھا رہے تھے، انہوں نے پناہ کی جگہ تلاش کی اور وہ انو دیوتا کے آسمان پر چڑھ گئے۔ دیوتا کتوں کی طرح (حرف مٹ گئے ہیں) سجدہ میں گر پڑے، چھ دن اور رات گزرے، ہوا طوفان اور سیلاب نے غلبہ کر لیا۔ ساتویں دن طوفان اور سیلاب بند ہوا جس نے زلزلہ کی طرح ہلاکت ڈال دی۔ سکون ہو گیا۔ سمندر کو اس نے خشک کر دیا اور ہوا اور بارش ختم ہو گئی۔ میں نے سمندر متلاطم دیکھا اور تمام بنی آدم ہلاک ہو گئے۔ لاشیں نرکلوں کی طرح تیرتی تھیں۔ میں نے کھڑکی کھولی اور میرے منہ پر روشنی پڑی وہ گزر گئی اور میں بیٹھ گیا اور رونے لگا میں نے ایک فاختہ بھیجی اور وہ

18-ہندوؤں کی روایاتِ قدیمہ میں بھی منوجی کشتی کے ذریعہ سے بچتے ہیں اور ان کے بھی تین صاحب زادے تھے (۱) سام (۲) کام (۳) پریاپتی۔ ان میں سے سام کا نام تو بجنسہ وہی ہے اور تیسرا نام پریاپتی سے بہت ملتا جلتا ہے۔

چلی گئی۔ فاختہ گئی اور وہ واپس آ گئی۔ میں نے ایک ابابیل بھیجی وہ چلی گئی اور واپس آ گئی۔ میں نے ایک کوا بھیجا اور وہ روانہ ہو گیا، کوا گیا اور اس نے پانی اترا دیکھا اور اس نے کھایا اور وہ تیرا اور آوارہ ہو گیا اور واپس نہ آیا۔ میں نے جانوروں کو ہر سمت روانہ کیا اور میں نے پہاڑ کی چوٹی پر ایک قربان گاہ بنائی۔

افسوس ہے کہ اس کتبے میں ۸ سے ۱۸ تک کی سطریں ضائع ہو گئی ہیں اگر وہ سطریں گم نہ ہو جاتیں تو یقیناً یہ معلوم ہو جاتا کہ کشتی کس طرح بنائی گئی تھی اور کس طرح زسوطرس اور اس کے تینوں بیٹوں کی جانیں بچی تھیں۔

کلدانی مؤرخ بیروسوس نے جو روایت بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ زسوطرس کو خواب میں کلدانی دیوتا کرونوس نظر آیا اور آنے والے طوفان سے مطلع کیا۔ زسوطرس نے ایک بہت بڑی کشتی بنائی جس میں اس نے اپنے اہل و عیال اور اپنے دوستوں اور زمین کے تمام جانوروں اور پرندوں کے نمونے کشتی میں رکھے وغیرہ وغیرہ۔ یہی بیان قریب قریب کتابِ پیدائش کا ہے اور اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ وہ کلدانی یا بابلی روایات سے لیا گیا ہے۔

برجِ بابل

جب طوفان ختم ہو گیا اور نوح کی کشتی خشکی پر آ کر ٹکی تو وہ اترے اور انگور کی کاشت شروع کی، جب انگور پختہ ہوئے تو اس سے شراب بنائی اور خوب پی۔ اپنے کو بد دعا دی، سام و یافث کو دعا دی اور ۳۵۰ سال تک زندہ رہے گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ جس وقت نوح کا انتقال ہوا ہے وہ اس وقت کے تمام انسانوں سے عمر میں ۵۰۰ سال بڑے تھے لیکن نہ ان کے مرنے کا ذکر کہیں پایا جاتا ہے نہ یہ کہ وہ کہاں دفن کئے گئے اور ان کی یادگار کوئی قائم کی گئی ہے یا نہیں؟ اسی طرح آدم و حوا کی وفات اور ان کے مدفن کا کوئی ذکر توریت میں نہیں پایا جاتا۔

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ برجِ بابل کی تعمیر کے وقت چوں کہ خدا نے انسانی زبان کو خلط ملط کر کے اسے ایک دوسرے کے لئے ناقابل فہم بنا دیا تھا اس لئے آدم و نوح کے متعلق جو روایات پائی جاتی تھیں وہ محو ہو گئیں اور ان کی اولاد نہ طوفان کا صحیح حال یاد رکھ سکی نہ نوح کی وفات کا۔ پھر جب دوسری زبان رائج ہوئی تو از سرِ نو ذریعۂ الہام یہ داستان سنائی گئی۔

اس جگہ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم و حوا کی وہ زبان کیا تھی جسے

سانپ بھی سمجھ سکتا تھا۔ زبان ایسی چیز ہے جو ایک دن یا ایک سال میں تیار نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے بہت کافی زمانہ درکار ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے ابتدائی حالت میں زبان صرف چند مخصوص آوازوں پر مشتمل ہوتی ہے جن سے صرف مسرت و غم یا محبت و نفرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن پیچیدہ خیالات کے ظاہر کرنے کی صلاحیت زبان میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ خیالات کا تعلق صرف تجربہ سے ہے اور ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا نے ان کو دفعتاً پیدا کر کے انسان کے دماغ میں بھر دیا تھا۔ آدم و حوا کی زبان عبرانی رہی ہو یا کچھ اور بہر نوع وہ دفعتاً پیدا ہو جانے والی چیز نہ تھی اور ایک زمانہ اس کی تشکیل میں صرف ہوا ہو گا۔ اب رہا سانپ کا حوا سے گفتگو کرنا سو یہ اور زیادہ حیرت انگیز امر ہے کہ اس نے آدم و حوا کی زبان کب اور کیوں کر سیکھی؟

الغرض اول تو زبان کے باب میں یہی معمہ حل نہیں ہو سکتا کہ آدم و حوا دفعتاً کوئی زبان کیوں کر ایجاد کر سکے اور دوسرے اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ برج بال کی تعمیر سے قبل تمام انسانوں کی وہی ایک زبان تھی جو عدن میں آدم و حوا کو سکھائی گئی تھی تو پھر یہ بات اس سے زیادہ نا قابلِ فہم ہے کہ برجِ بابل کی تعمیر کے وقت خدا نے زبان کو خلط ملط کر دیا تھا تا کہ کوئی دوسرے کی بات سمجھ نہ سکے۔

بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ برج کی تعمیر کے وقت تک تمام باشندگانِ کرۂ ارض کی ایک ہی زبان تھی اور ایک ہی رہتی اگر انسان برجِ بابل کی تعمیر کا ارادہ کر کے آسمان تک پہنچنے کی کوشش نہ کرتا۔ خدا انسان کی اس گستاخی سے برہم ہو گیا ور اس نے زبان کو گڑبڑ کر دیا تا کہ ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ سکے اور برج تعمیر نہ ہو سکے، چناں چہ کہا جاتا ہے کہ زبان کے مسخ ہونے کے بعد سب منتشر ہو گئے۔

اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا کو تعمیرِ برج میں کیا اعتراض تھا جب کہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح انسان آسمان تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر کہا جائے کہ یہ خیال انسانی گستاخی کی سزا تھی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے زبان کو خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا وہ ایسا نہ کر سکتا تھا کہ جتنا برج وہ دن میں تعمیر کرتے تھے رات کو اسے ڈھا دیا کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ زبان کی گڑبڑ سے تعمیرِ برج پر کیا اثر پڑ سکتا تھا اور وہ کیوں کر عمل میں آئی؟

زبان اسی وقت مسخ ہو سکتی تھی جب قوتِ حافظہ مٹ جائے تو کیا خدا نے انسان کی

قوتِ حافظہ محو کر دی تھی یعنی دماغ کے اس حصہ کو مفلوج کر دیا تھا جو اعصابِ گویائی پر حکم راں ہے یا یہ کہ قوت سلب کر لی تھی؟ اس کا کوئی ذکر توریت میں نہیں۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ زبان کے مسخ ہو جانے سے انسانوں میں انتشار کیوں پیدا ہوا اور الگ الگ ہو جانے کا سبب کیا تھا۔ کیا وہ ایک ہی جگہ قیام کر کے اس وقت تک انتظار نہ کر سکتے تھے کہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے لگتے۔ مصیبت کے وقت میں تو تمام افراد قدرتاً ایک ساتھ زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں نہ کہ منتشر ہو جانا۔ پھر ایک سوال یہ بھی ہے جب مسخِ زبان کے بعد مختلف جماعتیں مختلف مقامات پر چلی گئی ہوں گی تو وہاں انہوں نے کیا کیا ہو گا؟ جب کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتا تھا۔

بائبل کی کتاب پیدائش باب ۱۱، آیت ۱-۹ میں لکھا ہے کہ:

تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی اور جب وہ پورب سے روانہ ہوئے تو انہوں نے شنعار کے ملک میں ایک میدان پایا اور وہاں رہنے لگے۔ آپس میں کہا کہ آؤ ہم اینٹ بنائیں اور آگ میں پکائیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر بنائیں اور ایک برج بنائیں جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام روئے زمین پر پریشان ہو جائیں اور خداوند اس شہر اور اس برج کو جسے بنی آدم بناتے تھے دیکھنے اترا اور خداوند نے کہا دیکھو لوگ ایک ہی ہیں اور ان سب کی ایک ہی بولی ہے اب وہ یہ کرنے لگے سو وہ جس کام کا ارادہ کریں گے اس سے نہ رکیں گے۔ آؤ ہم اتریں اور بولی میں اختلاف ڈالیں تا کہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں۔ تب خدا نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین پر پراگندہ کر دیا۔ سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز رہے اس لئے اس کا نام بابل ہوا کیوں کہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبانوں میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کر دیا۔

بائبل کی اس "الہامی" روایت کا ماخذ بھی بابلی روایت ہے، بیروسوس مشہور کلدانی مؤرخ نے بھی قریب قریب یہی بیان در بارۂ برجِ بابل لکھا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

"زمین کے پہلے باشندے اپنے زور و قوت پر گھمنڈ کرتے ہوئے دیوتاؤں کو حقیر و حقیر سمجھنے لگے اور انہوں نے اس مقام پر جہاں اب شہر بابل ہے ایک برج بنوانا شروع کیا۔ جب اس کی چوٹی آسمان تک پہنچی تو ہواؤں نے دیوتاؤں کی مدد کی اور انہوں نے اس سر بفلک برج کو اکھاڑ پھینکا۔ نیز ان لوگوں میں اختلافِ لسانی پیدا کر دیا۔ اس وقت تک ان تمام آدمیوں کی ایک ہی زبان تھی، کہتے ہیں کہ اس برج کے کھنڈر اب بھی بابل میں موجود ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ برج کی حقیقت کیا ہے؟ اس باب میں جوزیفس کا قول یہ ہے کہ یہ برج نمرود نے بنوایا تھا اور دیودرس کا بیان ہے کہ اس برج کو اہلِ کلدانیہ نے رصد گاہ کی

صورت سے بنوایا تھا اور اس کا نام "ہفت منازلِ سیار گان" رکھا تھا۔

اس رصد گارہ کی منزلیں علی الترتیب آفتاب، قمر، زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، اور عطارد سے منسوب تھیں۔ لیکن بادشاہ بخت نصر کے عہد کے کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برج شہر بورسیپا (بابل) کا برج تھا اور اس نے اس کے پشتے خام اینٹ سے اور احاطہ خشتِ پختہ سے بنایا تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان بیانات میں "اختلافِ لسانی" کا کہیں ذکر نہیں۔

"اختلافِ لسانی" کے بارہ میں قدیم ارمن روایت بے شک عبرانی روایت سے ملتی ہے اور قدیم میکسیکو میں بھی ایسی ہی ایک روایت در بارۂ "اختلافِ اَلسِنہ" پائی جاتی تھی اور وہ لوگ اسی سلسلہ میں اپنے ملک کا برج چولولا دکھایا کرتے تھے۔ میکسیکو کی روایت یہ تھی کہ طوفان سے سات نفر دیوزاد بچے تھے ۔ ان میں سے ایک دیو نے جس کا نام "ذیلہوا" تھا آسمان پر حملہ کرنے کے لئے چولولا کا برج تعمیر کیا مگر دیوتاؤں نے اس برج کو آگ لگا کر تباہ کر دیا اور بنانے والوں کی بولی میں اختلاف ڈال دیا۔ اسی قسم کی ایک روایت شمالی ہندوستان کی تھارد قوم میں بھی پائی جاتی ہے جو مغل نسل سے ہے۔ مشہور انگریزی سیاح ڈاکٹر لونگسٹن کا بیان ہے کہ ایسی ہی روایت در بارۂ اختلافَ اَلسنہ افریقہ کے قبائل میں بھی پائی جاتی ہے جو جھیل نگامی کے سواحل پر آباد ہیں اور قدیم ایستھونیہ میں بھی ایسی ہی ایک روایت مشہور تھی۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں بھی اس قسم کی روایت درباۂ اختلافِ السنہ پائی جاتی ہے۔

جارج اسمتھ کی آثاری تحقیق سے جو کتبے بر آمد ہوئے ہیں ان میں برج بابل کا جو حال لکھا ہے وہ بائبل کے بیان سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے ان کتبوں میں درج ہے کہ:

> "بعض لوگوں نے ایک شخص کی سیادت میں جس کے خیالات اچھے نہیں تھے اور جس نے تمام دیوتاؤں کے باپ سے کفر کیا تھا بابل میں ایک ٹیلہ یا پہاڑی کی وضع کا ایک برج تعمیر کرنا شروع کیا۔ لیکن ہواؤں نے اس کا کام خراب کر دیا اور انو دیوتا نے اس ٹیلہ پر چھوٹے بڑے تمام لوگوں میں گڑبڑ ڈال دی ان کی بولی بھی بدل دی اور ان کے صلاح و مشورہ میں بھی اختلاف پیدا کر دیا۔ وہ بعل دیوتا، دیوتاؤں کا باپ ہے جس کا غیظ و غضب ان نابکار معماروں پر مشتمل ہوا اور وہ دیوتا انو ہے جس نے ان لوگوں کو ہلاک کیا"۔

اب رہی یہ بات کہ برجِ بابل کہاں ہے؟ اس کے متعلق بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ وہ بابل میں تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ برج وہاں تھا جہاں آج کل بئرِ نمرود کا ٹیلہ پایا جاتا ہے، یہ نواحِ بابل میں شہر سے آٹھ میل کے فاصلہ پر بمقام بورسیپا واقع ہے

اور اسے "ہیکلِ ہفت انوار" کہتے تھے۔ سر ہنری رالنسن نے جب اس برج کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایک مٹی کے چبوترے پر اینٹوں سے سات منزلیں تعمیر کی گئی تھیں اور ہر منزل کا رنگ جدا جدا تھا۔ اس برج کی بلندی اس وقت بھی میدان سے ۱۵۳ فٹ بلند ہے۔ برجِ مذکور عرصۂ دراز سے نامکمل چلا آتا تھا، حتیٰ کہ بادشاہ بخت نصر نے اس کی مرمت کرکے اسے درجۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ان تمام روایات اور بیانات سے ایک شخص اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ برجِ بابل دراصل ایک رصد گاہ تھا جس میں ہیئت داں لوگ رصد کیا کرتے تھے۔ اس رصد کو آسمان پر حملہ یا خدا کی دشمنی سے تعبیر کیا گیا۔ چوں کہ وہ قدیم رصد گاہ عرصۂ دراز سے نامکمل چلی آتی تھی، اس لئے یہ روایت پیدا ہو گئی کہ چوں کہ بانیانِ برج نے خدا کی شان میں گستاخی کی تھی اس لئے وہ ہلاک کر دیئے گئے اور برج نامکمل رہ گیا۔ عراق کے میدانوں میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں جن کی بولیاں الگ الگ ہیں اور اسی کو اختلافِ السنہ کہا گیا۔

مصنفینِ بائبل نے لفظ بابل کو عبرانی مصدر "بَبَل" سے مشتق سمجھا ہے جس کے معنٰی ہیں "پراگندہ" کرنا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دو آشوری لفظوں "باب" اور "ایل" سے مرکب ہے جس کے معنٰی ہیں "خدا کا دروازہ"۔

اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دل چسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ہندوؤں کی روایات میں دیوتاؤں کے رہنے کا مقام "میرو پربت" بتایا جاتا ہے۔ اس پہاڑی کی نسبت بھی یہ خیال تھا کہ وہ سات درجوں کے تعمیر کئے جاتے تھے، میرو پربت کے درجۂ اعلیٰ میں "برہما" کا مقام تھا اور ہیرودوطوس نے لکھا ہے کہ برجِ بابل کے ساتویں ہی درجہ میں "بیلوس" دیوتا رہا کرتا تھا یہ مماثلتِ بیان بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

حضرت ابراھیم

برجِ بابل کی تعمیر اور مسخِ زبان کے بعد سے ابراہیم کی پیدائش تک جو طویل زمانہ گزرا ہے اس کا کوئی ذکر توریت میں نہیں پایا جاتا کہ اتنا زمانہ انسان نے کہاں اور کیوں کر بسر کیا۔ اس میں صرف اس قدر تحریر ہے کہ مسخِ زبان اور انتشارِ آبادی کے بعد سرزمینِ کنعان میں ایک قوم عبرانیوں کی پیدا ہوئی جس کے سردار ابراہیم تھے۔ یہ لوگ خیموں میں رہتے تھے اور کچھ مویشی بھی رکھتے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرتے تھے اور ساری دنیا میں یہی ایک جماعت ایسی تھی جو خدا

کی مہربانی کامرکز تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیکڑوں شہر، ہزاروں محل اور بے شمار مندر آباد تھے۔ لاکھوں انسان اوسائرس کی پرستش کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی ترقی میں مصروف تھے لیکن خدانے ان سب کو نظر انداز کرکے صرف ابراہیم اور ان کے خاندان کو اپنی توجہ کے قابل سمجھا۔ کیوں؟ اس کا کوئی جواب توریت میں نہیں ملتا۔

اسفارِ خمسہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم اور خدا کے درمیان کافی بے تکلفی تھی اور مختلف امور پر آپس میں بہت کھل کر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ چناں چہ خدانے ان سے وعدہ کیا کہ ”میں تیری قوم کو بہت دوں گا اور جو کوئی تیرے خاندان کی مخالفت کرے گا اسے تباہ کردوں گا“۔

یہ خوش خبری سننے کے بعد حضرتِ ابراہیم سرزمینِ کنعان پہنچے، یہاں پھر خدانے اپنے کو ظاہر کیا اور حکم دیا کہ ایک گائے، ایک بکری، ایک بھیڑ، ایک فاختہ اور ایک کبوتر لے کر قربانی کرو۔ چناں چہ حضرت ابراہیم نے ان جانوروں کے دو ٹکڑے کرکے رکھ دیئے، شام کو غروبِ آفتاب کے بعد ایک شعلہ، گوشت کے ان ٹکڑوں کے درمیان پھرتا ہوا نظر آیا۔ گویا یہ علامت تھی اس امر کی کہ خدانے قربانی قبول کرلی۔

اس کے بعد خدانے ابراہیم کو حکم دیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کریں چناں چہ وہ اس پر راضی ہوگئے لیکن عین اس وقت جب کہ یہ خون کرنے والے تھے بجائے بیٹے کے مینڈھے کی قربانی کا حکم ہوا۔

اس تمام بیان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جسے عقلِ سلیم قبول کرسکے، خدا کا ابراہیم سے بے تکلفانہ گفتگو کرنا چند مخصوص جانوروں کو ذبح کراکے ان کے خون آلود ٹکڑوں کے درمیان روشنی کا نمودار ہونا، پھر انسان کی قربانی طلب کرنا اور بعد ازاں مینڈھے پر راضی ہو جانا ایسی باتیں ہیں کہ خدا کی حقیقی عظمت اور اس کے بلند تصور کے لحاظ سے کسی طرح قبول نہیں کی جاسکتیں۔

خدانے حضرت ابراہیم سے بہت وعدے کئے تھے، لیکن جیسا کہ اسفار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ان میں سے کوئی پورا نہیں کیا گیا۔ خدانے ابراہیم کو ایک بڑے قوم کا مورثِ اعلیٰ ہونے کی بشارت دی تھی، مگر پوری نہیں ہوئی۔ ایک وسیع حصۂ زمین کے مالک ہونے کی خبر دی تھی (جس میں دریائے نیل اور دریائے فرات کے درمیان کا حصہ

بھی شامل بتایا گیا تھا) لیکن یہ وعدہ بھی ایفاء نہ ہوا۔

جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے اسحاق جانشین ہوئے، پھر یعقوب اور اس کے بعد یوسف جو مصر میں صاحبِ اقتدار ہوگئے لیکن اس وقت یوسف اور ان کی تمام اولاد کو ملا کر کل ستّر (۷۰) عبرانی موجود تھے جو مصر میں دو سال تک رہے لیکن اس مدت میں ان کی تعداد تقریباً ۳۰ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس تعداد کا اندازہ ہمیں اس طرح ہو سکتا ہے کہ حسبِ بیانِ موسیٰ اس وقت ۳۰ لاکھ جنگ جُو سپاہی ان کی قوم کے موجود تھے اس لئے بہ لحاظِ آبادی ہر چھ آدمیوں میں سے ایک آدمی فوجی خدمت کا اہل قرار دے دیا جائے تو آبادی کا اندازہ کم از کم ۳۰ لاکھ ہوتا ہے۔

اس لئے اب غور طلب امر یہ ہے کہ کیا ستّر آدمیوں کی مختصر آبادی ۲۱۵ سال میں ۳۰ لاکھ تک پہنچ سکتی ہے؟ اور اگر اسے معجزۂ خداوندی قرار دے دیا جائے تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ غلاموں کی اتنی بڑی آبادی بڑھانے سے کیا فائدہ متصور تھا اور خدا نے اتنا انتظار کیوں نہ کیا کہ یہ جماعت آزاد ہو جاتی اور اس کے بعد آبادی بڑھانے کا یہ معجزہ صادر کیا جاتا۔

اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ ہر صدی میں چار مرتبہ دوچند ہو جاتے تھے تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے ستّر آدمیوں کی آبادی دو سال کے بعد بڑھ کر زیادہ سے زیادہ ۱۷۹۲۰ نفوس تک پہنچ سکتی تھی۔ اب باقی ۱۵ سال میں اگر یہ دوچند ہو جائیں تو بھی ۳۵۸۴۰ سے زیادہ نہیں بڑھ سکتے، چہ جائے کہ ۳۰ لاکھ۔

اسی زمانہ میں عبرانیوں نے مردم شماری بھی کی تھی تو معلوم ہوا تھا کہ ۲۲۲۷۳ پہلوٹی کے مرد ان کے یہاں موجود تھے۔ اگر پہلوٹی کی لڑکیاں بھی اتنی ہی فرض کر لی جائیں تو یہ تعداد ۴۴۵۴۶ تک پہنچ جائے گی۔ پھر ظاہر ہے کہ مائیں بھی اتنی رہی ہوں گی، اسی لئے ۳۰ لاکھ کی آبادی کے لحاظ سے اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ پیدائش کا اوسط فی عورت ۶۶ قرار پاتا ہے جو کسی طرح قرینِ عقل نہیں۔

حضرت موسیٰ

جب بنی اسرائیل کو غلامی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہوئے تقریباً ۲۱۵ سال کا زمانہ گزر گیا تو فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے آئندہ جو لڑکے پیدا ہوں وہ ہلاک کر دیئے جائیں لیکن اتفاق سے ایک لڑکا بچ گیا جس کو فرعون کی لڑکی نے نیل میں بہتا ہوا

دیکھ کر بچالیا اور اس کی پرورش کی، یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا۔ ایک دن اس جوان نے کسی مصری کو ہلاک کر ڈالا اور بھاگ کر مدین پہنچا۔ یہاں ایک مقدس راہب سے ملاقات ہو گئی جس کی سات لڑکیاں تھیں ان میں سے ایک کے ساتھ شادی کر لی اور راہب کی بھیڑیں چرانے لگا، یہ نوجوان موسیٰ تھے۔

ایک دن بھیڑیں چرانے کے دوران ایک مشتعل جھاڑی کے اندر خدا ظاہر ہوا اور موسیٰ کو حکم دیا کہ فرعون سے جا کر بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرو اور اسی کے ساتھ یدِ بیضا اور عصا کا معجزہ عطا کیا۔ عصا کا معجزہ یہ تھا کہ جس وقت موسیٰ اسے زمین پر ڈال دیتے تھے تو سانپ بن جاتا تھا اور اٹھا لیتے تھے تو پھر وہی عصا کا عصا۔ یدِ بیضا یہ کہ جب وہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے تھے چمکنے لگتا تھا۔

الغرض موسیٰ ان معجزات کے حربہ سے آراستہ ہو کر مصر چلے، ان کے بھائی ہارون بھی ان کی اعانت کے لئے مامور کئے گئے۔ مصر پہنچ کر بنی اسرائیل کو جمع کیا اور معجزے دکھا کر پیامِ خداوندی سنایا۔ جب سب نے ان کو پیغمبر تسلیم کر لیا تو یہ فرعون کے پاس گئے اور خدا کا پیام سنا کر بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا لیکن فرعون نے اور زیادہ سختی شروع کر دی۔ موسیٰ نے خدا سے عرض کیا کہ فرعون نہیں سنتا۔ حکم ہوا کہ پھر جاؤ، چناں چہ یہ گئے اور اس مرتبہ اپنے عصا کا معجزہ دکھایا، فرعون نے اپنے جادو گروں کو بلایا، انہوں نے اپنی اپنی لکڑیاں سانپ بنا کر پیش کیں، جنہیں موسیٰ کا عصا نگل گیا لیکن اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوا کہ فرعون نے موسیٰ کو ایک بڑا جادو گر سمجھ کر ان کا مطالبہ ردّ کر دیا۔

حیرت ناک امر یہ ہے کہ موسیٰ وہارون نے فرعون کے پاس جا کر کوئی ایک لفظ بھی آزادی کی حمایت اور غلامی کی مذمت میں نہیں کہا۔ انہوں نے مطلقاً بحث نہیں کی کہ نوعِ انسانی اپنی محنت کی پیداوار سے پورا فائدہ اٹھانے کی مستحق ہے اور ایسے مالک و آقا جو مزدوروں اور غلاموں کے منہ سے نوالہ چھین لیتے ہیں عرصہ تک برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتے اور وہ قوم جو دوسروں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے خود بھی غلام ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو غلامی سے آزاد کرنا چاہتے ہیں لیکن فرعون کے پاس پہنچ کر کوئی ایک لفظ بھی پند و نصیحت کا نہیں کہتے اور فوراً عصا کو سانپ بنا کر خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا کسی مصلح یا پیغمبر کے اس طرزِ عمل کو مستحسن سمجھا جا سکتا ہے کہ درسِ اخلاق کا درس دینے کے بجائے وہ صرف ایسے مظاہروں

سے کام لے جنہیں فریقِ ثانی بھی شعبدہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہ دے سکے۔ اس لئے اگر فرعون نے عصائے موسوی کا معجزہ دیکھ کر مطالبۂ آزادی کو پورا نہیں کیا تو تعجب نہ کرنا چاہئے۔ کیوں کہ خرقِ عادات کی نمائش اصلاحِ اخلاق کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ نے دوسرا معجزہ دکھایا کہ اپنے عصا کی ضرب سے نہ صرف دریائے نیل بلکہ تمام چشموں، جوہڑوں، کنؤوں حتیٰ کہ گھر کے اندر ظروف میں رکھے ہوئے پانی کو بھی خون میں تبدیل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کے ساحروں نے بھی ایسا ہی شعبدہ دکھایا در آں حالِ کہ پانی باقی ہی نہ رہا تھا جسے وہ خون میں بدل دیتے۔ اس معجزۂ قہر و غضب کا یہ نتیجہ ہوا کہ دریائے نیل کی تمام مچھلیاں مر کر سڑنے لگیں اور تمام مصر پانی کے لئے تڑپنے لگا آخر کار انہوں نے نئے کنوئیں کھودے اور اپنی پیاس بجھائی۔ اس واقعہ کے بعد سات دن تک موسیٰ و ہارون نے انتظار کیا لیکن فرعون نے بنی اسرائیل کو آزاد نہ کیا۔ خدا نے اس مرتبہ مینڈکوں کا عذاب نازل کیا اور زمین کا چپہ چپہ ان جانوروں سے ڈھک گیا۔ ساحرانِ فرعون نے خود بھی اس معجزہ کا جواب اسی طرح دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مینڈکوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ فرعون اس عذاب سے گھبرا اٹھا اور اس نے موسیٰ کو بلا کر کہا کہ اس مصیبت سے مجھے نجات دلاؤ میں بنی اسرائیل کو آزاد کر دوں گا۔ چناں چہ حضرت موسیٰ کی دعا سے یہ عذاب رفع ہو گیا مگر فرعون پھر اپنے وعدے سے پھر گیا۔

اس کے بعد خدا نے کلّیوں کا عذاب مسلط کیا مگر فرعون نے وعدہ خلافی کی، مکھیوں کا عذاب نازل کیا لیکن وہ نامانا۔ سرزمینِ مصر کے تمام مویشی ہلاک کر دیئے، وہاں کے تمام باشندوں کو جلدی امراض میں مبتلا کر دیا۔ ژالہ باری سے تباہ کیا۔ ٹیڑیوں کو مسلط کیا۔ نہایت شدید قسم کی تاریکی پھیلائی، لیکن فرعون وعدے کر کر کے پھر گیا۔ آخر کار خدا نے موسیٰ کے ذریعہ سے فرعون کو کہلا بھیجا کہ مصر میں جتنی اولادیں پہلوٹی کی ہیں وہ آج کی رات فنا کر دی جائیں گی۔ چناں چہ اس خیال سے بنی اسرائیل کے گھرانے اس عذاب سے بچے رہے۔ ان کے گھروں پر خون کے چھاپے لگ گئے تاکہ خدا کا فرشتۂ عذاب غلطی سے کہیں بنی اسرائیل کے لوگوں کو ہلاک نہ کر دے۔ آخر کار رات کو یہ عذاب نازل ہوا اور مصریوں کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس سے صبح کو جنازہ نہ نکلا ہو اور اس مرتبہ فرعون نے بہ مشکل تمام بنی اسرائیل کو آزاد کیا۔

اس تمام بیان کو پڑھنے کے بعد یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ فرعون کو راہِ

راست پر لانے کے لئے پے در پے اتنے عذاب اہلِ مصر پر کیوں نازل کئے جب کہ اسے معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی عذاب کارگر نہ ہو گا۔ اگر خدا جانتا تھا اور یقیناً جانتا ہو گا کہ جب تک مصر والوں کی پہلوٹی کے لڑکے فنا نہ ہوں اس وقت تک فرعون بنی اسرائیل کو آزاد نہ کر دے گا تو پہلے ہی یہ عذاب کیوں نہ مسلط کر دیا گیا اور درمیانی متعدد عذاب نازل کرنے کی زحمت کیوں گوارا کی گئی؟

علاوہ اس کے سب سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ گناہ تو فرعون کا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد نہ کرتا تھا لیکن مصیبت میں مبتلا کیا گیا مصر کی تمام آبادی کو جس میں معصوم عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی شامل تھے اور وہاں کے تمام جانوروں کو جنھوں نے کوئی قصور نہ کیا تھا۔ کیا خدا یہ نہ کر سکتا تھا کہ صرف فرعون کو شدائد میں مبتلا کر کے نافرمانی کی سزا دیتا یا اگر بنی اسرائیل کی آزادی یا فرعون کی اصلاح مقصود تھی تو وہ اس کے خیال کو بدل دیتا اور اس کے دل میں رحم و نرمی پیدا کر کے مقصد حاصل کر لیتا۔ اسی کے ساتھ دوسرا تعجب خیز امر یہ ہے کہ بنی اسرائیل مصر کے اندر لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے تھے، چھ لاکھ نبرد آزما جوان ان میں موجود تھے۔ ایک چھوڑ دو دو پیغمبر موسیٰ و ہارون ان کی حمایت کر رہے تھے۔ خدا کی طرف داری کا یہ عالم تھا کہ بار بار فرعون اور اہلِ مصر پر عذاب نازل کر رہا تھا لیکن خود ان کے اندر ظلم و استبداد کے مقابلہ کا جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا اور بے حس جانوروں کی طرح سر ڈالے تمام تکلیفیں غلامی کی برداشت کر رہے تھے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی بزدل، ناکارہ، کم ہمت اور بے غیرت قوم کی طرف داری کا خیال خدا کو کیوں پیدا ہوا اور اگر ایسی ہی خاطر منظور تھی تو کیوں نہ ان کے اندر مردانہ جوش اور ولولۂ حرّیت پیدا کر دیا کہ وہ خود اپنی ہمت و پامردی سے آزادی حاصل کر لیتے۔

بنی اسرائیل کی ہجرت

جب متعدد و پیہم عذاب نازل ہونے کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دے دی تو یہ سب کے سب مع اپنے گلّوں اور اسباب کے خانہ بدوشوں کی طرح ایک رات مصر سے باہر نکلے۔ کہا جاتا ہے کہ روانگی کا وقت مقرر کر دیا تھا اور تمام افراد بیک وقت سب کے سب ایک ساتھ روانہ ہو گئے اور صحراءِ سینا میں جا کر پناہ لی۔

اس بیان کو صحیح باور کرنے کے لئے عقلِ انسانی کو کتنی جگہ تامل کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ زیادہ دشوار نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ فرعون

کی پروانگی حاصل کرنے کے بعد فوراً ۳۰ لاکھ کا ایک ہی وقت میں روانہ ہو جانا کیوں کر قابلِ عمل تھا اور حضرت موسیٰ نے کیوں کر اپنی قوم کے ۳۰ لاکھ افراد کو اس قدر جلد وقتِ روانگی کی اطلاع دے دی کہ وہ سب دفعتاً تیار ہو کر ایک ساتھ روانہ بھی ہو گئے۔

اس زبردست جماعت میں ٦ لاکھ تو صرف وہ جوان تھے جو نبرد آزمائی کر سکتے تھے۔ بچے، عورتیں اور بوڑھے ان کے علاوہ تھے۔ اب غور کیجئے کہ یہ جا کہاں رہے تھے؟ صحراء سینا میں، یعنی اس صحراء میں جس کی خشکی و ویرانی کے سامنے صحراءِ اعظم گویا باغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں یہ ۴۰ سال تک رہے لیکن عقل حیران ہے کہ اتنی بڑی آبادی کے لئے ایک خشک و بے آب و گیاہ صحراء میں سامانِ خورونوش کہاں سے میسر آیا؟ ان کے ساتھ بھیڑیں اتنی کثرت سے موجود تھیں کہ ایک بار بنی اسرائیل نے ایک لاکھ پچاس ہزار پہلوٹی کے بچوں کی قربانی کی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بھیڑوں کے اتنے بڑے بے شمار گلوں کے لئے جن کو لاکھوں ایکڑ چراہ گاہ کی ضرورت تھی اس ریگستان میں کیوں کر زندہ رکھا گیا؟

خدا بنی اسرائیل کو ارضِ فلسطین کی طرف سے نہیں لے گیا۔ اس خوف سے کہ مبادا یہاں کے لوگوں کو دیکھ کر وہ پھر مصر واپس چلے جائیں بلکہ صحرا کے راستہ سے بحرِ احمر تک لے گیا اور اس سفر کی شان یہ تھی کہ دن کو بادلوں کا ایک ٹکڑا ان کی رہنمائی کرتا تھا اور رات کو آگ کا ستون۔

جب فرعون کو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل بھاگ گئے ہیں تو اس نے ٦٠٠ رتھوں پر اپنے سپاہیوں کو بٹھا کر ان کا تعاقب کیا اور ساحل تک پہنچتے پہنچتے ان کو جا لیا۔ اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب حضرت موسیٰ کی بددعا سے وبا میں مبتلا ہو کر مصر کے تمام جانور فنا ہو چکے تھے اور طاعون نے وہاں کی بہترین آبادی کو ختم کر دیا تھا تو ٦٠٠ رتھوں کے لئے گھوڑے اور سپاہی کہاں سے آ گئے؟

اس کے ساتھ اسفارِ موسیٰ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل مصریوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے (درآں حالِ کہ ان میں ٦ لاکھ جنگ جُو نوجوان موجود تھے) اور یہ خوف اس درجہ غالب ہوا کہ آخر کار حضرت موسیٰ کو پھر معجزہ سے کام لینا پڑا۔ یعنی اپنے عصا کے اشارہ سے پانی کے دو حصے کر دیئے جس سے درمیان میں راستہ پیدا ہو گیا اور بنی اسرائیل اس سے عبور کر گئے لیکن جب مصری فوج عبور کرنے لگی تو خدا نے رتھوں

کے پہیئے الگ کر دیئے اور جس وقت وہ بیچ دریا میں پہنچے تو پھٹا ہوا پانی پھر مل گیا اور سب کے سب غرق ہو گئے۔

اول تو یہ بات نہایت عجیب و غریب ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی بنی اسرائیل کی بزدلی و کم ہمتی بدستور باقی رہی اور باوجود ٦ لاکھ نبرد آزما سپاہ رکھنے کے ان کو مصریوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی (حالاں کہ ٦٠٠ رتھوں میں زیادہ سے زیادہ ٥٠ یا ٦٠ ہزار سے زیادہ آدمی نہ رہے ہوں گے) اور حضرت موسیٰ کو اپنے معجزہ کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ علاوہ اس کے یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ عصا کے اشارہ سے پانی پھٹ کر در و دیوار کی طرح علیحدہ علیحدہ کیوں کر قائم ہو گیا اور خدا نے رتھوں کے پہیئے علیحدہ کرنے کے لئے کیا صورت اختیار کی؟

اب دیکھئے یہ لوگ جا کہاں رہتے تھے یہ اس ارضِ موعود کی طرف جا رہے تھے جس کا رقبہ ١٢ ہزار میل سے زیادہ نہ تھا اور جو سوا خشک چٹانوں اور بے آب و گیاہ ویرانیوں کے کچھ نہ تھا۔ یہاں پہلے سے کتنے لوگ آباد تھے اس کے متعلق حضرت موسیٰ کا بیان ہے کہ یہاں سات قومیں یہودیوں سے زیادہ قوی آباد تھیں۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ یہودیوں کی ٣٠ لاکھ آبادی کے مقابلے میں ان کی تعداد کم از کم ٢ کروڑ رہی ہو گی جن کو خدا نکال کر یہودیوں کو بسانا چاہتا تھا لیکن خدا کا یہ مقصود نہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فوراً ارضِ کنعان تک پہنچا دے۔ اس لئے انہیں ٤٠ سال تک برابر صحرا میں سرگرداں رکھا یہاں تک کہ سوا دو کے باقی سب فنا ہو گئے۔

جب بنی اسرائیل نے بحر احمر کو عبور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ یہاں غذا کا کوئی سامان فراہم نہیں ہو سکتا اور پانی اس قدر شور ہے کہ اس کا پینا محال ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ نے خدا سے دعا کی تو ایک درخت نمودار ہوا جس کو کاٹ کر حضرت موسیٰ نے پانی میں ڈال دیا اور پانی شیریں ہو گیا۔ غذا کے لئے خدا نے یہ تدبیر کی کہ رات کو چھوٹے چھوٹے اولوں کے برابر ایک گول سی چیز آسمان سے برسائی جو سورج کی گرمی سے تو پگھل جاتی تھی لیکن آگ میں اس کو بھون سکتے تھے اس کا نام من تھا۔ اس پر ٤٠ سال تک انہوں نے بسر کی یہاں تک کہ وہ اس سے بے زار ہو گئے اور گوشت وغیرہ طلب کرنے لگے جس پر خدا بہت برہم ہوا اور انہی لوگوں کو جن سے دودھ اور شہد رکھنے والی سرزمین کا وعدہ کیا گیا تھا، سانپوں سے ڈسوایا گیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی

اسرائیل نے گوشت اور لہسن، پیاز وغیرہ کی خواہش کی تو خدا نے نہایت زبردست آندھی چلائی جس سے ایک پرندہ جس کا نام لوا (سلویٰ) ہے خیموں پر آکر گرنے لگا اور ایک مہینہ تک اس قدر گوشت ان کا کھلوایا کہ آخرکار وہ ان کے ناک منہ سے باہر آنے لگا اور پھر سانپ سے ڈسوانے کے بعد طاعون کی بلا ان پر نازل کی۔

اس بیان میں بعض باتیں نہایت عجیب و غریب ہیں اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیں صحراء میں درخت نمودار ہونا، اس کی مدد سے شور پانی کا شیریں ہوجانا، من و سلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا یہ سب کچھ معجزہ تھا تو بھی یہ امر کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا کہ خدا اپنی اس برگزیدہ قوم سے (جس کی نجات کے لئے تمام مصریوں کو تباہ کرنا گوارا کیا گیا) صرف اس بناء پر کہ وہ ایک ہی قسم کی غذا ۴۰ سال تک کھاتے کھاتے اکتا گئی تھی کیوں کر برہم ہوگیا اور اس میں ان کا کیا قصور تھا یہ بالکل فطرتِ انسانی ہے کہ مسلسل ہفتہ عشرہ تک ایک ہی غذا کھانے کے بعد اس سے تنفر پیدا ہوجاتا ہے چہ جائے کہ مسلسل ۴۰ سال۔ اس لئے ان کے اس مطالبہ پر برہمی اور وہ بھی اس حد تک کہ انہیں سانپوں سے ڈسوایا گیا۔ طاعون میں مبتلا کیا گیا، کیوں کر جائز و مناسب قرار دیا جاسکتا تھا۔

وہ خدا جو اپنے برگزیدہ بندوں کے لئے من و سلویٰ نازل کرسکتا تھا اس کی قدرت سے یہ امر باہر تھا کہ وہ غذا میں تنوّع پیدا کرتا رہتا اور اس فطرتِ انسانی کی رعایت کرتا جو خود اس کی پیدا کی ہوئی ہے۔

اسفارِ موسیٰ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صحراء کے دورانِ قیام میں بنی اسرائیل کا لباس بھی بوسیدہ نہیں ہوا اور جو جوتے وہ پہنے ہوئے تھے وہ بھی نہیں پھٹے۔ بعض مفسرین کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے لباس وغیرہ کی نگہداشت خدا نے محض مخصوص فرشتوں کے سپرد کردی تھی جو ان کا لباس آکر درست کردیا کرتے تھے اور پھٹے ہوئے جوتے ٹانک دیا کرتے تھے لیکن یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ اگر ۴۰ سال تک لباس وغیرہ وہی رہا تو کیا بچوں کی عمروں کے ساتھ ان کا لباس بھی بڑھتا رہا اور پاؤں کی درازی کے ساتھ ساتھ جوتوں کا سائز بھی بڑا ہوتا گیا؟

خدا نے بنی اسرائیل کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ صحراء میں درخت نصب کریں، درآں حالِ کہ وہاں اس سے قبل گھاس تک کا بھی وجود نہ تھا۔ تو کیا بنی اسرائیل مصر سے اپنے درختوں کے تخم بھی لائے تھے جو انہوں نے وہاں بوئے اور اگر بوئے تھے تو ان کے نشوو

نما کی کیا صورت تھی جب کہ پانی کا وہاں وجود نہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ بغیر پانی کے تخم یا درخت کو بار آور کر دے تو کیا اس کی قدرت سے یہ دور تھا کہ صحراء کو دفعتاً چمنستان میں تبدیل کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور ایک محال بات کے انجام دینے پر بنی اسرائیل کو مجبور کیا۔

حضرت موسیٰ کو ایک خاص قسم کا خوشبودار تیل بنانے کا بھی نسخہ خدا نے بتایا جو حناو زیتون وغیرہ مختلف درختوں کے پھلوں پھولوں سے تیار ہوتا تھا اس تیل سے بپتسمہ دیا جاتا تھا اور اس نسخہ کو نہایت راز رکھا گیا تھا اور یہاں تک کہ اگر سوائے موسیٰ اور ہارون کے کوئی اور یہ تیل بنانے کی جرأت کرتا تو اس کے لئے خدا کا حکم یہ تھا کہ مار ڈالا جائے۔

اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس صحراء کی ویرانی و خشکی کا یہ عالم ہو کہ لوگوں کا سامانِ خورد و نوش فراہم نہ ہو سکے وہاں عطریات پیدا کرنے والے درخت کہاں سے آ گئے؟ اور اگر حضرت موسیٰ نے کوئی تیل ایسا تیار کیا تھا تو دوسروں کو کیوں ممانعت کی گئی اور اس میں ایسی کیا خصوصیت تھی کہ سوائے حضرت موسیٰ کے کسی اور کو اس کی تیاری کی اجازت نہیں دی گئی؟ اسی صحراء کے دورانِ قیام میں یہودیوں کو یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ بطور کفارۂ گناہ ہر جننے والی "ماں"، فاختہ کا ایک جوڑا "موبدوں" کے پاس لائے جس کا کھانا ان پر فرض تھا جس وقت خدا کا یہ حکم نازل ہوا اس وقت یہودیوں کی آبادی ۳۰ لاکھ اور موبدوں کی تعداد صرف تین تھی۔ اگر پیدائش کا اوسط روزانہ ۳۰۰ رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ہر موبد کو روزانہ دو دو سو فاختہ یا کبوتر کھانے پڑتے تھے جو بالکل خلافِ عقل ہے اس وقت ایک عورت بچہ جننے کے بعد بالکل ناپاک سمجھی جاتی تھی۔ اگر وہ لڑکا جنتی تھی تو ۴۰ دن تک کسی مقدس چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی اور لڑکی جننے کی صورت میں پورے ۸۰ دن تک اس کی نجاست قائم رہتی تھی پھر کیا کوئی وجہ اس کی بتائی جا سکتی ہے کہ بچہ جننا کیوں ایک عورت کو نجس و گناہ گار بنا دیتا تھا اور یہ گناہ کبوتر یا فاختہ کے ذبح کرنے اور موبدوں کو شکم پری کے بعد کیوں دور ہو جاتا تھا اور لڑکے اور لڑکی میں کیا فرق تھا کہ ایک کی ولادت کے بعد تو وہ صرف ۴۰ دن تک نجس قرار دی جائے اور دوسرے کی ولادت کے بعد ۸۰ دن۔

الواحِ موسیٰ کے متعلق مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں، ایک یہ کہ جب وہ خدا سے ہم کلام ہونے کو طور پر گئے تو وہاں دو تختیاں پتھر کی خدا کی طرف سے دی گئیں جن پر "احکامِ

عشرہ" درج تھے۔ جب آپ واپس آئے تو دیکھا کہ لوگوں نے سونے کا بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ آپ بہت برہم ہوئے، تختیاں زمین پر پٹک کر توڑ ڈالیں۔ بچھڑے کو جلا کر اس کا سفوف پانی میں ملایا اور بنی اسرائیل کو اس کو پینے پر مجبور کیا۔

دوسری روایت میں نہ تختیوں کے توڑنے کا ذکر ہے نہ بچھڑے کا۔ تیسری میں "احکامِ عشرہ" کچھ اور بتائے گئے ہیں۔ آخری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ جب کوہِ سینا پر گئے تو بنی اسرائیل، زیور ہارون کے پاس لائے اور انہوں نے اس زیور کو گلا کر سونے کا بچھڑا تیار کیا اور جب موسیٰ واپس آئے تو انہوں نے اس بت پرستی میں ان کو مبتلا دیکھ کر بہت غصہ کیا اور تین ہزار آدمی تہِ تیغ کر دیئے۔

قطعِ نظر اس سے کہ خدا کے ہم کلام ہونے اور اپنے پاس پتھروں کی منقوش تختیاں دینے کا تصور بجائے خود ناقابلِ قبول ہے، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اگر موسیٰ کے چلے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی تو انہوں نے خدا کے کس حکم کی نافرمانی کی؟ اس وقت تک احکامِ عشرہ لے کر موسیٰ واپس نہ آئے تھے اور کوئی شریعت قائم نہ ہوئی تھی اس لئے بنی اسرائیل کو ایسے جرم میں ماخوذ کرنا جو فی الحقیقت اس وقت تک جرم ہی قرار نہ پایا تھا، انصاف سے بالکل بعید تھا۔ ہمیشہ قانون کے نفاذ کے بعد جرم وسزا کی تعیین ہوا کرتی ہے اور نفاذِ شریعت سے قبل کوئی فعل قابلِ سرزنش نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ احکامِ عشرہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ فلاں بات کرو اور فلاں بات نہ کرو اور اس میں یہ کہیں درج نہ تھا کہ اگر ان احکام کی خلاف ورزی کی تو سزا دی جائے گی۔ قانون صرف یہی نہیں بتاتا کہ یہ فعل اچھا ہے یا برا بلکہ وہ اس سے نافرمانی کرنے والوں کی سزا بھی متعین کرتا ہے، اس لئے اگر احکامِ عشرہ کی تبلیغ کے بعد بنی اسرائیل سرتابی کرتے تو بھی وہ مستحقِ سزا نہ تھے کیوں کہ سزا کی تعیین احکامِ عشرہ میں پائی نہیں جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ احکامِ عشرہ ہی تمام دنیا کے قانون و انصاف کی بنیاد ہیں لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کیوں کہ موسیٰ کی پیدائش سے ہزاروں سال قبل مصر میں جو قانون رائج تھا اس میں نہ صرف چوری، زنا، قتل، جھوٹ وغیرہ کی سزائیں مقرر تھیں بلکہ تمدنی تعلقات کے سلسلہ میں اور جتنے بھی جرائم ہو سکتے ہیں ان سب کی صراحت اس میں موجود تھی اور وہ "احکامِ عشرہ" سے بدرجہا زیادہ مکمل تھا۔ قانون ہمیشہ انفرادی و اجتماعی احساسِ تحفظ کے تحت بنا کرتے ہیں اور ضروریاتِ تمدن اور مخصوص واقعات و حالات کے لحاظ سے ان

میں تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے اس لئے تمام شریعتیں یا قوانین حقیقتاً نتیجہ ہیں انسان کے احساسِ اجتماعی کا اور اس میں الہام وغیرہ کے دخل کی توجیہ ممکن ہی نہیں۔

بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی عظمت و صداقت کے اعلان کے لئے بنی اسرائیل کا انتخاب کیا تھا اور اسی لئے وہ متعدد بار کوہِ سینا کی بلندی پر آگ اور بادل کے ملبوس میں ظاہر ہوا اور ہزاروں معجزے بنی اسرائیل کی اصلاح و تعلیم کے لئے دکھائے۔ ان کی خاطر اس نے سمندر کے پانی کو شق کر دیا، آسمان سے روٹیاں برسائیں، ان کی پیاس بجھانے کے لئے خشک چٹانوں سے چشمے پیدا کئے۔ ان کے دشمنوں پر طرح طرح کے عذاب نازل کئے۔ الغرض چالیس سال تک ان کی حفاظت کی پھر بھی بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ جب کوئی مصیبت ان پر نازل ہوتی تھی تو وہ پتھر اور لکڑی ہی کے دیوتاؤں سے التجا کرتے تھے۔ پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ وہی خدا جس نے بنی اسرائیل کے لئے یہ سب کچھ کیا وہ ان کے دل میں اپنی صحیح عظمت و جلالت پیدا نہ کر سکا اور کیا بنی اسرائیل کی انہی نافرمانیوں کو دیکھ کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی برگزیدہ قوم تھی اور اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے اس نے اس قوم کا انتخاب کیا تھا۔

اگر کہا جائے کہ انہوں نے خدا کی وحدانیت کی تعلیم دی تو یہ بھی صحیح نہیں کیوں کہ موسیٰ کی پیدائش سے بہت پہلے یہ عقیدہ موجود تھا۔ اگر دعویٰ کیا جائے کہ انہوں نے حقوقِ ملکیت کی تعین کی تو یہ بھی غلط ہے کیوں کہ چوری، حضرت موسیٰ سے پہلے بھی جرم سمجھی جاتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ قربانیاں کرنا انہوں نے سکھایا تو یہ بھی صحیح نہیں کیوں کہ یہودیوں کے وجود سے ہزاروں سال قبل قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ اسی طرح قتل، جھوٹ وغیرہ کو بھی ہمیشہ برا سمجھا گیا اور اسفارِ خمسہ میں اگر ان کو برا بتایا گیا تو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پس یہ دعویٰ کرنا کہ اسفارِ موسیٰ کی تحریر بغیر الہامِ خداوندی کے ممکن ہی نہ تھی اور اس میں جو کچھ درج ہے وہ ذہنِ انسانی سے بہت بلند ہے کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟

گلیلیو، سرعتِ جوہری Virtual Velocity کے میکانکی اصول بتاتا ہے لیکن اسے الہامی نہیں کہتے۔ کوپرنیکس کرۂ زمین کی صحیح پوزیشن کو متعین کرتا ہے لیکن الہام سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ نیوٹن، نظریۂ کشش ثابت کرتا ہے مگر اسے الہامی کوئی نہیں مانتا۔ اسی طرح اقلیدس، ڈیکارٹے، گلوانی، وولٹا، فرینکلن وغیرہ ریاضیات، میکانیات اور علم الکیمیا وغیرہ کے متعلق بیش بہا اختراعات و اکتشافات پیش کرتے ہیں مگر ان میں سے کوئی ایک چیز

بھی الہامی نہیں مانی جاتی، لیکن اسفارِ خمسہ جن میں کوئی ایک بات بھی عقل سے تعلق نہیں رکھتی، الہامی ہیں اور جو کوئی انہیں من جانبِ اللہ نہ سمجھے وہ بے دین اور کافر ہے۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ چین، ہندوستان، مصر، یونان اور رومہ کے قوانین جو اس قدر مکمل تھے، دماغِ انسانی کا نتیجہ سمجھے جائیں اور اسفارِ خمسہ جو نہایت نامکمل شریعت کو پیش کرتے ہیں، ان کو الہامی قرار دیا جائے۔

یونس اور مچھلی

بائبل کی کتاب، صحیفۂ یونس نبی میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"وہ حسب تعمیلِ کلامِ خداوند نینوا جا رہا تھا اور نبی یونس کو اسی کہنے پر طوفانی سمندر میں ڈال دیا گیا۔ (صحیفہ یونس باب ۱، آیت ۱۲) مگر خدا نے نہ چاہا کہ یونس کو نینوا نہ جانے کی وجہ سے سمندر میں غرق کر دے۔ پس خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی تھی کہ وہ یونس کو نگل جائے اور یونس تین شب و روز مچھلی کے پیٹ میں رہا (صحیفۂ یونس، باب ۱، آیت ۱۷، پھر یونس پاتال کے بطن میں سے چلاّیا (یونس باب ۲، آیت ۲) اور نجات کے لئے دعا مانگی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونان کے باشندے بھی اپنے دیوتا ہرقلیس کے متعلق یہی روایت بیان کرتے تھے کہ یافہ کے قریب (جہاں یونس کو مچھلی نے نگل لیا تھا) وہ بھی تین دن تین رات اس کے پیٹ میں رہا۔ دونوں روایتوں میں صرف اس قدر فرق ہے کہ یونس تو مچھلی کے پیٹ سے صحیح و سالم نکل آئے تھے مگر ہرقلیس کے سر کے بال گل گئے تھے (ملاحظہ ہو برنارڈ ڈی مونٹفاکن کی کتاب Antiquite Explica جلد اول صفحہ ۲۰۴ مطبوعہ پیرس ۱۸۲۲ء)۔

ڈاکٹر گاڈ فرے ہگنس کا بیان ہے کہ یونس اور مچھلی کی داستان یونانی دیوتا ہرقلیس کی داستان کا ایک حصہ ہے جو "ہرقل نامہ" میں بیان کی گئی ہے (ملاحظہ ہو کتاب (Anaclypsis) جلد اول، صفحہ ۶۳۸، نیز ٹائلر صاحب کی کتاب (Primitive Culture) جلد اول، صفحہ ۳۰۲، مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء)

عرصہ ہوا جرمنی کے مشہور سربرآوردہ پروفیسر دینیات روز میو گر نے لکھا تھا کہ صحیفۂ یونس میں جو معجزہ درج ہے وہ محض ایک تمثیل ہے جس کی بنیاد ایک قدیم فینقی روایت پر قائم ہے کہ "ہرقلیس ایک حسینہ ہزیوکی کو کسی عظیم الجثہ خون خوار بحری جانور سے بچانے

کے لئے اس کے منہ میں کود پڑا تھا اور تین دن اور تین رات اس کا پیٹ پھاڑ تا رہا۔

ہر قلیس اور یونس کی طرح کا ایک قصہ ہندوؤں کی کتاب "سوم دیو بھاڑ" میں بھی درج ہے ملاحظہ ہو ٹا مکر صاحب کی کتاب "بنی نوعِ انسان کی قدیم تاریخ" (Early History of Mankind) صفحہ ۳۴۴-۳۴۵

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی روایات در حقیقت تمثیلی ہیں جن سے مراد آفتاب کا طلوع و غروب ہے یا بالفاظِ دیگر رات کا آفتاب کو نگل لینا اور صبح کو اگل دینا۔

قدیم زمانہ کی بہت سی قوموں میں آفتاب کو "جوناہ" کہا کرتے تھے۔ قوم ہاسک میں آفتاب کا نام جُونا، جون، یا جَونا تھا۔ ٹروجن قوم بھی آفتاب کو "جونا" کہتی تھی اور پارسیوں میں آفتاب کا نام جوناہ تھا۔ ناروے اور سویڈن میں آفتاب کو جان کہتے ہیں۔ الغرض یونس ہوں یا ہر قلیس یا کوئی اور ان سب سے مراد آفتاب ہے اور مچھلی سے مراد زمین ہے، چناں چہ جزائر بحرِ جنوبی کی روایاتِ قدیمہ میں زمین کو ایک بہت بڑی مچھلی ہی سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اب رہا تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہنا، سو اس سے مراد غالباً ۲۲ دسمبر سے ۲۵ دسمبر تک کا زمانہ ہے جب آفتاب سب سے نیچے کے درجے میں ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ اس منزل سے گزر جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو گولڈ زہیر کی کتاب (Hebrews Mythology) صفحہ ۱۰۲)

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدی نے اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا تھا ؎

قرصِ خورشید در سیاہی شد
یونس اندر دہانِ ماہی شد

○○○

شیطان

بجواب استفسار

شیطان، عفریت یا جنّ کے وجود کا خیال بہت قدیم خیال ہے اور انسان کے اس عہدِ وحشت کی یادگار ہے جب طبیعیات کے مناظر سے وہ حال ہی میں آشنا ہوا تھا اور نظامِ فطرت کے رموز ونوامیس سے قطعاً اسے آگاہی نہ تھی۔ فطرت کے ان برکات کے ساتھ ساتھ جو اسے کاشت کاری و فراہمیٔ غذا و لباس میں مدد کرتی تھی جب وہ آفاتِ ارضی و سماوی سے دوچار ہوتا تھا تو کبھی وہ خیال کرتا تھا کہ یہ اسی قوت کا غصہ ہے جو اس کی مسرت ونشاط کی ضامن ہے اور کبھی وہ اس کو کسی اور قوت سے منسوب کرکے سمجھتا تھا کہ یہ قوت ان دیوتاؤں کی قوت سے تو کم تر درجہ کی ہے جو اس پر مہربان ہیں لیکن انسان کے معاملات میں وہ ضرور دخیل ہو سکتی ہے۔

بعد کو رفتہ رفتہ یہ سمجھا جانے لگا کہ بعض روحیں ایسی ہیں جو دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیان واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں بعض انسان کی خیر خواہ و محافظ ہیں اور بعض اس کی دشمن۔

خیر و شر کے لئے دو (۲) علیحدہ علیحدہ قوتیں تسلیم کرنے میں قدیم ایرانی مذہب کو خاص شہرت حاصل ہے جس نے یہودی مذہب کو بھی متاثر کیا اور پھر اس سے عیسویت نے اسی خیال کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ جزوِ مذہب بنالیا اور قواءِ عالم کو اچھی اور بری روحانی قوتوں کے زیر اثر تسلیم کرکے فرشتوں اور شیطانوں کے وجود کے قائل ہوگئے۔

مسلمان چوں کہ یہود و نصاریٰ دونوں کے مذاہب سے متاثر تھے اس لئے ان کے یہاں اس عقیدہ میں اور زیادہ غلو نظر آتا ہے ان کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم سے بھی دوہزار سال قبل وہ جنّ کے وجود کو تسلیم کرتے تھے لیکن چوں کہ جنّ نے خدا کی نافرمانی کی اس لئے وہ مردود قرار دے دیئے گئے، ان منکرین کا سردار ابلیس تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اور اس کی ذرّیات کا نام شیطان ہے۔ عفریت کا مرتبہ ذرا کم ہے لیکن نہ اتنا کم کہ انسان اس سے بے خوف رہے اس طرح کے اور متعدد

نام اسلامی روایات میں پائے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے عقیدۂ ابلیس کو ایک مستقل فن کی حیثیت دے دی اور ہزاروں قصے اس سلسلے میں گھڑ لئے گئے جو یکسر ”خرافیات“ کے تحت آتے ہیں۔

انسان اپنے عہدِ وحشت میں بھی خبیث روحوں کے وجود کا قائل تھا اور اسے یقین تھا کہ اکثر بیماریاں انہی روحوں کے حلول کر جانے سے پیدا ہو جاتی ہیں، چناں چہ آج بھی بہت سے لوگ عورتوں کے مرض اختناق الرحم (ہسٹریا) کو بھوت پریت کا اثر بتاتے ہیں اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ سے اس کا ازالہ چاہتے ہیں۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے لٹریچر میں شیطان، عفریت، جن اور ارواحِ خبیثہ کا وجود نہ پایا جاتا ہو اور اس کا سبب یہی ہے کہ جب انسان اپنے عہدِ جاہلیت میں حقائق سے بے خبر تھا تو وہ بہت سی باتوں کو غیبی قوت کا مرکز سمجھا کرتا تھا اور جب کوئی مصیبت اس پر نازل ہوتی تھی تو وہ اسے کسی غضب ناک قوت سے منسوب کیا کرتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس عقیدہ میں اوہامِ انسانی نے عجیب عجیب اضافے کئے یہاں تک کہ وہ علم الاصنام کی ایک مستقل شاخ بن گیا جو تمام وحشی اقوام میں اب ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

سلافی قوم کا خون چوسنے والا عفریت (جسے انگریزی میں Vampire کہتے ہیں) اسیریا کی عورتوں کا ہم صحبت والا شیطان، ہندوؤں کا راکھشس جو مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے، جاپان کا اونی جو طوفان لاتا ہے اور اسی طرح کے اور بہت سے شیطان مختلف ممالک کے لٹریچر میں نظر آتے ہیں۔ اکثر قوموں میں شیطان کا تصور اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ لنگڑاتا ہے، اس خیال کا اصل یہ سبب یہ عقیدہ ہے کہ شیطان اول اول جنت سے باہر پھینک دیا گیا تھا اور ظاہر ہے جو اتنی بلندی سے گرایا جائے گا وہ اگر مرے گا نہیں تو لنگڑا ضرور ہو جائے گا۔

یورپ کا شیطان پھٹا ہوا کھر رکھتا ہے کیوں کہ وہ زیادہ تر جانوروں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، ان جانوروں میں جن کی شکل وہ اختیار کرتا ہے خاص خاص یہ ہیں: سانپ (وہی جنت والا سانپ) خرگوش، بکرا، کوا، کتا، بلی، چناں چہ آپ نے اب بھی ہندوستان کے بعض مسلمان گھرانوں میں دیکھا ہو گا کہ سیاہ کتے اور سیاہ بلّی کو جن سمجھ کر کچھ نہیں کہتے۔ ہمارے فاضل اسلاف میں سے بعض نے نصیحت کی ہے کہ جب سانپ نظر آئے تو فوراً ہلاک نہ کرو بلکہ اس سے پہلے یہ کہو کہ اگر جن ہے تو چلا جائے ورنہ کھڑا رہے، اگر اس

تنبیہ کے بعد بھی وہ نہ جائے تو اس کے ہلاک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

سفید اقوام میں شیاطین کو اکثر سیاہ فام دکھایا گیا ہے لیکن افریقہ میں اس کا رنگ سفید ہے کیوں کہ جس طرح گورے رنگ کی قوموں میں سیاہ رنگ کو برا سمجھا جاتا ہے اسی طرح حبشیوں کے نزدیک سفید رنگ مکروہ ہے کیوں کہ وہ گورے آدمیوں کو مبروص سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں میں دوزخ کا عقیدہ بھی اسی سلسلہ کی چیز ہے، جہنم کا اصل عقیدہ یہود کا تھا جسے وہ شیاطین کے رہنے کی جگہ سمجھتے تھے اور جہاں سوا آگ کے اور کچھ نہ تھا۔ یہودیوں کے یہاں یہ خیال اس عہدِ قدیم کی یادگار تھا جب آگ کا ایک مستقل دیوتا علیحدہ قرار دیا جاتا تھا اور جو بعد کو اس منصب سے علیحدہ کر کے شیطان بنادیا گیا۔

آگ اور شیطان کے تعلق کا پتہ اکثر اقوام کی روایات سے چلتا ہے، چناں چہ یوروپین اقوام کا یہ عقیدہ کہ شیطان پانی کو عبور نہیں کر سکتا اور مسلمانوں کا جن کو آتشی سمجھنا اور دھواں بن کر اس کا غائب ہو جانا اسی قدیم عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ الہ دین کا قصہ، الف لیلہ میں آپ نے پڑھا ہو گا اس میں بھی جن کو چراغ ہی کا تابع بتایا جاتا ہے اور جب کسی آسیب زدہ کے سر سے بھوت پریت کا اثر دور کیا جاتا ہے تو اس کے سامنے دھونی کی جاتی ہے اور فلیتہ جلایا جاتا ہے۔

الغرض جن، شیاطین، جہنم اور آگ یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں جو انسان کے عہدِ جاہلیت میں تیار کی گئیں اور جن کی جھنکار اب بھی گاہے گاہے سننے میں آجاتی ہے۔

اس سلسلہ میں جو روایات اہلِ قلم نے پیش کیں ان میں سب سے بلند مرتبہ گوئٹے کی فاؤسٹ Faust کا ہے، جس میں شیطان کے کیریکٹر کو نہایت باوقار ثابت کر کے آخر میں اس کی نجات کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ مسلمانوں میں صرف محی الدین ابن عربی نے شیطان کو زیادہ مکروہ نہیں سمجھا بلکہ وہ اس کی انانیت کو ایک خاص رمز سمجھتے ہیں۔

معصیت اور مذہب و عقل

ایک استفسار

آپ کا استفسار متعدد مباحث چاہتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصل مقصود آپ کا یہ ظاہر کرنا ہے کہ پوشیدہ گناہوں سے احتراز کرنے کے لئے بہشت و دوزخ اور وجودِ باری کا عقیدہ ضروری ہے اور اس کے ثبوت میں آپ نے ابتداء اسلام کے عربوں کو پیش کیا ہے۔ مجھے اس کے جواب میں آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا ان مذاہب و اقوام میں (مثلاً اسلام و پیروانِ اسلام ہی کو لے لیجئے) جو آپ کے نقطۂ نظر سے وجودِ باری کے بھی قائل تھے اور مرنے کے بعد فردوس و جہنم سے واسطہ پڑنے کو بھی ضروری خیال کرتے تھے، معصیت کرنے والے نہ پائے جاتے تھے، کیا وہ سب معصوم تھے؟ آپ خیال کی معصیت کو کہتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہونے کے بعد وجودِ باری پر یقین رکھنے اور بہشت و دوزخ کے قائل ہونے کے باوصف وہ علانیہ معصیت سے بھی باز نہ آتے تھے، پوشیدہ گناہوں کا کیا ذکر ہے۔ خیر اس عہد کو چھوڑیئے خود رسول اللہ اور عہدِ خلفاء راشدین کو لے لیجئے اور تاریخ کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے شراب بھی پی، زنا بھی کیا، قتل و غارت گری بھی کی، چوری سے بھی باز نہ آئے، مکر و فریب سے بھی ضرورت کے وقت کام لیا۔ الغرض وہ کون سی ایسی معصیت ہے جس کا ارتکاب وجودِ باری و اعتقادِ بہشت و دوزخ کے بعد بھی انسان نے نہیں کیا؟ اور کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خود خلیفہ ثانی نے اپنے بیٹے پر حد جاری کی؟

مجھے حیرت ہے کہ آپ نے بالکل خلافِ حقیقت یہ لکھنے کی جرأت کیوں کر کی کہ "شیر شُتر پینے والوں اور سوسمار کھانے والوں کو جب خدائی بہشت و دوزخ پر ایمان آ گیا تو پھر انہوں نے خلوت و تنہائی میں بدیوں کے ارتکاب کا خیال ترک کر دیا۔ ان شیر شتر پینے والوں اور سوسمار کھانے والوں نے تو وہ گناہ کئے ہیں کہ باید و شائد۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہر مذہب اپنے ساتھ ایک شریعت لاتا ہے یعنی دینی عقائد کے ساتھ ساتھ وہ ایک دنیاوی قانون بھی بناتا ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا نظام قائم رکھا جاتا ہے اگر آپ کے خیال کے مطابق محض مذہبی عقائد گناہ سے باز رکھنے کے لئے کافی ہوں تو

قانون و شریعت کی ضرورت باقی نہ رہے گی، درآں حالِ کہ شریعت کا نفاذ و اجراء ہمیشہ ضروری خیال کیا گیا۔ کیا اسلام سے آپ ان حدودِ شریعت کو علیحدہ کر سکتے ہیں جن کی صراحت کلام مجید میں پائی جاتی ہے؟

ااس لئے اب سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ آیا "مجرد عقل" معصیت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے یا نہیں؟ مذہب کا تجربہ تو بہت کافی ہو چکا ہے اور وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اس لئے اب سوا اس کے کہ ہم "کار گاہ عقل" سے مدد چاہیں اور کیا چارۂ کار ہے؟

میں یہ کہنے کے لئے تو تیار نہیں کہ عقل کا استعمال وجوباً انسان کو معصیت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر عقل سے کام لیا جائے تو وہ بہ نسبت مذہب کے زیادہ اس میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

آپ غالباً گناہ کی حقیقت سے ناواقف نہ ہوں گے، یعنی آپ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ایک فعل کو معصیت قرار دینے کا سبب کیا ہے؟ آپ کوئی فعل کیجئے اس کا اثر واسطہ یا بلاواسطہ ضرور سوسائٹی کے نظام پر پڑے گا اور یہی وہ تجربہ تھا جس کی بناء پر عہدِ قدیم میں اچھے اور برے افعال کے درمیان خطِ فاصل کھینچا گیا، انسان کے گناہ کا علم کسی الہام کے ذریعہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ خود حیاتِ دنیاوی کے تجربات نے اس کو بتایا ہے کہ یہ فعل برا ہے اور وہ اچھا۔

پھر جب انسان کو اول اول اس کی عقل یا اس کے تجربے نے یہ بتایا ہو گا کہ چوری کرنا برا ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جس فعل کو خود اس نے برا قرار دیا تھا اس کے ارتکاب کے وقت اس کے دل نے ملامت نہ کی ہو گی؟ اور کیا قلب و ضمیر کی بار بار ملامت نے اس کو اس حرکت سے متنفر نہ کر دیا ہو گا؟

فرض کیجئے آپ ایک شراب خوار سے کہتے ہیں کہ "دیکھو! شراب نہ پیو، ورنہ خدا برہم ہو جائے گا اور تم کو جہنم میں پھینک دے گا" اب دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ واقعی خدا اور اس کے جہنم کا قائل تھا یا نہیں تھا۔ اگر تھا تو یہ عقیدہ اسے شراب خوری سے باز نہ رکھ سکا، لیکن اگر نہیں تھا تو بھی خدا و جہنم پر ایمان لانے کے بعد اس کا مے خواری ترک کر دینا ضروری نہیں جب کہ بالکل یہی عقیدہ رکھنے والوں میں کبھی پوری طرح اس کا انسداد نہ ہو سکا۔ اس کے مقابلے میں دوسری صورت استمدادِ عقل کی اختیار کیجئے، یعنی ایک شراب خوار کو بتایئے کہ اس کی یہ مذموم عادت خود اس کی صحت کے لئے بہت مضر ہے اور وہ اس کا عادی ہو کر اپنے قواءِ عمل کو برباد کر رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اس نصیحت سے متاثر ہو کر یقیناً ترکِ مے خواری پر

آمادہ ہو جائے گا لیکن وہ اس فعل کی قباحت کو ضرور تسلیم کرنے لگے گا اور اس طرح ممکن ہے کسی وقت وہ اس سے باز آجائے۔

گناہ دوسرا نام ہے ترکِ فرائض کا اور ایک فرض کسی شخص پر اسی وقت عائد ہوتا ہے جب اس سے کوئی مفید نتیجہ مترتب ہو۔ اس لئے ایک شخص کا کسی طمع یا خوف کی مدد سے ادائے فرض کی طرف متوجہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے احساسِ فرض نہیں لیکن اگر وہ بغیر خیالِ مزدو اندیشۂ تعزیر اپنے فرض کو ادا کرتا ہے تو بے شک یہ سمجھا جائے گا کہ احساسِ فرض شناسی اس میں موجود ہے۔

دوزخ کا خوف یا بہشت کی لالچ دلا کر کسی کو اچھے کام کی طرف راغب کرنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے ناسمجھ بچے کو مٹھائی کی لالچ یا مار کے خوف سے پڑھنے کی طرف مائل کرنا۔ اس لئے مذہب کا انسان سے یہ مطالبہ کہ وہ بہشت و دوزخ کا یقین کرے گویا اس کو حد درجہ احمق و بے وقوف قرار دینا ہے اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ واقعی ایسا ہی احمق ہے۔

اعمالِ انسانی کے مختلف مدارج ہیں، اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ کوئی کام صرف تعمیلِ حکم کی حیثیت سے کرے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بلا خیالِ احتساب، فرض کو محض فرض سمجھ کر انجام دے اس لئے اگر مذہب کسی شخص کو اچھے کام کی طرف مائل کر بھی سکتا ہے تو پہلے اس میں غلامی و محکومی کی اسپرٹ پیدا کر دیتا ہے، بر خلاف اس کے عقل کی رہبری و ہدایت آزادئ ضمیر و حریتِ فکر و رائے پر قائم ہوتی ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

یہاں تک تو صرف منطقی بحث تھی اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کچھ قیل و قال کر سکیں، لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ امریکہ میں جو جدید نقشے ارتکابِ جرائم کے مرتب کئے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ۹۰ فی صدی مجرم وہی ہیں جو کسی نہ کسی مذہب کے پابند ہیں اور ملحدین میں ارتکابِ جرائم کا اوسط ۱۰ فی صدی بھی نہیں ہے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی ثبوت اور آپ کو درکار ہے؟

آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ امریکہ والے اسلام کے پابند نہیں ہیں اور آپ ذکر کر رہے ہیں اسلام کا کیوں کہ جس حد تک وجودِ باری اور بہشت و دوزخ کے عقیدہ کا تعلق ہے وہ بالکل آپ ہی کے ہم آہنگ ہیں اور مرنے کے بعد عذاب و ثواب کی حقیقت کو بالکل آپ ہی کی طرح تسلیم کرتے ہیں۔

○○○

کیا شریعتِ اسلامی میں تغیر و تبدّل درست نہیں؟

بجواب استفسار

کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اسلام و شریعت دونوں ایک چیز ہیں یا ان دونوں کا مفہوم جداگانہ ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر یہ ایک ہیں تو کیوں؟ اور مختلف ہیں تو ان دونوں میں باہم کیا تعلق ہے؟

آپ جس چیز کو لفظِ سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الحقیقت فقہِ اسلامی ہے، اور آپ نہیں اکثر مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فقہ اور مذہبِ اسلام دونوں ایک چیز ہیں، اس لئے آیئے سب سے پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ فقہ کی حقیقت کیا ہے؟

اس میں کلام نہیں کہ شریعت یا فقہ، نام ہے اس مجموعۂ قوانین کا جو مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی زندگی پر حاوی ہے اور جس کی حدود سے ان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو بچا ہوا نہیں ہے، لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ ہمارے اسلاف جو قوانین وضع کر گئے ہیں ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں یا یہ کہ ان سے ہٹنا، مذہبِ اسلام سے ہٹ جانا ہے، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس زمانہ میں فقہ کے مفہوم کو جو اتنی اہمیت دے دی گئی ہے وہ ابتداءِ عہدِ اسلام میں مفقود تھی۔

اگر آپ نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قرونِ اولٰی میں فقہ کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور چیز بھی پائی جاتی تھی جس کا اصطلاحی نام علم تھا، اور جو فقہ سے بالکل جدا حیثیت رکھتی تھی۔

علم سے مراد قرآن و تفسیر کا علم تھا اور ان روایات کا جو رسول اللہ اور صحابہ سے منسوب کی جاتی تھیں لیکن فقہ سے (جیسا کہ اس کے لغوی معنٰی سے ظاہر ہے) مراد عقل و رائے کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچنا تھا، اسی لئے کبھی کبھی الفاظِ فقہ اور رائے مترادف حیثیت سے استعمال کئے جاتے تھے۔ الغرض علم اور فقہ دو (۲) بالکل علیٰحدہ علیٰحدہ چیزیں

تھیں اور اسی بنا پر مجاہدؔ نے (من يؤتى الحكمة) کی تفسیر میں ظاہر کیا ہے کہ صاحبِ حکمت سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن، علم اور فقہ کا ماہر ہو، ہارون رشید اپنے گورنر ہرشمہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ "اولو الفقه فی الدين" اور "اولو العلم بكتاب الله" سے مشورہ کرتا رہے۔ الغرض عالم اور فقیہ دو (۲) بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اسی بناء پر ابن عمر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جید الحدیث تھے لیکن جید الفقہ نہ تھے اور ابن عباس فقہ و علم دونوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر گویا یوں سمجھئے کہ عالم وہ شخص کہلاتا ہے جسے صرف قرآن اور روایات کا علم ہو اور فقیہ وہ کہلاتا ہے جو جدید مسائل میں غور و فکر کے بعد خود اپنی رائے سے کام لے کر کوئی فیصلہ کرے۔

جب اسلام بالکل ابتدائی دور سے گزر کر ارتقاء کی دوسری منزل میں آیا اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ اسے غیر قوموں کے تمدن اور نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑا تو بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں جن کا ذکر نہ کلام مجید میں تھا نہ رسول اللہ کے اقوال میں۔ اس لئے جن علماء کو عدل و انصاف کی خدمت سپرد کی گئی تھی وہ اپنی عقل و رائے سے کام لیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو علم و رائے دونوں مل جائیں، اسی کا نام تفقہ فی الدین تھا اور جو اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتا تھا اسی کو سب سے بڑا فقیہ سمجھا جاتا تھا۔ الغرض شریعتِ اسلامی میں جو مرتبہ علمِ قرآن و حدیث کا تھا وہی بلکہ اس سے زیادہ رائے کا تھا، کیوں کہ بغیر اس کے کام چلنا دشوار ہو جاتا، ایک بار امیر معاویہ نے جناب زید بن ثابت سے کسی امر میں قانونی مشورہ کیا لیکن فلم یوجد عندہ او عندھم فیھا علم (نہ وہ کوئی روایت پیش کر سکے نہ دیگر حضرات) آخر کار امیر معاویہ نے اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کیا۔ ایک بار مصر کے قاضی نے خلیفہ عمر ثانی سے کسی معاملہ کے متعلق دریافت کیا، آپ نے جواب دیا کہ مجھ تک اس بات میں کوئی روایت نہیں پہنچی، اس لئے خود اپنی رائے سے کام لے کر فیصلہ کر دو۔

بنو امیہ کے زمانہ تک باقاعدہ تنظیمِ شریعت نہ ہو سکی تھی لیکن بنو عباس کے دور میں البتہ قانون سازی کی ابتداء ہوئی اور اس کے چار اصول مقرر کئے گئے: قرآن، سنت، قیاس اور اجماع۔ چناں چہ ان اصول پر فقہِ اہلِ سنت کی جو کتاب سب سے پہلے مرتب کی گئی وہ مالک ابن انس کی مؤطا ہے اس وقت علاوہ مدینہ کے شام، عراق اور ہسپانیہ میں بھی مختلف حضرات اپنی اپنی فقہ مرتب کر رہے تھے، لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت

مؤطا ہی کو حاصل ہوئی، اس کے بعد عراق کی رائج کردہ فقہ کو حماد بن ابی سلیمان نے سنبھالا اور پھر ابو حنیفہ نے اس کو چار چاند لگا دیئے اور بعد کو ان کے دو (۲) شاگرد ابو یوسف اور محمد کی خدمات، تدوینِ شریعت میں بہت مقبول ہوئیں اور انہی کی مرتب کردہ فقہ پر آج کل اہلِ سنت عمل کر رہے ہیں۔

یہ تھانہایت مختصر سا بیان تدوینِ فقہ کی تاریخ کا، لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ مسائلِ شریعت میں تمام مسلم جماعتوں کا اتفاق کبھی نہیں ہوا اور ٹھیک اسی وقت جب کہ قیاس ورائے سے کام لے کر قوانین و قواعد مرتب ہو رہے تھے ایک جماعت ایسی جماعت بھی تھی جو اس کی سخت مخالف تھی اور وہ کہتی تھی کہ قرآن و حدیث میں کیا چیز نہیں ہے کہ ہم کو قیاس ورائے سے کام لینا پڑے؟ بعد کو یہ اختلاف برابر بڑھتا ہی گیا اور کبھی کوئی ایسی شریعت قائم نہ ہو سکی جس پر تمام سنیوں نے بھی اتفاق کیا ہو، چہ جائے کہ شیعہ، اور خوارج وغیرہ کہ اگر ان کو بھی لے لیا جائے تو پھر اختلاف کی کوئی انتہاء نہیں رہتی۔

اس بیان سے دو باتیں واضح ہو گئیں: ایک یہ کہ جس چیز کو شریعتِ اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کوئی منصوص چیز نہیں ہے یعنی نہ خدا کی نازل کی ہوئی ہے چیز ہے اور نہ رسول اللہ کی بنائی ہوئی۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی ایسی شریعت نہیں پائی گئی جس پر بالاتفاق سب کا عمل درآمد رہا ہو۔ اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجیئے گا کہ آپ کا یہ دعویٰ کرنا کہ "شریعت یا فقہ میں تغیر و تبدّل کو راہ دینا اسلام کو خراب کرنا ہے" کس حد تک درست ہو سکتا ہے؟

اس بحث میں آپ لوگ اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ دین و مذہب دو (۲) علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ دین سے مراد اصولی عقائد ہیں جو تمام افراد میں جزو مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، مثلاً یہ کہ خدا ایک ہے اور محمد اس کے رسول ہیں لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مذہب ہے۔ اگر اس میں اختلاف بھی ہو تو اس کا اثر "وحدت فی الدین" پر نہیں پڑتا اور اسی بناء پر ایک زمانے سے یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ شیعہ سنی کے جھگڑے دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور ان کا تعلق ان مسائل سے ہے جو ہماری دینی مرکزیت یا اسلامی اشتراک پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

مذہب جس میں ہمارے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی قوانین سب شامل ہیں کبھی متفق علیہ چیز نہیں ہو سکتا اور نہ ایک جگہ قائم رہنے والی چیز ہے کیوں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ہمارے تمدن، ہماری معاشرت، ہمارے عادات و اطوار اور ہماری ضروریات میں تغیر ہونا ضروری ہے اور تہذیب یا کلچر کے اس تغیر کے ساتھ ہمارے اجتماعی نظام کا بدلنا بھی لازم ہے، چناں چہ آپ دیکھئے کہ آج خود ہمارے علمائے کرام کی تہذیب و معاشرت کیا ہے؟ کیا یہ بالکل وہی ہے جو عہدِ رسالت و خلافت میں پائی جاتی تھی؟ اگر نہیں ہے تو آپ ان سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے شریعت کی پابندی نہیں کی کیوں کہ قانونِ اسلامی میں ہمارے لباس وغیرہ کے مسائل بھی شامل ہیں۔

اس سے تو آپ کو انکار نہ ہو گا کہ علوم و فنون کی ترقی نے اس وقت زمان و مکان دونوں کے مفہوم کو بدل دیا ہے اور تجارت نے ہر ملک و قوم کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مشاغل بہت وسیع ہو گئے ہیں اور ایسے ایسے مسائل ہمارے سامنے آ گئے ہیں جن کا اب سے قبل وجود تو خیر کیا؟ وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ کے بعد ہی معاشرت کی گتھیاں سلجھانے میں لوگوں کو قرآن و احادیث سے ہٹ کر قیاس ورائے سے کام لینے کی ضرورت پڑی تو اب کہ زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے اور ہزاروں نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں، ہم قیاس اور رائے سے کیوں کر قطعِ نظر کر سکتے ہیں اور وہ شریعت جو اب سے صدیوں سال قبل مرتب ہوئی تھی وہ ہماری موجودہ زندگی میں کیا کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ قانون ہمیشہ اقوام کی زندگی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اگر کسی مذہب میں اتنا لوچ نہیں ہے کہ وہ ضروریاتِ ملک و ملت کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر سکے تو وہ قطعاً بے روح مذہب ہے اور زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ شریعت میں تبدیلی کی ضرورت ہے تو کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ اسی مطالبہ کا اعادہ کرتا ہوں جو قرونِ اولیٰ میں اکابرِ دین کی طرف کیا گیا تھا اور جس کا نتیجہ آپ کی موجودہ شریعت ہے۔

ظاہر ہے کہ سرزمینِ عرب میں جو قوانین مرتب کئے گئے تھے ان میں وہیں کی آبادی اور اسی زمانہ کے مقامی ماحول کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو گا کیوں کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آج چین میں بیٹھ کر لندن کے لئے قانون وضع کیا جائے اور لندن میں بیٹھ کر چین کا، یا یہ کہ اس وقت ہم کوئی ایسی شریعت مرتب کر دیں جو ہزار سال بعد بھی کام دے سکے، پھر کیا

آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت فقہ حنفی تیار ہوئی ہے اس وقت اہلِ عرب کو اس کا علم حاصل تھا کہ ایک وقت ہندوستان میں بھی اسلام پھیلے گا اور ان کو اپنی ملکی ضروریات کے لحاظ سے فلاں فلاں امورِ رُشد و ہدایت کی ضرورت لاحق ہو گی، یقیناً نہیں۔ پھر آپ کیوں کر اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ شریعتِ اسلامی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اتنی ہی مفید و کار آمد ثابت ہو سکتی ہے جتنی اب سے سیکڑوں سال قبل عرب کے باشندوں کے لئے تھی، اور اس میں اب کسی تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں، اس سلسلہ میں ایک بات البتہ قابل غور ہے(اور وہ بھی ان لوگوں کے لئے جو بہت زیادہ قدامت پرست ہیں) وہ یہ کہ فقہِ اسلامی میں بعض مسائل ایسے ہیں جن کی صراحت قران مجید میں موجود نہیں، بعض احادیث سے لئے گئے ہیں اور بعض قیاس ورائے سے کام لے کر اجتہاد کئے گئے ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جو مسائل مذکور ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور وہ ایسے ہیں بھی نہیں جن میں تغیر کی ضرورت زیادہ محسوس کی جائے لیکن احادیث و قیاس کی مدد سے جو حصہ فقہ اسلامی کا مرتب ہوا ہے اس کو بدلا جا سکتا ہے۔ اگر اس کی ضرورت محسوس ہو، ایسا کرنے سے اصلِ دین کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا کیوں کہ قرونِ اولیٰ میں بھی برابر اسی اصول پر عمل درآمد ہو رہا ہے اور اس کو سامنے رکھے بغیر شریعتِ اسلامی ہر زمانہ اور ہر ملک کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی، رہا یہ اعتراض کہ اب سے ایک ہزار سال قبل کا انسان تو اجتہاد سے کام لے سکتا تھا اور اب اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے سو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ معترض کے سامنے بیل گاڑی اور ہوائی جہاز دونوں کو پیش کر کے خاموش ہو جاؤں۔

○○○

درود شریف

بجوابِ استفسار

اس سے غالباً آپ کو انکار نہ ہو گا کہ درود شریف ہو یا اور کوئی دعا، ان سب کا تعلق عبادت سے ہے اس لئے سب سے پہلے مختصراً عبادت کی حقیقت کو سمجھ لیجئے:

پرستش یا عبادت سے مراد کسی ایسی ہستی کے سامنے اظہارِ عجز و طلبِ فلاح کرنا ہے جو انسانی ہستی سے بہت بلند واقع ہوئی ہے اور جس کا اصطلاحی نام خدا ہے، اس لئے عبادت کا تعلق محض جذباتِ انسانی سے ہے اور الفاظ و حرکات کو اس میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہونا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خدا کا تصور جو عام طور پر مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ اتنا عجیب و غریب ہے کہ اس کے سامنے انسان اپنی انفرادیت و شخصیت، اپنی رائے و تمیز، اپنی آزادی و خودداری سب کچھ کھو بیٹھتا ہے اور اپنے تمام قواءِ ذہنیہ معطل کرنے کے بعد ہی وہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس نے "حقِ بندگی" ادا کیا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب معاملہ خدا ایسی عجیب و غریب ہستی کو خوش کرنے یا ناخوش رکھنے کا ہو تو ایک "بندۂ خدا" کے جذباتِ نیائش و پرستش کی شدت کا کیا عالم ہو گا اور کس شدید تاثر کے ساتھ "حضوری" کا تصوّر اس پر مستولی ہونا چاہئے۔

پھر چوں کہ ایک مذہبی انسان یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا اپنی تمام لازوال و غیر متناہی قوتوں کے ساتھ ساتھ ہر وقت "گوش بر آواز" بھی رہتا ہے اور "بصارتِ مطلق" ہونے کی بھی صفت کا حامل ہے، اس لئے وہ اس کی تعریف میں کچھ الفاظ بھی اپنی زبان سے ادا کرتا ہے (جس کا نام حمد و ثناء ہے) اور اپنے حرکات سے اپنے عجز و تذلل کو بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے (جس کا نام رکوع و سجود وغیرہ ہے)

مذہب نے خدا و بندہ کے درمیان اس تعلق کا تصوّر چوں کہ اسی دنیا کے شاہ و گدا کو سامنے رکھ کر کیا ہے اسی لئے وہی تمام باتیں جو یہاں کی ایک خود مختار فرماں روا ہستی کو خوش کرنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں، خدا سے بھی متعلق کر دی گئیں اور عبادت یا حمد و ثنا کی

صورت بھی تقریباً وہی قرار دی گئی جو کسی دربارِ شاہی میں رعایا و خدّام کی طرف سے زمین بوسی وغیرہ کی صورت نظر آتی ہے اور ان میں سوا اس کے کوئی فرق نہ رکھا گیا کہ خدا کی تعریف کا نام "حمد" اور بادشاہ کی تعریف کا (بہ تبدیلیٔ حروف) مدح ہے اس کو "خدا" کے لفظ سے یاد کرتے تھے تو اس کو اور چند حروف کے اضافہ کے ساتھ "خداوند" کہنے لگے، انہوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ اپنی تعریف سے خوش ہو کر انعام و اکرام کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خدا بھی خوش ہو کر بخشش و عطا سے کام نہ لے اور اگر بادشاہ بغاوت اور عدولِ حکم سے برہم ہوتا ہے تو یقیناً خدا کو بھی سرکشی و نافرمانی سے غضب ناک ہونا چاہئے۔

میں یہاں اس امر سے بحث نہ کروں گا کہ خدا کا یہ تصوّر اور عبادت کا یہ فلسفہ بجائے خود کس قدر لغو و مہمل ہے کیوں کہ موضوعِ زیرِ بحث سے اس کو کوئی تعلق نہیں میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ درود شریف یا کسی اور طریقِ عبادت سے انسان کو تسکین ہونا چاہئے یا نہیں؟

جب خدا اور بندہ کا تعلق وہی قرار پایا جو آقا و خادم یا مولیٰ و غلام کا ہے تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حصولِ مقصود کے لئے جو ذرائع یہاں مؤثر ہو سکتے ہیں وہی وہاں بھی کارگر سمجھے جائیں گے اور جس طرح یہاں انسان کو اپنی امیدوں کی تکمیل کے خیال سے تسکین پہنچتی ہے اسی طرح وہاں کی آرزوؤں کی تکمیل کے خیال سے بھی پہنچنا چاہئے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ خدا کی عبادت کسی غرض پر مبنی نہیں ہے، دنیاوی ثروت و دولت نہ سہی، اُخروی آسائش و راحت تو ہے "زہرۂ صبح و جامِ بلّور" نہ سہی جنت کا "موتی محل" اور وہاں کی "اچھوتی حور" تو ہے۔ اور زیادہ بلند ہو جایئے، قربِ خداوندی کی تمنا تو ہے؟ اس سے زیادہ اور عمیق فلسفہ تراشی کیجئے، حیزّ اصلی میں گم ہونا ہے، حدودِ تعینات سے گزر کر لاتناہی میں جذب ہو جانا تو ہے۔ بہر حال عبادت کا خیال خواہ وہ کسی نہج و صورت سے ہو، غرض سے خالی نہیں ہے اور اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ ہماری کوئی غرض ہمارے کسی قول و فعل سے پوری ہو سکتی ہے تو اس قول یا فعل سے تسکین ہونا ضروری ہے۔

بنابر آں اگر درود شریف کے ورد سے آپ کو تسکین ہوتی ہے تو اس کا کھلا ہوا نفسیاتی سبب موجود ہے اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نفسِ درود شریف کے الفاظ میں کوئی خاص اثر پوشیدہ ہے اور ہر شخص اس سے وہی تسکین حاصل کر سکتا ہے جو آپ کو حاصل ہوتی ہے۔

درود شریف کے ورد سے جو سکونِ قلب آپ کو میسر آتا ہے بالکل وہی ایک ہندو کو

گائتری کے پڑھنے سے ایک عیسائی کو دعائے یسوع کے ورد سے حاصل ہوتا ہے، اور اس سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً نہ درود کے الفاظ میں کوئی طلسمی اثر موجود ہے نہ گائتری اور دعائے یسوع میں، بلکہ اس کا تعلق خود اپنے اعتقاد و یقین سے ہے۔ آپ ایک ہندو سے کہئے کہ وہ درود پڑھا کرے اور آپ گائتری کی جاپ کیجئے، نہ آپ کو تسکین حاصل ہوگی نہ ہندو کو۔

اگر آپ کو درود شریف اور نماز سے کوئی ذہنی فائدہ پہنچتا ہے تو یقیناً آپ کو اس کی پابندی کرنا چاہئے اور تمام ایسے نفوس کے لئے جو بغیر اس قسم کی تدابیر کے اپنی وحشت نہیں کھو سکتے، علاج کی یہی صورت مناسب ہے، آپ نے وہ قصّہ پڑھا ہوگا کہ لومڑی ایک شیر کو ہلاک کرنے کے لئے کسی طرح ایک کنویں پر لے گئی اور وہاں پہنچ کر جب شیر نے اپنا عکس دیکھا تو یہ سمجھ کہ کوئی دوسرا شیر جنگل میں آ گیا ہے، اس پر حملہ کرنے کے لئے کنویں کے اندر پھاند پڑا۔

اب رہا نفسِ "درود شریف" کے دعا ہونے کا مسئلہ، سو "درود شریف" ایک دعا و التجا تو ضرور ہے لیکن اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے۔ عام طور پر درود شریف میں جو الفاظ ستعمال کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں: اللّٰھم صلّ علی محمد و علیٰ آل محمد و اصحابہ حضراتِ شیعہ "آلِ محمد" سے آگے نہیں بڑھتے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ "اے خدا! محمد و آلِ محمد و اصحابِ رسول پر برکت نازل کر، کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ پر نزولِ برکات کی دعا سے خدا خوش ہوتا ہے اور دعا مانگنے والے کو بھی اس کا ثواب ملتا ہے۔ ثواب سے مراد ہی خوش نودئ خدا، اعمال سیّئہ کی معافی اور آخر کار وہی بہشت و کوثر یا قربِ خداوندی ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔

درود میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ درود پڑھنے والا خود کوئی خواہش اپنی پیش کرتا ہے، بلکہ وہ رسول و آلِ رسول کے لئے دعا کرتا ہے در آں حالِ کہ ایسی برگزیدہ ہستیوں کے لئے نزولِ برکات کی دعا کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا یہ کہا کہ ؏

دعا قبول ہو یارب کہ عمر خصر دراز

میں نہیں سمجھتا کہ "تحصیلِ حاصل" کی اس سے زیادہ بہتر مثال کوئی اور پیش کی جا سکتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ درود کا ورد اس کو سمجھ کر کرتے ہیں یا بغیر سمجھے لیکن گمانِ غالب یہی ہے کہ اس کے مفہوم پر غور کئے بغیر یہ مشغلہ جاری رکھتے ہیں ورنہ یہ تسکین و سکین سب ختم ہو جاتی اور میری طرح آپ بھی گم راہ ہو جاتے۔

عبادت

بجواب استفسار

آپ نے اپنے شکوک و اوہام کی وضاحت نہیں کی، یعنی اگر آپ کو عبادت سے حقیقی سرور حاصل نہیں ہوتا تو کیوں؟ یہ بالکل صحیح ہے کہ اعمال کا دارومدار خلوص و صداقت ہے، لیکن عبادت کا مدعا بھی تو اس کے سوا کچھ نہیں، اگر کچھ ایسے لوگ ہیں جو باوصفِ نماز، روزہ کی پابندی کے افعالِ قبیحہ کے مرتکب ہوتے ہیں تو یہ قصور عبادت کا نہیں بلکہ خود ان کا ہے۔ عبادت کا لازمی نتیجہ تصفیۂ قلب نہیں ہے لیکن جس ذریعہ سے تزکیۂ اخلاق ہو سکتا ہے وہ یقیناً عبادت ہے۔

فرض کیجئے کسی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک شخص کے سامنے کئی راستے ہیں اور وہ ایک راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے لیکن اگر کچھ دور چل کر اس کو شک پیدا ہو جائے کہ یہ راستہ غلط ہے اور اسے چھوڑ کر وہ دوسرا غلط راستہ اختیار کر لے اور منزل تک پہنچ نہ سکے تو یہ قصور راستہ کا نہ ہو گا بلکہ خود راستہ چلنے والے کا ہو گا۔

عبادت کا صحیح مفہوم اپنے اندر وہ کیفیت پیدا کرنا ہے جو خلّاقِ عالم و عالمیان کے تصورِ صحیح سے اسے قریب تر کر دے اور خدا کا صحیح تصور صرف یہ معنٰی رکھتا ہے کہ انسان اپنے مفہومِ کلّی کو سمجھنے لگے۔ مفہومِ کلی سے میری مراد یہ ہے کہ وہ انفرادی طور پر صرف اپنی ذات کو سامنے رکھ کر ”انسان“ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ تمام نوعِ انسانی کو ”وجودِ واحد“ قرار دے کر اپنے آپ کو اس کا جزوٗ قرار دے اس صورت میں تمام افرادِ نوعِ انسانی سے وہی لگاؤ ہو جائے گا جو خود اپنی ذات سے ہے اور ایک جذبۂ لاذاتیت Self-lessness پیدا ہو کر وہ سراپا ایثار و لطف بن جائے گا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے محدود صورت میں دنیا کی قوموں کو ابھارا اور جس کے فقدان نے انہیں دنیا سے محو کر دیا لیکن اب کہ علوم و فنون کی ترقی نے تمام کرّۂ ارض کے باشندوں کو ایک دوسرے سے

وابستہ کر دیا ہے، اس جذبہ کو ملک و قوم کے تعینات سے گزر کر عام "انسانیت" کے حدود میں آنا چاہیئے اور انسانوں کا رشتہ بجائے رنگ و نسل کے صرف اس اصول پر قائم ہونا چاہیئے کہ وہ سب ایک ہی کرہ کے رہنے والے ہیں۔

وہ زمانہ جب کہ عرب کے لوگ سوا اپنے سب کو عجمی کہتے تھے ختم ہو چکا ہے، اور وہ روز جب اہلِ عجم اپنی شان و شوکت کے سامنے ساری دنیا کو حقیر و ذلیل سمجھتے تھے باقی نہیں رہا وہ عہد جب خدا کی پوجا، اذان و ناقوس کے ذریعہ سے ضروری قرار دی جاتی تھی گزر گیا کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ایشیا کا انسان یورپ کے انسان سے اور امریکہ باشندہ لنکا کے باشندے سے ناواقف تھا، اب زمین اتنی وسیع نہیں رہی جتنی ہمارے جہل و ناآگاہی کے زمانہ میں وسیع نظر آتی تھی اب وہ بہت تنگ ہو گئی ہے اتنی تنگ کہ ہم یہاں سے بیٹھے بیٹھے کرۂ ارض کے ہر ہر فرد سے باتیں کر سکتے ہیں اس لئے اب تمام تفریقات کو مٹ کر ایک وحدت میں تبدیل ہو جانا چاہیئے اور وہ وحدت صرف رشتہ انسانیت ہے۔

دنیا میں مذاہب کا وجود اکثر و بیشتر اسی محدود نقطۂ نظر کے تحت عمل میں آیا جب انسان کلی کا مفہوم متعین نہ ہوا تھا اس لئے عیسائی مسلمان کا دشمن تھا اور مسلمان عیسائی کا۔ اب کہ گبر و ترسا، ہندو مسلمان بحیثیت انسان ہونے کے ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے ہیں، مذہب کا قدیم مفہوم بدل جانا چاہیئے اور اس کی بنیاد اس حقیقت کو سامنے رکھ کر استوار کرنا چاہیئے کہ سارا کرۂ ارض صرف ایک گھر ہے جس کے اندر تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب کا مدعا پہلے یہ ہوا کرتا تھا کہ وہ کسی ایک مخصوص عقیدہ کو پیش کر کے کسی قوم و ملک کو ابھارے اور اس وقت کی تنگیٔ علم کو دیکھتے ہوئے یہ خیال برا نہ تھا لیکن تاریخِ مذاہب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس خیال نے رفتہ رفتہ ایک عسکری خود غرضی اختیار کر لی اور ان کا مقصود صرف ایک دوسرے کو برا کہنا اور ذبح کرنا رہ گیا، خدا کا مفہوم ہر مذہب نے جداگانہ قرار دے لیا اور جنت و دوزخ عطا کرنے کی خدمت خدا سے چھین کر خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مذاہب محض امن و سکون کی تبلیغ کا دعویٰ لے کر نمودار ہوئے تھے وہ بھی اپنا ہاتھ خون سے رنگین کئے بغیر رہ سکے اور آخر کار عقلی و اخلاقی حیثیت سے ان کی اہمیت رفتہ رفتہ اس قدر کم ہو گئی کہ مذہب کا وجود ہی امن و سکون کا منافی قرار پا گیا۔

بہر حال مذہب کسی زمانہ میں مفید ہوا ہو یا مضر، بحالاتِ موجودہ اس کے نقصانات کھلے ہوئے ہیں اور اس کو ذریعۂ نجات قرار دینا حماقت ہے۔ البتہ اگر ملتوں کا امتیاز مٹا دینے کے بعد کوئی ایسا دین رائج کیا جائے جو اپنا نصب العین ماوراء مسجد و مندر قرار دے تو بے شک چل سکتا ہے ورنہ مذاہب کی عمر اب ختم ہو چکی ہے اور تجربہ نے ان کو بہت ناکامیاب ثابت کیا ہے۔

اسلام مدعی ہے کہ وہ امن و سکون کا حامی ہے اور اس میں کلام نہیں کہ اس کا اخلاقی معیار بھی بہت بلند ہے لیکن تلوار چلائے بغیر وہ بھی نہ رہ سکا اور عملِ تکفیر کا سہارا اس نے بھی ڈھونڈا، اس لئے مسلمان رہنے میں تو کوئی حرج نہیں بشرطِ آں کہ آپ غیر مسلم کو "غیر انسان" سمجھ کر اس سے نفرت نہ کریں اور اگر نماز روزہ سے یہ کیفیت کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوتی تو وہ بالکل بے معنی چیز ہے جس چیز کا نام "صبغۃ اللہ" ہے وہ فی الحقیقت "انسانِ کلّی" کے اسی مفہوم کو متعین کرتا ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا اور "خدائی رنگ" کائنات کی ہر ہر چیز میں پایا جاتا ہے اور ہمیں ہر ہر چیز محبوب ہونا چاہئے لیکن عام طور پر مولویوں اور قائدینِ قوم کے نزدیک صبغۃ اللہ (خدائی رنگ) سے مراد وہ خون ہے جو شہید گنج کی مسجد کے لئے بہایا جائے۔ گویا خدا کو بت سمجھ کر اس کا ایک استھان مقرر کر لیا گیا ہے کہ وہ وہاں کے علاوہ کہیں اور نہیں پایا جا سکتا پھر آپ اسلام کا یہ مفہوم کیوں قرار دیں اور خود کو محراب و منبر کا پابند کیوں سمجھیں؟ ایک وقت مسلمانوں کی ہمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ جہاں وہ قدم رکھ دیتے تھے سجدہ گاہ ہو جاتا تھا ساری دنیا خدا کا معبد تھا اور جس طرف وہ منہ کر لیتے تھے خدا بھی اپنا منہ اسی طرف پھیر لیتا تھا مگر اب ان کا خدا صرف اسی مسجد میں مقید نظر آتا ہے جو سب سے زیادہ ویران ہے اور جہاں انہوں نے صدیوں سے کوئی سجدۂ عبودیت ادا نہیں کیا۔

دیکھئے اسلام کا مطالعہ آپ کبھی مولویوں اور پیروں کی وساطت سے نہ کیجئے، یعنی ان کی زندگی کو سامنے رکھ کر اسلام کو سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ ان سب سے کٹ کر خود فیصلہ کیجئے کہ اگر اسلام کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ دنیا میں امن و سکون کی اشاعت کے لئے آیا ہے تو اس مفہوم اور اس کی بتائی ہوئی طاعت و عبادت کا مدعا کیا ہونا چاہئے۔

نماز نام محض رکوع و سجود کا نہیں ہے، قعود و قیام کا نہیں ہے۔ مخصوص آیات کے پڑھ لینے کا نہیں ہے بلکہ اپنے اوپر اس کیفیت کے طاری کر لینے کا ہے جو عبد و معبود کے

تعلق کو استوار کرتی ہے اور اس تعلق کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ہر فرد کا خیال اپنے ابناء جنس کے ساتھ والہانہ وسعت اختیار کرلے پھر اگر نماز سے یہ کیفیت آپ میں پیدا نہیں ہوتی تو آپ کی نمازیں بالکل بے کار ہیں اور اگر علاوہ نماز کے کسی اور طریقہ سے آپ میں یہ ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے تو آپ کے لئے وہی طریقہ صحیح عبادت کا ہے اور ممکن ہے کہ مولوی اس باب میں آپ سے برہم ہو لیکن خدا جو تمام تعینات سے بلند وارفع ہے کبھی آپ سے مؤاخذہ نہ کرے گا۔

کوشش کیجئے کہ نماز آپ میں یہی وسعتِ خیال پیدا کرے لیکن اگر آپ کا ذوق اس سے پورا نہیں ہوتا تو یقیناً نماز آپ پر فرض نہیں ہے خدا کو کسی اور ایسے ذریعے سے یاد کیجئے جو آپ کے قلب وروح کو مطمئن کر سکے، ضمیر کوئی الہامی چیز نہیں ہے بلکہ وہ پیداوار ہے ماحول کی، اسی لئے ایک فعل جو ایک قوم کے نزدیک برا سمجھا جاتا ہے دوسری قوم کے نزدیک اچھا ہے، اس میں شک نہیں کہ مذہبی حس نے اس کی تشکیل میں بہت مدد کی ہے لیکن چوں کہ مذہب خود انسان کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اس لئے ضمیر کو کوئی مستقل بالذات شئے قرار دینا درست نہیں اور اختلافِ رنگ و نسل یا اختلافِ ملک و قوم کے ساتھ اس میں بھی اختلاف پیدا ہوتا رہتا ہے، چوں کہ مسلمان بچے گہوارہ ہی سے یہ سنتے آئے ہیں کہ سؤر ناپاک ہوتا ہے اس لئے وہ بڑے ہو کر بھی اس سے متنفر رہتے ہیں در آں حالِ کہ انگریز نہایت خوشی سے اسے کھاتے ہیں اور ان کا ضمیر مطلق سرزنش نہیں کرتا۔ ایک مسلمان اگر عیسائی ہو جائے تو بھی وہ سؤر کا گوشت نہ کھا سکے گا اور ہندو، مسلمان ہونے کے بعد بھی گائے کے گوشت سے احتراز کرے گا۔ الغرض ضمیر ہمیشہ مذہب اور سوسائٹی کے دباؤ سے پیدا ہوتا ہے اور ان اثرات سے ہٹ کر اس کا علیٰحدہ وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

مساجد اور سیاسی جلسے

بجواب استفسار

آپ نے بالکل صحیح فرمایا کہ بعض علماء کی ہدایت یہی ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے زمانۂ طالبِ علمی میں بعض اساتذہ کا یہی حکم تھا اور چند واعظین سے بھی میں نے یہی سنا تھا لیکن بعد کو مطالعہ و تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ یہ غلط کہتے تھے اور عہدِ اسلام میں مسجدیں نہ صرف عبادت، بلکہ تمام ملکی، قومی و تعلیمی مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے وقف رہی ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اسلام میں سیاست و مذہب دونوں ایک دوسرے سے وابستہ تھے، یعنی جس شخص کو مذہبی رہنمائی کے حقوق حاصل ہوتے تھے وہی سیاسی قیادت کا بھی ذمہ دار سمجھا جاتا تھا اور اس لئے مسجدیں عبادت و نظمِ حکومت دونوں کے لئے وقف ہوتی تھیں۔

ان دونوں کے باہمی تعلق کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مسجد ہمیشہ کیمپ کے مرکزی حصہ میں قائم کی جاتی تھی اور خلیفہ یا فرمان روائے وقت کا مکان جسے دالامارۃ کہتے تھے اس سے بالکل متصل تعمیر کیا جاتا تھا اور یہ روایت یا رواج اتنے عرصہ تک قائم رہا کہ جب قاہرہ کی مشہور مسجد جامعہ عسکر تعمیر ہوئی (۱۹۶ھ) تو اس رسم کو قائم رکھنے کے لئے اس سے متصل "دارالامراء مصر" بھی تعمیر کیا گیا جس کا ایک دروازہ مسجد میں کھلتا تھا اور جب ابن طولون نے مسجد تعمیر کرائی تو اس سے ملی ہوئی ایک عمارت "دارالامارۃ" بھی بنوائی جہاں سے وہ مسجد میں داخل ہو سکتا تھا حالاں کہ وہ یہاں نہ رہتا تھا۔

بعض خلفاء نے اگر اپنا قصر مسجد سے متصل تعمیر نہیں کرایا تو منارۂ مسجد میں ایک "منظرہ" ضرور بنوایا جہاں سے مسجد نظر آتی تھی۔ مسجدوں میں منبروں کا قیام محض اسی لئے تھا کہ خلیفۂ وقت وہاں سے قوم کو خطاب کرے اور انہیں ہدایت و مشورہ دے، انہی منبروں پر ایک خلیفہ کے بعد دوسرا خلیفہ اپنی خلافت کا اعلان کرتا تھا اور اسی جگہ بیٹھ کر وہ گورنروں کے عزل و نصب کی اطلاع لوگوں کو دیتا تھا۔ گورنر بھی اپنے علاقوں میں

منبروں پر بیٹھ کر فوجی و انتظامی احکام نافذ کیا کرتے تھے۔

علاوہ اس کے مسجدوں سے بیت المال کا کام بھی لیا جاتا تھا اور یہاں ملکی خزانہ محفوظ رہتا تھا چناں چہ فسطاط میں عثمان بن زید نے جو مالیات کے ناظم اعلیٰ تھے ۹۶ھ میں مسجد عمر کی تعمیر کے سامنے ایک قبہ یا کوٹھری اس غرض سے تعمیر کرائی کہ وہاں خزانہ رکھا جائے اس کے علاوہ تاریخِ اسلام میں اس قسم کے قبوں کا ذکر بکثرت پایا جاتا ہے۔

مسجدوں سے عدالت گاہ کا کام بھی لیا گیا ہے، چناں چہ خود رسول اللہ نے بھی مسجدِ نبوی میں احکامِ شریعت نافذ فرمائے اور اس کے بعد قضاۃ بھی منبر کے پاس یا صحن میں بیٹھ کر فتویٰ صادر کیا کرتے تھے چناں چہ ۱۳۲ھ میں مدینہ کے قاضی مسجد ہی میں مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے تھے اور بصرہ میں اسود بن سریع التمیم بھی مسجد میں قاضی کی خدمات انجام دیتے تھے، ۲۳ھ میں حضرت عمر کے حکم سے عمرابن العاص نے فسطاط میں جب قیس کو قاضی مقرر کیا تو یہ احکامِ قضا مسجد میں بیٹھ کر صادر کیا کرتے تھے۔

یعقوبی کے زمانہ میں بغداد کا قاضی مسجد ہی میں بیٹھ کر معاملات طے کیا کرتا تھا اور دمشق میں بھی یہی رواج تھا، یہاں تک کہ جب کسی دوسری قوم سے متعلق کوئی سیاسی یا ملکی معاملہ طے کیا جاتا تھا تو غیر مسلم حکم یا منصف کو بھی مسجد میں آکر فیصلہ صادر کرنے کا موقعہ دیا جاتا تھا، چناں چہ مسجد کوفہ میں ایک بارگی عیسائی شاعر اخطل کو حکم کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔

مسجدیں دارالقضا ہونے کے علاوہ دارالافتاء بھی تھیں اور بڑی بڑی مسجدوں سے ایک ایک مفتی بھی متعلق ہوتا تھا اور اس کا حلقۂ افتاء یہیں قائم ہوتا تھا۔

مسجدوں سے مدارس و مکاتب کا کام بھی لیا گیا ہے، قرآن، حدیث، فقہ تو خیر خالص مذہبی علوم ہیں اور ان کا تعلق مذہب سے ظاہر ہے لیکن تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ لسانی علوم یا ادبیات کا درس بھی مسجدوں میں دیا جاتا تھا چناں چہ فقیہ سعید بن المسیب مدینہ کی مسجد میں عرب شاعری پر لیکچر دیا کرتے تھے، ۲۵۶ھ میں طبری نے طرماح کے اشعار مسجد عمر میں بیٹھ کر لوگوں کو لکھوائے، اسی طرح غرناطہ کی جامعہ مسجد میں طلبہ کو نحو کی تعلیم دینا، تیونس کے جامعہ زیتونہ میں مقاماتِ حریری کا درس دیا جاتا تھا اور بغداد میں نمازِ صبح کے بعد کسائی کا صرف و نحو کا سبق دینا بھی تاریخ سے ثابت ہے اسی طرح علومِ عقلیہ کی درس و تدریس بھی مسجدوں میں دی جاتی تھی۔

مسجدوں سے کتب خانوں کا کام بھی لیا گیا اور ان کتب خانوں میں صرف تفسیر و حدیث ہی کی کتابیں نہ ہوتی تھیں۔ لوگ آتے تھے اور مسجدوں میں بیٹھ کر مختلف علوم کی کتابوں کا مطالعہ اور ان پر بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ الغرض مسجدوں کی حیثیت اسلام میں بہت متنوع تھی، وہ عبادت گاہیں بھی تھیں اور عدالت گاہیں بھی، دارالافتاء بھی تھیں اور ایوانِ حکومت بھی، وہاں علومِ عقلیہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور سیاست و ادب کی بھی۔

یہ درست ہے کہ لہو و لعب کی مجلسیں مساجد میں کبھی قائم نہیں کی گئیں اور نہ ایسا کرنا مناسب تھا لیکن اس کے علاوہ وہاں سب کچھ ہوتا تھا جس کا تعلق کسی جماعت کی قومی زندگی سے ہے اس لئے یہ کہنا کہ مسجدوں میں سوائے نماز و قرآن خوانی کے کچھ نہ ہونا چاہیئے، بالکل غلط ہے۔

○○○